

دار الحکومت اسلام آباد

کراچی

# پہلی کہانیاں

September

2014



اس شمارے میں

ایک گورنر کی کہانی جس نے اپنی محبوبہ کو

پہلی شہر کی حسین وادیوں میں جہنم لینے والی محبت کی داستان

پہلی کے ہاتھوں ہتھکڑی کی لڑائی اور داستان

اسرار میں دو بہنوں کے درمیان اور ان کے بے رحمی کے

پہلی کے قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY



# پچی کہانیاں

E-mail: pakpublication@hotmail.com

بانی سہام مرزا



بانیہ ایڈیٹر

رخسانہ سہام مرزا

نیز ایڈیٹر

زین العابدین

نیو ایڈیٹر

محمد جمال زمان

مدیرہ اعلیٰ : منزہ سہام  
مدیر : کاٹی چوہان / دانیال شمس

بانی پاکستان ہونے والی  
پاکستان ایس پی این ایس ایس  
MEMBER  
APNS  
CPNE

انٹرنیشنل ایڈیٹر  
محمد امجد گوٹلی (ایڈیٹر انچیف)

خط و کتابت کا پتہ: 110 آدم آرکیڈ  
شہید ملت روڈ / بہادر شاہ ظفر روڈ - کراچی

قیمت فی شمارہ: 60 روپے ✨ جلد: 31 - شمارہ: 09 ✨ ستمبر: 2014ء

ایڈیٹر پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

ہر ماہ اپنی کہنوں کے تحت شائع ہونے والے ہر نمونے میں اس کے علاوہ اور بھی کیا کہانیاں شائع ہوتے ہیں اور ہر نمونے کے ساتھ ہی ایک نیا اور دلچسپ کہانی بھی شائع ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر نمونے میں ایک نیا اور دلچسپ کہانی بھی شائع ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر نمونے میں ایک نیا اور دلچسپ کہانی بھی شائع ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر نمونے میں ایک نیا اور دلچسپ کہانی بھی شائع ہوتی ہے۔

احوال

10

مجید

تاریخ کے خطوط اور احوال  
احوال کا دل چسپ سلسلہ

کچھ اپنی باتیں

09

کاشی چوہدری

اپنے قارئین سے خواہش  
ہمیر کی کچھ دل داریاں

دھرتا ہوگا

07

منزہ سہام



گلابی دو چٹا

50

شہری سعید

گلابی دو چٹے میں ڈوبی اسرار  
بھری ایک لڑواں داستان

ڈکھو ہلیز کے

40

طاہرہ الہی

ایز کی پستانٹی کا دکھار  
ایک حوصلہ مند شخص کی کہانی

ڈور کے ڈھول

34

سلیم اصغر

ڈنگتے قدموں کو سہارا دینے  
دل کے شخص کی خوبصورت کہانی

انٹوکھا رشتہ

68

عارف رمضان

نامانی اقدام ہی آگ سے  
جھپٹے، دل ایک لڑکی کی داستان

فیصلے دل کے

64

نہت عین ضیاء

موباک کی دلچسپی مایوں  
میں ایک مٹھی ہوئی خبر

زندگی کا معیار

58

غلام احمد اعجازی

انٹیشن کی ذہنی غوری امانی  
ایک لڑکی کی ہیرت تک کہانی

عادت کی جھینٹ

85

فاطمہ بیگم

خاموشی کی سزا جھینٹے والی  
ایک لڑکی کی بچہ داستان

گل دستہ

82

شاہدہ شکیل

تھرت و تھم میں ڈوبی جہانی کی  
دکھ مایوں کی حسرتوں کی کہانی

کشف

78

مقصود بلوچ

موت سے آگے کی مرگت جوں  
ہے ایک محبت بھری کہانی

مکھنی

96

ارشاد علی ارشد

خیال اور حقیقت کی لہر سے  
آزاد ایک بچہ پلائی کی داستان

محبت کی لک

93

عبد الغفار عابد

موباک نون سے خم بیٹے والی  
ایک عورت کی ہیرت خیز کہانی

نا کردہ گناہ

88

نصرت سرسرازی

نا کردہ گناہ کی سزا پانے والی  
ایک عورت کی حیران کن کہانی

گوئی ماں

112

سیدنا سیدنا

کے پیار کے احساس کو  
انگڑ کر گئی ایک بڑا سرد اور تر

کیوں یہ کھیل کھیلا

116

فوزیہ جاوید

ایک ایسی لڑکی کی کہانی جو خود  
جی اپنی سوت کہ سب بن گئی

کائناتوں کی زمین

122

شعبان بکتوسہ

محررت سے بھائی دونی ایک  
پر مئی لڑکی کی عبرت خیر داستان

تشنہ جنوں

130

سلیمہ طارق

اس سارے حسیہ دہ گئے والے  
کے فوجیوں کی سرگزشت

تمہاری یاد میں

148

نور محمد

ایک نوجوان کی داستان جس کے  
لئے محبت ایک امتحان تھی

انسانیت کی بار

152

عزرا فردوس

پیسے کے لیے لوگوں کا خون  
بنانے والے مرد کی داستان تھی

قلمی دوست

157

ایب سید

قلمی دوستی کے ہر پہلو پر  
لے ایک بھر مگر کہانی

روشنی کے مینار

162

جہل صیقل

تعمیر کی داستان میں جہم لینے  
والی مجاہد کی محبت بھری داستان

نئی قبر

171

ایسا امین احمد

ایک گورنر کی عبرت خیر کہانی  
جس نے اپنی محبوبہ کو

قسمت کی دستک

178

روحانہ نسیم

دول جہازت کی کہانی جس  
نے خود اپنی قسمت پر جانا دکھایا

ماں کی قبر

192

سنگہ بیٹا

بچی کے قصوں میں کتنی ہیازت  
خیر داستان نو بہ ایک ننگ سے

تاگن

198

اعجاز احمد نواب

ہزاروں سال کی تپتیا پر  
پھیلا زندگی کا ایک رنگ

مسئلہ

222

ادارہ

پ کے مسائل کا حل،  
قلمی کہانیاں کا لڑا لڑا مسئلہ

سخن آباد

232

قارئین

شعراء کے کلام سے آباد  
ایک سخن فہم سلسلہ خاص

فیض عشق

236

امجد جاوید

عشق کے سوا اور کبھی عشق  
میں زندگی ایک خاص انگار کہانی

ایکشن، سسپنس، خوف و درہشت  
سے بھرپور کہانیوں کے خالق

”ایم اے راحت“

کا ایک اور لافانی سلسلہ

”ہم شکل“



بہت جلد ماہنامہ ”کہانیاں“ کی زمینت بن رہا ہے۔



## ”دھرنا ہوگا“

پاکستانی سیاست کس راستے پر گامزن ہے یہ اب سمجھنا مشکل نہیں..... پاکستان اور پاکستانیوں کا کیا مستقبل ہوگا، یہ بھی بہت واضح ہے۔ احتجاج اور دھرنے ہی اب ہماری قومی شناخت بن چکے ہیں۔ مرضی کے خلاف بات ہو تو بس ایک ہی راستہ سب کو نظر آتا ہے اور وہ ہے احتجاج اور دھرنوں کا..... زیادتی کے خلاف آواز بلند کرنا بہت ضروری ہے مگر ہر دو عمل جس سے وقت کا زیاں ہو اور دوسروں کو تکلیف ہو غلط ہے۔ احتجاج میں شریک لوگ حالات کی سنگینی سے کس قدر آگاہ ہیں، وہ ذہول کی تھاپ پر ہوتا رقص جاتا ہے۔ ڈھور ڈنگروں کو ہنکانے میں اور انسانوں میں فرق ہونا چاہیے۔ طاقت ور حزب اختلاف ملک کی تقدیر بدلنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ حکومت میں آ کر ملک کی خدمت کرنے کا جذبہ تو ہر شخص میں کوٹ کر بھرا ہوتا ہے لیکن اصل محبت تو یہ ہے کہ حزب اختلاف کی کرسیوں پر براجمان ہوں اور پوری ایمان داری سے حکومت کو کام کرنے کی تشبیہ کی جائے۔ یہی جمہوری طریقے ہیں، یہی شائستہ انداز ہیں۔ باقی رہی بات دھرنوں کی تو اس سوچ کو بدلنا ہوگا منزو سہام کہ سب اچھا ہوگا جب دھرنا ہوگا.....



پرل پبلی کیشنز کی جانب سے دو عظیم کتابیں

## چانگے دنوں

بانی پرل پبلی کیشنز، سہام مرزا کے قلم سے

صحافت کی دنیا کا نیلاب

ماہنامہ ”دوشیزا“ اور ماہنامہ ”بچی کہانیاں“ میں شائع ہونے والے منتخب اہلاریے، جو آج بھی لمحہ  
موجودہ کا عکس ہے۔

قیمت صرف = 200 روپے

## منورہ زوری حلیق کے قلم سے

## میری مسکاتی میری یادیں

ایک ایسی روداد جس کا ہر لفظ سچا، ہر سطر نہرت انگیز

ایک ایسی روداد جو مصنفہ کی اپنی ہے

مگر سبق اوروں کے لیے ہے

مصنفہ نے اپنے شوہر کے احوال زیست کو

اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے کہ اس پر ناول کی چاشنی بھی قربان ہو جائے

ایسے لطیف انداز میں بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں ہر گھر میں بطور استاد اسے ’رہبر بنا چاہیے۔‘

قیمت = 500 روپے

تاجین گلوانے کا پتہ: پرل پبلی کیشنز 110 آدم آرکیڈ شیڈ، ملت روڈ، کراچی

فون : 021-34939823-34930470

## کچھ اپنی باتیں

مخفیہ تو آپ نے یقیناً دیکھ ہی ہوں گے۔ محب و فریب دونوں سے صاحب ایسے تو ہے اس کا نام بھی کسی مجرب سے تم نہیں ہے۔ اس کے نام میں بڑی شہرت ہے، اگر آپ اس نام یا اسم کی تاثیر کے ذکر نہیں تو ہاتھ لگائیں تو آری... کسی بھائی بند کوئی کبہ کر دیکھ لیجئے، ہمہما بخلا انسان بھی بڑا باکائے کو دوز پر ہے۔ گویا اگرچہ کئے کو پکار کر کہا کہیں تو سرشارتی سے دم ہلانے لگتا ہے۔ صرف ایک پیکار کے جواب میں جان بچا کر مارنے کوئی جا ہے، سات پیکار کا اور چار سے ہلا گیا دیتے سمجھتے ہیں کچھ کھانا بنا کر بہت بڑی بات ہے، اگر آپ کی گل میں کسی گڑنی کے نیچے سوات تو پھر لاکھا سے دھکا دیں، لاکھا چھوڑیں، لاکھا فلو کر دیں، پھر کہیں، یہ نفسی گڑنی کی چھوڑوں کے بدلے آپ کی حفاظت کرنا باہر میں کچھ لیتا ہے۔ ہماری طرف ایک صاحب رہتے تھے، رحمت نصیب ہو گئے، اب ان کا نام کیا لکھوں، ان کے فلیں دو میلان برہان جا میں گئے، بڑے ہی کڑے کھیلے تھے، جیسے ان کی زبان نہ ہو کر بیٹے کا کھیت، وہ ان کا وہن کی زبرد عزیز میں سے تم ٹھوڑی تھا، کہ ہر موسم میں کھیلنے کی سرسبز تازہ فصل فصل سے لدا، پسند آتا تھا، آٹھیں زمانے کے ساتھ ساتھ گلی کے کونوں سے خدا واسطے کیر تھا۔ جہاں کوئی آٹا کھتے پھروں کے ساتھ ساتھ وفقات کی برسات کر دیتے، مگر کونوں کی جی، واری بھی ٹھیک تھا، کھلے میں بڑے سے بڑا اور مانجھی آ جائے، کونوں نے شام سے ڈرنا ہے اور نہ ہی شفاف واضح ہونے تک اس کا پھر بچھا چھوڑتا ہے، جیسے ہی کھلے کا کوئی آؤں انہی سے سلام دنا کرتا کئے جس پر ہو گئے ان کے سامنے ہلا آٹھروں کر، بے، جیسے شرم سے پانی پانی اور سے ہوں، مگر سلام سے ان کونوں پر کہ جس کسی کو کھلی سے کھڑا نہ است کے ساتھ چھوڑا، اس سے پوچھیں کی طرح پیسے کھس لیے، کبھی نہیں لے

بات ہو رہی تھی ان صاحب کی، یہ سہارنے ان کھلی سے صاحب سے ایسے سمجھتے پھرتے تھے کہ جیسے کہ ہم ادھار چڑھ جانے کے بعد کھرا پانے والے سے سمجھتے ہیں۔ ان صاحب کی آؤ کھلی کے سامنے لڑکی بیرواشی تھی۔ بیرواشی تو کھل سے پھر بھی پھا گئے، مگر کونوں ان صاحب سے پچھا کھلی تو ایک دن سر شام کونوں نے بھونک بھونک آؤں سر پر اٹھایا لوگ باہر نکل آئے، کونوں کا بھونکا نیز مھولی تھا، ایں لگا تھا کہ کھلے کے نہیں پورے ملامت کے کونوں سے بھونکے کے لیے سر و سڑکی بازی لگ دی ہے۔ معلوم ہوا کہ کونوں نے وہ روز سائیکس اور وہاں کچھ اور بات، ان سواروں نے کونوں پر گولی بھی چلائی مگر کونوں کو سزا منظور ہے، ان سواروں کو ملامت کی حدود سے باہر جانے نہیں دینا۔ جب تک لوگ وہاں بیٹھے، ہنر سائیکس اور وہاں کو بیچے گرا دیکھتے تھے۔ ایک کی پستول والا ہتھیاری تھے کے من میں تھا جو کہ بیٹے صاحب کے ہزار چھوڑنے کے باوجود ان کی گاڑی کے پیچے ہونے سے ہڈ نہیں آتا۔ کچھ دیر بعد صورت حال بدلتی ہوئی تو چاہا کہ ہنر سائیکس سوار کہ بیٹے صاحب کے پوتے کو ہانہ کی طرف سے انوار کر کے لے جا رہے تھے، کونوں کی مداخلت سے ان کا پوتہ تیرہ دنانیت واپس اپنی ماں کی گور میں بھیجی گیا۔ پھر تو کر بیٹے صاحب اور زیادہ کر بیٹے ہو گئے، گراب وہ کر بیٹے صرف انسانوں کے لیے تھے، کونوں کے لیے تو شیر شکر ہو گئے تھے۔ پھر پھرتے لائے اور کونوں کو ڈھونڈتے پھر تے گراہیں کھلا میں۔ اور یہ بات کہتے کہتے، تھے تیر گئے کہ کئے انسان سے اچھے ہیں۔ یہ تو کئی کونوں کی بات ہے، ہمیں کی اولاد کی حفاظت بھی اپنی جان پر تمیل کے کر گئے، اور اب ایک بات ہم انسانوں کی بھی ماسن معلوم ہے، کی جس کا کہیں نہیں تھا، جو اچھی و اچھی تو استوں سے ہم روٹنی کا سبق پڑھ کر آیا تھا، اچھی و اچھی تو اس نے اپنے وہ قد میں انہوں سے بڑے گھر پر کھتا تھا، اچھی تو اپنے دو ہنٹے ہاتھوں سے اس نے نہ جانے کئے کیا نہ جانے تھے، اسے کیا معلوم تھا کہ اچھی وہی یہ دو ہاتھ ایک ورنہ وہ نہیں لے گا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کے باپ کی مھولی ہی درمیش ہوا ایک مھولی روز نہ آتے ایسا ایک مصلحت سے، گوا کہ وہ چھوڑ چلا تار ہے؟ اور وہ نہ دیکھنے لگا ہوا، اس کے دوڑوں ہاتھوں بیل کے پنے میں وہ دے گئے، میں دوڑوں ہاتھ کے دو سے اس معلوم سے بیٹے کا اتار پونے دیں پھر کچھ رہا اور سوچ رہا آپ کا اپنا تھا کہ خرم کون ہیں؟ کیا ہم انسان ہیں؟ ہاں ہم باقی انسان ہیں، ہم انسان ہی کہا لے کے لائیں ہیں۔ ہم واقعی تھا کہا لے کے لائیں نہیں، مگر بیٹے صاحب ٹھیک ہی کہتے کہتے مر گئے کہ کئے انسان سے اچھے ہیں۔



# احوال

نارہین کے دو مہمان راہبہ آپ کے خطبہ اور ان کے جواب

**پیارے ساتھیو!**

خبر کا شور۔ آپ کے ہاتھ میں ہے ہمیں یقین ہے جس طرح آپ نے اہستہ کا ہتھوڑہ بند کیا ہے اسی طرح یہ بھی آپ کو بند ہونے کا اور آپ اپنی آراء سے ہمیں آگاہ کریں گے، ہم آپ کی رائے کے منتظر ہیں۔ ماشاء اللہ اور ان کا فائدہ کریں گے۔

۱۰۰ کھاروں سے نہیں ٹانہیں ٹانہیں احوال ہیں، کھینچتی ہیں۔ جناب ایڈیٹر صاحب، آپ نے میرے خط کا جواب دیا، شکریہ۔ مجھے اپنے ہتھوڑے جاننے کھساری اہم اے راحت کے نادل کا شدت سے انتظار ہے، آپ نے چند ٹانہیں کرنے کی یقین دہانی کرائی ہے اس لیے ایک بار پھر آپ کا شکریہ۔ ماہ اگست کا خرف، ناک ٹائٹل والا ہراسہ اربنبرہا، سرورق رکھ کر ہی اندر کے مضمون (کہانیاں) بھانپ لیا، پڑھ کر حزا آ گیا، ایک سے بڑھ کر ایک حضرت انگیز، عمر میں جتنا کر رہے والی کہانیاں شامل تھیں۔ اور ان کا حال رہ کر خوش ہوئی کہ اور ایوں کی انھوں پر صحن ہی جاری ہے جو کہ پرچے کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ ہمارے کے بانی تمام سلسلے بھی خراب ہیں، عشق آتش اور مصلحت بھی لا جواب رہے راہبہ ہمتیں آئندہ خط میں ہوں گی، ماشاء اللہ جان

۱۰۰ نیلہ بی احوال میں شہرت اور رہنے کی پسندیدگی کا شکریہ۔

۱۰۰ سدرہ اور علی جھنگ صدر سے ٹانہیں احوال ہیں۔ کھینچتی ہیں کاشی چوبان، ہما، ڈیڑھ سسز، براور، زہرا، آئل اسٹاف السلام، طلسم اسی وسید، یقین اور رعا کے ساتھ کہ آپ ہمیشہ کی طرح ہنسنے مسکراتے اور فرض و فرم ہوں گے۔ زندگی کے لحاظ سے جب وہ کہہ کر بھل جائیں تو پھر زندگی کے تمام رنگ، تمام رشتے آتے اور جذبات و احساسات پیچھے بڑھ جاتے ہیں، جیسا کہ آج کل ہمارے ملک کے حالات ہیں۔ انسان ہونے کے ناطے کہا نہیں تو تکلیف نہیں ہوتی؟



کہہ رہی روز ہمیں محسوس نہیں ہوتا تو ایسے سا کہ چند کانٹوں کے لیے فریاشیاں اور سرسوں ڈبھی جانیں تو کیا قیمت نہیں؟ سینے بعد ہم بھی کہانیاں میں تمام سسز، براور، زہرا، ایک دوسرے کو بہت سے بلائیں، ان کو کرنی لقب عنایت کریں، ان کا مطلب یہ نہیں کہ بے سرباب و ہجو، کا بھجوت ہے۔ ہمارے ملک میں، ہارنی زندگیوں میں زہر گھلا ہوا ہے، ایسا زہر ہر انسان کا سارا لب و لہجہ لہتا ہے۔ زردیوں کی مانند کھینچتی آنکھیں ہر طرف فریاشیاں کا عذاب کرتی ہیں، مگر سکون اور خوشی کبھی دکھائی نہیں دیتا۔ بدلہ لگنا کہانیاں کے ذریعے سے ہی نہیں فریاشیاں ہوتی ہے۔ وہ بھی کسی کو کھینچتی ہے، ذیہ ان کے حزان کی بات ہے۔ پہلے ملک کے حالات اسے خراب ہیں اور وہ پرچے کے حالات خراب کرنے کی کوششیں، وہ پشت گردانے پر درل ہما، ہمزہ منے، ررہ جانا، غم کو خط، نیکو کیا تھا، غمنا جہاںوں نے ہمارے اندر، غم اور میرے منہ پر بار بار ملک و احوال کو لقب خمیں، زہر چوکا میں نے ہی دیا تھا۔ اگر ہم کسی کو بہت سے مخاطب کرتے ہیں تو وہ سرباب ہے؟ خراب کیا۔ لگنا

کہا جاتا ہے کہ میرے لئے 4 سال 19ء ہو گئے ہیں مجھے جی کہانیاں کی طرف سے بہت محبت و چاہت تھی، جب میں نے لکھتے شروع کیے تب اگلے سال سردار میرے تھے۔ وہ میری تحریروں کی بہت تحریف اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ان کے بعد مزہ سپاس آیا خود میرا اگلے سیم ہارون کی اور اب آپ آپ نے جس طرح میری کہانی "میں کون ہوں" کی تحریف کی اس کی خوشی میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میں اداوار جی کہانیاں کی بہت شکر گزار ہوں کہ میری حوصلہ افزائی کے کہ میری تحریریں شائع کرتے ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہی ہوگا کہ پراسرار نمبر پورا اکتافورت نمبر ہے۔ 25 تاریخ کو موصول ہوا۔ اس نکل نے پراسرار ہونے کی خوب نقیضیں، بالی کرانی، مزوہ تھی کا عید مبارک اداوار بی دل کی آگ کو بے پڑھا۔ انہوں نے مجھے تمام خطوط بہت پسند آئے مگر اسامندہ تم کا خط لے کر دیکھنے لگی میں جڑا ہوا گلہ ہے۔ سب سے پہلے ان تمام سزوز ہارون کا بہت شکر ہے جنہیں میری کہانی پسند آئی۔ جن میں کنول عمران، سزوزید باجی، منشی محمد عزیز بیجا، مجید احمد بیجا، فیصل ندیم، شمیمہ ناز، شائستہ جمال، عادل حسین، شاہد حسین، عبدالغفار عابد، اشفاق شاہین، کرن ناز، حفصہ علی بیجا، حسین جو جو، اسامندہ، دوری، منشی محمد عزیز بیجا میرے آگاہ تمام شہر انور ملی ہے۔ ہم لوگ سید نہیں۔ ملک انہوں نے حسین جو جو آپ نے مجھے ظالم کہا، پھر بے

میں آ رہی ہوں۔ سزوزید باجی آپ کا پھر اس نکل میرے دل میں آ کر جا رہا ہے۔ Beautiful Woman۔  
 انکل محمد علی کی، خان زبیر، نسیم وہاں کو پھر سکتے زور لگائی، آصف ضیاء احمد کی راج تھی پسند آئی۔ سزوزید کی انار کا درخت بھیجی وہ دن سے ٹوٹ ہوئے والی تحریر ہے۔ نیکل خان کی عاشق جن، منگل خیرال کی پراسرار خوشی نے نسیم، جان کرگز اداوار۔  
 اداوار ناصر اداوار کی ایک حسینہ پسند آئی۔ مور عیسا کی برائی، آف ایسی کہانی سے تو طبیعت مجھ ہی ہوئی۔ آپ میری نفس کی روح سے ملاقات اچھی لگی، حیران خان کی آسب مجب ترس آیا اس کہانی کے کرداروں پر کا شیف مجھ کی وہ کون تھی اور خندانہ کی پہلے سوچ لیتے، ملک مندر عباس کی نادیہ روح تمام تحریریں پسند آئیں۔ جن کا ہوا میں تمام شہر اداوار کی شاعری پسند آئی۔ عبدالعزیز انکل، بے کوئی کرنے کی بات، اس طرح انہوں سے ناراض ہونا؟ آپ نے سوچا ہے کہ آپ آخری ہوگا۔ ہم بات کے سچ، اصول کے یکے ہیں۔ کاشی بیجا شاعری پر نظر ثانی کیجئے گا۔ جی کہانیاں میرا دل میری جان پڑھے سارا پاکستان۔ زندگی رہی تو پھر بولی ملاقات تب تک کیلئے اللہ تعالیٰ۔

بڑا بڑا سردار جی! چھوڑیں، غصہ تھوک دیں، وہ کہتے ہیں تاکہ۔ طے والے کا۔ ہمیں نقیض ہے کہ جی آجی استاد حضرت نہیں ہیں، وہ تو میں انہیں زاریا سے غصہ آ گیا تھا۔ وہ آپ کی نہ صرف عزت کرتے ہیں بلکہ بیوقوف جیسا بیان بھی دیتے ہیں آپ کو، وہ آپ کی بات ضرور مانیں گے اور..... اور..... پھر اپنے بچوں کی سرپرستی کرتے رہیں گے اپنی تحریروں اور بیانات کے ذریعے۔

عظیم جوجو بڑی شریف خیر لار تاجن شاہ سے لکھی ہیں، اداوار بیجا مبارک خیریت کے ساتھ مالک خیر مبارک کرے۔ آتین۔ کچھ اپنی باتیں سدا سے اپنی لکھی ہیں، منگل بیٹلو جی تو ہاں بیجا میں خوش ہو۔ ذریعہ سردار انور جی یعنی نیکل کے میدان میں، میں نے بھی گول کر لی دیا، پھر تو یہ خوشی کی بات ہے تا غصہ نہیں کرتے پھر تصویر کیا، وہ روی، ملوں کی..... میں بھی اُمد خدا بھی ہوں، اپنا خیال رکھنا..... عزیز سے بھائی، بھانجرا مایا آپ نے نا اچھی بات ہے۔ شہبان کورہ سلطان بھائی، اچھا خیال ہے۔ خوش رہیے شمیمہ ناز جی، بہت مسنون ہوں، سلامت رہے، شائستہ جمال جی، سوزی نواز، خوش رہے۔ مور شاہد حسین بھائی سلامت رہے۔ عبدالغفار عابد بھائی حوصلہ افزائی کے لیے مشکور ہوں۔ اسامیل بروہی بھائی اپنے ہی کچھ کچھ میں ساتھ رہے ہیں۔ اشفاق شاہین بھائی بہت شکر گزار ہوں، خط کی پسندیدگی کیلئے..... آپ کا خط اچھا ہوا، کیا کہتا ہوں میں جو بہترین رہی۔ (تبرہ کیا کرں جب کاٹ دی دے ناے) برائی، مور شاہد حسین۔ عاشق جن، بشری کشیش خان۔ خانزادہ، نسیم اختر انکل۔ عشق ہوش ربا، حفصہ علی حیدری، فیض عشق، امجد یاد پور اور منشی پسند آئی۔ جن آد میں بااے شہت، مسائل زبیر، عیدہ کھنڈ خیرال، عبدالعزیز جی آنگل، اور تھوڑی سی دنا تھیں



کی مدد رہیں۔ اب اجازت مانگ کر یہ خط لکھنے پر توجہ فرمائیں۔  
 ☆ اردنی قسمن۔ احوال میں بھر پور شرکت کا شکر یہ دلچسپی سے نہ گھبرا سکیں، یہ تو کافی ہے جس میں اچھا کھساری جانتے کے لیے۔

☆ عامل پور سے سید مبارک علی شمس لکھتے ہیں۔ محترم جناب کا شیخوپورہ صاحب سلام سنوں! سب سے پہلے تو میری طرف سے کئی کہانیاں کی پوری ٹیم اور تمام کھساریوں اور معزز قارئین کو بہت بہت سلام اور میری دعا ہے کہ خالق اکبر آپ سب کو خوش و فرخ اور ہمیشہ سلامت رکھے۔ یہ آپ کی تحفوں کا کمال ہے، میں آپ کی محبت میں اس قدر ہر کہی کہانیاں میں پہلی بار خط لکھ رہا ہوں اور انشاء اللہ یہ سلسلہ جاری و ساری رکھوں گا۔ آپ کے آٹے سے کئی کہانیاں کا معیار بہتر ہوا ہے اور سرکوشن میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اس کی پر تنگ وغیرہ میں مزید کھساریاں ہوا ہے۔ یہ آپ کی محنت اور اہم اور ذہنی کا پتلا جوا تھا اور مزہ ہوتا ثبوت ہے۔ میرے تخلص دوستوں جناب صفدر علی حیدری ایچ شریف، جناب عبدالحی حیدری، جناب شمیم کوثر لاہور، جناب سحر حسن بیڈیا کئی نئی نئی کہانیاں میں لکھنے کو کہا، مگر میں اپنی ذاتی مصروفیات کے باوجود بروقت تحریر میں نہ سچھا۔ کا جس پر معذرت خواہ ہوں اب انشاء اللہ باقی مددگی سے لکھتا رہوں گا۔ تمہید پر سے گریز کرتے ہوئے آئندہ ملاقات تک اجازت چاہوں گا۔ اللہ تعالیٰ۔

☆ بھائی مبارک آپ کی آغا احوال میں مبارک ہو، آپ کی کہانی "بدلتی مہجول ہوگئی ہے، انشاء اللہ بہت جلد چلی کہانیاں کی ازیت بنے گی۔ آپ احوالوں سے رشتہ منیبہ طور رکھے اور ظلم کو کئے مست دینی، ہماری حوصلہ افزائی کا شکر یہ  
 ☆ ایمان شمیم۔ مزگنا لاہور سے لکھتی ہیں جناب ایڈیٹر صاحب، آپ نے مجھے اپنے پرچے میں جگہ دی، شکر یہ کہ اسرار شمیم کی کہانیاں بول گیا، سرسری کی تصویر نے سب سے پہلے بتا دیا کہ پرچے کے اندر کی جگہ ہوا ہے۔ کہانیاں نہ کہہ کر اور بھی حیرت ہونی کہ لکھنے والوں نے کمال کر دیا، کیسے اسرار کو ہر اسرار میں بدل دیا، آپ کو میرا خط پسند آیا۔ بہت بہت شکر یہ باقی آئندہ ملاقات میں۔

☆ بھائی بھائی احوال میں آپ کی آغا اور حوصلہ افزائی کا شکر یہ۔

☆ امیر احمد بھٹی، بہاولپور سے شامل احوال ہیں۔ محترم کا شیخوپورہ صاحب، آداب۔ السلام علیکم جو جولائی 2014 کا نئی کہانیاں تک اشغال سے فرمایا۔ یہاں بیادوں پور میں ماہنامہ دوستی ڈائجسٹ کی اشغال یا شاپ پر نظر نہیں آتا۔ براہ مہربانی بہاولپور کے لیے دو ٹیڑھ پہنچانے کا بندوبست کیجئے۔ شکر یہ۔ صفحہ نمبر 13 پر خوش خبری کا جو اشتہار شائع ہوا ہے۔ ایسا اشتہار تلاش کے قریب والے صفحے پر ہو جائے، تاکہ تمام کھساریوں کے لیے آسانی ہو اور وہ پڑھ سکیں کہ اب مفکر کوپن کے کوئی خطا یا کہانیاں شائع نہ ہوگی۔ کوپن کے ساتھ کہانی سمجھنے سے یہ ناگوار ہوگا کہ ہر ماہ ہر قاری صرف ایک کہانی ارسال کرے گا اور ایک ترتیب سے سب کی کہانیاں شائع ہوں گی۔ ظاہر ہے دوسری کہانیاں کے لیے باقیوں کو اگلے شمارے کا انتظار کرنا پڑے گا، تاکہ نئے شمارے کے کوپن استعمال کیے جا سکیں یا پھر مزید ایک شمارے کو اور نئے خرید جائے۔ ایک ساتھ تین تین کہانیاں کوئی نہیں بھیجے گا۔ ہر ماہ کہانی نمبر 11 کا شدت سے انتظار ہے۔ اس شمارے میں ساتھ میں کئی کہانیاں میں جو عزیز نے صاحب کی تصویر بھیجی۔ سوسوف کی صورت بہمانی اور اکا رکھنے کا رستہ ملتی چلتی نظر آتی ہے۔ ان کی کہانی بھی پسند آئی۔ کہانی مہراں بھی مہروان ہے۔ خط مفکر کوپن کے خطوط بھی احوال میں شامل ہو سکیں، اگلے شمارے تک خدا حافظ۔ شکر یہ



☆ بھائی امیر احمد بھٹی احوال میں شرکت اور تھوڑے تھوڑے شکر یہ۔ جن اساتذہ پر شکر نہیں ملتا، ان کی تفصیل آپ نے نہیں کہی۔ آپ 0300-2313256-0333-2269932 پر ایس ایم ایس کر دیں یا کال کر کے اطلاع دیں۔ عن قریب ہمارے سرکوشن شجر آپ کے شکر کا ورد بھی کریں گے۔ آپ ان سے رابطے میں رہیں۔



محمد یوسف لغاری تپہ سے چلی مرتبہ احوال میں شرکت کر رہے ہیں، لگتے ہیں۔  
اسلام ٹیکم پہلی مرتبہ آپ کے "جی کہانیاں" ایڈم میں شرکت کر رہے ہیں۔ امید ہے ال کی  
گہرائیوں سے خوش آمدید ہوئیں گے اور ساتھ ہی کہہ سکتے ہیں کہ اسے میانہ بینی دیکھ کر ہی ہر ماں  
آتے آتے آتے" کیوں کہ جی کہانیاں کے ساتھ رابطہ کا کافی پرانی ہے، مگر آپ نہیں بک کے  
کافی سارے بہن بھائیوں کو گستاخ کر کے دارالکلمہ کنز العمال میں نہیں رہا۔ جولائی کا جی کہانیاں

تو تا کمال کے پورے رمضان مبارک لکھا تھا تو کاشی بیبا آپ کو بھی رمضان مبارک اور عید مبارک مگر یہاں ایک خانی تھی کہ  
رمضان مبارک کے حوالے سے سرورین نہ تھا۔ کوئی مسجد، کوئی دل نشین تصویر ہوتی تو مناسب تھا۔ امید ہے مناسب تشبیہ  
قبول کر لیں گے۔ مزہ بہام کے ساتھ ہم نے بھی دعا کی، اے اللہ کروا چھا اور پورے ملک کو اس دان کا گہوارا بنو گے  
(آمین) مخطوطہ کے احوال میں کل مخطوطہ 44 تھے، جن میں 29 نکار میں تھامر کے ساتھ موجود تھے، جبکہ الیکٹرونک  
احوال میں 12 مہینوں نے لکھ لیا ہوا تھا۔ ہر ماہی اپنے اپنے وقت کے رنگ و سار ہوا تھا، کبھی لکھو، کبھی جگہ محبت  
بھی ٹپک رہی تھی۔ کوئی اپنا زہر باسٹا شہرے میں عورت کے ہاتھ کے کر دیا تو کھانا کھا کر رہی تھی۔ کسے اترام دوں، بہن زہر  
جو نہ جوئے آسودہ کال کے رکھو۔ قوموی کیسا تہ کا شکار کی، لیکن عہد و کبانی تھی۔ کیا آج بھی عورت پر ایسا ظلم ہوتا ہے؟  
رنگوں کا دار، امیران، اپنے ہی دام میں، میں کون ہوں یہ عورت کی ذمہ داریاں ہی معلوم ہوئیں۔ میں سردی  
کہانیاں میں کھلاڑی کے خطرناک انجام نے بہت خوف زدہ کیا کہ جب انسان اللہ کی بکڑ میں آتا ہے تو انجام کیا ہوتا  
ہے۔ مردوں کے معاشرے میں ایک مرد، مردوں کے خلاف مزل صدیقی کی مدد کی بانی نے خوب متاثر کیا۔ بانی  
جس کا نام ہی شعلہ سالانہ تحریریں ہوں اس کی تعریف کیا کرنی، تاہم اس میں بندہ دیکھ کر کہانی ہوا اور نہ بہت اثر  
چھوڑا۔ مدد مرقی کی واہینی نے بھی خوب متاثر کیا۔ جن آواز میں نوبل 18 ساتھیوں نے حاصل ہوا تھا، جن میں ایک شاعر  
مبارک جلال ہیران ملک عمرین سے بھی تعریف فرما جس۔ آپ نے یہ جہان خانی سلسلہ شروع کیا ہے اب اگر کوئی سالانہ  
خبر پڑھے تو دیکھ کر کہے گا، کیوں کہ کوئی قدر نہیں کیوں خطا رساں کرتے ہیں۔ اس کا دل یہ ہے کہ سالانہ خبری اردوں کو کھیر  
لائے کیا ہائے، وہ کیوں نہ فائل ای میل کرتے وقت اپنا مکمل ایڈریس اور خبری نمبر لکھیں، تاکہ ذیل خرق سے بچ سکیں  
اور ان خانی مقالے میں یاہ سے ہی وصول شدہ، وہاں اشاعت کہانیوں کے نام سنا لیں کہ دینے جائیں کہ وقت آتے پڑے شائع  
ہو جائیں گی، تاکہ ہر ماہ کا انتظار ختم ہو سکے۔ جی کہانیاں اور دو شہزادہ کافین بک گروپ بنا جائے، جس پر ہولنگار،  
افسانہ نگار، شاعر کھٹے ہوں تاکہ ایک دوسرے کی خبریں کو پڑھ اور اس کا ایڈریس رسالے پر شائع کیا  
جائے تاکہ کوئی جعلی ایڈریس نہ بن سکیں اور جو اس گروپ میں خوشی آتا ہے، یہ نہیں آتا ہے تو ان کی  
اپنی مرضی، تو جس جناب نے قصا تار اپنا خطا اور تہمیر۔ لازمی تباہی کا کیا لگا؟ شکر ہے۔

چند ماہ پہلے لغاری ہذا حال میں آپ کی آواز اور کج ذہل کا بہت بہت شکر ہے۔ زندہ رہی ہر ماں آتے آتے لیکن اب آگے بہنو  
پھر ہوا آتے رہے، لیکن ایک بیچ بنا ہوا ہے۔ [monthlysachcheekahaniyan@gmail.com](mailto:monthlysachcheekahaniyan@gmail.com)  
تے آپ بھی شک ہو جائیں اور اپنے دوستوں کو بھی شامل کریں۔ آپ اپنی کہانی یا تبصرہ ای میل کر سکتے ہیں، کوئی  
ضرورت نہیں، آپ کی کہانی کا انتظار ہے۔



اسلام آواز سے نصرت سرفراز صاحبہ احوال میں شریک ہیں، لگتے ہیں مدیرہ اعلیٰ منزلہ  
سہام مرزا اور مدیرہ کاشی چوہان صاحبہ السلام ٹیکم۔ ماہ جولائی کا جی کہانیاں کا شمار بہت تاخیر  
سے ماہ اخبار رسالے نے ڈالا نہیں اور اس کے انتظار میں ہم نے خریدے نہیں اور جیسے ہی سات  
جولائی کو خریدے تو اعلیٰ معیار اخبار والا بھی ذہل کر جا گیا۔ اس طرح ماہ جولائی کے دو شمارے  
دار سے پاس ہو گئے، لہذا ایک شمارہ اپنی دوست کو گفت میں دے دیا، وہ بھی خوش اور مزہ بھی کہ



رسالہ سے ہی اتنا شروع ہوا کہ شروع کرنے کے بعد فتح کے بغیر رکھنے کا دل ہی نہیں چاہتا ہے، چاہے لاکھ کام، خبر کا شمار ہو جائیں۔ مگر والے آداز میں لگتے رہ جائیں، ہم نے پہلے رسالہ فتح کرنا ہوتا ہے، تاکہ احوال میں شمولیت کی جائے مگر داغے قسمت کے دیکھنے تین ماہ سے خط (رسالہ دور سے ملنے کی وجہ سے) خبر کا شمار ہو جاتا ہے۔ اس بار اگر وہ شمولیت کی منزل تک پہنچا تو میرے کرمینڈ ہوگا، لہذا تمام اخبار میں سزا بانی قارئین کی کہانیاں، وسبر ان اور کوئی امید مارا کہ قبول ہو۔ اب آتے ہیں رسالے کی جانب، مزہ بہام مرزا کے قلم سے نکلنے والا نکتہ نگار کی روایت کی وہ شہر کرچی کو کسی کی نظر میں لگ گئی ہے۔ آج کل آئی ذی بیز کا شمار کیا جا رہا ہے، کیا کرچی کے قوی ذی بیز کی کسی کو خبر بھی ہے؟ ہم نہیں سمجھتے کہ ہم نے ہم قبول کئے ہیں بہام مرزا اپنے قلم سے ذمہ میں اور سزا بانی تصور بہام کے طور پر ہمارے درمیان موجود ہیں۔ تمام احوالیوں کی بے حد شکر گزار ہوں جنہوں نے ہر دو دن میں شائع ہونے والی سبزی کہانی امانت پر اپنے الفاظ سے پسندیدگی کی مہر ثبت کی اور ادارہ کی کہانی کی بے حد شکر ہوں جنہوں نے ہم جیسے نئے لکھاریوں کی بے پناہ حوصلہ افزائی کی ہے۔ کوہن والا سلسلہ بہت اچھا ہے اس طرح قاری کی پسندیدگی اور آرا کو مد نظر رکھتے ہوئے پہلے دوسرے اور پھر تیسرے نمبر پر آنے والی کہانی کا انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ پراسرار کہانی ضرور شدت سے انتظار ہے، کیا ایسی اچھا ہوتا ہے ایک دو ماہ پہلے ہی بتا دیا جاتا تو ہم بھی کوئی ڈرامائی تحریر لکھنے کی کوشش کرتے۔ صحیح بیانیوں میں کوئی اپنا نہ رہا تو کاش حسین، کے اظہار میں ذریعہ جو بچھو بھوسی، غزل ترسٹی میراں کشور ہم، اپنے ہی دامن میں حضور عباس، زخموں کا دوا احمد عزیز سے، سب جائزے عبدالغفار عادل سے ایک سے زیادہ کہ ایک شخص خاص طور پر سب جائزے کے سوال کا جواب شاید ہی کسی کے پاس ہو۔ میں کوہن ہوں سدا بہ نور علی کے قلم کی تحریر اعمال کا انجام اس دنیا میں مل جانے کی کہانیاں اچھی تھی۔ تاہم سزا اور مقدر کی آگ بھی پسند آتی۔ سلسلے کی واقعی حقیقت سے دور ایک جگہ پر لڑکی کی داستان ہے۔ ناکتہ صدیقہ کی ایک حقیقت ایک کہانی کو اصول پر اسرار ہر قسم شائع ہونا چاہیے تھا۔ لکھنا ہی نہیں آوارہ کے یوں تو سارے اچھے تھے، مگر خواہیں نے مرد حضرت کو یہاں پر بات دے دی خاص طور پر نیک بھلو کرچی کی "کارٹی" سب پر چھائی۔ امید ہے اس بار خط شامل احوال ضرور دیا جائے گا، جو پہلے ماہ سے تو منت دیا بھی ہی جلی ہوئی ہے۔ کاش بھائی میری کہانی میں لڑکی جوڑتی ہے؟ آج ایک اور کہانی "ناگروہ گمانہ" اور سال کرچی ہوں امید ہے مناسب طرح و برہ کے بعد شائع کر کے شکر یہ کا موقع عنایت کریں گے۔ سخن آباد میں ایک جھوٹا سا ایٹ روکا ہے، چڑھ کر نیکھ کر میں کھل سکتا ہے کہ نہیں۔ تمام جوانیوں، وقار میں اور ادارہ کی کہانیاں میں کام کرنے والے تمام لوگوں خصوصاً کاش بھائی اور مزہ بانی کی محنت ترقی اور کامیابی کے لیے دعا گو۔

بہت نصرت سرفراز تھی احوال میں شرکت اور پرستے کی پسندیدگی کا شکر ہے۔ سخن آباد میں آپ کو بلا ت اللات کیا جا چکا اب اس کا مستقل رہائش ہو جائے۔ آپ کی کہانی ناگروہ گمانہ بھی شامل اشاعت ہے، اخبار والے کو پسند کیجئے کہ وہ بر وقت پر چھپائے تاکہ خط نہیں بروقت مل سکے۔ آپ پر اسرار اللہ کے لیے کوئی پر اسرار کہانی ضرور دست ہی لکھ سکیں۔ کوہن سسٹم کی پسندیدگی کا شکر ہے۔

لہذا تمہارا سب سے بڑی خوب شاد سے شائ احوال ہیں، السلام علیکم کاشی ہمیں ہی دانا میں اور نیک تمنا میں آپ اور پورے اسلاف کے ہم۔ اگست کا شمار ہوا۔ آف، سرداروں کو کچھ کر پورے جسم میں مسخنی روڈ تھی، مزہ آئی کا ادارہ دل آگھ سے پڑھا، آپ کی ہائیں بھی پڑھ کر اچھا لگا۔ احوال کی طرف سے آئے تو مخلص تھی، دونوں میں، جیڑوے شاد کو ہم کہتے ہیں، وہ نکل کر تیری آ صاحب ہم آپ کو جانے نہیں دیں گے، سدا بہ نور علی بھی اپنے خط میں بتا رہی تھی ہم تمہیں۔ دو شاہدہ مجید جانی، امجد علی، نظام رسول اور کاشف مجید کو سلام، محمد شمس اختر کی ڈانڈا، ساہیلوں سے جزی اور آصف ضیاء کی، راج ترنگی بہترین کہانی تھی۔ سزا نوہ پڑھی کی انار کا روخت بھی دل چسپی سے پھر پوچھی، بشری لکھل خان کی عاشق جزی، مسکلی غزال کی پر اسرار حویلی، الماس ناظمہ کی ایک حسد بھی پسند آتی۔ میرت اور لودت راطر، شاد کو ہم لکھی کہانی پڑھنی پسند آئی۔ دوسرے ملاقات اور آ سب بھی اسرار سے بھری ہوئی کہانیاں تھیں۔ تریا حوصلے کی ناچان بھی منظر اور راجی کہانی

## خوش خبری

میرے قاری دوست اور لکھنؤ کے ساتھیو! جیسا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ ابنا سرگئی کہانیاں قاری اور لکھنؤ کے لیے ایسا بڑا دل خیز پرچہ ہے جس میں ان کے دل کی عرضیاں اور دُور مَن کی چٹانیاں اشاعت پذیر ہوئی ہیں اور لکھنؤ اور پڑھنے والوں کے دلوں کی تسکین کا سبب بنتی ہیں۔ اس بات سے انکار تو ناممکن ہے کہ سچی کہانیاں لکھنؤ کے لیے حوصلہ افزا پرچہ ہے کہ جس میں بدست بدتر خبر بھی جاسنا اور کہہنے کی ذہنت بنا دی جاتی ہے۔ سچی کہانیاں کو یہ اعزاز بھی سچی کہانیاں کو حاصل ہے کہ اس نے بے شمار لوگوں کو گوشہ نشین کیا ہے۔ سیدان نامور نے اپنی لکھنؤ کی کتاب اور آج دعوتِ اولیٰ کے لکھنؤ کی کتاباں ہیں، یہ سلسلہ حال جاری ہے۔ سچی کہانیاں کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ اپنے لکھنؤ اور قارئین کی حوصلہ افزائی کے لیے کوئی نہ کوئی سلسلہ جاری کرتا رہتا ہے۔ اب سچی کہانیاں کی جانب سے آپ تمام لوگوں کو یہ خوش خبری دی جاتی ہے کہ اور وہ کی جانب سے لوگوں کے لیے حدِ اصرار پر دوبارہ سے انعامی سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے، جس میں سچی کہانی کو 1500 روپے، دوسری کہانی کو ایک ہزار روپے سے گھبر پڑنے والی کہانی کو 700 روپے دیے جائیں گے۔ لیکن اس کے لیے ادارے سے ایک سو پنچاسی سو روپے کی رقم کی ہے، جس کے تحت کہانی چھپوانے کے لیے کوئی منسلک گھر یا ضروری ہے۔ اسی طرح جس کہانی کے لیے قارئین اپنی آراء اور پسندیدگی کے ساتھ سب سے زیادہ کوئی بھیجیں گے وہ کہانی پہلے انعام کی حق منگوانے کی۔ اسی طرح آپ کو اجازت میں اپنے خطوط چھپوانے کے لیے بھی خط کے ساتھ کوئی بھیجنا لازمی ہوگا۔ یاد رکھیے، ایسی کوئی کہانی یا خط ہرگز ہرگز قابلِ اشاعت نہ ہوگا جس کے ساتھ کوئی منسلک نہ ہوگا اور سچی کہانیاں انعام کی حق دار ہوں گی جن پر کوئی کے ذریعے پسندیدگی کا اظہار کیا گیا ہوگا۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے قاری و لکھنؤ حضرات اس مطالبہ کو ضرور اپنائیں گے اور اس سلسلے کو مزید آگے بڑھانے میں تعاون کریں گے۔

تمہیں۔ تمہیں کی کیا بات ہے، تاہم میری فورٹ کہانی ہے ویڈیو، ایکاز نواب، آتش جنوں اور فیض عشق بھی بہتر ہیں۔ اہم اسے راحت کی ہم شکل کا ہے جس سے انتظار ہے۔ رضوان قیوم صاحب کہاں ہو، کوئی کہانی تو تمہیں ہزار آفریں۔ نیکھل جیلو، حسین جرنیل، کنول عمران، ممتاز احمد، غلام حسین، کرن کار اور امانت علی کو سلام۔

بھلا وہ اس سلسلے پر وہی پہنچ کر آئی تھی۔ اجواں میں آہ اور کہانیوں کی پسندیدگی کا شکر ہے۔ اہم اسے راحت کا سلسلہ ہم شکل ان شاہدہ تبر کے شمارے سے شروع کیا جائے گا۔

نیکھل سرگودھا سے مرحوم شاہ بخاری شامل احوال ہیں، پکارے کا شکر ہے! السلام بخیم احوال میں طوفان غیر حاضری کے بعد دوبارہ فرماں فرمائیں آپ کی اس چاند ستاروں کی شکل میں حاضر ہوں۔ غیر حاضری کی کیا ہے کھوں؟ بہت سی ہیں، وقت کی کمی یا چکرانہ سانحات کا ذکر کروں جو اس دور میں سے دور ہے، ہمارے زندگی میں آئے اور جس خون کے آنسو نزلتے رہے۔ سب سے پہلے میری بیٹی زادوین، گلنشا، افسانہ، برسی کی شرمیں، بیس روپے چھوڑ کر چلی گئی، سیدہ کوئی بخاری، جس کے بدن میں دوبارہ زندگی کی لہر دوڑانے کے لیے ہر چہ ماؤ احمد خون تہہ لیں کیا جاتا تھا، ہمارے چچا سید صاحب حسین نے چند روزوں میں جو کچھ کہا سب لینی لازمی اور بخاری لینی کے علان پہ خرچ کر دیا مگر انہوں..... وہ چھوڑی صورت ہمیشہ کے لیے منوں کی تھے جاسوتی۔ اسی نام اس صدمت سے پوری طرح سلجھنے نہ پائے تھے کہ چند روز بعد ہی بخاری خالہ کے پیارے بیٹے اور تاروی بیٹھائی کے بڑے بھائی، بیس، اسی عداوت دے گئے۔ ہم جن دن جانے والوں کو جاتا دیکھتے رہے۔ انہیں روک نہ سکے۔ برسوں بعد واپس آئے تھے تو ساتھ فریضہ اجل لیے چلے آئے۔ دل ان کا ذکر کرتے رہا، اب ان کی شفقت اور رحمت بھرنی آواز اب بھی میرے کانوں میں گونجتی ہے۔ بیٹا، مسور کی اول پکار کھلاؤ گی تو



آؤں کی مسودہ کی دال پکائی کی برہمنی مگر جانے والے نے تو لپٹ کر دکھا سب نہیں..... بھلا بھی ہو کرتے ہیں کم از کم جاتے جاتے اپنا ہاتھ ہی سر پر رکھ جاتے..... دل ٹم لہریز ہے، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں مرنے والوں کے ساتھ سزا نہیں جاتا، دم نے بھی لوٹ کر اسی جانی جاتا ہے، پھر بھی دل سے ہوک سی اٹھتی ہے "کاش" "کاش".....! آپ سب سے انتظار ہے کہ ہماری مجلس کے لیے دو زمانے خیر فرما دیں اور ہمیشہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ "بچی کہانیاں" سے الگ کت کر نہیں رہ سکتے اسی لیے کاغذ کلم سنسٹال اور کھتے بیٹھ گئے، مگر صرف اپنی سنا میں..... ابو آپ لوگ تو اس ہو گئے، سو رہی..... اچھا چینی جگ جگ ٹائیکس میں کس کس نے یاد کیا؟ کیا؟..... کس نے بھی نہیں۔ ویری ہیڈ پر میں نے تو آپ سب کو بہت مس کیا اسی لیے تو آپ سب کے درمیان پھر سے آگئی آپ سب کا رمانگ کھانے..... ہوشیار ہو جائیں (اپنے اپنے سامنے سنسٹال میں بابا بابا) ہم لکھتے بھی تو پوری فہرست تیار ہو جائے گی اور کاشی بھیا کی چینی کا تو پھر چٹائی سے نا آپ سب کو..... اسی لیے مختصر یہ کہ سب کو درج نہایت اب واحترام سے ہمارا سلام پہنچے اور دعاؤں کے سبکے پھول آپ سب کے نام..... اللہ تعالیٰ آپ سب کی زندگی میں آسانیاں پیدا کرے اور ہمیشہ شاد و آباد رہیں۔ آمین، منور آؤنی اور نئی رخصت سہ ماہی مرزا کو بھی بہت بہت سلام، کاشی بھیا اپنی ایک فرمال بھی بھیج رہی ہیں، میں امید ہے آپ کو پسند آئے گی اور "بچی کہانیاں" کے ذوق میں جگ بھی پائے گی، خدا کرے "بچی کہانیاں" دن دگی اور رات چوٹی ترقی کرے۔ آمین



ہم سرگرمی میں اللہ تعالیٰ آپ کو اپنا مرحومین کے لواحقین کو کھربھریں عطا کرے۔ ہم آپ کے ہم میں برابر کے شریک ہیں، بلاشبہ موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے منفرط نہیں۔ احوال میں آدہ کو شکر ہے فرمال لگی ہے، جلد شائع ہوگی۔

محمد عمران فاقی، آنک سے شامل احوال ہیں، صاحبان ادارت، صاحب ذی احترام! السلام علیکم اور آزادی "گنت" کا بچی کہانیاں نہایت معروضیات کے عالم میں موصول ہوا۔ ٹائیکس اور اس پر درج شدہ "پراسرار نمبر" کو دیکھ کر کتابت ہی ہوئے گی، کیوں کہ "ہم" ایسی تحریروں سے اکثر گریز کرتے ہیں، جس میں وقت کے ضیاع کے اسباب داخل ہوتے ہیں، سوجور ہوں۔ بہر کیف "بچی کہانیاں" سے ایک خاص قسم کا انس اور محبت ہے، یہ ہم پر ہمارے مطلق سے پیچھے آئیں اور مخالف معمول دیکھی بھی نہیں۔ سلیم نوری کی صاحب کی "آؤنی جنوں" سلسلہ در سلسلہ بہت خوب جاری ہے۔ پراسرار کہانیوں میں راج ننگی، آصف ضیاء احمد، ماگن، واکاز احمد نواب۔ آسیب، عمیرہ خان اور عاشق جن، بشری ننگی خان اچھی ہیں۔ روٹنے کڑے کر دیے ان ہمارے۔ احوال میں ایم حسن نظامی، ایم اشفاق بیٹ، شمس محمد عزیز سے اور مجید احمد جاتی نے بہت خوب کما۔ ریحان نسیم کا شائق احوال خط پڑھ کر یوں لگا جیسے انہوں نے میرے دل کی بات کہہ ڈالی.....! صدورہ انور کو "خطاب" اچھا لگا۔ اپنے پسندیدہ سلسلے "جنس آباد" کے دورے میں جھاک کر دیکھا تو پھر فضا میں دل درمیان رہتا نظر کرتیں۔ کیا خوب منظر کشی ہے شاید فراز کی۔ بڑا ہی رو میٹنگ منظر پیش کر دیا۔ حافظہ منور شاہ بخاری.....! بہت اچھے، ٹائیکس بھی اپنے آپ کو خوب دقا دار Show کرتی ہوئی نظر آئیں۔ مہر نسیم کی فرمال اچھی ہے۔ عزیز نسیم کا کھٹا اچھا ہے لیکن یہ کچھ تھائی کہ یہ کون سی صنف ہے؟ حسن نظامی صاحب کی فرمال کے اعداد 13 اور 4 وضاحت طلب ہیں۔ موصوف سے گزارش ہے کہ خود احوال کر دیں تاکہ ہمارے لیے بھی کچھ ہو جائے۔ چلو ہر اب احوال کیسے ہیں کام زیادہ ہی ہو گیا۔ (مزید کلام ارسال کر رہا ہوں) اور ہاں ذرا خوش تمام قارئین سے گزارش ہے کہ میرے لیے دعا فرمائیں میرا ICS سیکنڈ ایئر کا رزلٹ مختصر یہ آنے والا ہے۔

خواجہ راج عمران فاقی، احوال میں شرکت اور پرچے کی پسندیدگی کا شکر ہے۔ برتھ روز وقت کا ضیاع نہیں ہوتی، لوگ تو گورے سے بھی کوراؤ ادا شایا تلاش کر لیتے ہیں، پھر یہ تو پراسرار نمبر ہے جس کا لوگ شدت سے انتظار کرتے ہیں، بہر حال پسند اپنی اپنی.....

محمد عمران فاقی سے شامل احوال ہیں۔ محترم ایتھیر صاحب السلام علیکم۔ میں یونی ایلن دیکھ میں

لازمت کرتی ہوں۔ بینک سے گھر مگر سے دفتر اور رات میں انٹرنیٹ کتاب پڑھنا پڑھا، ہم نے یہ چیزیں اس سے کافی دور ہیں مگر میری لیکن سزویہ ہاشمی پڑھنے لکھنے کی شوقین ہیں۔ ان کی کہانی "امار کا درخت" مجھے بے حد پسند آئی۔ جو کہ صرف بینک میں اٹھنا تھا آج "امار کے درخت" کی بدست اظہار ہی ہوں۔ آپ کی کتاب دوسری مرتبہ پڑھی ہے میں نے اور مجھے بے حد پسند آئی ہے۔ باقی اس کتاب کی ویسے ہی تعریف نہیں کرتی ہیں۔ ناہاج اور یا مصطفیٰ اور صان زرارہ، محمد سلیم اختر کی اچھی لگی مگر پہلے نمبر پر "امار کا درخت" ہے یہ ایمان داری سے کبر رہی ہوں۔ ذر خوف کے علاوہ اس کہانی کا پلاٹ بہت مضبوط ہے۔

بلا دروہیزا پرچہ آپ کو پسند آیا اور امار کا درخت کی جید سے آپ نے قلم اٹھایا، مجلس اسی جانے آپ نے احوال میں شرکت تو کی۔ اب کوشش کیجئے گا کہ یہ سلسلہ جھونے۔



الذی اسید محمود حسن، حیدرآباد سے لکھتے ہیں۔ محترم جناب مددیر کاشی بھائی المسلم ملیم۔

امید ہے کہ آپ اور سارا اہل انصاف خیریت سے ہوں گے، اپنا نام چچی کہانیاں بلاشبہ ایک

معیاری رسالہ ہے اور ہر طرح کے موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے ہوتا ہے۔ تمام کہانیاں

سماجشرتی، سماجی اور صحیح عقیدتوں پر مبنی ہوتی ہیں اور سبق آموز ہیں۔ میں بچوں کے رسالے

نو نیاں، ڈورڈا انجمن اور دیگر رسائل میں لکھتا رہتا ہوں، پر میرے لیے باعث فخر ہوگا کہ

میری لکھی ہوئی کہانی آپ کے رسالے کی زینت بنے۔ میں ایک کہانی جو کہ چچی ہے تمام "چھلواہ و کراؤٹہ" ارسال

کر رہا ہوں۔ امید ہے اصلاح کر کے شائع فرمائیں گے اور شکر یہ کام موقع دین گے۔ اللہ تعالیٰ ناہاج۔ چچی کہانیاں کو

مزید کامیابیاں اور فروغ عطا فرمائے آمین۔

پیارا رسید محمود حسن، احوال میں آپ کی آمد کا شکر ہے آپ کی کہانی لکھی ہے جلد ہی شائع ہوگی۔



اشفاق شاہین کراچی سے شامل احوال ہیں، چچی کہانیاں عید سے پہلے نہیں کیا جاوے

ہواری تو عید ہوگی لیکن یہ کیا، پر اسرار نمبر کے ذرا لے سے نائل آتا خوفناک تھا کہ ناری نظریں

نہ خیر نہیں، کچھ عید مارک کے حوالے سے ہی زمین بنا دیتے۔ مزہ سہام کا ادا ہے "عید

مارک" لا جواب تھا۔ کاشی کی اپنی باتیں نکال کی ہوئی ہیں۔ احوال میں پہلے حسن نظامی سب

سے پہلے برائیاں تھے کاشی بھائی آپ کے جناب خوب ہوتے ہیں، آپ روش میں نکل

احوال کی، ویسے روزی کی نوکری کا بھلے روزہ ہو، رات کو تو روزہ نہیں ہوتا۔ ۲۔ چرنو، عیبت پر وہ نیکل بھلا بہت

خوب نکول عمران ذرا تفصیل سے لکھیے۔ اشفاق بنت، وہ بھانڈا، فیم، فریہ عالم، ریحان آفاق، شازہ گل، لا جواب خط

آپ کے مقصود بلاوجہ محبت آپ کی جناب آپ نے پکارا نام حاضر آپ سے نکل کر سیرا خون بڑھ گیا۔ عبدالعزیز

آؤ پزیر یہاں محبت کی بات کیجئے، محبت کی نہیں۔ اگر کسی نے جاننا ہوتا ہے تو وہاں دینے کی ضرورت کیا ہوتی ہے؟ اسد رو

انور، نیوک ویری ہاشمی جو بیجر کے، فشی عزیز محبت سے یاد رکھتے ہیں تو دل کو بہت خوشی ہوئی۔ مجید جانلی لا جواب لکھتے

ہو گئے، کرن ناز چھا افشاں ہیں ویری ہاشمی آباؤں۔ مصدق حیدری نکل کی جان ہیں ذریعہ فہمیں اب ہم کہیں نہیں

جانیں گے اور چاہتے ہیں کہ آپ کی دعاؤں کے حصار میں رہیں۔ کاشی بھائی ہماری تو کوشش ہے کہ احوال میں اپنا قاعدہ

رہیں اور اپنا قاعدہ ہونے کے ساتھ ساتھ خیریتوں کے ظہور دار بھی اور میں امید ہے کہ یہ نکلن پوٹھی بھلا دے گا اور نکلنے

سندار کی آہل سے اور روشن بنا دے گی۔ رہا تبصرہ آؤ نکل جنوں بھجریں جا رہا ہے نہ ہر دست، مصدق حیدر دہی کی شش ہوش

پر باہت خوب۔ مکلفی بھی فیکہ ہی جاری ہے پر اسرار کہانیاں پر تبصرہ اس لیے نہیں کر رہا کہ مجھے اس سے رغبت نہیں ہے

اتنا کافی کہ پڑھی ہے، سب فیکہ ہی ہیں۔ تمام جناب سے ایک شعر کے ساتھ اجازت۔

طرف ہر ایک کا خواندہ میں چھپا ہوتا ہے جو ترستا ہے سندھ کو، وہ سحر ہوا!



تیار اور اشفاق شاہین، احوال میں شرکت اور پرے کی پسندیدگی کا عنصر۔ عید سے قبل آپ کی عید ہوگی، سن کر خوشی ہوئی۔ اب آپ احوال میں باقاعدہ ہو جائیں۔

بچے مسز نوید باغی تراہنگ سے شامل احوال ہیں۔ میرے دوستوں ساتھیوں تمام اصناف عجمی کہانی، پڑھنے لکھنے والوں کو عید کی بہت بہت مبارکباد قبول ہو۔ سچا جس میں باغ میں شاہی رہی تھی کہ اچانک میری نظر ایک خورنگ کچرے پر پڑی جو اپنے ہی ہاتھ کے انخول سے اچھا چہرہ نوج رہی تھی، مجھے گھور کر دیکھ رہی تھی، ایسا لگ رہا تھا اپنے پاس باری رہی ہو کہ آج باری طرف آ جاؤ۔ اس خورنگ کچرے کو دیکھ کر میں مسکرائی گئی اور اس کو اپنے ہاتھ میں ڈھالیا۔



میرا خوشی سے نہ احوال تھا کیوں کہ وہ چہرہ بھی کہانی کے برابر نہیں کا تھا۔ سب سے پہلے تو میں شکر ادا کرنا چاہتی ہوں اپنے چھوٹے بھائی کا شہی چوبان کا، پھر مزہ بہام صاحبہ کا، پھر خاص ڈاکٹر شاہ محمد عزیز کی اور انیل عجمی کا شکر ادا کرتی ہوں کہ میری کہانی اس عید پر دے کر میری عید والا کر دی۔ رمضان کی طاق راتیں پھر عید کی ہوتے تو میری کتاب کو کم پڑھ پائی کر جیسے ہی موقع ملا میں نے کتاب ہنرم کر لی اور شکر و کھیر ہی ہوں۔ سلسلہ اور کہانی، سخن آرا بھی پائی ہے آہستہ آہستہ پڑھوں گی، جب تک میرے ہاتھ میں دوسرا شمارہ نہ آ جائے۔ گئی کہانیاں ہمیشہ سے پسند ہے، تمام کہانیاں ہی مجھے پسند آتی ہیں کہ ان کا لہجہ اور لہجہ کا نہیں۔ اول منیہ آنکھیں اور پاش حسین شاہ، دوم پہلے سوچ لیتے ارشاد نہا، سوم پر اسرار حویلی، سنی غزال، چوتھی ناریدہ روح، ملک صدق عباسی احوال، خان زادہ، محمد نسیم اختر کی ساہنوں کی پسند آتی۔ راج نرنگی، آصف ضیاء احمد اچھی لگی، انار کا درخت مسز نوید باغی کی ہے میں مسز نوید اچھا نہیں لگتا، دوسروں کو پسند آتی ہے سزا آئے گا اور گی خوشی ہوگی۔ عاشق حسن، بشری نیکل خان کی، ایک حسینہ، الماس فاطمہ ارمان کی کہانی بھی پسند آتی، میرا شاہ حسین نے بریائی کی کہانی لکھ کر میری بی بی بیٹھی اور بھانجور کو بریائی کھانے سے ڈرا دیا ہے، روح سے ملاقات، ایب نسرین کی اور آئیب، تمیر انان کی اچھی لگی۔ وہ کون تھی، کاشف عید چھوٹے سے راتر کی چارنی کہانی، ناچاں، زریبا مصطفیٰ کی کہانی اور جنوں والا باغ، محمد داس خان کی پسند آتی، مزہ بہام نے ہمارے فریضی جوان بھائیوں کے لیے اپنے عقیدت سے محبت کے پھول خوش کیے، وہ تمام مکتبے رہیں گے۔ کاشی چوبان کی تحریر میں ایک تک کھت اور پیلا سا شرارتی لڑکا نظر آ جا جو مجھے بے حد پسند آتا۔ احوال میں سب دوست اور ساتھی ہیں، ایوں سے مل کر کے اچھا نہیں لگتا۔ خط کافی لیا ہو گیا ہے کاشی بھائی جو پسند آئے رہے رہا جو پسند آئے کاٹ دینا ہمیں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ آج میں خوشی ہوں اور خوش رہنا چاہتی ہوں۔

بچہ مسز نوید باغی صاحبہ پرچہ آپ کو پسند آ یا، شمارے کی کہانیاں آپ کے دل لگیں، پسندیدگی کا شکر ہے۔

✉ عبدالغفار حامد، چچہ وطنی سے احوال میں شریک ہیں لکھتے ہیں۔ آگت کا شمارہ برابر اسرار نسرین، خورنگ، ایک حسینہ کے ناخن کے ساتھ ما۔ مزہ صاحبہ کا ادارہ عید مبارک بہت گراں لے لیے ہوئے تھا، کاشی چوبان کی کچھ اپنی باتیں ہمیشہ کی طرح یاد ہیں۔ امین حسن نکاتی، میر نوید شاہ، نادیہ امین، عصمت پرین عجمی، نیکل میٹلو، فریہ فریہ احمد، نیلہ شاہین، اہم اشفاق بہت، انول عمران خان، دریمان، سیم، مقصود احمد بلوچ، فریہ عالم، ریمان آفاق، شانزیدہ گل، فرحت صدیقی، عید اعزیز جی، آرم خان، چوہدری مدثر حسین، نسرین اختر، رضوان قوم، سدرہ انور علی، مسز نوید باغی، عظمیٰ بھور، شمعان کھوسو، مجید احمد جانی، منشی عزیز اور دیگر تمام بہن بھائیوں کے احوال میں شکر ہے زبردست رہے۔ کہانیوں میں محمد سلیم اختر کی خان زادہ اپنی مثال آپ رہی، راج نرنگی، انار کا درخت، پر اسرار حویلی، بریائی، آہ سب، عشق، ہوش، بادا دیدہ، روح اور شیدائے لکھنؤ، اس پر اسرار نسرین کے متعلق کہانیاں ثابت ہوئیں، پائی عاشق حسن، ایک حسینہ، روح سے ملاقات، وہ کون تھی، جنوں والا باغ اور نصیحت رو میں بالکل پسند میں آئیں، جبکہ ناچاں اور پیٹے سوچ لیتے بھری گھر تہ رہے بہتر





پاکستان کی شان، قومی پہچان

سید علی خان

فتوحات کے قصے، سنہری یادوں کے چمکتے حروف اور  
آج کی کارگزاریاں۔

وہ محبوب کھلاڑی، جنہیں بین الاقوامی طور پر ”فلاسنگ  
ہارس“ اور ”ڈینیجر مین“ کے خطابات سے نوازا گیا۔



دو شہزادہ کے صفحات پر ایک یادگار ملاقات کی صورت ملاحظہ فرمائیے۔

اگست 2014ء میں چچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کر لیں۔

اگست 2014ء

کوین

برائے

احوال

نام

مکمل پتہ

اگست 2014ء میں چچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شامل اشاعت کر لیں۔

اگست 2014ء

کوین

برائے

اشاعت

کہانی

عنوان کہانی

تعداد صفحات:

نام

مکمل پتہ

فون ریسل نمبر

اگست 2014ء میں چچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا کرتی ہوں۔ سہری رائے میں

اگست 2014ء

کوین

برائے

پسندیدہ

کہانی

اول، عنوان:

مصنف:

دوم، عنوان:

مصنف:

سوم، عنوان:

مصنف:

نام

شہر



تصنیف۔ خلیفہ آج برسرِ عہدہ ملتز برحقی، عمران خان، مور شاہد حسین، امام حسن نظامی، نظام رسول گل، درگزر شہزاد، نجف اکرم اور رابعہ ہند سے روانہ کے حکام ہند آئے۔ سلسلے دار انارکال اٹھے جاوے ہیں، جبکہ رئیس عیشی گنگا احمد جادو کی خاص فرخ رہے، مگر بڑی مختصر ہی مگر میں آیا۔ انشاء اللہ اگلے باہر سافر ہوں گے، منام سہاٹیوں کو بہت سلام۔

عزیز القادری عابد صاحب! دربارِ آبدورست آبد، آپ کی کہانیاں بھی اس بار شائع ہو رہی ہیں۔ آپ نے مندرجہ بہت شکر ادا کیا۔



☞ عظیم علی ایڑو ملہر، کراچی سے لکھتے ہیں۔ محترم کاظمی جو بانِ السلام علیکم۔ اس بار بڑی سچی کہانیاں دل کو بہت بہا با۔ شمارہ خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ پر اسرار نمبر شائع کرنے پر مبارکباد قبول فرمائیے۔ سب سے پہلے ادارہ پر ہمتا ہوں، اس بار منتر جی نے بہت اچھا لکھا، وہ اس ہی کہہ رہا ہے۔ کچھ اپنی باتیں تعریف کے لیے سر سے بان لگا دیتا۔

احوال میں سامنیوں کے خط پڑھے، جو لالی کے شمارے پر بہت ہی اچھا نمبر لکھا گیا۔ بڑے شاہ صاحب، حسن نظامی، نجل، سید، امام نظامی، بیٹ، جو بدشاہ، فرخین، صدر، انور شاہ، عظیمی شکور، مجید احمد بانی، شعیب تازہ، مارلی حسین، مہر شاہد حسین، ممتاز احمد، شفاق شاہین، مندر علی جدوی، حسین جوہر، کمال پرنسز اور نرگس احمد۔

منام کہانیاں اسرار سے پر ہیں۔ انارکال کا رخسار دل و بلاخیا پر اسرار کہانی پڑھنے کو کٹاؤ نہ کرید، ورنہ بہت ہی خوفناک لگتی۔ پہلے سو فیصد اپنے بہت حیرت انگیز ثابت ہوئی، نور بانیاں اسرار سے گھر پڑھی، مہر شاہد حسین مزید کا سببان کیلئے دعا میں۔ عظیمی ارشد علی ارشد کے قلم سے انارکال پڑھ کر حلو اسات میں کافی اٹھانہ رہا ہے۔

☞ ادا عظیم علی ایڑو آپ کو پرچہ ہند آیا شکر ہے۔

☞ عزیز القادری، ایدہ آباد سے لکھتے ہیں، السلام علیکم۔ میری طرف سے سچی کہانیوں کے بھی اسٹاف اور قارئین کو دل سے سلام اور دُعا ہے، دعا میں قبول ہوں۔ 3 اگست کو پانچواں نمبر، گرم جواؤں کے برسوں کے ساتھ ہم اپنے چارے رسالے کو آخری بار پر اسرار نمبر کی صورت لے بیٹھے۔ سب سے پہلے ایک مثال پر پہنچنے پر مثال گریں، ڈانٹا دو شہزاد کی صورت میں اپنا بد صورت چہرہ نہ منی ہوئی (میں اول میں آئی ہوں نہیں میں نہیں) کا ذکر ہے، اسکا تعنی اور رسالے کے اندر درسی صفحات پر ایک بار پھر امام اسے راحت صاحب کی نسط واد کہانیاں جلد آ رہی ہے کی توجہ کے ساتھ رسالے کے کچھ بہتر ہونے کی توجہ سنائی گئی۔ امام اسے راحت صاحب جن کو میں نے بہت پر حال دار بہتر پایا، جن کا میں نہیں ہوں۔ ان کی کہانیاں کے اشتہار نے مجھے رسالے سے تعلق جوڑنے اور اس خط کی صورت میں شکر سے، شکایات اور تجویز پڑھنا پڑھنا، ہر اس امید پر کہ ان پر عمل بھی ہوگا مجھ کو کرنا۔ سچی کہانیوں سے تعلق بھی پر اسرار نمبر پڑھے کی ہی شروع ہوا تھا۔ بہت سے پرانے سچی کہانیوں کے شمارے بھی پڑھے، کڑے بہت ترست تھے۔ آج سچی کہانیاں میں ہر سب سے صرف نین جاوے دوسری اور دو فسطار کہانیاں ہی اچھی اور پڑھنے کے قابل ہیں، ایک سلیم فاروقی صاحب کی آئی جنوں بہتر نہیں پڑھا ہے اور کچھ بہتر ناگن ہے، انکا نواب صاحب کے قلم سے سلیم فاروقی کا بھی میں قلم لے رہا ہوں۔

زارہہ دار کا رخسار، جنوں والا بلاغ اچھی لگی۔ خدا حافظ اب اجازت۔

☞ پر اسرار عزیز القادری، ایدہ آباد سے لکھتے ہیں، السلام علیکم! چارے بہت اچھے۔ امید ہے آپ شہزاد سے ہوں گے پاکستان سمیت تمام عالم اسلام کو جن بھلا صاحب دالم کا سامنا ہے، ان سے اللہ پاک ہم سب کو نجات عطا فرمائے اور رحمت کر دے گا مکمل فاتحہ ہو جائے (آمین) اگست کا شمارہ آپ کی محنت کا ثمرہ ہوا، اللہ تعالیٰ آپ کو اور سچی کہانیاں کے تمام اسٹاف کو



مزید ترقی عطا فرمائے (آمین) کئی کہانیاں ایک رسالہ میں سے، بلکہ جس طرح اس نے میری طرح اور بہت سوں کو علم بکرا سکا، یہ اب ایک آئینہ بن گیا ہے جہاں سے طالب علم تعلیم حاصل کر کے جاتے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ کہانوں کو خاص بناؤ، آپ کا شی کمال ہے اور ہم کئی کہانیاں کی محبت کی بیحد تعریفیں کریں گے۔ اگست کا شمار روز بہ روز ترقی اور ترقی یافتہ بننے پر بڑھ کر ہوا ہے۔ آپ نے تحریریں لکھ کر تمام لاکھوں کو جواب دیں، مگر خان زاد، سلیم اختر صاحب، رابع ننگی، اے صفیاء احمد، برائی، سرد شاہد حسین، سید زاہد، دروچ، ملک صفدر عباس، اگست کے شمارے کی خاص تحریریں تھیں۔ اس کے علاوہ تاجاں، عاشق جن، پراسرار جوئی، انار کا درخت، عشق ہوئی زبا، جنوں والا باغ، ایک حسینہ، آسیب بھیجا، حد فرب صورت اور سنی آموز تحریریں تھیں۔ عشق ہوئی زبا کا ایڈیٹر حد فرب صورت تھا لیکن اگست کے شمارے کی طرف ہاک کہانیاں اور تھیں، زاہد و دروچ، ملک صفدر عباس، اعوان اور سفید آنکھیں، رویا حسن شاہد، بان دونوں کہانوں کو رات میں پانچ بجے پڑھا نہیں جاسے تھا، مگر اب تو پڑھ لیں، جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ آپ روزوں حضرت زمرانے میں کیا سب سے ہے، یہاں بہت بہت سادگی، ہوائی اچھی کاوش پر۔ ذریعہ جو یہی اللہ پاک آپ کو کھلتے عطا فرمائے اور آپ کی اچھی ہی تحریر کا انتظار ہے۔ سرد، انور، جس طرح تم خود بہاری ہو، ایسے ہی تمہاری ہر تحریر خوب صورت ہوتی ہے، دعا خوش رہو۔ عبدالعزیز جی آ صاحب: آپ بلا امید نہ ہوں۔ اللہ پاک بہت بہتر کرنے والا ہے، اللہ آپ کو خوش رکھے ہم آپ کی کہانیوں سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ کاشی بیانیے جس انداز میں آپ کا حوصلہ بڑھا جائے، کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمام احوالیوں، کہنے والے دوستوں اور تمام بڑے والوں کو زمرانے میں دعا کریں۔ سنی بارہ فیصلی خدا رکھے، کھلی چھاپ دیں تو میرا بیانی ہوگی اور نہ بیانات رہ جائیں گے آئندہ طویل خط نہیں لکھوں گی، اب اجازت۔ اللہ حافظ

مظہر کا رویہ ہے۔ اللہ کرے کہ ذرا روز یاد۔ پر ہے کیا پسند بیانی کا شعر یہ، بلاشبہ کئی کہانیاں ایک آئینہ بنی حقیقت رکھتا ہے اور آج کی طرح کھلی بھی لکھاویں گی وہی طرح حوصلہ افزائی کرتا ہے گا اور ان کے فن کو اجاگر کرے گا۔



اللہ اور شاہد حسین فخر شہد اوگت سے شامل احوال ہیں۔ ہر عزیز کا کاشی پڑھنا، یہاں سلام دعا کریں، اب اگست کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے، بالکل بہت ہی خوفناک پر اسرار فہر کے لیے ہے حد اچھا تھا۔ خوفناک تصویروں سے کئی فہرست میں لڑے یاد اور سرد شاہد حسین بھی احوال "برائی" شامل ہیں۔ حوصلہ افزائی کا بے حد شکر ہے۔ ایم اسے راحت کے ناول ہم بھی کا انتظار ہے۔ آئی مزہ و سہام کا ادارہ، علیہ سہارک برآمدی طرح بہترین ادارہ تھا۔ آپ کی کچھ کہانیاں بہت ہی شامل تحریر ہے۔ اپنی ہی عقل و احوال اپنے عروج پر تھی، ایم حسین انسانی سماج کی زندگی پر شاہد، شبانہ کھوسہ، اشفاق شاہین، کھلی کرے آپ۔ اگلے عبدالعزیز جی آ کاشی یا منظور، منظور، ممتاز احمد بیجا اور سرد و انور، بیانیہ خاکے کم سے کم بالکل ٹھیک ہیں۔ مجید احمد جانی بھی تمہارا ٹھیک ہے، دے ہر خند، بتوں کے والد صاحب کی محبت بیانی کے لیے پُر مشغول رہا میں۔ شائستہ بتال، بہن نمرے کی، عمارت مبارک ہو۔ ڈاکٹر امین، وقار اور تمام رسول گل اپنی محبت و اہمیت، بیحد کلمہ لکھیے، کاشی خدیو عزیز سے، لیعل ندیم، سنی، انجل ایڈ، اشفاق بنت، صفدر علی خدیو، آپ کے خط میں میرا نام کیوں نہیں؟ کاشی مجھ سے لے لکھی کر لیا کرو گی۔ امجد علی، سید صفدر، شری اور شکر، خدا آپ کو بھی سدا سلامت رکھے۔ آئی زریہ جو یہ اب آپ کی حقیقت کاشی سے خدا آپ کو کھلتے دے ہاں! ننگی احوال آئی حسین جو یہ صاحبہ لوگ، کیوں آپ کو دادی انہاں پکارتے ہیں اب تاجاں دو، محمد و امین، بروٹی اور ڈاکٹر امین، دانا آپ اپنی تصویر بھیجیں، ٹاپلیز، شدو، یہ ادبی کرے، شاہد نواز، دانا محمد شاہ، رفیق رسول، طارق جاوید، ملک صفدر عباس اعوان، دھرتی مرزا، آئی اس حسین عقل میں آپ کی کئی کہانیاں ہیں آپ؟ کاشی، یہاں یہ کیا شبانہ کھوسہ۔ کئی کہانیاں میں سلطان دوسے کا ڈرائی کر رہے ہیں اور حسین جو یہ جو ملک بنی ہوئی ہیں میری کاشی ایک چھوٹی بہت ہی چھوٹی سی اتنا سا

سے کے مجھے شہزادہ احوال بنا دیا جائے، بابا بابا! محمد سلیم اختر، خان زادو، آصف ضیا، احمد، راج کرگئی، حیرت واسرارت نے پڑھنے کوئی۔ سزوندہ باغی، اتار کار خست، بشرنی کھیل خان، عاشق حسین، اچھی نہیں۔ سلمیٰ غزال، پراسرار عروسی، آخر آجیب نے کیوں کا بھلائی کیا ان کو گھر کی صورت تھوڑے گئے۔ اسی اس فاطمہ ارمان، ولید حسین، یاب نسیم، اروج سے ملاقات، حیرت خان، آجیب، کاشف عبید، وہ، کون تھی، حیرت اور نسیم سے بھر پور نہیں، انکی سلیم فاروقی، آتش جنوں، انکی قسط کا نے جینے سے انتہار ہے۔ رخسانہ نہاد، پیلے سوچ لیتے، لالچ بہت ہی بری تھے (چیز) ہے اسی کی لاہور کی اور لالچ نے بیٹے کو موت کی خند ملا دیا۔ اعجاز احمد نواب، ناگن، ارشد علی ارشد صلی، اچھی جارہی ہیں۔ صندوقی حیدر کی عشق بوشا، پانک، صندوق عباس، اعوان، ڈوید و وروج، ارباض حسین شاہد سفید آجیب، حیرت نسیم اور اسرار میں ڈرونی بہت ہی خوف ناک تھیں۔ زریعہ صلف، ناچاں، نارایہ، بھگت نے اسی کی جان ہی لے لی۔ محمد قاسم خان، جنوں دلا باغ، نسیم آراہ، شویت رو میں، مختصر مگر اسرار سے پر جا سکتی تھی۔ سخن آباد میں سب کے خیال انچوتے تھے۔ احمد جاوید، نسیم، عیسیٰ دوسری تھیں یہ بھی شادا تھی۔

۱۹۸۱ء اور شاہد حسین بابا شہزادہ احوال بنا ہے تو ذرا سی سدر سے رائے کریں، یہ نائل وہیں سے ملے ہیں۔ ایم اے راحت کا سلسلہ جلد ہی شروع ہوگا، احوال میں شرکت اور پتے کی پسندیدگی کا شکر ہے۔  
 ڈاکٹر انیس و نالا ڈاکٹر سے کہتے ہیں، بھیا کاشی چوہان سدا خوش رہو۔ احوال میں یہ میری تیسری شرکت ہے۔  
 حکم آپ کے احوال میں تیسری شرکت تھی بنایا پھر انشا اللہ چوہی، پانچویں اور پھر مستقل احوال ضرور ہو جائیں گے بشرط احوال میں مختصر ہی جگہ ملتی رہی تو؟ تازہ شمارہ میرے سامنے پہر پر ہے۔ احوال کی کھیل ہمیشہ کی طرح بے حد پسند آتی۔ مور شاہد حسین آپ نے کئے دکھایا ہمارے دل کو شکرگ اور احت محسوس ہوئی تھی ہم نے آپ کو ذرا وہاں گلے دکھایا۔ کیا یاد کر دے گی۔ غلام رسول گل عید کا دن آپ کے ساتھ بہت ہی یادگار گزارا، آپ ہمارے لیے بہت خاص ہیں؟ اور یہ عید مبارک، یکجا اپنی باتیں، کچھ سوچنے پر مجبور کر گئی۔ کہاںوں میں سب سے پہلے اپنے محبوب مور شاہد حسین کی برائی، دل کی آکھتے چرچی اور دوس میں آخرتی چلی گئی۔ مبارک اور مور شاہد حسین۔ دروج سے ملاقات، وہ کون تھا، ایک حسینہ جنوں دلا باغ، سفید آجیب تمام کہاںیاں اسرار سے بھر پور تھیں۔ بے حد پسند آئیں، سخن آباد میں مور شاہد حسین عید کا شکر اور غلام رسول گل عید لائے۔ اپنی سب کی عزتیں اور تھیں دل کو بھائی۔



۱۹۸۱ء اور شاہد حسین بابا شہزادہ احوال بنا ہے تو ذرا سی سدر سے رائے کریں، یہ نائل وہیں سے ملے ہیں۔ ایم اے راحت کا سلسلہ جلد ہی شروع ہوگا، احوال میں شرکت اور پتے کی پسندیدگی کا شکر ہے۔  
 ڈاکٹر انیس و نالا ڈاکٹر سے کہتے ہیں، بھیا کاشی چوہان سدا خوش رہو۔ احوال میں یہ میری تیسری شرکت ہے۔  
 حکم آپ کے احوال میں تیسری شرکت تھی بنایا پھر انشا اللہ چوہی، پانچویں اور پھر مستقل احوال ضرور ہو جائیں گے بشرط احوال میں مختصر ہی جگہ ملتی رہی تو؟ تازہ شمارہ میرے سامنے پہر پر ہے۔ احوال کی کھیل ہمیشہ کی طرح بے حد پسند آتی۔ مور شاہد حسین آپ نے کئے دکھایا ہمارے دل کو شکرگ اور احت محسوس ہوئی تھی ہم نے آپ کو ذرا وہاں گلے دکھایا۔ کیا یاد کر دے گی۔ غلام رسول گل عید کا دن آپ کے ساتھ بہت ہی یادگار گزارا، آپ ہمارے لیے بہت خاص ہیں؟ اور یہ عید مبارک، یکجا اپنی باتیں، کچھ سوچنے پر مجبور کر گئی۔ کہاںوں میں سب سے پہلے اپنے محبوب مور شاہد حسین کی برائی، دل کی آکھتے چرچی اور دوس میں آخرتی چلی گئی۔ مبارک اور مور شاہد حسین۔ دروج سے ملاقات، وہ کون تھا، ایک حسینہ جنوں دلا باغ، سفید آجیب تمام کہاںیاں اسرار سے بھر پور تھیں۔ بے حد پسند آئیں، سخن آباد میں مور شاہد حسین عید کا شکر اور غلام رسول گل عید لائے۔ اپنی سب کی عزتیں اور تھیں دل کو بھائی۔  
 ۱۹۸۱ء اور شاہد حسین بابا شہزادہ احوال بنا ہے تو ذرا سی سدر سے رائے کریں، یہ نائل وہیں سے ملے ہیں۔ ایم اے راحت کا سلسلہ جلد ہی شروع ہوگا، احوال میں شرکت اور پتے کی پسندیدگی کا شکر ہے۔  
 ڈاکٹر انیس و نالا ڈاکٹر سے کہتے ہیں، بھیا کاشی چوہان سدا خوش رہو۔ احوال میں یہ میری تیسری شرکت ہے۔  
 حکم آپ کے احوال میں تیسری شرکت تھی بنایا پھر انشا اللہ چوہی، پانچویں اور پھر مستقل احوال ضرور ہو جائیں گے بشرط احوال میں مختصر ہی جگہ ملتی رہی تو؟ تازہ شمارہ میرے سامنے پہر پر ہے۔ احوال کی کھیل ہمیشہ کی طرح بے حد پسند آتی۔ مور شاہد حسین آپ نے کئے دکھایا ہمارے دل کو شکرگ اور احت محسوس ہوئی تھی ہم نے آپ کو ذرا وہاں گلے دکھایا۔ کیا یاد کر دے گی۔ غلام رسول گل عید کا دن آپ کے ساتھ بہت ہی یادگار گزارا، آپ ہمارے لیے بہت خاص ہیں؟ اور یہ عید مبارک، یکجا اپنی باتیں، کچھ سوچنے پر مجبور کر گئی۔ کہاںوں میں سب سے پہلے اپنے محبوب مور شاہد حسین کی برائی، دل کی آکھتے چرچی اور دوس میں آخرتی چلی گئی۔ مبارک اور مور شاہد حسین۔ دروج سے ملاقات، وہ کون تھا، ایک حسینہ جنوں دلا باغ، سفید آجیب تمام کہاںیاں اسرار سے بھر پور تھیں۔ بے حد پسند آئیں، سخن آباد میں مور شاہد حسین عید کا شکر اور غلام رسول گل عید لائے۔ اپنی سب کی عزتیں اور تھیں دل کو بھائی۔  
 ۱۹۸۱ء اور شاہد حسین بابا شہزادہ احوال بنا ہے تو ذرا سی سدر سے رائے کریں، یہ نائل وہیں سے ملے ہیں۔ ایم اے راحت کا سلسلہ جلد ہی شروع ہوگا، احوال میں شرکت اور پتے کی پسندیدگی کا شکر ہے۔  
 ڈاکٹر انیس و نالا ڈاکٹر سے کہتے ہیں، بھیا کاشی چوہان سدا خوش رہو۔ احوال میں یہ میری تیسری شرکت ہے۔  
 حکم آپ کے احوال میں تیسری شرکت تھی بنایا پھر انشا اللہ چوہی، پانچویں اور پھر مستقل احوال ضرور ہو جائیں گے بشرط احوال میں مختصر ہی جگہ ملتی رہی تو؟ تازہ شمارہ میرے سامنے پہر پر ہے۔ احوال کی کھیل ہمیشہ کی طرح بے حد پسند آتی۔ مور شاہد حسین آپ نے کئے دکھایا ہمارے دل کو شکرگ اور احت محسوس ہوئی تھی ہم نے آپ کو ذرا وہاں گلے دکھایا۔ کیا یاد کر دے گی۔ غلام رسول گل عید کا دن آپ کے ساتھ بہت ہی یادگار گزارا، آپ ہمارے لیے بہت خاص ہیں؟ اور یہ عید مبارک، یکجا اپنی باتیں، کچھ سوچنے پر مجبور کر گئی۔ کہاںوں میں سب سے پہلے اپنے محبوب مور شاہد حسین کی برائی، دل کی آکھتے چرچی اور دوس میں آخرتی چلی گئی۔ مبارک اور مور شاہد حسین۔ دروج سے ملاقات، وہ کون تھا، ایک حسینہ جنوں دلا باغ، سفید آجیب تمام کہاںیاں اسرار سے بھر پور تھیں۔ بے حد پسند آئیں، سخن آباد میں مور شاہد حسین عید کا شکر اور غلام رسول گل عید لائے۔ اپنی سب کی عزتیں اور تھیں دل کو بھائی۔



✽ اجمل علی - جیزل آباد سے شامل احوال ہیں، مدبر اعلیٰ منترہ بہام، مدبر کوشی چربان اور دیال کوشی صاحب السلام ملکہ۔ اسید بے مزاج نثر ہوں گے، آگست کا چنگا دکنگا پر اسرار نمبر 27 جولائی کو اپنے نمائندے کے بک اسٹال سے خریدیں منترہ بہام، جی کاردار یہ غیر مبارک کاشی چربان کی کچھ اپنی باتیں، بہت ہی خاص، موضوع پر لکھی گئی۔ اسماعیل بروہی ہماری طرف سے دوستی کیا اور اپنی کچھ نثریں ایڈیٹنگ میں پارہے ہو۔ غلام رسول گل، مور شاہ حسین، شفقت حسین، یادگیری کا شکر ہے۔ ناول آتش جنوں بہت اچھا ماہر ہے۔ عشق، دوش، بابا، پیٹے سوئے، بھٹی، بے حد پسند آتی، مور شاہ حسین آپ کی کہانی بریانی اور لکھنوی عید کا تھکا پھوٹی تھی۔ ویڈیوں۔ ٹانگی اپنی مثال آپ منترہ دیال ہے۔ اہر کا رخت بھی اتھی تھی۔ شاعری بھی پسند آتی، کاشی بھائی اپنا اور تمام حوالوں کا خیال رکھیے۔

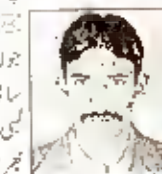


✽ غلام حسین، جیکب آباد سے لکھتے ہیں۔ کاشی بھائی السلام ملکہ چاروں طرف غیر کی خرابی، پیاریاں بوری تھی، بازاروں میں رش اسے عروا پر تھا، پھر جیسے بے فروشی ریش کر رہی تھی مگر مرادوں کیوں کے آنسو میں ڈوبنا اس کے لیے تڑپ رہا تھا، ایران آنکھیں اس کی ستلائی تھیں وہ یوں پچھڑا کے آنکھیں اس کی یاد میں اب تک اٹک جاتی ہیں۔ وہ اپنے پیاروں کی جج پکار کے بار جو بھی آنکھیں نہ کھول سکا۔ آفتاب علی میرا خانزادہ اور بہت ہی پیارا دوست تھا چند دن پہلے اس نے فون کیا کہ آج ہم لاڈکانہ شفقت پور سے تیرا تم پر سوں تک، دارا ندوگر دیکھنے ضرور آنا میں نے اپنے مبارکبادی پھر بڑھ جانا حفظ کر رہے ہوں، نون بند کیا۔ یوں تھے بعد نون آیا کہ دو دن منترہ ماہی ہو آفتاب علی کی باتیں سنی گئی ہیں اور اسی وقت سول اسپتال کے ایمر جنسی وارڈ میں ہے۔ اس کی ڈیٹری اور بیماری دیکھو جب اسے ہوش آیا سب کو مسکرا کر تسلی دینے لگا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں بس سسٹمی جی جوت لگی ہے اس کی بیماری پر ادوی چیزوں پر روٹی کھرتی ہوں سب کو حوصلہ دیتے ہوئے اور زندگی سے لاتے ہوئے رات 3 بجے زندگی کی بازی ہار گیا سب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روتا، ڈوا چھوڑ کر اگلے جہاں چلا گیا جہاں سے لاکھ کوشش کرنے کے باوجود بھی واپسی ناممکن ہے۔ یہ خط لکھتے: دسے میرے ہاتھ کا پتہ دے، وہ ہے اور آنکھیں پر نم ہیں۔ آخر میں تمام کارکن سے گزارش ہے کہ میرے دوست آفتاب علی کے لیے دعائے شفقت ضرور کریں۔



✽ ہاراد غلام حسین! اس انسوسٹاک واقع پر ہم سب آپ کے ساتھ شاملی نم ہیں، اللہ تعالیٰ مرہم کے لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے اور آپ کو بھی۔

✽ شفقت حسین جب چوکی سے شاہ احوال ہیں، 27 رمضان المبارک برطانوی 26 جولائی کو آگست 2014 کا جی کیا نیاں پر اسرار نمبر بہت ہی ڈاؤن سے مروتق کے ساتھ ساڑھے گیارہ بجے سو سول ہوا۔ حسب عادت پرچہ ملتے ہی ایڈن کی محفل احوال کی جانب لسی چلا گیا لگتی اور ہمیشہ کی طرح اپنے خط پر قلم رک نہیں گئے۔ آپ کا محبت سے پھر پھر جواب پڑھا کہ نوسلہ بڑھ گیا میں دوستوں، بہنوں، بھائیوں کے بندے ناچیز کو یاد رکھا ان کا بے حد شکر ہے۔ خاص عبد العزیز جی آ، مدد و انور علی، منشی محمد عزیز، امجد علی، صبا، مجید احمد جانی، غلام رسول گل، مور شاہ حسین، حسین جونیو، محمد افش، وسلاست ربو، امین شکر ہے۔ نانا، زاوہ، محمد سلیم اختر، آ، سیب، جمیرا خان، محمد وقاص، خان، جنوں، والا باغ۔ غیبیہ روتیں، نسیم آرد، مور شاہ حسین، بریانی، فنیل عشق، امجد جاوید اپنے مثال، آپ تھیں۔ آتش جنوں، سلیم نارتھی، منشی، اور شد علی ارشد، ٹانگی، الکا زار احمد نواب پسند ہے، سٹیلے ہیں۔ اب اجازت آپ پر گئی کہانیاں کی پوری ہم اور تارکینا کے لیے پڑھ لوس دعا میں۔



میں کس جگہ  
سچی کہانیاں  
کے چرچے نہیں



آپ سچی کہانیاں کے خریدارین کو ملک کو  
ذریعہ بدلہ دیجیے

اندرون ملک = 600 روپے

ہر ملک ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

|                 |          |                 |           |
|-----------------|----------|-----------------|-----------|
| 55 امریکی ڈالرز | ایران    | 55 امریکی ڈالرز | کویت      |
| 55 امریکی ڈالرز | سری لنکا | 55 امریکی ڈالرز | سعودی عرب |
| 55 امریکی ڈالرز | جاپان    | 55 امریکی ڈالرز | بھارتی    |
| 55 امریکی ڈالرز | لیبیا    | 55 امریکی ڈالرز | مصر       |
| 55 امریکی ڈالرز | ڈنمارک   | 55 امریکی ڈالرز | ایٹان     |
| 55 امریکی ڈالرز | جرمنی    | 55 امریکی ڈالرز | فرانس     |
| 55 امریکی ڈالرز | ہالینڈ   | 55 امریکی ڈالرز | یٹالیہ    |
| 55 امریکی ڈالرز | نولینڈ   | 55 امریکی ڈالرز | ناروے     |
| 65 امریکی ڈالرز | کینیڈا   | 65 امریکی ڈالرز | امریکہ    |
| 65 امریکی ڈالرز | آسٹریلیا | 65 امریکی ڈالرز | افریقہ    |

زوسانہ

110 آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ، بہادر شاہ ظفر روڈ، کراچی

ای سی رابطہ کیجیے

فون نمبر: 201-34939823, 34930470

☆ شفقت جی! بجز آپ کی شفقت کے تھی جس پر احوال میں آپ کی شرکت کا شکر ہے۔

☆ آزیہ جیہا نغمہ خان لاہور سے شریک احوال ہیں! صحتاً ہیں! السلام میرا نام آزیہ جیہا ہے، میں بھی کہانیاں کی بہت پرانی قاری ہوں! تقریباً پانچ سال سے میں پڑھ رہی ہوں، مجھے بھی کہانیاں بہت پسند ہے بہت زیادہ مگر اب آپ نے اس میں قسطا و کتابیاں بہت زیادہ کر لی ہیں۔ میرے جانے والے جو یہ پڑھنے میں یگان سب کو یہ شکایت ہے کہ یہ قسطا و کتابیاں حقیقت سے دور تھیں۔ اصل واقعات سے بہت کہ کہانیاں تھیں، پر اسرار نہیں پڑھتا، یہ میرے پھر بھی زبردست تھا۔ مسئلہ یہ ہے بہت ہی اچھی سلسلے سے خدمت خلق کا یہ سلسلہ بہت اچھا ہے۔ مجھے لگنے کا بہت شوق ہے مگر مجھے تجربے نہیں ہے، لیکن میرے پاس چینی کہ یہ چار سال سے اس لیے میرے پاس بہت سے صحیح واقعات ہیں جنہیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ دل بہت کڑا تھا لگنے کو مگر بہت پسند ہوئی تھی، لیکن آج بہت کر لی ہے، پلٹ کر میری کہانی اور احوال میں لگنے ضرور شریک کر لیں۔ میں بھی کہانیاں کی مستقل نگہداری چنا چاہتی ہوں، میری سمت بندھاؤں، میری کہانی ضرور شائع کریں، کوئی غلطی ہوگی جو مبالغہ کر رہیں، کاشی چرمین کو ساما اور مبارکباد اس درمیان کیلئے مبارک۔

☆ آزیہ جی! محفل احوال میں آپ کی جتنی بار آمد، شکر ہے آپ کی کہانی جلد شائع ہوگی اور آپ کی ویل فرمائش بھی ضرور پوری ہوگی، آپ کو چھٹا کھساری ہم بنائیں گے۔ آپ اپنا بھی رشتہ ہم سے مضبوط کر لیں اور ہمیں اپنی تجربے اور خطا براہ راست بتائیں، کہانیاں کے معاملے میں سب کی پسند اپنی اپنی، قسطا و سلسلے بھی بچے کا حصہ ہوتے ہیں، برقرار رکھنا اور اپنا مزاج داتا سے اس لیے سب کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔

☆ آزیہ جی! لہذا جانتی ہو کہ تمہارے محرم رضوان قوم لکھتے ہیں! محترم کاشی چرمین صاحب السلام شکم، میں خیریت سے ہوں! امید کرتا ہوں کہ آپ بھی خیریت سے ہوں گے، مگر احوال یہ ہے کہ آپ نے کچھ سے وعدہ کیا تھا کہ میری جانب سے بھی آزیہ جیہا پر اسرار کہانیاں میں سے ایک بھی شائع نہ ہوئی، وہ لاکھ کے سامنے آپ کو CD میں، دونوں کیڈز رکھ کر بھیجی تھیں، اور وہی غلطی، اور "سدا" وغیرہ کہانیاں کا نام بہت منفرد اور اچھا ہے۔ آپ کے پاس میری یہ کہانیاں بھی موجود ہوں گی، "میرت" اور "تعلیم گون" میری ہی کر کے آئیں جگہ دیں، یہ سب کہانیاں کی بھی ڈائجسٹ میں شائع نہیں ہوئیں۔ بھی کہانیاں، اگست 2014 کو پڑھنے کی گاہوں کے سامنے ہے۔ میں نے تمام کہانیوں کو پڑھا، خان زادہ، تھیلہ اختر کی بھی یہ کہانی راقی اپنے بلاگ کے لگا دتا، اجنبی اور لیس، حرمین، جیکو، ہارکا درخت اسے بھونسنے کے لگا سے، جو بھی تجربہ ہے۔ ذہنی والا بلاگ کے رائٹرز وہ جس کا خیال بہت جاندار، تعلیم کی گرفت قدرت کے کڑا نظر آئی، میرے خیال میں جو صوفی اگر تجویزی اور اس کہانی پر منت کرتے تو یہ کہانی مزہ خوب صورت لکھی جا سکتی تھی۔

☆ آزیہ جی! برادر رضوان قوم انٹارنا آپ نے اگست کے احوال میں ہمارا جواب نہیں پڑھا۔ ہم نے لکھا تھا کہ آپ کی کہانیاں سدرہ کا پرنٹ بھیجیں، لیکن آپ کی سی ڈی بالکل خالی، سادہ، پلیٹک ہے اس میں کوئی کہانی نہیں ہے، لہذا آپ ہمیں اس کا پرنٹ بھیجیں۔ شکر ہے

☆ آزیہ جی! حاکم عاقق حسین صاحب، ایڈیٹنگ سے شامل احوال ہیں! محترم جناب کاشی چرمین صاحب السلام، تعلیم اگڑے وقت کے ساتھ ماٹا، اللہ بابتنا۔ "جی کہانیاں" ترنی کی منزل میں طے کرتا اپنے سفر پر وہاں سے واپس آیا ہے، فیصلہ آدب میں اس کا مقبول نام معیار کے حوالے سے خاصا مستر اور منفرد ہے۔ آپ کی قیادت میں زبردست جا رہا ہے واقعات کا سلسلہ و بار شروع کر کے آپ نے لوگوں کے دل بہت لیے ہیں، اس سے نگہداری مزید اچھے سے اچھا خیال اور حقیقت لکھنے کی کوشش کرے گا تمام کہانیوں کا انتخاب ملا جواب داتا ہے، مگر تعلیم کے حوالے سے بہت کم احباب کو جگہ دی جاتی ہے، اس پر توجہ کی ضرورت ہے، قارئین کو کام کے فیک اور سنے کے ساتھ قلمی بیانات کا سلسلہ شروع کریں یہ سب حالات وقت کا





تقدماے ناگزیر ترقی و شعراء اور مصنفین کے باہمی روابط فعال اور مضبوط ہو سکیں۔ ایک دو کہانیاں اور غزلیں بھی ساتھ لایا ہوں، انہیں آپ کی توجہ کی ضرورت ہے۔ معیار پر اتریں تو ترقی و اشاعت میں جگہ دے کر سنوں فرمادیں، تمام کارکنان کو درجہ بدرجہ سلام۔

منا ذیترہ ماجدا آپ سب لوگ جی کہانیاں کی فیس بک پر ایک دوسرے سے رابطے میں رہیں، یہ رابطے کا سب سے مضبوط سلسلہ ہے۔ آپ monthlysachcheekahaniyan@gmail.com



پاکستان سٹاک ٹاؤن سرگودھا سے ممتاز احمد لکھتے ہیں۔ پیارے کاوشی بیبا السلام علیکم، سلاحتی کے ساتھ اندھ پاک آپ کو ہمیشہ خوش رکھے، آمین۔ ماہ اگست کا شمار و عیدت میلاد گیا تھا۔ ادارہ میں منورہ سہام نے دلکش الشفا، خوب صورت انداز اور زبردست پیغام کے ساتھ عید کی مبارکبادی اور ایک احساس کو چٹایا۔ کاوشی چو بان کی بکھا پنی باتوں نے سرکاری ہسپتال کا چکر لگایا اور بعد ازاں فٹ بال کے کھیل تک پہنچا دیا۔ احوال میں پہنچے تو نظر متحرک رہا، نیم صبح کے خط کی کراچی کراچی، کھری کھری کڑی سی مگر بہت حد تک جی باتوں پر تھم گئی۔ مگر آپ کی کچھ باتوں سے میں متفق نہیں ہوں۔ بات یہ ہے کہ اگر کسی کی شاعری کہانیاں اچھی ہوتی ہے تو اس کا اچھا تجربہ تشریح کرنا دراز اور شاعر کا نوجوان بل جانا ہوتا ہے۔ لیکن ان کا بااخر شاہد کرنا مقصد نہیں ہوتا، ابنی آپ کی یہ بات سو فیصد غلط ہے کہ ہر شخص خط اور تصویر بھیجوانے کے لیے جھوٹی تفریبن کرنے میں لگا ہوا ہے، کہانیاں پر تنقید بھی ہوتی ہے ان پر ذرا کم ہوتی ہے، باقی تنقید برائے اصلاح ضرور ہوتی چاہیے، میں ذاتی طور پر ان تمام لوگوں کو سلام کرتا ہوں جن کا قلم سے مرثیہ ہے جو کہ آج کل انٹرنیٹ، موبائل، کیبل، فیس بک وغیرہ کے حیرت نکل کر کتابوں، ادب، اور لکھنے لکھانے سے ششک ہیں تو اگر کسی کی تحریر یا تصویح اللغات اور خوب صورت جملوں کی تشریح میں کوئی چند لکھ لکھتا ہے تو یہ جھوٹی تفریح نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی نثرانی۔ اس حد سے زیادہ تفریبن کے لیے اہم عناصر اور خود ساختہ القابات و چابہت شعر ستا ہے۔ بھائی عبدالعزیز جی صاحب السلام علیکم، اللہ آپ کو کرم فرما دے اور آئین۔ ادارہ نہیں تو نہ کسی جناب آپ اپنا مستحق فی النور داپس لیں، بہار کیا تصور ہے جو ہم سب کو اپنے جاننے والوں کو چھوڑ کر جانے کی باتیں کر رہے ہیں؟ آپ کا مستحق نا منظور منظور۔ میں دل سے ممنون و مشکور ہوں کہ اپنی کراچی کی مسز نوید باغی، شائستہ جمال، بھائی عادل حسین، ساسا، سعید، اور سرگودھا کی عظمیٰ شکور کا آپ سب نے مجھے صراحتاً سعادت حاصل کرنے کی مبارکباد دی۔ کراچی کی کنول عمران خان، سعید و انور علی، منشی محمد عزیز سے، حنا بشری، فیصل، سعید، علی، شمیم، ناز، سعید شاہ، حسین، اشفاق شاہین اور سعید علی حیدر نے آپ سب نے میری کہانی ”کھلاڑی“ کو اپنی پسندیدگی کی سند سے نوازا، یہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔ بہت بہت شکر، گزارش ہے کہ ایس ایم ایس کے ذریعے اجمل کا حصہ سے والے دوستوں کے چھات بھی شائع کیا کریں۔ مجھ سلیم اختر کی کہانی ”خان زادہ“ حیرت سے ڈونڈا دیکنا تو دل میں کہانی تھی۔ مسز نوید باغی کی ”ادارہ پر درخت“ حیرت انگیز اور زبردست کہانی تھی۔ عاشق جن، پر اسرار علی، ایک سینہ، روح سے ملاقات، آسب اور وہ کون تھی؟ ہمارا رنبر کے حوالے سے بہترین کہانیاں تھیں، رعشان، جاوید، کیپلے سوٹ لیتے، بہت عمدہ کہانی تھی۔ مسفر علی حیدر کی ”عشق، دوش زبا“، ”دانی ایک بوش رہا کہانی تھی، ”بانی“، ”فیض عشق“ خاص کہانی صرف چار صفحات کی؟ خط کا کافی طویل ہو گیا ہے اس سے پہلے کہ پہلی جمل جائے اسے پیغام کے ساتھ اجازت چاہوں گا کہ ”بھتیجیوں کا پھول تقسیم کرنے والوں کا“ اور ”کبھی کبھی خوشیوں سے خالی نہیں رہتا، زبانش انسان کا حوصلہ بڑھاتی ہیں۔“ میر دل کرنے والوں کی اللہ ضرور مدد فرماتا ہے۔ ”اگلے ماہ اگست، ماہنامہ حاضری ہوگی، اللہ تمہارا۔“

ذیترہ ممتاز احمد، پرپے کی ضرورت کے مطابق رد و بدل صفحات وغیرہ میں ضروری رہتا ہے، انہیں بہت سے معاملات دیکھنے ہوتے ہیں، مگر پورے خط لکھنے کا شکر ہے۔



حافظ ندیم کراچی سے لکھتے ہیں، کاشی بھائی اگست کا چچی کہا بیاں میں اور میرے دوست نے سنی بار کوئی ڈائجسٹ پڑھا۔ میں نائی کاس کا اسٹوڈنٹ ہوں اور مجھے ڈرامائی کہانیاں پڑھنے کا بچپن سے بہت شوق رہا ہے۔ گھر میں چچی کہا بیاں آتا ہے، میرے لئے سنے کا چچی گوگھ برادر ماسٹرم ندیم چچی کہا بیاں شوق سے پڑھتے ہیں، سب سے پہلے تو مجھے پڑھانی کہانی نے جو لکھے برچھو کر دیا، یہ کہانی میں نے پہلے بھی پڑھی ہوئی ہے۔ شاید آپ سنی کا چچی۔ خیر یہ پہلے بھی میرے ذہن میں چمکی ہوئی تھی اور پھر تے پڑھ کر بہت اچھی لگی۔ زبردست، اس کے احوال والا باغ، انار کا درخت، مادہ و روح، آسب، ارواح سے ملاقات، وہ کون تھی، پہلے سوچ لیتے تھیک ٹھاک ڈرامے میں کامیاب رہیں مگر سفید آکھیں، خان زادہ، پراسرار حویلی، مادہ و روح اور عشق پر ہوش و باہوش شاعر کی جان میں، کچھ جانی باتیں میں آپ نے ہمیں عشق شش کرنے پر مجبور کر دیا جب کہ سنز و بائی نے عید مبارک بہت پیارا لکھا۔ شاعری بھی اچھی تھی ڈائجسٹ میں اب اگلے ماہ کو خط لکھوں گا، سب کو میری طرف سے سلام قبول ہو۔

خیر پیارے مجھے حافظ، تمہارا تمبر بہت پیارا تھا۔ پوسٹ کے پاؤں ہائے ہی میں نظر آ جاتے ہیں، تمہاری یہ پہلی تحریر بتا رہی ہے، تم میں بہت اسپارک ہے۔



کراچی سے کول عمران زمان لکھتی ہیں۔ سب سے پہلے تمام اسٹاف اور آپ کو عید مبارک اور تمام کارکن کو بھی اے اسرار نمبر 2 زبردست تمنا، سونے کی زراؤں، احوال کی محفل زبردست دہائی، ہر ایک کی اپنی لیندا، اپنا تمبر، پڑھ کر مزہ آ گیا مگر کچھ حضرات ناراض بھی ہو گئے، آپ کچھ لکھتے ہوں گے اور وہ پڑ سوز دہی، بہت گھٹ لگ رہی ہوئی تصویر میں، ممتاز بھائی آپ کو عمرے کی بہت بہت مبارک مستحبات کہاں ہے بھئی۔ "خان زادہ" بیسٹ لگی، بہت زبردست، راج ننگی، انار کا درخت، عاشق جن اتنی پراثر اور متذکر نے دہائی تحریریں کی ہیں، پراسرار حویلی اچھی لگی۔ پڑھانی زبردست رہی، ویسے پڑھانی مجھے بھی بہت پسند ہے، مور بھائی، دو کون تھی؟ اچھی کاوش تھی، پہلے سوچ لیتے بھی اچھی لگی۔ عذرت کے ساتھ عشق ہوش و باہوش بہت فخر ضروری باتیں میں اور کہانی کو بلا جہ طویل کیا گیا، مگر نہیں آتا اور سنی حال نوبہ و روح کا بھی اچھی۔ اپنی کہانیوں میں ناچاں، جنوں والا باغ، سفید آکھیں سب اچھی لگیں۔ ویسے شاعر میں مشتعل دار کہانیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے گھنٹہ بھانہ ہو کر یہ سلسلہ دار کہانیوں کا ڈائجسٹ بن جائے (ہا ہا ہا)۔ میرا خط شائع کرنے پر بہت شکر۔ کاشی بھائی ستمبر میں میری بیٹی کا ساگر و آ رہی ہے 7 ستمبر کو اور پھر 12 ستمبر کو میری سگی ماں گرہے، میری طرف سے سب کو سلام سنز و آئی کو بہت سلام۔

بھئی کول، بی صاحب زادی کو اور آپ کو باری طرف سے بیس سال گرہ مبارک، احوال میں شرکت اور پرے کی پسندیدگی کا شکر یہ سلسلہ دار کہانیاں بھی شکر سے کا حصہ ہیں اور تقاریر کے ذوق کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ جیذا۔۔۔



کراچی گروہا سے لعل ندیم یعنی شامی احوال ہیں، لکھتے ہیں۔ محترمہ منزہ بہام سلیب اور کاشی چند بان صاحب بیسٹ فوش رہیں اور بچوں کی طرح شکر آتے رہیں، اگست کا شمارہ میرے ہاتھ میں ہے جو کہ عید کے بعد موصول ہوا اور عید کی مصروفیات کی وجہ سے تھوڑا سا سنی مطالعہ کر سکا۔ منزہ بہام صلیب کا ادارہ عید مبارک پڑھ کر احساس ہو رہا ہے کہ اسل عید تو خیر یا کو عید میں شریک کرنے کا نام ہے۔ چکوانی باتیں، اس بار تو آپ نے بہت ہی فلسفی انداز میں ادارہ یہ لکھا ہے، احوال میں دوستوں سے ملاقات عید کے حوالے سے اچھا ہے، انجیل میں اس میں شکر یہ ادا کرنے کی کون سی بات ہے آپ کی کہانی اس قدر اچھی ہے کہ ہم نے سزا۔ عبد العزیز جی آ، یہ تو بات نہ دنی کا ہم خود چکوال آ جائیں گے آپ کو احوال میں لینے کے لیے، آپ کے ساتھ ہی تو شاعر کی روانگی ہے، سوز و انداز طری مطالعہ آپ کی عید میری گزری؟ آپ کبھی

کھلاڑی ہیں تو ذہنی مرزائی کی طرح ایک استاد بن سکتی ہیں، کوشش جاری رکھو، مجید احمد جانی آپ کیسے ہیں؟ مسر شاہد بھائی سلام کریں آپ کو شمارے میں خوش آمدید۔ آصف ضیاء، احمد، راج، تنگی، انار کا درخت، بہت ہی اچھی کہانیاں ہیں، بشری کفیل خان کی عاشقین جن جبران کر دینے والی ہے، الناس ناظر کی ایک صینہ، بیچے پر جن کا عاشق ہو جانا بھی عجیب منظر ہے، درد شاہد کی بانی بہت ہی پسند آئی، مایاب نسرین کی روح سے ملاقات آ سبب ہو، وہ تو بھی اچھی کہانیاں ہیں۔

بٹا برادر فیصل یعنی، احوال میں شرکت اور پرے کی پسندیدگی کا شکر ہے، دعا کریں مسر وہ جی ذہنی مرزائی کی طرح مشہور ہوں، جی آئی واہس آچکے ہیں، خوش ہو جائیں۔



شہینہ عبدالقیوم، کراچی سے شامل احوال ہیں، محترمہ کا جی بھائی السلام علیکم وسید ہے آپ سے بہت پورا شرف، مددگار منورہ سہام اور تمام تارکین خیر و عافیت سے ہوں گے، تمام وطنی وطن کو جشن آزادی کی ڈھیروں خوشیاں مبارک ہوں۔ انکل عبدالمعز جی آ بیٹیز ویسی باتیں مت کریں آپ میرے حسن اور رہنا ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جی کہانیاں میں میرے پہلے تیرے کو کھردن آپ ہی نے قرار دیا تھا۔ پڑھ سار کے حساب سے ناظمہ تو شاہد اور دل شمس نما، مگر جی بوجھ تو میرے کمزور دل کو اس کی قدرت اور دہشت بھری آنکھیں بالکل پسند آئیں، لہذا مسر دل پر بلیک پیج جہاں کر دیا، تاکہ کچھ اپنی باتیں، سلسلہ وار کہانیاں اور شاعری تو پڑھی جاسکے، البتہ میرے شوہر نے پورا ڈاؤنٹس پڑھا ڈالا اور کہنے لگے، کہہ کہانیاں تو واقعی رات میں پڑھنے والی ہیں، خوف دلانی اور دل دہلائی تحریریں ہیں۔

جی کہانیاں انعامی سلسلہ بہت شاندار بلکہ جاندار ہے۔ بھائی نوید شاہ، بھائی ایم اشفاق، بت ٹیکم کی پسندیدگی کے لیے بہت شکر ہے۔ بھائی ممتاز احمد آپ کو شکر ہے، بہت بہت مبارک باد قبول ہو، یاد کرنے کا بہت شکر ہے۔ حسن آباد میں عبدالمعز جی آ ایم حسن نظامی، مسائل ابراہیم اور کنول عمران کی نواہوں نے خوش کر دیا۔ درد شاہد حسین، حائلہ مون، نسیم بیکز صدف اور عمیت اکرام کی نگاروں نے دل کو چھو لیا، تھلا دیا، کتنی پڑھ کر مرئی مصلحت میں کافی امتنان ہوا، اعلیٰ فنوں اور نامی نگہی بہت خوب رہیں، فیض عشق پڑھا کر مزہ آ گیا، کئی قطع شدت سے انتظار ہے گا۔ اپنی تمام نگاروں سے معذرت، اس ماہ تمبر سے قاصر ہوں، جی کہانیاں خوب تر تھی کرے۔



شہینہ جی کہانیاں پسند آئیں شکر ہے، آپ تو صرف بائبل سے ہی ڈر گئیں مگر خیر چھوڑیں اور شریک احوال رہیں۔ ایم اشفاق بیٹ، ملازمی سے لگتے ہیں۔ اس دفعہ جولائی کا پراسرار نمبر عید سے تمہیں چاردن پہلے ہی ڈرانے آ گیا، بڑا ہی ذرا دکھ تھا، ایک دفعہ تو کچھ کے دل رکھ رکھ کر دیکھ کر نے

انگل سب سے پہلے سوز سہام نے جی کہانیاں کا اچھا آغاز کیا، کاشی بھائی کچھ اپنی باتیں ہمیشہ کی طرح دل میں ڈرتا جانے والی کر رہے تھے، ان کی باتوں میں ایک جاوہر ہے، جو کہ پڑھنے والوں کو اپنے حشر میں لے لیتا ہے۔ احوال بہت ہی اچھا کالم ہے، اس کے ذریعے قارئین کی ایک دوسرے سے کپ شپ ہو جاتی ہے، دفعہ دوا احمد بھوج صاحب آپ بھی چھانگ لگا کر جی کہانیاں میں آ گئے ہیں، وری گند بہت اچھا کیا ہے آپ نے، جی آ یا نواں بلوچ جی اب اس کو چھوڑ کر مت جانا، پڑھ سار بھیر میں جناب محمد سلیم اختر کی کہانی پڑھی، مسٹیس سے بھر پوری، بانی کہانیاں جتنی بھی تمہیں ایک سے بڑھ کر ایک تمہیں حسن آباد میں سب نے بہت اچھے کام پیش کیے، میں فریڈ فری کو بہت بہت مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ ان کی شاعری کی کتاب، رحمت یار رکھوں گی، یاد کرتی ہیں آ گئی ہے، اپنی سب جی کہانیاں پڑھنے والوں کو میرا سلام اور دعا ہیں۔ جی کہانیاں دن بدلتا اور زیادہ تر تھی کرے آہن۔

بٹا برادر اشفاق بہت استقبال کر رہا، تصود جی آ گئے ہیں سیدان میں، یہ چھوٹا گلن لہی لگا ہے، ذرا راج کے۔ احوال میں آ رہے کی پسندیدگی کا شکر ہے۔





افریڈ ورنی یوسف زئی، الابر سے لکھی ہیں محترم بھائی کاٹھی چو بان اسلام شہک، اچھی کہانیاں پر اسرار و نمبر ۱۱، ایسی ایسی زردانی کہانیاں، نائل تو اتنا زارہ، ہاتھ کا کہ سیری چھوٹی ہی بھانجی ہے، اس نے تو دیکھ کر تجھیں، زور زور نا شروع کر دیا، ہمارا بھوت آ گیا، اجواں میں سب دوستوں کے خطا جھگڑا رہے تھے۔ ایک تو لاہور کی گری نے مت داری ہوئی ہے، اپنا بھائی بھی جابے تو جس ہو جاتا ہے۔ دو شیرو اور گئی کہانیاں کے تو ہم دیا انے ہیں، یہ دو دن ستر گئی کہانیاں ہی مباری ہیں اور ہم ان کے بہت پرانے کہانی ہیں، سکرین میں اہم اشفاق بہت اور قصہ اور ہمارا بھائی گور کیکہ کے بہت خوشی ہوئی، سب بہت اچھا لکھ رہے ہیں تو ہم راغز، ہار گئیں کہ وہ اسلام، سدرہ اور نوکے بہت سلام اور دعا۔

افریڈ ورنی کی ادا کرنی ہدایت کے مطابق ایسے پرچے بھی بچوں کی سنجی سے دور رکھیں، اجواں میں آپ کی آمد سب کے لیے باعث مسرت ہے۔

ڈیوید وغازی خان سے اور خان لکھتی ہیں، بھیا جی کیسے ہیں آپ، امید تو یہی ہے خوش باش، نمیک ٹھاک اور سلامت ہوں گے۔ ویسا ہی ہے، ہمارے چلو اچھا ہی ہے، اللہ پاک میرے سب مسلمان بھائیوں کو سدا سلامت رکھے آمین۔ اگست کا چچی کہانیاں سامنے سے، نائل کے بارے میں کیا کہوں، اس وقت کہوں گی، تو فہ اب اللہ بچائے۔ میں نے خطا کاٹی لیٹ بیجا بھانجا، لیکن بھری آپ نے جگہ دیا، بہت شکریہ، اب جلدی سے میری غزل کو بھی جگہ دیں، یہ سن کر خوشی ہوئی کہ روزی کی نوکری کا روزہ ہے۔

اکرام علی کا روزہ بچوں کا ہے۔



افریڈ ورنی یوسف زئی، الابر سے لکھی ہیں، ایسے غرض صاحب آداب اگست کے جس زور و دم میں "چچی کہانیاں" کی آمد ہونے والی ہو سکون دے گی، دیکھتی ہی "پر اسرار نمبر ۱۱" انھوں میں آیا، میں ایک چچی بار کرے ہوش ہو گئی۔ تو اور کیا سرون تھا ہی ایسا ہیست، تاکہ وہ تو خوش کریں کہ مجھے ہوش آ گیا اور میں نے فوراً سے پہلے سب کہانیاں پڑھیں اور کتنے بیٹھے تیرے تو آئے پلٹے ہیں تیرے کی طرف، سب سے پہلے سوزہ سبام کی ہانسی پڑھنے کو کہیں، ان کی اٹن سے بہت کے جذبات پڑے کہ رماں میں فن کی عزت اور بڑھتی۔ "بھو اپنی باتیں" پڑھیں، کاٹھی چو بان صاحب ایسے بولتے ہیں جیسے سب اجواں والے ان کے سامنے ہی بیٹھے ہیں، سوزہ آتا ہے ان کو پڑھ کر، اجواں میں آئے تو بہت سے غلطو پڑے، کچھ میں ہمارا ذکر بھی تھا اور میں، یہ عید المیز صاحب کہاں ہمارے ہیں؟ دو کہیں ان کو بلینز، سدرہ اور نوکے نے اتنی بہت سے سلام کیا، میرا ڈیوید سادا پیار سدرہ علی کے لیے، ہوتا ز صاحب کہانی سمیت چچی کہانیاں میں آئیں، ان کی کوئی کہانی نہیں تھی اگست کے شمارے میں، دلوں کو تھا ہنس، اس اب ہم چارے ہیں جنوں اور روحوں کے دہیں میں جہاں بہت ہی کہانیاں گھری پڑی ہیں اور تیرے کے اظہار میں ہیں۔ سوزہ شاہد بھائی کیا کرتے ہیں۔ "بڑائی" کا سوچ کر ہی خوف آ رہا ہے کہا تو زور کی بات۔ "لمساں قاطرہ اور ان" کی گئی تحریر "ایک حسرت" فہ خوف زدہ ہو گئے پڑھ کر اور زور کھینک اٹک ہوئے۔ "گنی غزل" کی پر اسرار جو جلی ہائے ایسا جن نہیں بھی لے جانے کہ ایک حسرت سا مگر لے آئے، پرتھووں ہی، ماشق جن، بشری قلم خان کی تحریر بہت زبردست تھی۔ سوزہ پڑھی کا کھانا ادا کا درخت بہت خوش و خوش سے شروع کیا۔ اداوں تک بہت ٹھیک تھی جیسے ہی انسانی کھوپڑیوں کا ذکر آیا ہوتوں یہ خود بخود آیت انگری کا اور شروع ہو گیا اور سب سے ملاقات نایب فرین صاحب کی گئی تحریر بایں قسم سے بہت اچھا لکھ کر کم از کم اس کی اپنے مشہر سے ملاقات تو ہو گئی پھر اداوں کی گئی کہانیاں "آسیب" فہ زبردست تھی، سندرہ بی بیرونی کی کہیں کہانی مشق ہوش رہا، کہانیاں سے جملوں کی ادائیگی بہت خوب تھی، زبردست لکھتے ہیں سدرہ صاحب، ایڈیٹر صاحب آپ کا خوب اچھی طرح سے اندازہ ہو گیا، وہ کہ کس نسبت سے میں نے انہوں سے پڑھا ہے، سوزہ پورا ہو گیا۔ سب سے زور دیا میں آ رہی ہوں آؤں۔ عید المیز صاحب کی غزل داد کی

سنتیں ہے، عصمت پر وہ بن صاحب نے بھی اچھا لکھا "میں خود سے بچھڑ گئی" البتہ میرا صاحب جلیقہ تھی ذرا دور دیکھیں میرے خط سے میرے مخصوص سے خط آ کر آپ کی لکھی سے خوف آتا ہے۔ سب لکھنے والوں کو سلام اور اللہ حافظ۔  
 جی، لکھی سے نہ ڈریں، "یہ تو چلتا ہے تمہیں لکھاری بنانے کے لیے۔" تم بے ہوشی میں لکھنا گیا خط، تبصرہ اچھا ہے۔ آپ کی محبت اور غلطیوں کا شکریہ



ایمان سے مجید احمد جانی شامل احوال ہیں، لکھتے ہیں سلام و محبت! بعد از سلام افلا  
 قباتی سے دعا کروں کہ جی کہانیاں کے تمام اسٹاف، مزہ، سہام، کاغذی چوبان، ودانیال  
 شمس، کارکن اور لکھاریوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔ بہت شکر ہے کہ لکھی  
 کہانیاں عبد الغفور سے پہلے ملو، گر کیا، جس کے لیے تمام اسٹاف وا کے سخت ہیں۔ ورنہ  
 میرے چھلکے ہو جاتی، امراتوں پر چڑیل کی خوف ناک شکل دیکھ کر ہم تو ذریعہ گئے، وارے  
 اور سے کیا چڑیل بھی لکھیوں میں، لکھی، انگوٹھیاں پہنتی ہے۔ ڈرتے ڈرتے آگے کو بڑھ گئے، مزہ سہام سے مجید  
 مبارک، رسول کی، ہمیشہ کی طرح بہترین نصیحت فرمادی ہیں۔ کچھ اپنی باتیں، کاشی چوبان نے اپنا گرویدہ بنا دیا  
 ہے۔ سب سے پہلے لکھی اپنی باتیں نہ پڑھیں دل کو چین نہیں آتا۔ احوال میں بیچتے تو میرے سن موئے محمد حسن لکھی  
 سر فرست تھے، وہ لکھی جی، یاد رکھنے کا شکر ہے۔ عصمت پر دین، نیکل، بیٹو، پیارے امہ اشفاق بہت، کنول عمران خان،  
 نرید عالم، رحمان آفاق، سردار، انور علی، اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ منی کد عزیز مے، حنا شریفی، لیصل نہ ہم بھئی، نعمتہ  
 ناز کا شکر ہے۔ عادل حسین، مور شاہد حسین، شفقت حسین، ممتاز احمد، اشفاق شاہین، زرید، نوید، نورا اور پیارے صفدر علی  
 حیدری خوب صورت تبصرے کے ساتھ نظر ہوئے تھے۔ باقی تبصرے بھی خوب تھے۔ زریدانہ نیم مزگ خوب صورت  
 الفاظ کے ساتھ شامل احوال تھیں۔ یہ دور ہی ایسا ہے، بڑے لکھاری ہوں یا چھوٹے اپنی تعریف سننے کے لیے بے  
 تاب ہیں۔ تنقید کروا کرے جیسی لکھی ہے تنقید کرنا اور تجارہ جانا، کیوں کہ جانی کسی کو پسند نہیں سے سب بھونٹ کے  
 پیچھے مہرہ کاٹے کھڑے ہیں۔ میں آپ سے اتفاق کرتے ہوں اور دانا ہوں کہ دل جگر کے ساتھ لکھی جانی تھیں اور  
 لکھی کہانیاں کا شکر ہے کہ انہوں نے آپ کا احوال شائع بھی کیا، ورنہ کاشی چوبان بھائی، منی ناز، منی لالے ہیں۔ بابا بابا  
 ..... ارے میرے سونے عبد الغفور جی آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ آپ کے لہو کی پرموت کی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔  
 مفید و ازھنی کی لالہ نجا، و دنیا داری کے رشتے دوتے ہی ایسے ہیں، لکھی دل جاتے ہیں۔ بابو نہیں ہوتے۔  
 پیارے صفدر احمد بلوچ، ہم تو بیچ کر آپ کو کہتے رہے کہ لکھی کہانیاں میں آ جاؤ مگر آپ سننے کی سب تھے، اب گھر  
 بھی ہم سے، انا، بوجہ کو تو لڑاؤ، و لکھی جناب ڈاکٹر آ کاش صاحب آپ بھی ریڈیو حاضری دیں۔ خان زادہ محمد  
 سلیم اختر خوب صورت تحریر لائے، عشق ہوئی رہا، صفدر علی حیدری کیا تحریر بھی، کیا کمال کیا آپ نے۔ لائف میں لکھی  
 پر آتی طویل کہانی لکھی ہوگی، ورت آپ تو مختصر لکھتے ہیں، پر اپنی مور شاہد حسین، تارید و روح صفدر عباس اعوان،  
 جنوں والا باغ محمد قاض، سفید آکھیں، ریاض حسین شاہد زبردست تحریریں تھیں، باقی تحریریں بھی لکھیں۔ لکھی  
 زبردستی چاہی ہے۔ تاکہ آتش جنوں بھی تم نہیں ہیں۔

بنا ڈیٹر مجید جانی اپنی ہی سے جو ڈر گیا اور... جدید دور کی چیز ہیں ایسی ہی ہوتی ہیں، غالباً آپ کا واسطہ نہیں پڑا  
 ابھی تک... احوال میں شرکت اور پرے کی پسندیدگی کا شکر ہے۔



ایمان اور احمد شاہد بوریہ والا سے شامل احوال ہیں، اگست کا شمار و پراسرار نیرمان، پراسرار  
 نیر و کثری لکھی کہانیاں شائع کرنا رہا ہے۔ اگست کے حوالے سے آزاد بی، نیر وغیرہ ہوا تو  
 زیادہ اچھا لگا، میری تجویز ہے کہ اگست و تبصرہ آزادی و دفاع پاکستان میرے کے طور پر شائع کیا  
 کیجئے، و ورسا خاصا سب لکھی میں بھی نظر آ رہا ہے۔ ایک ہی موضوع پر بار بار خصوصاً نیر

قادرین کی دلچسپی کو کم کر دیتے ہیں۔ منور وسام علیہ کی مبارکباد سے رہی تھیں۔ کاشی پر اپنی اپنی باتوں میں فٹ بال والوں کو کلب میں پاکستان کی شمولیت کا تذکرہ کر رہے تھے۔ عبدالعزیز جی آج بھی کہا جاتا ہے کہ ان کے دورِ جاہلیت اور نفاقت کا انہماک کرتے نظر آئے۔ منشی محمد عبدالعزیز نے آپ کا شعر یہ یاد رکھا، "مردہ اور نونہلی یاد رکھنے کا شعر ہے۔" خود ہی زمانہ بعض اوقات انسان کو انسانیت دور کر دیتے ہیں، ویسے بھی اب ماشاء اللہ بہت سے نئے احوال، احوال کی روشنی بڑھانے ہوئے ہیں۔

نماز خیر مرانا شاہد کہا جاتا ہے آپ کی شائع ہو جانے لگی، بس ذرا۔۔۔



اللہ تعالیٰ سے منشی محمد عزیز سے لکھتے ہیں، ڈیزر کاشی جو بان، جی الاسلام ملیم سب سے پہلے تو آپ تمام اراکین ادارہ کو اس قدر محنت اور مستعدی پر مبارکباد قبول کیجیے۔ آپ سب اور باہمی منور وسام مرزا بھی کہ جن کو اتنے نعال اور مستعد کارکن اللہ نے عطا کیے ہیں۔ میری یہ باتیں نہ تو خوشامد ہیں اور نہ ہی نسا کا، خصوصاً یہ بات میں درمیانہ نوع، مزگنگ کو کلاب کے کبریا ہوں، کیوں کہ ان کو احوال و دستوں کا کہا جیوں کی تعریف کرنا شاید اچھا نہیں لگا۔ جتنی ساری حد تک آپ کی بات بھی درست ہے کہ خاصوں کی نشاندہی بھی ہوتی چاہیے، لیکن یہ بھی ذہن نشین رہے کہ شریف سے لگھاری کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے اور وہ پہلے سے بھی بہتر لکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کاشی بھائی! اب صرف آپ سے ایک انتہا، ہاں کہ اگست کا شمارہ پر اسرار سیر تھا لیکن پلیز سرورق اس طرح کا نہ دیا کریں، در سالے کے اندر بے شک کوئی زندہ "بھتی" یا "پڑیل" بخدا دیا کریں۔ پلیز۔۔۔ پلیز ایسا لگا کوئی ایک چیز میں عید مبارک کبریٰ سے لیکن اس کی مبارکباد میں قبول نہیں۔ آپ کی عید مبارک پر ہم خیر مبارک کہتے ہیں۔ کچھ اپنی بات میں کاشی میں ہمیں پیسے کی ایجاد سے متعلق بتا رہے تھے۔ احوال کی ابتدا میرے پسندیدہ شہر قبول شریف کے اہم ترین نظامی کے خط سے ہوئی، ان کو ہم خصوصی طور پر دیکھتے ہیں۔ ساتھی عزیز خیر شاہ! خط کی پسندیدگی کا بہت شکر ہے۔ فریہ عالم ایاد بڑے بے مروت ہو، ہم بھی آپ کے پرانے ساتھیوں میں سے ہیں لیکن آپ نے ہمیں تو شاید بالکل ہی بھلا دیا ہے۔ آیا عبدالعزیز جی آجی وارے پار اقصہ تھوک دیکھیے، دیکھیے تو ذرا دوستوں کے چہرے آپ کے استثنائی دانی بات پر چڑھ کر نکلا گئے ہیں، مسدودہ انور عرف گز یاد دانی، مسز خیر بائی، عظمیٰ شکور، حنا ہاشمی، شہینہ زامہ شاکستہ، جمال، عادل حسین، مور شاہد حسین، عبدالغفار، عابد ممتاز احمد، اشفاق شاہین، صفدر علی حیدر اور حسین جویریہ! انہوں نے کہا ادا کی پسندیدگی پر آپ سب کا شکور ہوں۔ خان زاہد میں ایک تمنا یہ کہ اوراہ راست پر آتے دیکھ کر دل بہت خوش ہوا کہ جاؤ کوئی توند ہوا چاہے ڈنڈے کہا کرتی۔ راج خرنکی میں آصف ضیاء احمد نے انڈیا کی سیر کر رکھی، ایاد کا درخت میں مسز خیر بائی ایک جن کی مانتی کی داستان سناری میں، بشریٰ کی نعل خان اپنی نالی کی آپ بیٹی سناری میں۔ مور شاہد حسین کی برائی پڑھتے ہوئے بار بار میں پانی بھرا آٹا لیکن آخر میں سارا مستیاس میں ہو گیا۔ اچھی تحریر تھی، صفدر علی حیدر کی محبت ہوشی ر بارا ت کے وقت پر تھی اور جب لائن چلی گئی تو سر سے تو مینے ہی چھوٹ گئے۔ تاہاں زبیر مصطفیٰ کی تحریر آخر میں بہت رنجیدہ کرتی، خصوصاً شعر بہت زبردست تھا۔ جنوں والا باغ میں دو خاص اسٹے پانچویں کے اڈے کے کاردار رہے تھے، سفید آکھیں کے عنوان سے پڑ اسرار سیر کی مصلحت سے بہت ہی زبردست تحریر زبون کے لائے ہیں۔ بہت خوب شاہد صاحب! اللہ کرے زور قلم اور زیادہ دار و دل مبارکباد، میرا اشارہ تو آپ مجھ ہی گئے ہوں گے، انہیں تو عبدالغفار عابد صاحب سے پوچھ لیجیے گا۔ کاشی بھائی اللہ حافظ کہنے سے پہلے یہ بتا دوں کہ جن آباؤ میں شازہ گل، مور شاہد حسین، عبدالعزیز جی آ اور تانیہ سمنی کی شاعری دل کے تار پلا گئی، اللہ حافظ سوئے رب وے حوالے۔

نماز خیر مرزا سے احوال میں آپ کی آمد رفتی کی دعا بھی، شکر ہے۔





کراچی سے اسامہ مذہب احوال میں شریک ہیں لکھتے ہیں، کاشی بھائی آگست کا شمار پراسرار سیرانی مثال آپ حاضر ہو، جی کا عہد مبارک گہری گہری دعوت دے گیا۔ کچھ اپنی باتیں میں آپ نے باادگار بائیں کہیں۔ سچا اللہ خان سے اترو پو دو ٹیڑھ میں کب آ رہا ہے؟ میرے گھر والوں کو بہت انتظار ہے، اب آنے ہیں کہانیوں کی جانب خانزادہ دراج زنگی، پراسرار حوٹلی، خوب روئیں، پیلے سوچ لینے، اناہر کا درخت، عاشق جن، ایک حبیبہ، دو کوئی، تاجاں، جنوں والا باغ بہت دل و بلا دینے والی کہانیاں نہیں لیکن ان شمارے کی جان برائی، عشق، ہوش و آواز سب اور سفید گھبسا ثابت ہوئیں۔ اس قدر خوب صورت کہانیاں لکھنے پر میں سو شکر ہے حسین مصنفہ علی حیدری، جبرائیل اور باش حسین شاہ صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ امید ہے آئندہ بھی اسی طرح کے شمارے شمارے پڑھنے کو ملنے ہیں گے۔ سخن آباد میں نام شعراء کے کلام دل کو بھائے، کاشی بھائی اسامہ فاضل عشق کی خط بہت مختصر تھی، مخلصی، مامکن اور آتش جنوں جنوں بہت خوب صورت سے آنے کے بڑھ رہے ہیں، میرے پاپا خاص طور پر آتش جنوں اور آگن بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔

بلا بہت اچھے اسامہ! بہت گہری نظر رکھنے ہو کچھ لکھنے کی طرف بھی آ جاؤ امید ہے جلد آپ کی کہانیاں ہمیں ملے گی۔ خوش رہو۔

ایس ایم ایس کے ذریعے احوال کا حصہ پٹنے والے قارئین

زیبا ان امرت پٹی۔ کراچی، حرافاروق۔ کراچی، کوکب جہاں۔ گھر، جنیم حسن۔ حیدرآباد، ضیہ احمد۔ گوجرانوالہ، شازیہ مکی۔ پشاور، جاوید احمد، برنی پور ہزارہ، مصعبہ مہر، گھر، رشوان نکوس۔ کوئٹہ، عید خان۔ ملتان، باسعیاں۔ کراچی، مائیکل قربان چیمان۔ جانشورو

**ساتھیوں!** لکھیے اس بار کا احوال تو اپنے اہتمام کو پہنچا اب پڑھنے والے لکھے گا کہ اس مادکا پرچہ آپ کو کبھی آگا؟ ان شاء اللہ اگلے ماہ ان ہی صفحات پھر سے ملاقات ہوگی۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

آپ سب کی دعاؤں کا طالب

**کھلی کچھری**

آپ کے بے حد اصرار پر دھماکہ خیز خبر

پچی کی باتوں کے سوا اور؟

ہو گیا آپ کی سبھی نئی کہانیاں شامل اشاعت نہیں ہوتی؟ ہاں کیا آپ کو ایسا نہ پچی کہانیاں درست ہو وہاں ہونے کی ضمانت ہے؟ ہاں کیا پچی کہانیاں آپ کے شہر میں دستیاب نہیں؟ اور اس طرح کے کئی سوالات اور درہنہ سائل پر بات کرنے کے لیے سرگرمیوں کو خبر آپ کے شہر میں بہت جلد موجود ہوں گے

رابطہ کریں کال یا بذریعہ ایس ایم ایس: 0300-2313256-0333-2269932

نوٹ: تمام سائٹی فیس بک پر پچی کہانیاں میں شامل ہو جائیں، تاکہ رابطہ مضبوط رہے۔

MONTHLYSACHCHEEKAHANIYAN@GMAIL.COM

## پہلی سچ بیانی

# دردور کے دھول

محمد سلیم اختر



ڈرگ سے نڈوں کو سہارا دینے والے ایک شخص کی خوب صورت کہانی



جاوید نے آسہ کے نرم و نازک ہاتھ کو ہمارے ہنڈے پر رکھا۔ ہاتھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

”نہارے ہاتھ کتنے نرم و نازک اور سڈول ہیں۔ تو آسہ شرمائی گئی تھی، وہ ہونٹوں میں بہت محبت تھی۔ آسہ اپنے ہاتھوں کی بہت ہی حفاظت کرتی، ان پر گھنٹوں کر جم کر ہاتھ نہیں کرتی۔ مہینہ ستورانی اور جاوید کی پسند کی ہاتھ لگاتی۔ یوں نیا وقت گزرنے لگا، جب آسہ وہ بچوں کی ماں بن گئی تو وہ اپنے ہاتھوں کی حفاظت کرنا ہی بھول گئی بلکہ وہ اپنے آپ کو بھی بھول گئی۔ گھر میں اس کی ساس کے علاوہ ایک نندھی تھی، آسہ نے گھر کا سارا نظام اور کام کا سنبھال لیا۔ جب وہ نیرتے بچے کی ماں بنی تو وہ اپنا بناؤ سنگھار تک بھول گئی۔ گھر کے کام کاج کے ساتھ بچوں کو سنبھالنے کی وجہ سے اس کا آرام و سکون ختم ہو گیا۔ اس نے کئی بار جاوید سے کہا کہ کوئی ڈھنگ کا نوکر تلاش کریں، کیوں کہ مجھ سے اب اتنے سارے کام نہیں نینتے۔ گھر اور ناگھوں میں اب تو مستقل درد رہنے لگا ہے۔ ہاتھ لوگوں کے لیے کھانا پکانا، ڈھیر سارے برتن اور کپڑے دھونا، اسٹری، سلائی، پٹائی، گھر کی صفائی، سارا دن لگی رہتی ہیں، پھر بھی گھر کے کام مکمل نہیں ہوتے۔ آسہ شام کو بچوں کو پڑھانے کا کام ہی اپنے ذمے لے

انسانی فطری طور پر اپنا پسند و ناپسند ہوا ہے یا حالات اسے اپنا پسند بنا دیتے ہیں۔ وہ نفرت کرنے لگے تو نرم و نازک ہتھوں کو بھی بے دردی سے نسل دے اور ہمارے برائے ہواں ہڈت سے کہ کاتوں کو دامن میں سمالے۔ بدگمانی کی کیفیت طاری ہو تو اپنا آپ بھی نہ اٹھے اور خوش گمانی ہو تو دشمن جان کو بھی رشتی سمجھ کر گلے سے لگالے۔

جاوید بھی کچھ ڈول سے ایسی ہی کیفیت سے دوچار تھا۔ جب سے اس نے ہاتھ کو دیکھا تھا تب سے اسے اپنی بیوی آسہ سے نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ آسہ سے ایک پوجہ تکتے لگی تھی، جبکہ آسہ لاکھوں میں نہ سکی مگر ہزاروں میں ایک ضرور تھی۔ پوری برادرانی میں اس جیسی حسین لڑکی اور کوئی نہ تھی۔ آسہ مرد، سرخ و سپید رنگت، سیاہی مائل بھورے بال، بڑی بڑی روشنی آنکھیں اور بھرے بھرے ہونٹوں کی مالک تھی۔ اس کا لب و لہجہ ایسا تھا کہ لگتا تھا اس کے منہ سے بھول برس رہے ہوں، جاوید نے آسہ کے منہ سے برستے والے بھول ہن کر اپنے دامن میں بھر لیے، جاوید اور آسہ کی شادی نہ صرف محبت کی شادی تھی بلکہ آسہ جاوید کی ماں کی بھی پسند تھی۔ یوں یہ شادی ایک باادگار اور مفرد کہلائی تھی۔ سہاگ رات کو

کے دور میں گزارا مشکل سے ہوتا تھا..... اس جاوید پر کسی کمانی بھی ہو جاتی ہے مگر جاوید اور آسیہ نے یہ وعدہ کیا ہوا تھا کہ وہ حلال کی روزنی نکالیں گے اور حرام کا نوالہ تک اپنے اور بچوں کے منہ میں نہ ڈالیں گے..... جاوید اس عہد پر قائم تھا اور روزی حلال سے اپنے خاندان کی کنالٹ کر رہا تھا۔ حرام اور اوپر کی کمانی سے وہ کوسوں دور تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آسیہ کے لیے ایک نوکرانی کا بندہ دست نہ کر پارہا تھا کہ یوں اس کا ہاتھ تنگ

نہیں تاکہ میرا کچھ بوجھ بٹ جائے..... سچ جاوید میں بہت تنگ جانی ہوں۔“  
کئی جاوید تو کہتا ہے مگر نوکر تنخواہ بہت زیادہ مانگتے ہیں اور ہمارے اخراجات تو پہلے ہی پورے نہیں ہو پارہے۔“  
جاوید نے دھناخت کر دی۔  
"اس بات کا مجھے اندازہ ہے۔ میں اسے طور پر پورنی کوشش کرتی ہوں کہ آپ سے کچھ نہ مانگوں مگر صحت جواب دیتے مگی ہے۔ کیڑے دھونے اور برتن مانگنے ہیں



ہو جاتا..... آسیہ بھی صبر شکر کر کے گزارا کر رہی تھی اور بھی شکایت کا لفظ زبان پر نہ لاتی تھی، اُس کی ساری اُس سے بہت خوش تھی کہ وہ نہ صرف اپنی کھینچا رہتی تھی بلکہ ماں سمجھ کر ان کا احترام بھی کرتی تھی، یعنی تو وہ اس کے داری جانی تھیں اور اسے بہت پسندینی کرتی تھیں۔ ساس اور بہن کی یہی محبت اور حسین احوال نے اس گھر کو اس کا گہوارہ

کو ذرا کم تنخواہ پر مل جائے تو وہ بھی غصیت ہوگا۔“ مگر جاوید اس کی بات کا جواب نہ دے پاتا۔

☆.....☆

جاوید ایک سرکاری ادارے میں ملازم تھا جہاں سے لوگ اپنا سپورٹ وغیرہ بخواتے ہیں۔ وہ اس صنعت کے عہدے پر ناز تھا، تنخواہ تو معتول تھی، مگر اس مہنگائی



بارکھا تھا۔ گھر میں کبھی لڑائی جھگڑا نہ ہوا تھا۔ سب لوگ  
اخفاق سے دور رہے۔

☆.....☆

چھ ماہ قبل جاوید کی ہند بلی ایک چھوٹے سہر میں  
کری گئی اور ایک تحصیل بھی..... اس تحصیل کے زیادہ  
لوگ پورب اور عرب ممالک میں گئے ہوئے تھے، ان  
لوگوں کے اصرار پر حکومت نے وہاں بھی پاسپورٹ  
آفس کی نئی برانچ کھولی اور جاوید کی ہند بلی وہاں  
کروٹی کی۔ جاوید روز روز انہیں گھومتے پڑے وہاں دفتر  
آتا رہ جاتا تھا۔ ان دنوں گھنٹے کا سفر تھا۔ جاوید خوش تھا کہ  
وہاں سامنے سے اس کے بچھو والا دفتر میں اضافہ ہو گیا  
تھا۔ نئے دفتر میں اسٹاف کی کمی تھی۔ اس لیے جاوید کو مشین  
سٹیوں کا کام کرنا پڑا تھا۔ انکو ٹھنکے لگانے، بیلا تھری اور  
پاسپورٹ ڈیوٹی بھی وہی کرتا تھا۔ چونکہ دفتر نیا تھا۔  
رنگ گن تھا، اس لیے جاوید سٹیوں کا کام بخوبی سراغ تھا۔ وہ رہا  
تھا اسے کسی قسم کی پریشانی نہ تھی اور وہ اپنے کام اور ذمہ داریوں  
سے مطمئن تھا کہ وہ وہاں بھی سب کام نبھائے ہی  
اجناسداری اور گن سے کرتا تھا۔ اس کے آئینہ زار اسٹاف  
کے لوگ اور سائل بھی اس سے مطمئن تھے۔

☆.....☆

اس روز موسم کاٹی خراب تھا صبح ہی سے بارش  
ہو رہی تھی، ساتھ ہی زور کی ہوا بھی چلی رہی تھی،  
جاوید وقت کی پابندی کرتا ہوا دفتر جا پہنچا تھا، وہ اپنے  
ایک چپرائس اور گارڈ کے اور کوئی بھی ملازم ابھی تک دفتر  
نہ پہنچا تھا، پھر بھی جاوید نے اپنے کام کا آغاز کر دیا مگر  
ابھی تک کوئی سٹریٹری نہ آیا تھا۔ وہ اپنا سیٹ پر بیٹھا  
گزشتہ دن کا کام وہ بارہ چیک کر رہا تھا کہ دفتر کی  
خاموشی فضا میں اچانک سبڈل کی آواز کی تک تک کرنی  
آواز نے ایک عجیب بکاسائٹ سے فخر بکھر اور سیاہی  
کرتی تھی جبکہ آٹھا، جانے وہ کون سی خوشبو لگنے لگی کہ  
کمرہ باغ و بہار ہو گیا..... جاوید نے سر اڑھا دیا تو  
سب سے پہلے اس کی نگاہ ان محترم کے اٹھنے ہوئے  
قدموں پر پڑی، سرخ سبڈل میں انتہائی سفید اور  
سڈول سے باڈن جن کے ناخن بالکل سبڈل ہی کی  
طرح سرخ رنگ کی پائٹس سے سجے تھے۔ اوپر نازک

نازک نگوں پر پلانی پاز ب چمک رہی تھی۔

”ہا، اس نے دل میں کہا اور پھر نظر اٹھائی..... وہ  
چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائے ایک سائیا بے بناڑی سے چلی  
آ رہی تھی..... نگاہ ملنے پر خابنوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے تک  
لے جانے ہوئے۔ ”اسلام علیکم“ کہا۔ ابھی وہ باڈن کی  
خوب صورتی کے رعب میں زبا ہاتھا کراس کے ہاتھوں کی  
کوٹنے اسے بالکل ہی چندھاوا..... وہ گورے گورے  
تھروٹی انگلیوں والے ہاتھ، جن میں جانے کتنی ہیروں جڑتی  
انگوٹھیاں بگڑ گئی تھیں۔ نازک پوروں پر ہاتھ ہونے لگے  
بے ناخن بھی پاؤں کے ہاتھوں پر لگی پائٹس ہی کے رنگ  
سے آراستہ تھے۔ مشین چیز باڈن پازو کے اوپر اٹھنے پر ٹھنکنا  
انھیں۔ جاوید نے بھی کرسی پر سے ڈراما اٹھتے ہوئے سلام  
کا جواب دیا اور خاتون کو سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ  
کرتے ہوئے کہا۔ ”شرف رکھیے۔“

کرسی پر بیٹھ کر زرا آگے جھٹکتے ہوئے ان محترمہ  
نے اپنے بازو مہر پر چھلوا دیے۔ جاوید اس کی اس شان  
ذرا بلی پر بوکھلا سا گیا۔ جلد ہی اس نے اپنے آپ کو  
تاریف کرنے ہونے کہا۔

”جی فرمائیے محترمہ۔“

وہ کسی بڑے آدمی کی جیسے ہی وجہ سے باہر تھا۔  
ان کی حال میں فی ساری ہوتی تھی، محترمہ نے ایک سالان  
فاخر سے اپنا تعارف کرایا اور بلی کہ دو گئی اپنے شوہر  
کے پاس جانا چاہتی ہے۔ اس لیے پاسپورٹ ڈرامے  
کے لیے آئی ہے۔ وہ اپنا کام بناتے ہوئے دست اپنے  
ہاتھوں کو اس انداز سے جھپک رہے تھے کہ اس کو باور دھیرے  
رہ چہرے رض کر رہی۔ وہ سر سرس نکالی رکالے اسٹریٹ  
کی مشین بندھی تھی۔ بیٹھلیاں اتنی گھالی تھیں کہ بارنگ لگا  
گیا ہو۔ جاوید نے آج تک اسے گورمت، گھالی اور نرم و  
نازک ہاتھ نہیں دیکھے تھے۔ وہ بے بسی وہ نہ جانے کیوں  
ہر ایک کے ہاتھ اور پاؤں بڑے گور سے دیکھا کرتا تھا اور  
ان کی صفائی اور خوب صورتی کو شخصیت کو سمجھنے میں بڑی  
اہمیت دیتا تھا۔

جاوید نے محترمہ کا سٹائشی کارڈ اور فیس اور آجی کی  
رسید لی اور ان کو ڈوگن رہا، پھر اس نے اس کی تصویر بنائی۔  
جب اس نے محترمہ کا ہاتھ پکڑ کر ان کی انگلیوں کے

انگوٹھے لگانے تو وہ ان کے نرم دماغ کو ہاتھوں اور بجلی انگوٹھوں کے سحر میں کھو گیا۔

”کاش وہ ان ہاتھوں کو سدا یوں ہی تھامے دیکھے۔“ اس خیال کے آنے ہی اس نے انگوٹھوں کے نشان کھل کے پھر جب اس نے محترمہ کی ڈیٹا انٹری شروع کی تو اس نے جان بوجھ کر ایک اعتراض لگا دیا کہ وہ اپنا نکاح نامہ بھی دکھا جس محترمہ نکاح نامہ ساتھ نہ لائی تھیں، قبضہ اس نے ان کو اٹھنے دن بھر آنے کو کہا۔

محترمہ جانے کے لیے انھیں اور اس کا شکر ادا کرتے ہوئے کمال بے باکی سے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا، جس کا تقاضا ان کا تاس کے لیے ضروری تھا۔

”آف خدایا“ اسے یوں لگا کہ جیسے خاص رشم اس کی سطحی میں ساٹھی ہے۔ اس نے ہاتھ چھڑا دیا اور وہ لبرائی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆.....☆

واپس کر ہی پر ہتھ کر کہاں میز پر لگانے اور محکم سے انداز میں اپنا چہرہ ہاتھوں کے پالے میں لیتے ہوئے جا بدکھانے والی اس ہاتھ سے خوشبودی بہت آتی، وہ اپنے ہاتھ کو رو بادو سوٹھنے لگا۔

”کہاٹے بھی؟“ وہ سوچ رہا تھا۔

”چلو، بار۔“ واپس دفتر بھی آ جا رہا۔ اس کے ایک ساتھی نے ساتھ دانی کر ہی بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے بھی اس خانوں کو دیکھا جس جانے ہوئے دروازے میں دیکھا لیا تھا۔

”جا بدکھانے پر۔“ ہاں پرا میں نو دانی اس کے ہاتھوں کی تری اور خوشبو سے جانے کون سی دنیا میں چلا گیا تھا۔ دو عورت بھی باؤٹھم کی بنی ہوئی گڑا؟ کتنا خوش قسمت ہے اس کا شہر، ایک ہماری ہو جاں ہیں کر لگتا ہے کہ با کسی دیگستانی مٹی کی بنی ہوئی ہیں۔“

”ہاں جا بدکھانے۔“ اس کا ساتھی بولا۔

”ہمارے عورتوں کو تو اپنے آپ کو کھانے کا بلڈھی نہیں آتے۔ سارا دن سر جھانڈ، منہ پیاز بنی بھرتی ہیں۔ اب دیکھو اس کی چند منٹوں کی موجودگی ہی نے سب کو تازہ کر دیا ہے۔ لگتا ہے چوکھو اور اور چھرا ہی کی کھنکھن بھی کا نہ ہو گئی ہے۔“

☆.....☆

سارا دن اس خاتون کی موجودگی کا سحر جا بدکھانے کے اعصاب پر چھا رہا تھا، کچھ جتنی کا وقت ہو گیا وہ گھر لوٹ آیا، مگر اس خاتون کے سحر سے آواز نہ ہو سکا۔ شام کے وقت کھن میں بھی گرم گرم چائے کی چسکیاں لینے ہوئے وہ نجانے کون سی دنیا میں گم تھا۔ اس کے چہرے پر سردی کی کیفیت نما ہاں گئی، جیسے جاتے جاتے وہ کوئی سہانا خواب دیکھ رہا ہو۔ وہ ان ہی خیالوں میں گم ہی خوشبو اور ان نرم دماغ کھلائی ہاتھوں کو ہتھم انور سے دیکھ دیا تھا کہ ساتھ دانی کر ہی برآسیہ آ کر بیٹھ گئی۔ بسپے اور سسٹے سے پاؤڈر کی ٹٹی ملی باس کا جھنڈا آ بار اور ان کا چہرہ لاشہ دونوں طور پر ستر گیا۔

”ایک کپ جائے تجھے بھی دے دوں، جسم مضمحل ہو رہا ہے۔ اس شہد پر گرمی میں کھڑے ہو کر اسزی کرنے ہوئے نڈھال ہو گئی ہوں۔“

تاگواری سے جا بدکھانے اس کے لیے جانے کپ میں ڈال دی، ان کے صحن تھوڑے کونیں نہیں کرنے پر اسے آسپہ پر غصہ بھی آ بار اور خوا خواہ اس سے چڑھی محسوس ہوئی، ساتھ ہی اس نے گن اکھبوں سے ان کے سراپے پر نظر ڈالی، ہلے، ڈنے کپڑے، اٹھتے ہوئے بال، بغیر کپ اسٹک کے کورن کورے ہونٹ، بھڈے کھر درے ہاتھ اور نڈے جھونے بائیں دکھائی دیے، جن کے کناروں پر یوٹیاں پھوٹی ہوئی رور سے نظر آ رہی تھیں۔ اس کا سارا نش کا نور ہو گیا۔

”کتنی بد مشق اور بد ذوق ہے، اپنے آپ کو ڈھنک سے ستوار بھی نہیں سکتی۔“ اس نے مدحزہ ہوتے ہوئے سوجا۔

☆.....☆

اٹھتے دن جا بدکھانے کو جلدی آنٹھ گیا۔ اس نے چنت اور شرت نکال کر خود ہی اسٹری کی اور وہ پہن کر دفتر روانہ ہو گیا۔ آج اس خاتون نے پھر آنا تھا۔ وہ دفتر پہنچ کر بے قراری سے ایک ایک ٹیل سمیٹنے لگا اور جب ایک نئی خوشبو کا جھونکا آ بار نو د جان گیا کہ وہ خاتون آ گئی ہیں۔ آج اس نے درسر الباس پہنا ہوا تھا، بیک کھر کے سوٹ کے ساتھ اس نے سینڈل بھی اسی کھر کے پہنے ہوئے تھی، ہاتھوں پر پائس بھی پنک

سبک اب کیا ہوا تھا۔ اس کے بالوں کا جوڑا بھی خوب  
صورت لگ رہا تھا۔ سفید رنگ کے سوٹ اور دکالے  
رنگ کے سنبھلے سبب اس کا حسن و شباب دو آنسو ہو گیا  
تھا۔ وہ بلبلیاں گرائی ہوئی آئی اور پاسپورٹ لے کر  
ترتیب سے ڈھائی ہوئی چلا گیا۔ اب اس کے بعد اس نے  
تجربے آنا تھا۔ پاسپورٹ اس کے ذمے لے کرنے کے بعد  
جادوہ اپنی سب سے بڑی بات کہہ گیا۔ اس کے دل کی  
دھڑکنیں شور مچانے لگی تھیں اور سارا جسم جلنے لگا تھا وہ  
دیکھتے ہوئے چند بات کے اندر دل پر اترنے لگا۔ وہ گھر  
لوٹا تب بھی وہ انجانائی ہی آگ میں جھل رہا تھا۔ آنے  
ہی اس نے آسہ سے پانی لائے کو کہا۔

آسہ نے فرحت سے بڑھ کر نکالی اور پانی کا گلاس بھر  
کر اس کے کمرے میں لے گیا، جاوید نے اسے گلاس بھر پر  
دیکھے کو کہا۔ جوں ہی اس نے گلاس بھر پر رکھا تو اس کا  
دو چنار برک کر اس کے بازوؤں اور ہاتھوں بھر جو آن کر  
نواں کے ہاتھوں کی پوزیٹوں میں اٹھ گیا۔ اس نے دو چنار  
بواہیں سے چھڑانے کی کوشش کی تو زانی کا گلاس اس کی  
ذمے آ کر فرش پر آن کر اور ٹوٹ گیا۔ آسہ نے اپنے  
ہاتھوں کو دانت پلٹ کر دیکھنے لگی۔ جاوید کا نو ذراغ ہی گھوم  
گیا۔ اس نے ایک زور دار جھڑپا سے اس کے پیڑھے پر  
گازتے ہوئے کہا۔

”جائیں اور بد خبر ہوئے! تمہیں کسی بات کا سلیڈ نہیں  
سے اپنے ہاتھ اور اپنی شکل دیکھو، پھینک لگ رہا ہے۔“  
آسہ کی آنکھیں بھراؤ میں اور دو آنسو ٹپک رہے تھے  
تھی، جاوید نے سبلی باراس پر ہاتھ اٹھا دیا تھا۔  
”جاؤ نکل جاؤ میرے کمرے سے اور مجھے اپنی  
منہوں شکل سے نجات دلاؤ۔“ جاوید ہارازا۔

آسہ روئی ہوئی اس کے کمرے سے نکلی اور سانس  
کے کمرے میں جا کر ان کی گود میں سر رکھ کر رونے لگی۔  
اس کی سانس بھی پریشان ہو گئی، آسہ نے دو دنوں  
ان کو نام بات بتائی۔ تو وہ حیران اور پریشان ہو گئیں کہ  
جاوید کو کیا ہو گیا ہے۔ اس نے بہو پر ہاتھ کیوں اٹھا  
ہے۔ انہوں نے آسہ کو سنبھل دلا سادے کر چپ کر لیا کہ  
وہ جاوید کی خبر لیں گی اور اس سے باز پرس کریں گی کہ اس  
کا ذہن چاکنے بدل کیوں گیا ہے؟ گھر کی بڑھن فضا

کھڑکی تھی اور دن پر طلافی یازیب چمک رہی تھی، آج  
خوشبو بھی تھی۔ جاوید نے دیکھے کر گریں سے اٹھ کھڑا  
ہوا۔ خاتون نے سلام کہا اور نکاح نامہ کی کاپی جاوید کی  
طرف بڑھادی، جاوید نے کاپی وصول کر کے نوکری  
خاتون کی طرف بڑھایا اور بولا۔

”دو دن بعد آپ کو پاسپورٹ مل جائے گا۔“  
شکر بہ کہہ کر خاتون نے مصافحہ کے لیے ہاتھ  
بڑھادیا۔ جاوید نے بھی اپنا ہاتھ بڑھادیا اور پھر وہ خاتون  
چلی گئی، مگر اس کی خوشبو اور اس کے حسین سراپے کا خیال  
دن بھر جاوید کے دل و دماغ پر چھا رہا۔ اس کے گھانٹا  
اور کبھی ہاتھوں کا لمس وہ دن بھر محسوس کرتا رہا۔

وہ پھینکی کر کے گھر پہنچا تو اس خاتون کا سراپا  
ابھی تک اس کے خیالوں میں جما ہوا تھا۔۔۔۔۔ شام کو  
جب اس کی بیوی اس کے لیے چائے لے کر آئی تو  
اس نے اس کے ہاتھوں سے کپ ٹھانے ہوئے اس  
کے کھردے اور دکالے ہاتھوں کی طرف دیکھا تو اسے  
آج بھر چہرہ ہی محسوس ہوئی۔ اس نے چائے کے تھینت  
بھرا اور ڈراؤنی کپ بھر رکھ دیا اور براہ راست بنا کر  
غصہ سے بولا۔  
”کیسی چائے بنائی ہے تم نے۔۔۔۔۔ کبھی ڈھنگ کا  
کام بھی کر لیا کرو۔“

”کیوں کہا ہوا۔ دو دن میں ہی چائے بنائی ہوں  
اور ایسی ہی بنائی ہیں۔“ آسہ نے اپنی صفائی پیش  
کرنے سے کہا۔ ”آج سے پہلے بھی آپ نے ایسی  
بات نہیں کی، آپ تو ہمیشہ میرے گھانٹوں کی تعریفیں ہی  
کرتے رہتے ہیں آج آپ کو کیا ہو گیا ہے؟“

”میں دیکھ رہی ہوں کہ وہ ہے۔۔۔۔۔ آج ہی نہیں چاؤ  
دبا جائے پیٹے کو۔“ جاوید نے اسے لائے۔ دو دنے کہا۔  
شاید اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا، مگر آسہ  
کے من میں شک کا ناگ کھڑکی مار کر بیٹھ گیا۔ جاوید نے  
کبھی اس سے اس طرح بات نہیں کی تھی، آسہ پریشان  
تھا ہوئی، جاوید کا ذہن آسہ سے ڈھکی کر رہا تھا۔

☆.....☆

دو دن بعد وہ ملکہ حسن پاسپورٹ لینے آگئی۔  
اس روز اس نے نکالیا سہنا ہوا تھا، ساتھ ہی بڑھن فضا



آخرت ہاتھ اور پاؤں خوردگی گواہی دیں گے کہ وہ رونا میں کہا کھل کرنے رہے ہیں۔ تو اس وقت آسیر کے ہاتھ بولیں گے کہیں گے۔

”ہم نے اپنے وسائل میں رو کر اپنے گھرانے کو پائے اور میاں کو ناجائز کاٹی لانے پر مجبور نہ کرنے کے لیے دن رات مشقت کی ہے، آسیر کے گھر رہے ہاتھ بچھے ان نازک ہاتھوں سے بہت عظیم اور واقعی گنتے ہیں جو نم لوگوں کی شادی سے پہلے سننے، ہم نے نہ جانے کس کے حسین اور نرم و نازک ہاتھ دیکھ لیے ہیں کہ بیوی کے ہاتھوں سے نفرت ہو گئی ہے۔ یاد رکھو جو ہاتھ کام نہ کر رہے اور نرم و نازک بنی رہیں گے۔ آسیر اب کسا گیا کرے، اپنے ہاتھوں کو سنوارنے کے لیے لوشن، کریمیں وغیرہ خریدے، خوشبوئیں لگائے جاگھر او بچوں کی ضرورت بات پوری کرے۔ آج کے بعد ہم نے اگر سب پر ہاتھ اٹھانا تو میں تجھے بھی معاف نہیں کر رہا گی۔“

ماں کی باتیں سن کر اندر ہی اندر جلدی اپنی سوچ کی پسینی پر پانی پانی ہو گیا۔ اپنی نظیم جون ساجھی کا بزوب کیوں اس کی نظموں میں ماند پڑ گیا تھا۔ اسے یاد آنے لگا۔ وہ بھی سرخ ریشہ اور نرم و نازک تھی جب وہ اسے باہ کر لایا تھا۔ اس نے خود ہی نو سادگی کے بعد اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی جائز آمدن میں بھی گزارا کرے گی اور وہ اپنی اس لیے اس برسوں میں جاہد سے بھی کوئی فرمائش نہیں کی تھی۔ گزارتے وقت کے ساتھ گھر کے اخراجات بھی پڑھنے لگے تھے۔ جاہد کو اس کا انداز وہی رہا تھا، مگر آسیر نے اپنی محنت اور سلیف سے گھر کے فلتے کو ختم کیا ہوا تھا۔ شکوہ کا لفظ بھی اس کی زبان پر نہ آیا تھا۔ جاہد کو اپنی قلمی کا احسان ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا، اس نے لاشعوری طور پر آسیر کا ہاتھ خام بابا اور اسے چومنے بونے آنکھوں سے لگا باور پولا۔

”راہتی کہتے خوب صورت ہیں شہارے ہاتھ جو میری گلگی نسل کو سنیجے میں اپنی آب و تاب کھونٹتے ہیں اور اس میں کوئی تنگ نہیں کر روز فیاضت پر چاند کی طرح چمکیں گے۔“

☆.....☆

میں بھونچال سا کیوں آ گیا ہے؟ کرن ہے جو اس گھر کی دیواروں میں شگاف ڈالنے لگا ہے؟ انہیں کسی پل چھین نہ تھا۔ انہوں نے آسیر کو اپنے پاس ہی بٹھا لیا اور جاہد کا انتظار کرنے لگیں کہ وہ جب ان کو سلام کرنے آئے گا تو وہ اس کی خوب خبر لیں گی۔

جب کافی دیر گزرنے کے باوجود بھی جاہد ان کے پاس نہ آیا تو انہوں نے پونے کر کہہ کر اسے بلوایا، جاہد شرمندہ سا ہو کر ان کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اس پر برس پڑیں کہ اس نے مرد ہو کر ایک کزور عورت اور وہ بھی اپنی بیوی پر کیوں ہاتھ اٹھا ہے؟ لگتا ہے مہر کی وی ہوئی نہ بہت میں کوئی کارہ گئی ہے؟

جاہد شرمندہ سا نکلا جاں چمکا کر بیٹھا تھا اور ماں کی کسی بات کا جواب نہ دے رہا تھا۔ انہوں نے آسیر کو اذہار دے کر اپنے کمر میں بلایا اور اس کے سامنے جاہد سے پوچھنے لگیں۔

”بتاؤ۔ اس کا کیا قصور تھا، صرف ایک شخصے کے گلاس کے ٹوٹنے پر تم نے اس پر ہاتھ اٹھا دیا۔ اس کا قصور صرف یہ ہے کہ اس کے ہاتھوں میں بوئیاں بھرت چکی ہیں، اس کے ہاتھ کھر دے ہو گئے ہیں۔ میں آسیر کو تم سے زہاؤر جانتی ہوں، یہی شہارہ کی بیٹی ہو رہی ہے، شہارہ کے ڈھکے کھکے کی ساجھی ہے۔ یہ کام سے کبھی نہیں گھبرائی، تم دونوں نے حلالی روزی سے گزارا کرنے کا عہد کیا ہوا تھا، آسیر کو زہا پاری اور کزوروی نے گھبرا دیا ہے۔ تمہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ ایک بار پھر شہارے بے بیگی ماں بننے والی ہے۔ اسے اپنی فرصت ہی کہاں ملتی ہے کہ رہے اپنے ہاتھوں اور صلے پر توجہ دے۔ تم بیچاؤ نو سکی، ہمیں وہ نرم و نازک اور سڈول ہاتھ ہیں جن کی تم تعریف کرتے اور ہونٹوں سے لگاتے تھے۔ تم اس کے ہاتھوں کی ہی نہیں اس کے پاؤں کی خوب صبرت کی بھی تعریف کیا کرتے تھے۔ اب تو اس کی پوری، چانو چھریوں کی مسلسل خراشوں اور ویسی صابن کے سوزے کی سختی سے کٹ گئی ہیں۔ ہاتھوں کی سہانی نے ان کا رنگ دودھ لگا ڈالا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ آسیر اپنے ہاتھوں کے کھر دے بن اور سانولے رنگ پر فخر محسوس کرتی ہے۔ جب روز

دردِ گھڑی و شہزادے کے

جاہ پیدرائی

انہوں کی بے امانی کا شکار ایک مہلک شخص کی کہانی

کرتی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ "جی رانی بھائی یہاں؟"  
چوہدری صاحب نے پوچھا؟  
"مجھے دفتر چھوڑ دیں۔" وہ مجھے اور مجید کو سرد  
چمک میں طالع کونسل پلازہ کے باہر اتار کر واپس بلدیہ  
چلے گئے۔

میں مجید کو لے کر اپنے آفس آ گیا۔ ات بٹھا کر  
میں نے اپنے ہیڈر آصف کو گواہ بنانے کا کہہ کر ان  
سے خطاب ہوا۔ مجید ایک بات میری سمجھ سے بالا ہے۔  
تم باہرے نیاز کو اپنا باپ کہہ دے ہو مگر وہ تمہیں اپنا بیٹا  
ماننے سے سراسر انکار کر رہا ہے؟ چندیل وہ میرے دفتر  
کے دروازے پر آ کر کھڑا رہا، چھوڑ میری طرف دیکھتے ہوئے  
بولی۔ "باز جی آپ کو کیا لگتا ہے کہ میں اپنے باپ اپنے  
گھر واپس ماں اور اپنے نہیں بھانوں کو نہیں پہچانتا؟ کیا ہوا  
جو میں اٹھارہ سال تک ان سے دور رہا۔ اس عرصے میں  
مجھے تو اپنے گھر والے بھی سمجھ لوگ بے پناہ اذیتوں میں بھی  
بھولے نہیں۔ اپنے گھر والے اور شے وار جی کر در کے  
رشتے دار بھی مگر تمہیں ہے کہ میرے والد نے مجھے اپنا بیٹا  
ماننے سے انکار کر دیا۔ میں نے شہر کے کسی کروڑ پتی کو باپ  
تو نہیں کہا اور نہ ہی میرا کوئی ایسا چلان تھا اور نہ ہی ہے۔  
مجھے اپنی بد نصیبی پر رونا آ رہا ہے۔ لڑکپن سے آج تک  
بزاروں اذیتوں نے جو نشانہ بنایا، وہ اتنا تکلیف دہ نہیں

بجائے محلے میں بیچے ہوئے نوجوان باہرے نیاز کے  
گھر کے سامنے اکٹھے تھے۔ بابا نیاز کونسل اس بات پر ہند  
تھا کہ تم میرے مجید نہیں ہو سکتے لیکن اب کا کونسل کر رہا تھا  
کہ "ابا جیے پچانو، میں ہی تمہارا کچا ہوا بیٹا ہوں۔"  
میں نے غور سے اس شخص کا جائزہ لیا۔ روڈوں  
آکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ سر کے سارے بال سفید  
ہو رہے تھے۔ جسم استخوانی پنجر کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ ہنسنے  
پر اسے کپڑے، چوڑوں میں ٹوٹا ہوا جوتا۔ ہار باران کا تکی  
نقشا اور باہرے نیاز کا وہی فقرہ کہ "جاہ جاڑا پنا کام کرو۔"  
میں نے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے یہی مناسب  
سمجھا کہ کسی طرح باہرے نیاز اور آفس میں شخص کو کر کے ایسا  
موقع فراہم ہو جائے کہ یہ دونوں علیحدگی میں بات چیت  
کر سکیں، مگر لوگوں کے اس جھوم میں یہ ممکن نہیں لگ رہا  
تھا۔ بلدیہ کے اٹھینٹر چوہدری صاحب، جو میرے ہمراہ  
علی پور محلے کی اسٹریٹ لوکیشن دیکھنے آئے تھے، اپنی  
سرکاری گاڑی میں بیٹھے میرے واپس آنے کا انتظار  
کر رہے تھے۔ میں نے جھیل کو بناتے اس شخص کو بازو  
سے پکڑا اور گھسنے کے ساتھ انہیں، جب کی طرف لے  
آیا۔ پچھلے دروازے کھول کر اسے اندر بٹھا یا اور خود چوہدری  
صاحب کے ساتھ اٹلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے انہیں چلنے کا  
کہا۔ درجیچے بیٹھا اپنے آپ سے ہنس کر رہا تھا جس کی

پڑھتے تھے۔ چھوٹی سی ٹھیکلی کی گزراوقات براے اچھے طریقے سے ہورہی تھی کہ اچانک مجید گھر سے غائب ہو گیا۔ بہت تلاش کیا گیا مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا، بالآخر اس کی جدائی کا غم آہستہ آہستہ بٹا ہوتا گیا۔ اس روتے روتے اندھی ہو گئی اور نیاز کی کمر بستی گم سے جھک گئی۔ وہ نیاز سے بابا نیاز بن گیا۔ آج اٹھارہ سال کے بعد یہ شخص جو خود کو مجید بتا رہا تھا، جب اسے گھر پٹا تو اس کا باپ اس کو اپنا بیٹا ماننے سے انکار کر گیا۔

میں نے پھر مخاطب کیا۔ ”مجید تم اتنی مدت کہاں رہے؟“

”میں اس وقت اپنے آپ میں نہیں ہوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنے ساتھ ہونے والے سارے حالات سے آپ کو ضرور آگاہ کر دوں گا۔“ مجید نے چائے ختم کر کے کپ واٹس نیٹیل پر لکھتے ہوئے کہا۔

”اب تمہارا اچھا پروگرام کیا ہے۔ تمہارے گھر

تھا، جتنی اذیت اور کرب کا سامنا مجھے اپنے گھر کے باہر مجھے باپ کے انکار پر کرنا پڑا۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ میں نے اٹھ کر اسے دلاس دیا، اسے میں آصف نے جائے کا کپ اس کے ہاتھ میں دیتے دیتے دیکھ نہ سکتے میری طرف دیکھا، جسے میں نے اشارے سے باہر جانے کا کہا اور دوبارہ مجید کی طرف متوجہ ہو گیا، جو اپنی ٹھیکلی آستین سے اپنے آنسو پونچھ رہا تھا۔

بابے نیاز کا بیٹا اٹھارہ سال قبل جو پانچویں کلاس میں پڑھتا تھا، آٹھ گھنٹہ سا گورا چننا، تیز طرار اسکول گیا، پھر واپس نہ آیا۔ باپ جو حجام تھا اور محلے میں ہی کرسی میز رکھے حجام بنانے کا کام کرتا تھا اور ساتھ میں چکوائی بھی۔ اسے روز کوئی نہ کوئی ویک پکانے کے لیے مل ہی جاتی تھی۔ بابے نیاز کی دو بیٹیاں اور مجید سمیت تین بیٹے تھے۔ دونوں بیٹیاں اور سب سے بڑا بیٹا شادی شدہ تھے، جب کہ مجید اور اس سے چھوٹا شید پانچویں اور چھٹی میں



بالے تو تمہیں قبول کرنے سے صاف انکار ہی ہیں، بس ار پر والے کا سہارا تو نہیں چھوٹا، دراز نے نا اپنے مسکین بندوں پر کرم کرنے والا۔ اگر آپ مہربانی کر رہی ہو مجھے کام کاج پر لگوا دیں۔"

میر نے سٹوا آکر گہرے کے ذرا کینڑ صاحب سے فون پر مجید کے ساتھ ہونے والی ساری صورت حال بیان کی تو انہوں نے ان کو گھبت پر دروسے سکھائی گاڑ ڈکے رنگ میں شامل کر لیا۔

مجید کی مدد کر کے جہاں مجھے ذہنی سکون ملا وہاں بابے جہاز کی بے نیازی پر بہت افسوس ہوا۔

اسی روز ان میں کچھ دفت کے لئے کسی کام کے سلسلے میں غنائی لینڈ چلا گیا۔ مہرئی دابھی کوئی دریا کے بعد ہوئی۔ پاکستان آکر پتھر میں اپنے روزمرہ گھر کے کاموں میں اُلجھ گیا۔ ایک دن جب میں گاڑی بند کر کے گھر کے گیٹ کی طرف آ جاؤ گھبت کا چھوٹا روزمرہ کھولنے والا مجید تھا، جس نے ہاتھ میں گن پکڑی ہوئی تھی۔ دو رجب سے ملنے با ہوا تھا۔ مجید کی حالت پہلے سے خاصی درست ہو چکی تھی، پھر خیریت کے بعد میں نے اس سے بابے جہاز کی بابت پوچھا تو اس نے بلائے ڈکے مہرے لکھ میں جواب دیا۔ "صاحب جی! کہا لہنا رچا ہے، ابسے مال باب اور بکن بھائیوں سے، جن کے ہونے ہونے میں الارامت ہوں۔ اللہ بھلا کرے آپ کا جنہوں نے مہرے سارے گھاڑ بھر دیے ہیں۔ وہ میرے ساتھ آفس تک آیا اور بھر دابھی چلا گیا۔

چوہدری صاحب سے فارغ ہو کر میں واپس جانے ہوئے مجید کے پاس چھبرا اور اسے اس کا وعدہ یاد دلا با۔ اس نے چٹھنی والے روز میرے آفس آنے کی حالی بھری۔

دو تین دن کے بعد میں آفس میں بیٹھا کام میں مصروف تھا کہ مجید نے اندو آنے کی اجازت لی۔ میں نے خوش دلی سے اسے بیٹھے کا اشارہ کیا۔ رسا خیر خیر بہت میں اس نے بتایا کہ وہ بکٹری میں ہی رہنا تھا۔ چٹھنی کے بعد اس کا زیادہ دفت سٹوا کے خیر الی اسپتال اور مسجد میں گزارنا تھا۔ کھانے پینے کی پروا نہیں تھی۔ فوار رو اپنی دیگر ضروریات پر خرچ کر رہا تھا۔ ادر ادر کی

بائوں کے بعد اس نے میرے کہنے پر اپنے ساتھ بیٹھے واقعات بول شروع کیے!

"اسی کم لا کلا، میں مہرے نچر سلطان سلیبی تھے، جن سے میں ناچو نہیں کلاس میں گزرد ہونے کی بنا پر رہا مگر چند لوگوں کے ہمارے چٹھنی کے بعد سینی یاد کرنے کے لئے ڈک جاتا تھا۔ وہ گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی کر دہی لیا کرتے تھے۔ اپنی بد چٹھنی کے آغاز سے بے خبر سلیبی صاحب کے گھر کے لئے سہزی منڈی سے ان کی بنائی چیزیں خرید کر وہاں آ رہا تھا کہ وہ آدمی جو زالہ نا جب میں بیٹھے ہونے لگے، نے مجھے دک کر مجھ سے سینی گھر کا پنا پوچھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے ان کو سمت بتائی تو ایک نے کہا کہ "بنا آپ بیٹھو، ہم آپ کو چھوڑ دیتے ہیں۔" میں جھٹ سے کچھ بھی سوچے پتھر جب کے چھٹے حصے میں بیٹھ گیا، جہاں ان کا ساکھی چھپے موجود تھا۔ جس نے پچھلا دروازہ بند کرنے کی پتھر پوچھ لیا۔ ان سے پہلے کہ میں کچھ مزاحمت کرنا، مگر کوئی تفریق کی بوجہری تاک میں کھس گئی اور مجھے کچھ خبر نہ دی کہ میں کہاں ہوں۔ جب مجھے ذہن آ یا تو میں گھب اندھیرے میں کھسے فرش پر رہا ہوا تھا۔ مہرئی دابھی اکڑا ہوا تھا اور سر تھا کہ مجھے کسی نے من پھر کا پتھر میرے سر پر باندھ دیا ہو۔ آہستہ آہستہ کر کے سارے حالات مجھے یاد آنے لگے، میں انورا ہو چکا تھا۔ بولی مشکل سے میں نے خود پنا یاد پایا۔ اندھیرے میں ادر ادر حزن نزلنے، دو باروں کا سہارا لے کر کھڑا ہوا اور دو بار ہی کے سہارے آہستہ آہستہ رینگ کر بند دروازے تک پہنچ گیا۔ پورا کمر تار کٹی میں زرد ہوا تھا، کسی طرف سے بھی کوئی درختی کی کرن اندر نہیں آ رہی تھی، بازو ات کی تاریکی تھی با کمرہ ہی ایسی جگہ پر جا رہا تھا جہاں درختی کا نام نشان تک نہیں تھا۔ مجھے اپنی بد چٹھنی پر بے اختیار دانا آ گیا۔ گھر والے یاد آ گئے، مگر اب کہا ہو سکتا تھا۔ مجھے تو یہ بھی خبر نہیں کہ میں کتنے دن بعد ہوش میں آیا۔ کانی روبر ہو چکی تھی، ہاچک مہرے کانوں میں قدموں کی چاپ ستانی رہی، شاید کوئی ادر ہرنی آ رہا تھا، پھر باہر کی کاندھی تھلی۔ روز وہ کھٹنے پر بھی اندھیرا تھا۔ ڈر کے مارے مہر ا پورا ادر ادر پھر کاپ رہا تھا۔ آنے والے نے مجھے اس طرح دکھ لیا جسے ان کی آنکھیں



اپنے گلے میں لٹکانا بھول چھوڑتے تھے وہمکنی دی۔ جلدی جلدی سے کہا ہاشم کرد، پانی آتا ہوں یہ کہنے ہی وہ پھر دابہں چلا گیا۔ اس بار اس نے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔

میں ٹھنڈی سانس بھرے بھرے کھانا زبرداری کر کے لگا، ساتھ ہی مبر سے دل دو ماخ میں طرح طرح کے سوسے سر اٹھا رہے تھے، مگر میں بے ہمت کر بھی کیا سکتا تھا۔ دروازہ پھر بند کر دیا گیا تھا۔ میں اب اس ماحول میں خودزاد خودزاد کو ہانوس کر چکا تھا۔ یہاں رہتے ہوئے بھگت کنی دن ہو گئے تھے بہت سارے لوگ آئے، مجھے دکھا گیا، شاید ہر اسودا نہیں ہو رہا تھا، پھر آخر کار ایک پادری کے سر اٹھے کر دیا گیا۔

جس جگہ مجھے لایا گیا تھا، ان کے چادروں جانب فلک بوس پیاز ہی پیاز تھے۔ چھوٹی چھوٹی آبادیاں او، تھوڑے تھوڑے گھر تھے۔ میرے نئے مالک مجھے جیب میں بٹھائے ہی سفر تھے۔ دن دو بجے سے چوٹی زد وادگ مجھے لے کر ایسے مقام پر آ گئے جہاں بہت ہی بڑی بڑی مٹیئیں پتھر کے کوزے و زور زور کرنے میں مصروف تھیں اور کئی چوٹے بڑے لوگ وہاں پتھر اٹھا کر مٹیئیں میں زائل رہے تھے، کئی نے میری طرف توجہ نہیں کی۔ بس اپنے اپنے کام میں مگن ہوئے تھے۔ جیب چلانے والے خان نے اپنے ساگی کو اپنی زبان میں کچھ کہا تو اس نے مجھے نیچے اڑنے کا اشارہ کیا۔ میرے اڑنے ہی جیب آگے بڑھ گئی۔ وہ مجھے لے کر بڑا سا جگر کاٹ کر مٹیئوں والے حصے کو کھینچے جوڑتا چوٹی نما بڑے سے گھر کے دروازے پر آ گیا۔ اس نے باہر کھڑے کھڑے کچھ کہا اور اندر سے ایک سٹخ خان نے دروازہ کھول دیا۔ وہ مجھے اس کے سپرد کر تا دیا میں پلٹ گیا۔ اس نے میرا ہاتھ جوازہ لیتے اندر سے پھر کٹھنی پر نہالی اور سر کے اشارے سے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

اندھا آدمی نے چادروں جانب کا جوازہ لیا۔ چار دیواری کے ساتھ ساتھ گہری کھائی بنی ہوئی کسی اور دیوار سے بہت کم پورٹی لائن میں چھوٹے چھوٹے گھر کے تھے اور دو سٹخ پیرے دار ادر ادر گھر کم رہے تھے۔ مجھے ان دوڑوں کے سپرد کرنے دو اب میں پلٹ گیا۔ گہری خاموشی کئی پورے ماحول پر۔ کوئی نہیں بندھے دوڑے بڑے

اندر جبرے میں بھی دیکھ سکتے کی طاقت رکھتی ہوں، کیوں کہ اس کا ہاتھ میرے بازو پر رکھا۔ اس نے بے دردی سے مجھے پکڑ کر اٹھا اور گھٹینا ہوا کرے سے باہر لے آیا۔ یہ کوئی راجداری تھی خاصی طویل، جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے، لیکن ملکی درستی کا احساس ہو رہا تھا، پھر ایک بڑا سا دروازہ آ گیا۔ جس کے اوپر سڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ اب میری سمجھ میں اندھیرے کا مطلب آیا۔ وہ گھر زمین دوز بنا گیا تھا۔ چند میڑھیاں عبور کر کے میں اس آنے والے آدی کے ساتھ ایک دروازے کو عبور کرتا کھلے آسمان کے نیچے پہنچ گیا۔ وہ آدی وہی تھا جس نے جیب میں مجھے کچھ سٹھکا دیا تھا اور میرا سے ہوئی ہو گیا تھا۔ دو کوئی بڑا ارباب تھا۔ چادروں جانب کچھ والان اور اونچا اونچا بنی دیواریں اور آخری کرنے میں خاصا بڑا گھر بنا ہوا تھا اور گھر کے باہر کچھ لوگ چار بانہوں پر موجود تھے۔ وہ مجھے گھٹینا ہوا دیاں لے آیا، سامنے وہی دونوں جیب والے، جن کی ہاتھوں میں آکر میں جیب میں بیٹھ گیا تھا، بلکہ چار لوگ اور تھے۔

دو چادروں میرا لیے جانزور لے رہے تھے جسے میں کوئی قربانی کا جانور ہوں، پھر ان کے سر ملانے پر دونوں نے اسے اشارہ کیا جو مجھے وہاں لایا تھا۔ وہ مجھے پھر گھٹینا ہوا اسی طرف لے آیا اور دروازے کے اندر داخل کر باہر سے بند کر تان کے پاس پلٹ گیا۔ دروازے کی جھری سے باہر کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا، حالانکہ وہ فاصلہ اس جگہ سے دور تھا، مگر دو لوگ صاف دکھائی دے رہے تھے۔

مجھے یقین ہو گیا تھا کہ لوگ ترکاٹھے اور یہوں کو انوا کر کے خرید و فروخت کا وعدہ کرتے تھے۔ گھر کے اندر سے ملازم کھانے کے برتن باہر لائے دکھائی دیے تو میری جھوک پھر سے جاگ اٹھی۔ جب دو کھائے تو وہی آدی جو مجھے نیچے سے اوپر لایا تھا۔ میرے لیے بچا ہوا کھانا اٹھانے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا کہ پورا کھانا لیتے زمین پر بیٹھ گیا۔

دروازہ کھلا اور کھانے کے برتن اس نے میری طرف کرنے ہوئے کہا کہ کوئی ہوشیار نہیں کرتی، یہاں فرار ہونے کا دوسرا نام موت ہے یعنی گولی۔ اس نے

گوئیوں سے چھٹی کر ڈالا کہ دو ایسے گھر والوں کو یاد کر کے آسو بہا رہا تھا۔ اس کی لاش سارا دن ہماری آنکھوں کے سامنے بڑی سڑتی رہی، شام کو اس لاش کو اٹھوا کر گہری کھائی میں گرا دیا گیا۔

میں تمام رات خوف کے مارے سو نہ سکا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہم سب کے سامنے کیا گیا کہ ہم عبرت پکڑیں۔ پہاڑ بڑے خان کی ملکیت تھے اور ان کو توڑ توڑ کر شیٹوں پر کرکٹ بنا کر ایک جگہ ختم کر دیا جاتا، پھر کرکٹ کے خریدار ایسے ٹرکوں میں بھر کر شہر لے جاتے، اس بڑے زحیر کے قریب کرکٹ کو شہر لے جانے والے ٹرک کھڑے ہوتے تھے، وہاں کسی کو جانے کی نہ اجازت تھی اور نہ ہی کوئی اس طرف منہ کرتا تھا۔ جن ٹرکوں میں مجھ جیسے غمو کر کے لائے ہوئے لوگ رکھے جاتے تھے، ہر دوسرے تیسرے روز ان کو اول بدل کیا جاتا تھا، کہ ہم لوگ آپس میں کوئی اتفاق واسطہ نہ بنا سکیں۔

”مجھ نہیں کوئی اندازہ ہے کہ وہ مقام کہاں تھا جہاں یہ خزا کرکٹ بنایا گیا۔“

”راہی صاحب! میں سلسل 22 دن تک پہاڑوں اور دروں میں بھٹکتا پھرا۔ اگر میں جا کر تلاش بھی کرنا چاہوں تو نہیں جا سکتا وہاں۔“ اس نے پہلو پر لٹے جواب دیا۔

”اس خوف ناک جنم میں بچے رکاتے سات سال بیت گئے۔ دل نے فیصلہ کر لیا کہ اب یہی گھر اور یہی قبرستان بنے گا، مگر اس جنم سے فرار ہونے کا جذبہ دل میں کبھی بھگا جاگ نہ آتا، لیکن اس فرعون کے خوف سے میں سختی سے اپنے دل کو اپنے بس میں کر لیتا۔“

ایک دن ساج بہم ٹرکوں سے اتر کر بیچا رکرنے کا سفر طے کر کے کھپ پینچ (میان میں تاج چلوں کہ ٹرک ہمیں جہاں آتے تھے، وہاں سے پہاڑ کی کھائی چڑھ کر دوسری جانب نیچے اتر جا جاتا تھا، کیوں کہ ٹرک آگے نہیں جا سکتے تھے۔) پینچے پینچے تو ہمارے سامنے گھوگا خان کی بجائے ایک ایسا ٹھرا پنجان، جس کا نام بعد میں معلوم ہوا پچھو شان تھا، کو کھڑے پایا۔ جس نے بتایا کہ گھوگا خان جج کی سعادت پر گیا ہے، اس کے آئے تک پچھو اس کی جگہ زینت کرے گا اور سارے لوگ

کتوں نے سر اٹھا کر دیکھا اور دو بار وہی پوزیشن میں دوڑا ہو گئے۔ گردن کے دو داڑھے باہر سے بند تھے۔ ایک بندر دوڑا دکھولنے ہوئے مجھے اس نے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اندر چھائی پر چار لوگ بیروں میں لوہے کے کڑے ڈالے دیوار میں پوسٹ کنڈوں کے ساتھ منگھوں میں جکڑے ہوئے پڑے تھے۔ ایک سنگھل کے ساتھ میری ٹانگ بھی باندھ دینی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں بیچوت پھوٹ کر دوڑ پڑا۔ چاروں نے مجھے دلاسا دیا اور ہمت سے دن کاٹنے کا مشورہ دیا۔

دوسرے دن مجھے بھی دیگر لوگوں کے ساتھ بڑے سے ٹرک میں سوار کر دیا گیا۔ ٹرک جو آگے پیچھے چل رہے تھے، دونوں میں سٹا پیرے دار گن تھاے ٹھرائی پر مامور تھے۔ کافی دیر کے سفر کے بعد ٹرک پہاڑوں کے درمیان رُکے۔ وہاں بڑی بڑی ڈرکریاں اور کدواں پڑے تھے۔ مجھے بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ جن میں میری عمر کے کم ہی لڑکے تھے، کام پر لگا دیا گیا۔ نو ٹرکوں میں پتھر بھر کے ان لوگوں کے سروں پر رکھوانے کے لیے اور پتھر جو پہاڑ توڑ کر ابھر اُدھر بکھرے پڑے تھے، اپنی ہمت کے مطابق اٹھا اٹھا کر بڑے زحیر میں جن کرنے کے کام پر لگا دیا۔ ذرا سا تھکات کا احساس ہوتا یا کام میں سستی آتی تو ہم پر جلاؤ مقرر تھے، مار مار کر لیو لہان کر دیتے۔ دوپہر کے کھانے میں پانی کی طرح دال اور بڑی بڑی باجرے کی روٹیاں اور تالاب میں بھرا کڑوا پانی ملا، جو بڑی مشکل سے حلق سے نیچے آتا۔ پھر آہستہ آہستہ میں اس کا بھی عادی ہو گیا۔ کام کے دوران ہارات کو ایک دوسرے سے بات کرنے کی سختی سے پابندی تھی۔ اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرتا تو اس کے ساتھ ہونے والے تشدد کو دیکھ کر دو بار کوئی جرأت نہ کرتا۔

گھوگا خان، سارے ملازمین اور وہاں کام کرنے والوں کا سرخ تھا۔ اس کا راج اور حکم چلتا تھا۔ اس خزا کر کھپ پر اگر بڑے خان کا ملازم بھی کوئی گڑبگ کرتا تو اس کی چرخی ادھر جالی اور گھوگا خان سے بڑے خان صاحب بھی کوئی جواب طلبی نہ کرتے کہ جو بھی اس نے کیا ٹھیک کیا۔ وہ اس بلا کا سنا کہ اس نے صرف اس بات پر کہ ایک انما ہونے والا پنجان لڑکا سب کے سامنے

کان کھول کر سن لو۔ اگر روشن کے قانون کو کسی نے توڑنے کی کوشش کی تو اس کا انجام سزا نہیں بلکہ سزائے موت ہوگا۔ اب کام پر لگ جاؤ۔ اس کا بچہ سردار سناک تھا۔ میرے سر پر پتھر سے بھرا ٹوکرا تھا کہ میرا پاؤں پھسل گیا، میں ٹوکرے سمیت لڑکھڑاتا دوڑ تک لڑھک گیا۔ بس کیا تھا کچھ خان نے اپنا ہید اس وقت چھوڑا جب تک وہ میرے جسم پر رہتے پرستے ٹوٹ نہ گیا۔ سردار سناک جسم خون سے لٹ پت ہو گیا، مگر اس بے رحم دروہم نے آہ میں نے بے بسی سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے دعا کی۔ یا اللہ مجھے موت ہی دے دے تاکہ میں روز کی موت مرنے سے ایک باہری قسم ہو جاؤں۔ میں اسکی حالت میں سردار دن کام کرتا رہا۔ تکلیف کی شدت کے باوجود منہ سے کوئی حرف شکایت نہ نکلا۔ مجید اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کو یاد کر کے سسک اٹھا۔ میں نے اسے دلاسا دیا۔ اسی اثناء میں جیڑمین پر بس کلب کا فون آ گیا کہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں ذرا کلب آؤ، میں مجید کو کھانا وغیرہ کھلانے کا کہتے آؤں سے نکل کر پرسن کلب چلا آیا، تقریباً دو گھنٹے بعد میری والدہ بسی ہوئی، اس وقت مجید باز دم ہوا بیٹھا تھا۔

ہاں جی شروع کریں جہاں سے سلسلہ ہونا تھا۔ میں سردار دن کی حالت میں پتھر اٹھاتا رہا۔ مجید نے مجھے یاد دلایا میں پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ سب کچھ میرے ہی ساتھ نہیں ہوتا تھا، بلکہ روز کسی نہ کسی کی شامت آتی تھی۔ رات بھر میں بخار میں جلتا رہا۔ جب مگر اس نے دوسرے ستم رسیدہ دوستوں کے ساتھ مجھے سنگھ سے آزاد کیا تو مجھ میں سکت نہیں تھی اٹھنے کی، پانہیں اس درد نے مگر اس کو کیا ہوا، دم نام کی چیز تو میں نے اتنے عرصے سے اس میں نہیں دیکھی تھی، مگر اس نے مجھے دوبارہ مشکل میں مبتلا کر دیا اور باقی ساتھیوں کو لے کر وہ باہر نکل گیا۔ یہ پہلا موقع تھا اس ہا کر وہ گناہ کی پاداش میں قید کا جو کسی انسان کو انسان پر ترس آتا تھا۔

کوئی دو گھنٹے بعد وہی خان، جس کا نام ٹار خان تھا، آہ اس کے ہاتھ میں چائے کا گلاس اور اس کے علاوہ بخاری گولیاں بھی تھیں جو اس نے میری طرف بڑھاتے ہوئے ناشتہ کر کے روا کھانے کی تاکید کی اور چلا گیا۔

دو پہر کو ٹار خان نے آ کر میرا سال دریافت کیا جو تھوڑا سا بگڑ ہوا تھا، پھر مجھے کھول کر سہارا دیتے لے کر باہر آ گیا۔ میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ مجھے لے کر بڑے خان کی بیٹھک پر آ گیا۔ ہمیں حکم تھا کہ نظر نیچی ہی رکھیں یہاں نہیں اٹھنی چاہیے۔ ڈر کے مارے میرا برا حال تھا۔ بڑی مشکل سے خود کو اپنی ٹانگوں پر کھڑا کر رکھا تھا۔ بڑے خان نے ٹار خان کو اپنی بولی میں کہا کہ اسے ٹھیک ہونے تک اپنی عمرانی میں اپنے پاس رکھو۔ اتنا عرصہ ہو گیا تھا ان لوگوں کی قید میں رہتے ہوئے ان کی زبان کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی تھی۔

ٹار خان مجھے سہارا دیتے ہوئے ان کمروں کی طرف لے آیا جس میں مگر اس رہتے تھے۔ تین دن تک میں وہاں ان کے کمرے کے کونے میں بڑا رہا، صرف مطلب کی بات ہوتی تھی مجھ سے، وہ نہ لیں لگتا جیسے اس کمرے میں میری حیثیت بھی کسی بے باق چیز جیسی تھی۔

جب میں کام کرنے کے قابل ہو گیا تو بڑے خان نے مجھے اندر زبردے کے کام کاج پر مامور کر دیا۔ یہاں یہ فائدہ ہوا کہ میں ہر ہفت کی مار پھینکا رہتا تھا۔ یہاں بھی کام کاج مشقت سے کم نہیں تھا۔ رات گھنٹے دوسرے روز کام کرنے والوں کے ساتھ گزارتا۔ رات کو جس جگہ ہم تھیں سوتے تھے، وہ کمرہ ہر لحاظ سے ایسا بنایا گیا تھا کہ اس سے باہر والے کی مرضی کے خلاف باہر سے نہیں نکلا جاسکتا تھا۔ کمرے کی چھت تقریباً 25 فٹ اونچی، چھت کے ساتھ دو چھوٹے چھوٹے رشتہ دار اور باہر آنے جانے کے لیے صرف گھڑی کا بھاری دروازہ،

زمین پر چٹانیاں اور پانی کا گھڑایا کونے میں ہنا زمین دوز بڑا سا کٹواں، جس کے اوپر بڑی سی پتھر کی بس بڑی تھی اور درمیان میں سو داغ تھا، جو کہ فرخ حاجت کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اور بس۔ یہاں اتنا ضرور ہو گیا کہ ہم تینوں آپس میں بات چیت کر لیا کرتے تھے۔ اس خراک بہتی میں اغوا شدہ تھوڑے ہی لوگ تھے، زیادہ تر خرید و فروخت یا ایڈوائس کے نام پر تاجو کیے لوگ، جن کی زندگیوں میں اپنا زوں اور مشینوں کی نذر ہو چکی تھیں۔

میں بچپن یا نو عمری، پھر جوانی کی حد سے بے نیاز دن رات اور سال گزارا جو اس جہنم میں اغواویں

ٹرک سے اقبال چیک پوسٹ پر اتار کر ٹرک آگے جانے دیا جاتا اور ٹرک پر مال لوڈ کرنے والی ٹوٹی ٹنٹ سے آجاتی۔ اگر کسی ٹرک پر سوار ہوا بھی جاتا تو پکڑے جانے کا زیادہ اندیشہ تھا۔ آخر کار میں نے فیصلہ کر لیا کہ جو ٹرک دوپہر کے بعد نکلے گا، کیوں کہ دو شام تک مشکل سے بھرا جاتا تھا، میں نے اسی میں فرار ہونے کا پروگرام ذہن میں رکھا۔ کئی ماہ تک میں چوری چھپے بھر جانے والے ٹرکوں کا جائزہ لیتا رہا، تاکہ کبھی اور کس طرح فرار ہونے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ پکڑے جانے کا مطلب موت تھی اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آزادی یا پھر موت۔

آج صبح سے موسم خراب تھا۔ پہاڑوں پر دھوپ بھی بہتو، ماحول پر دھوپ چھاؤں جیسا ہی گمان دکھائی دیتا ہے۔ صبح والے ٹرک لوڈ ہو کر جا چکے تھے، اب گلنے والا بڑا فرار تھا، جسے ذیل لیبر بھرنے میں مصروف تھی۔ میں دھڑکتے دل سے اس بات اور لمحہ کے انتظار میں تھا کہ کب لیبر فارغ ہو کر اپنی ٹوکریاں اور کرش اٹھانے والے کدو لے کر ٹرک سے نیچے اترتے ہیں۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ ٹرک بھر چکا ہے اور لیبر اپنا کام ختم کر کے پھٹی کرنے والے ہیں۔ میں نے ذریعے پر آخری نگاہ ڈالی اور سب لوگوں کی نظر بچا کر ادھ کھلے گیٹ سے باہر نکلا۔ آپ میرا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا کہ ابھی اچھل کر باہر آن کرے گا۔ مجھے گیٹ سے پھٹی جلدی ہو سکے، وہ حد عبور کر کے مشینوں کے پیچھے اڑے جانا تھا۔ وہاں سے ٹرک پر چڑھ کر کہیں کے ادھر والے حصے میں جہاں ٹرک کا ٹول اور بال بسز، غیرہ ڈرائیور رکھتے تھے، تک جا اور چھپنا تھا۔ میں تیز تیز چھپنا ہوا چھپتا چھپاتا اس جگہ تک پہنچ گیا، جہاں ٹرک کر میں نے ٹرک گزرنے کا انتظار کرنا تھا، یہ تھا بل جو نیچے کو جاتی تھی، یہاں تک ٹرک کی اسپینڈرل رہتی، جس میں صوبہ تھا، اُن تک کر چھپنے سے ٹرک پر سوار ہونے کا۔ میں سانس روکے چاروں جانب کا جائزہ دینی لے رہا تھا، ابھی تک قسمت مہربان ہی چلی آ رہی تھی کہ میرے ذریعے پر سے غائب ہونے کا کسی کو شکھی نظر نہیں ہوا تھا، پھر ٹرک اسٹارٹ ہوا، میری سانسیں تیز تیز چلنے لگیں، ٹرک میرے قریب سے گزرا اور میں پوری قوت صرف کرتے ہوئے اس

سال میں پہنچ گیا تھا۔ اس دوران بڑے خان فوت ہو گئے۔ سارا نظام بڑے خان کے بیٹے طارق خان، جسے کڑھو خان کہا جاتا تھا، کے سپرد ہو گیا۔ اس کا دل شاید اپنے آبائی کام میں زیادہ خوش نہیں تھا۔ اس لیے کئی لوگ، جن کے درہا، نے بڑے خان سے ایذا دہش رقم لے کر اپنے بچوں کو یہاں کام پر لگا رکھا تھا، کو وہاں ان کے درہا کے حوالے کر دیا۔ پہلے کبھی ذریعے پر اتنی آزادی نہیں ہوتی تھی۔ اب کبھی بھار کوئی بیوپاری کڑھو خان کے ساتھ ذریعے پر کاروباری معاملات کے سلسلے میں آ جاتا تو کب شب اور صبح میلہ رات گئے تک جاری رہتا۔ میری خوش قسمتی یہ تھی کہ اب میں ذریعے کا با اعتماد آدمی تھا۔ باہر آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی، کیوں کہ ہفتادہ سال کے لیے غرض سے نے اور کبھی بھی نہ بھانسنے والی شکاریت نے میرا اعتماد کڑھو خان پر بحال کر رکھا تھا، مگر آزادی کا خواب اور اپنے والدین، بھائی، بہنوں، پارہ دوستوں کی جدائی کا زخم ہر لمحہ ہمارا پتلا تھا۔ باہر سے آنے والے ٹرک، جن پر کرش لوڈ ہوتی تھی، وہ جگہ ذریعے سے زیادہ دور نہیں تھی، کیوں کہ پتھر مشینوں پر کرش ہونے کے بعد بڑے ذریعے پر جمع ہوتا رہتا تھا اور ٹرک ادھر ہی رکھتے، ادا چکی کرنے کے بعد دو لوگ جو یہاں ملازمین کی مدد میں کام کرتے تھے، وہ ٹرک میں کرش لوڈ کرنے کا کام سرانجام دیتے۔ دو لوگ ہماری طرف نہیں آتے تھے، کیوں کہ وہ آتے ہی سخت پابندی تھی۔

میرے ذمے کڑھو خان نے اپنے کتوں کی دیکھی بحال بھی لگا دی تھی۔ بڑی جلدی اور خوشنواہر گدی تھے، جن کی آنکھوں میں ہر وقت خون اُزارا رہتا تھا، میرے کہنے کا میں آتے۔ جب میں کتوں کو لے کر باہر گھمانے جاتا تو میرا گزر مشینوں والے حصہ کی طرف ہوتا۔ وہاں کام کرنے والے لوگوں سے میری جان بچان بھی ہوتی تھی۔ ٹرکوں پر لوڈ ہوتی کرش کو دیکھ کر میرے اندر اس جہنم سے فرار ہونے کی خواہش دن دن مضبوط ہوتی جاتی تھی۔ میں فرار ہونے کی راہیں تلاش کرتا رہتا۔ ٹرک کے اوپر کرش لوڈ ہونے کے بعد ٹرک واپس شہر کی طرف جاتے۔ کڑھو خان کی حد وہ گراں کرتے، دقت لوڈ مال کے ناپ تول کا بھی جائزہ لیا جاتا۔ اگر مال کی پیمائش زیادہ ہوتی تو



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)

پر پہنچ کر اس وقت کا انتظار کرنے لگا کہ کب اس کی رفتار کم ہو اور میں بچے کو دو جاؤں، شاید آگے کوئی موڑ آ رہا تھا۔ ٹرک کی رفتار تھوڑے سے کم محسوس ہوئی تو میں جھٹ سے پیچھے والے حصے کو چلا کر ٹرک گھما دو چلا گیا لگاؤں۔ گرنے سے مبرے وڈوں باتوں کی ہتھیلیاں اور گھٹنے برنی طرح سڑک پر گرے گئے، مگر میں سڑک پر بے حس و حرکت اس وقت تک ای پوزیشن میں بیٹھا رہا جب تک ٹرک کافی دور تک نہ نکل گیا، پھر اٹھنے ہی میں نے دور تک پیچھے نظر دوڑائی چدر ٹرک کا ڈنڈا تھا پیازوں کی چیز حسانی چڑھنے دوسری طرف آ گیا۔ جاووں جانب نوکا عالم تھا، جنگلی جانوروں کا خوف ایک دم میں دہشت شائع کیے بغیر دوڑ پڑی اور جھما پوں میں الجھنا آگے بڑھ رہا تھا۔ کبھی کبھار کوئی پرندہ یا گبڑ وغیرہ دہاتا تو میں ہم جاتا۔ نہ کوئی راستے کی خبر نہ منزل کا پتہ، بس چلا ہی جا رہا تھا، چدر راستہ جاتا اور چیل پڑتا۔ رات کی ۱۲ بجے بھر وہی تھی اور وہاں سے کاکولی کلم نہیں تھا، ایک اونچے درخت پر چڑھ کر میں نے رات بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

پہلے چلنے کے باعث نائلیں پھوڑے کی مانند تھک رہی تھیں اور بھوک کے ارے ہر احوال تھا۔ چلنے ہوئے میں نے جب میں تھوڑے سے چنے اور گرگڑ کی ڈولی پھانسی تھی کہ پائینیں آگے کیا حالات ہیں، ایک بڑے سے خاردار دھت کے اوپر پہنچ کر میں نے خود کو ان کے دو شاخ بننے کے دوہان پھنسا لیا کہ اگر اٹھ بھی آ جائے تو کم از کم گرنے سے محفوظ رہ سکیں۔ رات بھر ان درخت پر بیٹھا رہا، جب اندر جبرائیل ہوا تو میں نے خود کو بھرتے آگے بڑھنے کے لیے تیار کر لیا، اب بھی میں کڑھو خان کے علاقے میں تھا اور مجھے ڈر تھا کہ کہیں مجھ کو گھاس کرنا ہے گدنی کونوں سمیت اس طرف ہی آ جائے۔ میں جلد سے جلد اس حدو سے نکل جانا چاہتا تھا۔ ان بات کا مجھے یقین تھا کہ میں اگر اس سمت بڑھتا رہا تو کوئی نہ کوئی محفوظ لہکا نہ آتی جائے گا۔ راستے میں کسی جگہ جنگلی مہر کی جھانپوں نے مہر کی بھوک کا مسئلہ کم کروا دیا، ٹھوڑی بہت جو دنیا کی ایڈلی تھی اس کے تپان میں حالے میں فائے والی کسی آبادی میں پناہ بھی لے سکتا تھا۔ اونچے نیچے راستوں آگے بڑھنے مجھے نہیں روز ہو چکے تھے۔ خدا کا شکر تھا کہ نہ کسی جنگلی جانور سے اور

کے پیچھے والے حصے کے ساتھ چٹ کر کرش کے اوپر جا گیا۔ ان سارے عمل میں کسی کٹانوں کان خبر نہ ہوئی، بھر میں نے رجب کر خود ڈرک کے آخری کونے تک کر لیا، چند بل سانس روکے پڑے رہا۔ جب نصیب ہو گیا کہ ڈرک کے اوجھنے سے نکلنے والے شہر میں ڈرک کے عملے کو میرے ڈرک پر کونے کا علم نہیں ہوا تو میں بغیر آواز پیدا کیے اور اڑنے سے میں پہنچ گیا۔ اس کہیں نما اسٹور کا تختہ اور پرائیمر میں ترپال کے اندر بے حس و حرکت ایک گہبے دل مارے خوف کے بیٹھا جا رہا تھا۔ پورا جسم سینے سے ہلک رہا تھا۔ مجھے کڑھو خان کی آخری جگہ پوسٹ کا انتظار تھا، جہاں ٹرک میں کہے مال کا جائزہ لینے والے چیک کرنے تھے اور پھر جانے دینے تھے۔ جوں جوں دہت گزر رہا تھا میری حالت غیر ہوتی جا رہی تھی، آخر کار ڈرک ڈلاؤ، ڈرائیو کا ہاتھ ہوا، پھر کوئی ٹرک کے اوپر چڑھا، میں نے لگا پیچھے کوئی مہرا لگا دیوچ کروا دیا ہے، مارے ڈر کے میری سانس بند ہو رہی تھی، میں دل میں پروردگاری کی دعا مانگا اور گرگڑاں ہاتھ پھر ڈرک کا سا جھکا لے کر آگے بڑھ گیا۔ پیازوں کے بیج اچھلتا کرتا ڈرک آگے بڑھا جا رہا تھا اور میں جھڑکنے دل سے بس ایک ہی ڈھانگے رہا تھا کہ ڈرک جلدی سے نہ چلانے چھوڑ کر ایسے علاقہ میں پہنچ جائے جہاں میں خود کو محفوظ کر لوں۔ کبھی کبھار میں دھکن ڈھکا کر سر باہر نکال کر اوپر گر دو اور پیچھے کا جائزہ بھی لیتا آ رہا تھا۔ ٹرک کی رفتار اب لگائی تیز تھی، کہیں کہ اوپر چاٹھا راستہ بہت پیچھے رو گیا تھا۔ پیازوں کے درمیان وہ سا بنا ہوا تھا، چاروں جانب نہ کوئی آبادی نہ کوئی انسان، صرف ٹرک تھی اوجھنے کا شور با میرے سینے کا اندر تیزی سے وھڑکنے دل کی آواز جو صرف میں ہی محسوس کر سکتا تھا۔

پورے ماحول پر ایک ایسا اندر جھرا تھا۔ مجھے بہ یقین تھا کہ اب تک پیچھے میری کوئی خبر نہیں ہوئی تھی پر نہ کڑھو خان کی ٹون اور گلاباں کب کی اس ڈرک تک پہنچ جائیں۔ اب بھر پیازوں کا اونچا بیجا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، میں نے ڈرک کو خبر باو کینے کا فیصلہ کرتے ہوئے اس کہیں والے حصے سے اٹھ کر پیچھے کرش پر آ کر رہنا شروع کر دیا اور بڑی احتیاط سے ڈرک کے آخری سرے

نی کسی انسان سے مذہب پھینز ہوتی تھی اور میں مسلسل اس جہنم کو بچھڑی چھوڑتا آ رہا تھا مگر اس آزدی میں بھی خود کو رقبندی کی محسوس کرتا رہتا تھا۔

کبھی اور اور کبھی اور ہر ہفتے مجھے جس روز ہو گئے، مگر دو ہفتوں پہاڑوں ندفی نالوں کے سوا کچھ بھی رکھائی نہیں دے رہا تھا، آذکار میں نے فیصلہ کیا کہ جو اور نماسا پہاڑ سبر سے بالکل سامنے تھا، اس کے دوسری جانب دیکھا جائے تو شاہ جادوئی ہے کوئی آبادی وغیرہ نظر آ جائے۔ گرتا پڑا مارن ڈھٹلے سے فٹل میں اناٹا ہی ستر کر پاپا کہ اس بلند زہن پہاڑ کے دوسری جانب جھماک سکوں۔ سبر سے سامنے بھی دور تک پہلائی سلسلہ تھا مگر پہاڑوں کے اس پار آبادی کے نشانات آسمان کی طرف اٹھنے والے مختلف مقامات سے دوسری طرف کی شکل میں محسوس ہوتے تھے۔ چھپے کا خوف سبر سے اندر سے ختم ہو چکا تھا اور اب صرف یہ وحسن سر پر سوار ہو گئی کہ معنی جلدی ہو سکے میں اترالی تک پہنچ جاؤں۔ اندر سے تک میں پہاڑ کی اونچائی پر چڑھتا رہا۔ خورا کی شکل میں چنگلی گھاس پھوس، بہرہ وغیرہ تھے۔ سبر سے آس پاس پانی جو چاروں جانب دائرہ مقدار میں نالیوں کھاہوں کی شکل میں بہنے کی جانب گرتا تھا۔ جب بہت جواب سے رہی تو میں نے ایک جگہ ڈک کر رات گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ علی الصبح اٹھ کر دوبارہ سفر شروع کیا۔ کربا۔ دو پہر تک میں پہاڑوں کے درمیان سپاٹ کھائی عبور کرتا ہیچے اٹھ گیا۔ اپنے انداز سے ایک جگہ ٹھنڈی پر اونچائی کی جانب بڑھنے لگا۔ میرے چلنے میں اب طاقت آچکی تھی، ایک عزم تھا سبر سے ارادے میں۔ دو پہر تک چلنے چلنے میں اٹھا جگہ پہنچ گیا، جہاں سے سڑک پر آئی جانی ٹریک نظر آ رہی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میں اب کسی محفوظ مقام تک آسانی سے پہنچ جاؤں گا۔

سبر اسٹیشن پھولا ہوا تھا اور میں سڑک کے کنارے دنگر کئے دل کے ساتھ کسی سداہی کے انتظار میں کھڑا تھا۔ ایک دوڑک گزرے مگر میں نے جان بوجھ کر اشارہ نہ کیا کہ شاید کوئی کرش والا ہی سڑک نہ ہو اور میں پھر سے پکڑا جاؤں۔ دوڑ سے آتے ایک چھڑے نما چھوٹے سے ڈک کوزر سے ڈرتے ہاتھ دبا مگر وہ آگے بڑھ گیا۔ میں ہاڈس ہو کر دو بارہ سڑک کے کنارے پہنچ رہا تھا کہ میں نے

اسے تھوڑی دور جا کر زک کے رہ گیا۔ میں اٹھ کر اس کی طرف سریت بھاگ اٹھا۔ میں کوئی سوال جواب کرتا کہ سائیز پر بیٹھے آری نے مجھے اشارہ کرتے چھپے بیٹھے کا کہا۔ میں جھٹ سے اس مٹی سڑک کے اوپر چڑھ گیا۔ ڈک پر نما۔ وہں کی ڈک باں لدفی ہوتی تھی۔ ایک کو نے میں خود کو سمیٹ کر چھپس گیا۔ ڈک آگے بڑھ گیا۔ ناٹا نے مجھ سے پوچھا۔ تم نے کچھ نانا کہہ کر کون سی جگہ گئی اور وہ کھر چار ہا تھا۔ اس سے بے نیاز میں اللہ تعالیٰ سے دعا میں کہنا بیٹھا ہوا تھا۔ کئی کھنے کے سفر کے بعد وہ سنی ڈک ایک مقام پر ڈک گبارہ دشاہ کوئی زرا سبر ہوئی تھا۔ اس نے اشارے سے مجھے بیٹھے کو کہا اور پیچھے والا نغذہ ہاتھ سے پینے مجھے نیچے اترنے کو کہا۔ میں جا ہوا نیچے اتر آیا۔ چار پانی پر اس پھولے ڈک کا ڈرا تیر آ لئی پانی مارے بیٹھا تھا۔ میں نے فریب جا کر اسے ہاتھ پر ہاتھ رکھنے سلام کہا، اس نے جواب دینے مجھے بیٹھے کو کہا۔ سبر سے بیٹھے پر اس نے بڑی شفقت سے پوچھا، بنا کہاں جاتا ہے۔ کھلی بار کسی کے منہ سے پکار پکارا لفظ بنا سننے ہی صبرتی آنکھیں پھرتی تھیں۔ وہ رویشان ہو گیا، مجھے دلا مارا اور اپنے مہلبہ کو سبر سے لیے بھی کھانے کا کہا۔ اس دوران مجھے ان جگہ کا پنا چلا کر اور (اشو) کا مقام تھا۔ بہ نائر بندنی کی سڑکی منڈی میں چارہ تھے۔ اتنے دنوں بعد کھانا اور چائے نصیب ہوئی تھی۔ سبر سے پورے جسم میں بڑائی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

پنڈی پہنچنے سڑک کی اڈا میں ہو رہی تھیں۔ وہ دونوں نزاری تھے۔ ان کے آنے تک میں نے ڈک کا اٹھا حاضہ کپڑے اور پانی سے پکا ہا تھا۔ ہڈ اسکرین کو بھی چھام کر دبا تھا پرانے اخبار سے، جو ارھر پڑی خالی نوکر ہوں میں سے مل گئے تھے۔ ہڈوں والوں آئے تو دیکھ کر مجھے شاپاوش دی۔ کھانا کھانے میں نے دونوں کو ایک فرضی کہانی سنائی کہ میں گاڈس سے شہر چار ہا ہوں کام کی تلاش میں۔ ناشتا کے بعد بڑے ذرا تیر کرنے مجھے پچاس روپے کا نوٹہ ربا اور دعا میں رہے کہ مجھے فارغ کر دیا، کیوں کہ یہ ان کی آخری سفری تھی۔ اب مجھے نہ نوکر کوئی خوف تھا اور نہ ذرا، میں جس



## کمال گائو مسلمانو

اس بار ایک ایسی ہی جلد تھی ہے ذکاں اور اس میں بچے کا ارادہ ہے پاکستان اس بار نو سنہ بھی اپنا ہے، سوچ بھی جھانسنے میں پہلے نوم بھی اس بار فوج بھی اس بار بھی تیس لوگوں کو آٹو گاڑوں کا سبب نہ جانے دوں گا، مٹانے دکھاؤں گا رازہ خراب کیجے، نازیبا بھی چھوڑے بس مجھ کو دیکھیے فقط بظاہر چھوڑے میں ایک نانشا گر ہوں یہ زالی ہے کاروبار ہوئی بھی میری ساتھ چلائی ہے کاروبار رمضان کو نانشا بنا ہے میرا کام دھندا بنانا، بیٹا کمانا ہے میرا کام لاش میں اغذات کے سب دوزخے آئیں گے ایک ایک اغذات کے لیے بلو جائیں گے مہرین عترت کا بیلا کشا، تین بچیاں بھر بھرا بھی، منہ، خالہ، جواں بھینچی چچیاں شوہر کو چھوڑ، واقف کو اس کی کردی گا ڈوم تاکہ غلام دنیا کے تازہ بھی جائیں جھوم رہی تو میں چھوٹے بچوں کو نفعے سناؤں گا لیکن میں ان کی پاریں برا کہ پلاؤں گا بچھروں کو ڈلاؤں گا رینگو بڑھاؤں گا ان کی سفید پوٹی دھند نکاؤں گا آسان کروں گا ہے تھوڑے کوزے ڈالنا کرنا ہے جو کرنا بیاں رکھنا ہے پانا میں کیوں کہوں کسی کو کہہ سکتے نہ کہیں گے جس آپ ذمے دار آئے پاس، پوسے میں کیوں کہوں کہ اشیے زائد کو جانے رمضان اپنا مل دن چ ہوں مت کھانے ہاتھی ز کے نام پر دہن بڑھاؤں گا بنی کسی کی سینٹ پر اپنے دوزخوں کا رود کہاں گا، کون سا اسلام، کس دین قسبی، مذاہب، عتقا، منسخر، نانشا دین جینے بھی تھیکو جہاں یہ مرے کشن با پر جہا یعنی نانشا کرنے میں سارے بار جہا میں دین عارفی کی بناہ ڈال رہا ہوں ہرپ کے چوزے ایشیا میں پال رہا ہوں (سراج عالم)

اسٹینڈ کا پناہ چھو کر پیول ہی چلتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ ایک خدا ترن نے میرے پچاس روپے بھی واپس کر دیے اور مجھے لاہور کے لیے اپنی بس میں بٹھالیا۔ سارے راتے میں اپنی آزادی جو مجھے اٹھارہ سال بعد نصیب ہوئی تھی، کا جشن مناتا رہا، کچھلے واقعات یاد کرتا اپنیوں کی طرف رواں تھا۔

لاہور پہنچ کر وہی پچاس روپے کام آئے اور میں رات کے کوئی دو بجے اچھے گھر والے شہزاد کا رو پہنچ گیا۔ اپنے گھر اور اپنے شہر کی سہک نے کچھ پر ایک نئے کسی کیفیت طاری کر دی تھی۔ بیاں کا نوپورا منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد تھا کہ ہمارا محلہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ تھا۔ بس اسٹینڈ کے مسافرخانے سے باہر بیٹھا میں دن نکلنے کا انتظار کر رہا تھا کہ پولیس والوں نے بکڑالیا۔ میرا محلہ اور حالت ہی ایسی تھی۔ رات کا بٹا ہوا حصہ ٹھانے میں گزارا۔ اللہ بھلا کرے خورشید جیلانی نامی ایک خدا ترن کا، جو ٹھانے میں کسی اپنے سرکارنی کام کے لیے آ پٹھا، مجھ پر نظر پڑی تو اس نے پوچھا۔ یہ کون اور کیسے۔ میں نے اٹھ کر انہیں یہ بتایا کہ میں آج اٹھارہ سال بعد اپنے شہر اور اپنے گھر آ رہا ہوں۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا میں ان دنوں کہاں ہوں، کہنے کہتے میں بے اختیار رو پڑا۔ شہی مخر نے ان کے کہنے پر مجھے چھوڑ دیا۔ میں ٹھانے سے باہر آ کر ذہن برزور دیا اپنے گھر کے راتے پر چل پڑا۔ گھر تلاش کرنے میں کوئی دن تین ڈنڈا آئی۔ میرا خیال تھا کہ میرے گھر والے مجھے دیکھ کر دوبارہ دار پانوں ہاتھ لیں گے، مگر جوہر سے ساتھ ہوا، وہ آپ خوراچی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں، کہنے کہتے مجھ نے تھنڈی آد بھرنے سر نیچے جھکا لیا اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

میں اس کے ساتھ جتے واقعات کے تانے بانے محسوس کرتا خود بھی اور بھی ہو گیا۔ مجید اجازت لے کر چلا گیا۔ جب میں کچھ دنوں بعد گلی والوں سے مل لینے گیا تو پتا چلا کہ مجید چپکے سے بغیر اطلاع دینے اپنی خواہ لے بغیر نہ جانے کہاں چلا گیا۔ اپنے ہی گھر میں بے گھر ہونے والا مجید خدا جانے کس جرم کی سزا کا ٹاٹا کھرتا تھا۔



## تیسری سچ بیانی

گلابی داو پینا

بشرتی سعید احمد



گلابی داو پینا ہے س ذہنی ماسرا بھری ایک لانا ذوال داستان

اور مسکرائی رہتی۔ اچھا اور کونوں کھدروں میں جھجھی پنا نہیں کس سے بانٹیں کر لی رہتی تھی۔  
میں شاہد سچ میں انجان تھی با پھر کوز کی طرح آنکھیں بند کر کے امتحان ہننے کی کوشش کر رہی تھی۔ دن میں ہزار بار خود کو تیار کر لی کہ لائیہ سے بات کر دوں لیکن نہ تو وہ مجھے سوچ دیتی اور نہ ہی مجھ میں ہمت ہوتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو سب کی نظروں سے دور رکھنے کی پوری کوشش کرتی تھی۔ عثمان اور میرے شیڈوں سے اس کی بدگلی کیفیت کا گلہ کرنے تو میں امتحان کی تہنیش کا کہہ کر نالانے کی کوشش کرتی، لیکن سچ بات تو یہ تھی کہ میں کسی آنے والے طرفان کا سوچ کر اندر سے خوف زدہ تھی۔

ان اپنی پریشان دلوں میں اچانک میری نند اور رافقہ ذہنی سے آگئی۔ اس کی آمد سے جہاں گھر کے جس زرد ماحول میں تازہ ہوا کا سا احساس پیدا ہوا وہاں مجھے بھی حوصلہ ملا کہ اب رافقہ سے کہوں گی کہ وہ خود اپنی لادلی سے بات کرے۔ رافقہ کہیں کہ انکلی آئی تھی اس کا شوہر اور بنیاد ذہنی میں ہی تھے۔ اس لیے وہ صرف چند دن رہے آئی تھی اور ان چند دنوں میں وہ وہ وہ دنوں سرے وہ دنوں دیروں کی طرف گزار

کے چہ دنوں سے میں اپنی تیس سالہ بیٹی کے بدلے ہوئے انداز وہ کہہ دیتی تھی اور اندر ہی اندر گھبرا رہی تھی۔ میری بیٹی لائیہ جو میں بھائیوں کی انکلی بنی تھی۔ گھر بھر ہی کی لادلی نہیں بلکہ پودے خانہ ان کی آنکھ کا تارا تھی۔ اپنے دو صحاب کی انکلی بنی تھی، میرے شوہر چار بھائی ہیں اور ان کی ایک بی بی بھی ہے۔ سب سے بڑے میرے شوہر عثمان ہیں، ہمارے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے، پھر میرا پور فیضان ہے جس کے دو بیٹے ہیں۔ اس سے چھوٹا عمر جس کے تین بیٹے ہیں اور سب سے چھوٹا بلال ہے جس کی ابھی شادنی نہیں ہوئی۔ ان چاروں بھائیوں کی لادلی ہیں میری انکلی نند رافقہ ہے، جس کا صرف ایک ہی بیٹا ہے اور وہ ذہنی میں رہتی ہے۔

سارے خانہ ان کی لادلی میری بیٹی لائیہ جو چند دن پہلے تک کسی پارے کی طرح اچھا اور بھری بھری تھی، ایک پٹی بھی آرام سے بیٹھنا جس کے لیے مشکل تھا۔ ہر دنت اپنے بھائیوں کے ساتھ لڑ کر کھتی تھی، کبھی ننت بال کھینچی دیتی تھی۔ پورے گھر میں اس کی آواز میں گوئی تھی۔ عثمان کہتے تھے "لائیہ ہا وہ بے گھر کی رہتی ہے۔" چند دنوں سے بردہ ہن مانہ پڑتی ہوئی تھی۔ ہر دنت سو بائیں کان سے لگائے دیکھے دیکھے لہجے میں بائیں کر لی دہنی



دکھائی دے رہی تھی۔ اُس کی حالت ایسی تھی جیسے کسی  
بچے کے ماہی کو اپنا نظر پورا کرنے کا موقع نہیں مل رہا  
ہو اور وہ سب کو اپنا دشمن سمجھتا ہے۔ اُس کی ان بے  
چینیوں نے مجھے بھی بہت بے چین کر دیا تھا۔ اب میں  
نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں لاپتہ سے صاف انکشاف میں  
بات کروں گی، لیکن اس کی نوبت ہی نہ آئی۔

\*\*\*

کراہ باقی دن ہماری طرف رہے آئی تھی۔ دو تین  
دن تو مہمانوں کی آمد و رفت میں گزار دیے۔ نکلان کی  
پیاری، ملاؤنی چھوٹی، لیکن اتنی دور سے آئی تھی اُن کی تو  
خوشی سننے والی نہیں جا رہی تھی، لیکن میرے بچے اور  
چھوٹا بچہ اور بھی ہر روز کوئی نہ کوئی پروگرام بنا لیتے۔ اس  
سلسلہ میں ہر دو مہمان لاپتہ سب سے الگ الگ اور  
کچن چھین رہی۔ اب اُس کی بے چینی بچے اور بھی واضح

بیچ لائے کہ جنید کا نام لے کر چمپڑے لگے۔ رات کو جب میں کئی کام سے لائے کے کمرے میں آئی تو وہ پہلے ہی میری نظر پھینکی۔

”مالہ پھوپھو کو کیا شوشا چمپڑے آئی ہیں؟“ لائے کے لہجے اور انداز گفتگو نے مجھے اندر تک رنجیدہ کر دیا۔

”بیٹا وہ جنید کی شادی تم سے کرنا چاہتی ہیں اس میں شوشا چمپڑے والی کیا بات ہے؟ اور تمہارے پاپائے تو ہاں بھی کر دئی ہے۔“ میں نے اپنے لہجے کو نرم رکھ کر کہا تو وہ اور بھی چلا کر بولی۔

”یہ میری زندگی ہے اسے کیسے اور کس کے ساتھ گزارا ہے، اس کا فیصلہ میں کروں گی کوئی اور نہیں۔“ میں نے حیرت سے اپنی فرمانبردار اور حیزدار بیٹی کو ایک بدلے ہوئے روپ میں دیکھا اور افسوس سے کہا۔

”بیٹا وہ تمہارے پاپا ہیں، تمہارا اچھا نام تم سے زیادہ جانتے ہیں۔“ لائے بیٹی نے اسے جھجھکی میں بولی۔

”اگر وہ سب جانتے ہیں تو ان کے لیے یہ جانا بھی ضروری ہے کہ میں جنید سے شادی نہیں کروں گی۔“

”کیوں؟“ مجھے اپنی آواز خود کو ہی سنائی نہ دی۔

”کیوں کہ جو اب بھی میں آپ کو جلد ہی دے دوں گی پہلے آپ پھوپھو کو جو اب دے دیں۔“ لائے نے تیز لہجے میں کہا اور میرا جواب سننے بغیر ہاتھ دم میں گھس کر زوردار آواز سے وہ دوازہ بند کر دیا۔

میں آنکھوں میں آنسو بھر کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

☆.....☆

اس رات میں ایک بل کے لیے بھی نہ سونئی، ساری رات میں نے جانے نماز پے گزری اور درد و کراپے رب سے دعا کی کہ وہ میرے گھر کا تماشا بنے۔ یہاں لے۔ وہ میرے شوہر اور بیٹوں کا سر جھکنے سے بچالے۔ وہ میری لاڈلی کو بر باد ہونے سے بچالے۔ اتفاقاً میں جاں گئی تھی کہ لائے کس اور کو پسند کرتی ہے، مجھ سے نہ جان سکتی کہ آج کی محبت کیسی محبت ہے جو چند دنوں میں ہی برسوں کے رشتے بے وقعت کر دیتی ہے جو زندگی کا سلیقہ کھانے کے بجائے بات کرنے کا طریقہ تک بھلا دیتی ہے۔ اس رات اپنے رب سے میں نے درد و کراپے ججزے کی دعا کی، کیوں کہ وہ ہر شے پہ قادر ہے، تاہم کن کا لفظ اس کے

رافعہ کو آئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا، ایک رات کھانے کے بعد سب کے لیے جانے جانی تھی کہ رافعہ میرے پاس کچن میں آگئی۔ باتوں باتوں میں وہ بولی۔

”بھالی! اب میری اچانک آمد یہ حیران تو ہوئی ہوں گی۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”رافعہ یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ جب تمہارا دل چاہے تم آؤ ان میں حیرانگی والی کیا بات ہے۔“ وہ بھی میرا جواب سن کر کھنٹی اور بولی۔

”یہ سن کر تو آپ ضرور حیران ہوئی گی کہ اس وزٹ کی تیاری میں ایک سال سے کر رہی تھی۔“ اب تو میں واضح میں حیران ہوئی۔

”کیوں ایک سال پہلے سے کہیں تیاری کر رہی تھیں؟“ میری حیرانگی کو محسوس کر کے وہ پھر کھنٹی اور بولی۔

”کیوں کہ اس بار میں بہت خاص ارادے سے آئی ہوں۔“

”خاص ارادے سے؟“ میں نے اور بھی زیادہ حیران ہو کر پوچھا تو وہ ہنستے ہوئے ہی بولی۔

”بھالی! میں لائے کو بیچ میں اپنی بیٹی بنانے آئی ہوں۔“ میں جنید کے لیے لائے کا ہاتھ مانتے آئی ہوں۔

آب کو تو کوئی اعتراض نہیں ہے بھائی؟“ رافعہ نے مجھے آنے کا مقصد بتا کر سارنی جہاں کی خوشی سمیٹ کر مجھ سے پوچھا۔

”نہیں مجھے کیا اعتراض ہوگا رافعہ! جنید گھر کا بچہ ہے، تم نے اپنے بھالی سے بات کی؟“ میں نے پوچھا تو وہ بولی۔

”نہیں میں نے سوچا پہلے آپ سے بات کر لوں پھر بھائی سے بات کر لوں گی۔“

پھر رافعہ نے عثمان سے بات کر لی اور عثمان کی خوشی کا تو کوئی نمکنا ہی نہ تھا۔ عام حالات ہوتے تو شاید میں عثمان سے بھی زیادہ خوش ہوتی۔ جنید بڑھا لکھا، خوب صورت لڑکا تھا، اچھلا جواب کرتا تھا، لیکن اب لائے کی موجودہ حالت میں مجھے آنے والے ٹونڈاں کی دستک صاف سنائی دے رہی تھی۔

اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ بات عثمان سے ہوتی ہوتی سارے گھر میں پھیل گئی۔ میری دیواریاں اور

ہاں کہیں نہیں ہے۔

اگلے دن رافعدا دوسب گھر والوں نے مرنی کی سیر کا پروگرام بنالیا۔

لاہور سے نری تقریباً چھ گھنٹے کی دوری ہے۔ رافعدا تو مرنی کو دیوانی تھی۔ اپنی شادی سے پہلے بھی اور شادی کے بعد بھی اسے جب موقع ملتا مرنی کا چکر ضرور لگاتی۔ مرنی کی آپ دہوا ہے بھی بڑی نرمالی۔ انسان دینی طور پر اپنے سب غم سب پریشانیوں بھول جاتا ہے۔ رافعدا کی طرح میرے بچے بھی مرنی کی سیر کے لیے ہر وقت تیار رہتے۔ اسی وجہ سے چند سال پہلے عثمان نے مرنی میں ایک خوب صورت سائیکل خرید لیا تھا۔

انٹانٹا پروگرام بنا اور ہم سب ہڈی سی کوچ میں جو میرے دیور نے کرانے پہ لی تھی، سوار ہو کر مرنی کے لیے نکل پڑے۔

سارے راستے لڑکوں نے خوب ہنگامہ کیا۔ لیکن لاشیہ سب سے الگ تھلک آخری سیٹ پر بند بھلائے بیٹھی رہی وہ تو آتا ہی نہیں جاہتی تھی بڑی مشکل سے اس دھڑے پہ آئی کہ واپسی پہ سب عثمان سے بات کر دی۔ اب لاشیہ کو اس طرح رکھ کر میں خود بھی ماحول کا حصہ نہ بن سکی۔ اس بات کو سب نے نوٹ کیا۔ میں نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر ال رہا۔

مری میں ہم پنڈی پوائنٹ پہ ٹھہرے۔ تین دن کے قیام کا ارادہ تھا اور تینوں دن سب نے بہت انجوائے کیا۔ مال روڈ کی لمبی لمبی سیریں کی۔ مختصری ٹھنڈی آؤشکریم کھاٹی اور بھی گرم گرم کافی پی۔ نومبر کے مہینے میں مرنی کا موسم اور اس پر گرم گرم کافی کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ ہر کوئی ان تین دنوں کو بھرپور جویا جاتا تھا۔ لیکن لاشیہ کی حالت ایسی تھی جیسے اسے اچانک زہر کی دوز کر دی گیا ہو۔ ہر لمحہ بے چینی اور بے قرار بھی ایک طرف جا کر اکلی بیٹھ جاتی اور بھی دوسری طرف، بھانپوں نے اسے اپنے ساتھ ملانے کی کاپی کوشش کی مگر وہ ان کے ساتھ کھل مل ہی نہ رہتی تھی۔ بھائی استقامت کا ڈر سمجھ کر اسے ریٹیکس کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عثمان مجھ سے کہتے۔

”تو یہ ایسے تو یہ بیمار ہو جائے گی۔“ سب ہی اس کی ٹھکر میں پریشان تھے۔ اور دوسری اور کی باد میں پریشان..... میں جاہتی تو لاشیہ پہنچ کر کے یا غصہ دکھا کر اسے روک کر اُنہی کی بدلی تھی۔ جس کا مظاہرہ وہ میرے سامنے کر چکی تھی۔ میں نہیں جاہتی تھی کہ عثمان بھی دیکھیں اور اُن کا مان ٹوٹ جائے۔ لیکن اب میں نے سوچا کہ واپس لاہور جا کر عثمان کو سب بچ بناؤں گی۔

تین دن کیسے گزرے پتا ہی نہ چلا۔ لڑکوں کی شرارتوں نے ماحول میں روڈ ہی بھجوری تھی۔ ابھی ایک درخت کے پاس تصویر چھوڑتے تو بھی دوسرے..... لاشیہ کی بھی انہوں نے زبردستی وہ چار تصویریں بنانی لیں۔ واپسی پہ بھی جگہ جگہ قدرتی مناظر کو دیکھتے اور تصویریں اُتارتے سفر جاری رہا۔ اسی دوران اچانک ایک موٹر پہ لاشیہ نے اپنے چاچا فیضان سے گاڑی روکنے کو کہا اور بولی۔

”ماما میں نے وہاں تصویر چھوڑی ہے۔“ اُن نے ایک درخت کے نیچے دو بڑے بڑے پتھروں کی طرف اشارہ کر کے کہا تو عثمان نے کہا۔

”بیٹا درخت کے نیچے بہت گہری کھاٹی ہے۔“  
 ”کوئی بات نہیں پاپا دیو تو دیکھیں کتنا پیارا ہے۔“  
 لاشیہ جب کہہ رہی تھی وہ بوہت ہی خوب صورت تھا جس نے سیری مٹی کا موڑ ٹھیک کر دیا تھا۔ میں نے عثمان سے کہا۔  
 ”کوئی بات نہیں عثمان احتیاط سے تصویر اُتار لیتے ہیں۔“

تب میرا بڑا بھائی ابراہیم کیمر دستیال کر کے سب سے نکلا اور بڑے چارے لاشیہ کو اُن دنوں پتھروں پہ بٹھایا اور اُس کی تصویر اُتاری۔ تصویر اُتارنے کے بعد لاشیہ جب پتھروں سے اُٹھنے لگی تو اچانک بولی۔ ”بھائی کوئی گلہزی یا چھڑی وغیرہ ہے۔“ ابراہیم نے اسے درخت کی ایک خشک ٹہنی توڑ کر دی جو لاشیہ نے دونوں پتھروں کے درمیان جو باریک سی دراڑ تھی، اُس میں ڈالی اور کوئی چیز کھانے کی کوشش کی، پھر اچانک اُس دراڑ میں پھنسا ہوا ایک گلابی پھولوں والا ٹھب صورت سا دوپٹا نکلا۔ جس کا ایک برا تو پتھر میں اٹکا تھا، لیکن



بانی و پناہ گھائی کی طرف لگا ہوا تھا۔  
 ”اما! کتنا پاراودہ ہے۔“ لایب نے اپنا دونا چا کر  
 کر آ کر دوپٹے کو لپیٹے ہوئے خوشی سے چپک کر کہا  
 ایک جگہ کو مجھے اپنی وہی مصمص لاپرواہی لایب نظر آئی۔  
 صرف میں نے ہی نہیں ابراہیم نے بھی اس بات کو  
 محسوس کیا اور میں کہ ہوا۔

میں دے پاؤں سبز میاں چڑھتی لایب کے  
 کمرے تک آئی، خوش فحشی سے ورداؤ بکھلا تھا، لیکن  
 لایب اپنے کمرے میں نہ تھی، اس کمرے سے لایب  
 چھوٹی سی ٹیبل سے سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ میں  
 آہستہ آہستہ چلتی ہوئی نہیں تک آئی، میرے سامنے  
 لایب کھڑی تھی، اس کی کمر میری طرف تھی اور چہرہ  
 سامنے، بال کھلے کھڑے ہوئے تھے اور گلے میں وہی  
 گھالی دونا تھا۔

”لایب! اس بیک، دادو دونا ہے باجو۔“ لایب نے مسکرا  
 کر وہ بے نظریے سے گرد لپیٹا اور کوچ میں سوار ہوئی، ابھی کوچ  
 کو چلے تھوڑی سی دور ہوئی تھی کہ راند کی آواز آئی۔

”ارے اتنی چارنی خوشبو کہاں سے آ رہی ہے؟“  
 اب میں نے محسوس کیا وہ اٹلی سا ون کوچ خوب صورت  
 تھی، یعنی خوشبو سے بہک رہی تھی۔

”یہ خوشبو تو لایب سے آ رہی ہے۔“ میرے چہرے  
 دہر بلاں نے کہا تو میں نے لایب کی طرف دیکھا جو وہ پنا  
 لپیٹے مست سو رہی تھی اور اس کا پورا وجود خوشبو سے بہک  
 رہا تھا۔ جس کی خوشبو نے سارے کوچ کو بہکا دیا تھا۔



”لایب! میں نے اسے آواز دنی تو لایب نے میری  
 طرف غرور کر دیکھا مگر یہ تو میری لایب نہیں تھی، اس کے من  
 قش بدلے بدلے گئے۔ میں نے خوف زدہ ہو کر ہچکا۔  
 ”کون ہو تم؟“

”میں رابہ ہوں خدا کے لیے مہری مد کرو۔ مجھے  
 اس خذاب سے نجات دلاؤ۔“ لایب کے حلق سے کسی اور  
 کی آواز نکلی اور پھر وہ رونے رونے زمین پر گر کر بے  
 ہوش ہو گئی، میں بھاگ کر آگے بڑھی اور زمین پر گر کر  
 لایب کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔ میرے حلق سے نکلنے  
 والی چیخوں نے سب کو جگا دیا اور پھر لایب کو تیز بخار ہو گیا  
 جو کسی طرح اترنے کا کام ہی نہ لے، پنا تھا۔ بے ہوشی میں  
 بھی لایب مسک رہی تھی، اس کی بند آنکھوں سے آنسو  
 رہے تھے۔ ہم سب اس کی حالت کو دیکھ کر رو رہے  
 تھے۔ ایک منٹ کے بعد ہر طرح کا علاج کر دیا مگر نہ لایب کا  
 بخار اترتا اور نہ اسے ہوش آتا۔



میں نوالا تھی میری حالت کا لانا دنا، کوئی کیا کرے،  
 لایب کے پاؤں اور ہاتھوں کی حالت بھی بہت بُری تھی، وہ  
 کسی کو کھانے کا دن اور نہ پینے کا، پورے گھر میں بر  
 وینٹ لایب کی سسکیاں کہتی رہیں، وہی پریشانی میں ایک  
 ماہ گزار گیا۔

ایک دن بارہ ماہی جو چچاں، چچین سال کا تھا  
 میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔

”بابھی ماں! میرے چچا آئے ہیں۔ سب  
 کہنے ہیں ان کے پاس دودھانی علم ہے، اگر آپ کی

بھرنے کیلئے کہے پندرہ دن گزارے پنا ہی نہ چلا  
 اور پنا چھ ماہ بعد آنے کا وعدہ کر کے وہاں چلا گئی۔ وہ  
 جانتی تھی لایب کے بل ایس سی کے امتحان ہو جائیں گے  
 تب وہ دھوم دھام سے منتقلی کرے گی۔

میں نے ابھی عثمان سے لایب کے بارے میں کوئی  
 بات نہ کی تھی، کہیں کہ لایب سرن سے آنے کے بعد بالکل  
 بدل گئی تھی، ونون سے بھی لاپرواہ ہو گئی تھی۔ ونون کسی کو نہ  
 میں پڑا جگا رہتا اور وہ سنسنی نہ تھی پھر کچھ دنوں بعد ونون  
 جانا بند ہو گیا۔

لایب ونون سے نو کیا اپنے آپ سے بھی لاپرواہ ہو گئی  
 تھی وہ ہر وقت اپنے کمرے میں بیٹھی رہتی۔ کمرے سے  
 نکلی تو کھوٹی کھوٹی سی خالوں میں دیکھی رہتی، اب فانس  
 کی حالت نے مجھے پہلے سے بھی زیادہ پریشان کر دیا تھا۔  
 سب سے زیادہ پریشان مجھے اس کا ہر وقت دنگاؤں و پنا  
 لے کر بھرتا کرتا تھا۔

کچھ دنوں سے مجھے لایب کے کمرے سے رات کو  
 رہنے کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن میں اپنے اپنا وہم سمجھ  
 کر نظر انداز کرتی رہی۔ ایک رات میں یکن میں پانی

اجازت ہو تو چھوٹی لپٹی کو ایک بار نہیں بھی دکھا دیں۔“  
 ذہبے کو نہ دیکھنے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔ میں نے  
 دونوں ہاتھ جوڑ کر اس سے کہا۔  
 ”جاؤ خدا کے لیے اپنے چچا کو لے آؤ شاہد وہ اسی  
 ہماری کوئی مدد کریں۔“

اور پھر میں نے دیکھا کہ اللہ کیسے اپنے بندوں کو  
 فرشتے بنا کر انسانوں کی مدد کے لیے بھیجتا ہے۔ ہمارے  
 مامی راشدہ کے چچا بابا رحیم اسی دن توڑے سال کے ایک  
 بار تیش بزرگ تھے۔ انہوں نے لائیبہ کے کمرے میں  
 آ کر اس کے بید کے ارد گرد فرعون پاک کی کچھ مورچیں  
 منہ میں پڑھنے ہوئے سات چکر لگائے۔ ساتواں چکر  
 پورا ہوا تو انہوں نے لائیبہ پر دم کیا اور ہاتھ سے اس کاٹیا  
 دوپٹے کو چھوا۔ دوپٹے کو چھونے کی دوسری لائیبہ نے  
 آنکھیں کھول دیں، دلال سرخ آنکھیں دو مہرئی لائیبہ کی  
 آنکھیں نہ تھیں۔

”کون بزم؟“ بابا رحیم نے پوچھا۔  
 ”میں ماریہ ہوں، لائیبہ کی زبان سے ایک سسکی سی  
 نکلی اور میں جسے اپنا دم سمجھ رہی تھی، دوچ نکلا۔  
 ”کون ماریہ؟“ بابا رحیم نے دو بار دوپٹا چھوا۔ ان کے  
 ساتھ ساتھ ہم سب بھی جانا چاہتے تھے کہ ماریہ کون  
 ہے؟ اور لائیبہ سے کہا جاتی ہے۔

”میں بھی لائیبہ کی طرح وہ بھائیوں کی اکلوتی بہن  
 اور بے امی بابا کی لاڈلی گلی، ملیا اے کیا غالبہ تھی، نہ  
 کوئی فکر تھی نہ پریشانی سارے گھر والے مجھ سے بے  
 پناہ محبت کرتے تھے اور پھر میری زندگی میں سعد آ جاو  
 میری بیست فریڈ فونز کے بڑے ہاں میں رہنا پڑا۔ اس  
 نے چاہیں ایسا کیا جاو کہ کیا کہ میرے لیے امی، بابا اور  
 دونوں بھائیوں کا پیار کم پڑ گیا۔ مجھے تو صرف سعد کا پیار  
 چاہیے تھا اور سعد کا ساتھ۔۔۔۔۔ اور اس ساتھ کو بانے کے  
 لیے ہم سب کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو گئی۔ اُن دنوں  
 گھر میں میری تنگی کی باتیں ہورہی تھیں، میں نے انی  
 سے سعد کا ذکر کیا تو دو مہرئی خرقی کے لیے میرے ساتھ  
 اُس سے ملنے گئی پھر اُس کا چھوٹا سا دوسرے کا کرانے  
 کا گھر اور ادھورنی تعلیم نے امی کو انکار پر مجبور کر دیا،  
 لیکن میں محبت کو دولت میں نہ لے کر تھیں نہ تھا مگر امی

بار بار مجھے کہیں۔“ دو دم سے نہیں نہ ہار کی دولت سے  
 پیار کرتا ہے۔“ لیکن میں نہ مانی دکاش میں مان جانی تو  
 آج یوں بے چین نہ ہوئی، انکار کا سن کر سعد نے مجھے  
 گھرت بھاگنے کا مشورہ دیا اور اُس دن جب میں کالج  
 کے بہانے گھر سے بھاگ رہی تھی تو پہلے میں نے اپنی  
 شادی کے لیے عرواہا برا سا راز ہو اور اسی کی الماری  
 کے لاکر سے دن لاکھ بھی نکال لیے لیکن پھر ہرے دل  
 میں خیال آیا، اگر میں سب کے کئی نواسی کو اپنی بات  
 سچ ثابت کرنے کا موقع مل جائے گا کہ سعد مجھ سے نہیں  
 میری دولت سے پیار کرتا ہے۔ شاہد میں خود ماریہ  
 جانا چاہتی تھی کہ سعد مجھ سے پیار کرتا ہے یا میری  
 دولت سے۔“

گھر سے بھاگ کر ہم نے مرئی جانے کا فیصلہ کیا۔  
 سعد نے کرانے بابک گاڑنی لے لی مرئی جانے ہونے  
 راستے میں اُسی پتھر کے پاس سعد نے نمبر ڈیڑھ روکے لیے  
 گاڑنی روکی کیوں کہ وہ گرم ہو گئی تھی، میں اپنی محبت اور  
 بیڈ بات میں سست سعد سے باتیں کرنا کرنی اتنی پتھر  
 بیٹھ گئی اور سعد سے کہنے لگا۔

”سعد ہم مرئی پتھر کر شادی کر لیں گے اور وہاں ہی  
 ایک چھوٹا سا گھر بنا کر رہیں گے اور تم بھی وہاں نہ جاؤ  
 گے۔“ سعد نے ہنس کر کہا۔

”چھوٹا سا کیوں میری جان بڑا سا بلکہ بنا گیا  
 گے۔“ اُن کی بات۔“ مجھے بھی نہیں آئی اور میں بولی۔  
 ”سزا کار بڑے جتنکے بڑے چھوڑوں سے بنے ہیں اور ہم  
 دونوں ہی نکلے ہیں۔“ میری بات سن کر وہ پوٹو نکلا اور بولا۔  
 ”کتنے کیوں؟ تم سب گھرت اپنے زویا اور ہر جیسے نو  
 لائی ہو؟“ اُس کی بات سن کر میں اُس سے بھی زیادہ چونکا  
 اور میرے کانوں میں اُن کے الفاظ گونجنے لگے کہ اُسے  
 مجھ سے نہیں میری دولت سے پیار ہے۔

”نہیں سعد میں اپنے ساتھ کچھ نہیں لائی، وہاں  
 اپنی محبت کے۔“ میں پتھر سے اٹھی اور چلتی ہوئی درخت  
 تک آئی اور نیچے کھائیاں میں دیکھ کر سعد سے کہا۔  
 ”نہماری خانی خانی محبت کا میں کیا چارواؤں گا۔“  
 میری بات کے جواب میں سعد کا بے زار آواز آئی تو  
 میں نے سعد کی طرف دیکھ کر کہا۔

”جس میں مجھ سے محبت ہے، ایسی ہی دولت ہے؟“ تو  
 وہ بے دردی سے بولا۔

”بے ذوق لڑکی خانی محبت کے درگاہ سے زندگی نہیں  
 گزارتی، زندگی گزارنے کے لیے دولت کی ضرورت ہوتی  
 ہے جسے تم اتنی آسانی سے لاتا رہے۔ اب ہم دائیں  
 جائیں گے، میں تمہارے ذمے داری نہیں اٹھا سکتا۔“

”کیا؟“ سعد کی بات پہ میں پریشان ہو کر سعد کی  
 طرف بڑھی تھی کہ اچانک میرا پادش پھلا لیکن ان  
 سے پہلے کہ میں گر لی، میں نے سعد کا بازو پکڑ لیا، لیکن  
 اس سے پہلے کہ میں پہنچتی، سعد نے میری پہلی اور  
 آخری محبت نے جس کی خاطر میں نے اپنے بھائیوں  
 اور ماں، باپ کے پیار کو کھٹا، تاجا، بڑی بے دردی سے  
 میرے ہاتھ کی انگلیاں کھول کے تجھے لے آ سزا چھوڑ  
 دیا، کھالی میں کرتے ہوئے اگرچہ میری آنکھوں میں  
 آنسو تھے مگر میں نے سعد کے ہونٹوں کو مسکراہٹ دیکھ  
 لی تھی، پھر چھ ماہ بعد وہاں سے یہ لوگ گزروے اور میرا  
 وہ پٹا اس لڑکی کے ہاتھ لگ گیا اور وہ اپنے کے ساتھ  
 میری بے چین روح بھی.....

لائیے کہ اندر موجود اربہ کی روح نے روتے روتے بولے۔  
 ”تم ہم سے کیا چاہتی ہو؟“

ابا رحم نے پوچھا تو اربہ کی روح نے اسی طرح  
 سسک کر کہا۔

”انصاف اور ان عذاب مسلسل سے نجات۔ میرا  
 قاتل ابھی بھی آزاد ہے۔ میں اسے سزا دلوانا چاہتی ہوں  
 اور ایک بار صرف ایک بار اپنے گھر والوں سے ماننا چاہتی  
 ہوں۔“ اربہ کی روح نے کہا تو ابا رحم بولے۔

”بیٹا بہت بڑا ہوا تمہارے ساتھ۔ تمہیں جو کچھ دیا گیا  
 لیکن تم نے بھی تو اپنے ماں باپ اور بھائیوں کو جھکا دیا  
 تھا، یہ اسی کی سزا ہے، ماں باپ سے بڑھ کر بھلا کون  
 محبت کر سکتا ہے۔ ہم سعد کو سزا دلوانے کی کوشش کریں  
 گے، لیکن تم اس پٹی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گی۔“ اربہ  
 کی روح نے کہا۔

”میں اسے کیوں نقصان پہنچاؤں گی۔ اسے تو اللہ  
 نے میرے لیے وسیلہ بنا دیا ہے کہ میرے گھر والے میری  
 گم نام موت سے واقف ہو سکیں۔“

تمام حقیقت جان کر ہم سب بہت دکھی ہوئے،  
 عثمان نے مشورہ دیا کہ پہلے اربہ کو (جولانہ کے اندر  
 ہے) اس کے والدین کے گھر لے جایا جائے پھر اس  
 کے والدین کی طرف سے سعد کے خلاف ان کی بیٹی کی  
 گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی جائے، باقی معاملہ ان  
 کے ذہنی ایس بی درست سمجھا لیں گے۔

☆.....☆

جس دن ہم لاہور کے اندر موجود اربہ کو ان کے گھر  
 لے جا رہے تھے، وہ تمام راستے بہت بے چین تھی۔ جیسے  
 ہی ہم ڈیفنس ہاؤسنگ اسٹیم میں داخل ہوئے اس کی بے  
 چینی حد سے بڑھ کر اور سسکیوں نے ہلکی ہلکی چیخوں کی  
 جگہ لے لی اور پھر جب ہم اس کی شناختی پانے اس کے  
 پہنچنے میں داخل ہوئے تو ان ہلکی ہلکی چیخوں نے میں کی  
 شکل اختیار کر لی۔

چیخوں کی آواز سن کر گھر سے اک سو بری خاتون  
 نکلیں، جنہیں دیکھ کر لاہور (اربہ) وہ دنوں بازو کھول  
 کر ان کی طرف دوڑی اور چیختی ہوئی ان کے سینے  
 سے لگ گئی۔

”ہی آپ جج کتنی تھیں، سعد کو بھرنی دولت سے  
 پیار تھا۔ اتنے مجھ سے پیار نہیں تھا۔ ہی آپ جج کتنی  
 تھیں۔“ نزارہ قطار روئے ہوئے اربہ نے ماں کے سینے  
 سے لگ کر کہا اور اربہ کی ماں جو پہلے حیران تھیں، نے  
 اربہ کی آواز سن کر اور ان کے سینے سے لٹکنے کے بعد  
 انہوں نے لاہور کے گلے میں موجود گلابی شیفون کے  
 دوپٹے کو اپنے ہاتھ سے چھو اور اڑھیں۔

”اربہ میری بیٹی تو کہاں چلی گئی؟“

نہ تعارف کی ضرورت پیش آئی اور نہ کچھ بتانے کی  
 ایک دل سے آہ نکلی اور دوسرے دل تک پہنچی، دوسرا  
 دل بھی ماں کا دل خائے کچھ بتانے کی ضرورت پیش نہ  
 آئی وہ جان گئی کہ اس کی بیٹی کے ساتھ کچھ نہ ہوا ہے۔

لاہور اس عورت کے کھلنے لگی رہی اور اربہ اپنی ماں کو  
 رو رو کر اپنی بے بسی کی داستان سناتی رہی ان بے بس  
 عورت کی حالت دکھنی نہ جانی تھی، اربہ کے دونوں  
 بھائی اور بھانجی وہاں آگئے اور ان کو بھی تمام حالات کا  
 علم ہو گیا۔ باپ اور بھائیوں کو رو رو کر اربہ یقین دلانی

میرنی بھی سنوری - جتنی ہی بنی نے مسکرا کر میرنی طرف دیکھا اور بولی -

”میں جانتی ہوں ماما آپ کیا پوچھنا چاہتی ہیں، آپ جانتی ہیں ماما اس دن دو دو پٹا مجھے ہی کیوں ملا، ہر روز وہاں سے ہزاروں لوگ گزرتے ہوں گے، پھر میں ہی کیوں؟ کہیں کہ ان دنوں میں بھی ماریہ کے نقشہ قدم پر چل رہی تھی، شاید وہ آپ کی دعاؤں کا اثر تھا یا پھر کوئی معجزہ کہ ماریہ کا دو پٹا مجھے ملا۔ میرنی وجہ سے ان کو نجات ملی یہ سب جانتے ہیں لیکن ان کی وجہ سے مجھے کیا ملا یہ کوئی نہیں جانتا؟ مگر میں جان گئی تھی کہ اصل محبت کیا ہوتی ہے۔ میں بھی ان دنوں اپنی فریڈ جو یہ کے بھائی کو پسند کر لی تھی، جو ابھی پڑھ رہا تھا اور بائج بیٹوں کی فہم دار تھی جس پہ لیکن پھر بھی دو چاہتا تھا کہ میں آپ سب کو شادی کے لیے مجبور کروں یعنی وہ میرے ذریعے سے اپنی زسے وار ہاں پوری کرنا چاہتا تھا۔“

محبت کو ترقی کی سیرمی سمجھنے والے ضرورت مند ہوتے ہیں اور ضرورت مند کو محبت کی نہ تو ضرورت ہوتی ہے اور نہ قدر یہ بات شاید میں بھی نہ سمجھی اگر ماریہ میری زندگی میں نہ آئی - اس کے دو پٹے نے مجھے عزت کی قدر، قیمت اور اہمیت کا احساس دلایا اور میں نے جان لیا کہ اپنے ماں باپ کی محبت اور عزت پاؤں تلے روند کر جانے والیاں ساری زندگی محبت اور عزت کو ترستی ہیں۔“

لائب نے مسکرا کر میرے گلے میں ہاتھیں ڈال کر کہا تو میں اپنی تھکی سی گڑبا کو اتنی سمجھ دار تھی کہ ہاتھیں کرتے دیکھ کر اندر تک نہال ہو گئی اور میں نے اپنے رب سے دعا کی کہ اسے میرے رب میری جی کو اتنی عزت اتنی محبت دینا کہ اس کی زندگی میں ان دونوں کی جگہ کی نہ ہو۔“

پھر میرنی بیٹی رخصت ہو کر دینی چلی گئی۔  
آج وہ ماشاء اللہ دو بیٹوں کی ماں ہے۔ جنید اسے بے پناہ جوار کرتا ہے اور وہ بھی جنید سے۔

اور ہاں وہ گھائی دو پٹا لائبا اپنے ساتھ لے گئی تھی، جس نے اسے عزت کی اہمیت کا احساس دلایا تھا۔

رہی کہ اس نے ان کی عزت پہ کوئی آج نہیں آنے دی۔  
دو جیسے اس گھر سے گئی تھی ویسے ہی اس دنیا سے چلی گئی۔  
یوں لگ رہا تھا جیسے ان سب کے ساتھ ساری کائنات بھی وہ رہی ہو، پھر چاہے لائبا بے ہوش ہو کر گر گئی لیکن اس سے پہلے ہی مادہ نے اپنی داستان الم پوری بنا دی تھی۔

☆.....☆

ماریہ کے بابا نے سعد کے خلاف ایف آئی آر رج کر دانی اور پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔ وہ جو بے فکر آزاد گھوم رہا تھا، وہ نہیں جانتا تھا کہ ایک مسنبولی دہسنے نے اس کے خلاف گواہی دی، لیکن دو پٹا مسنبولی کیسے ہو سکتا ہے، وہ تو بہت خاص ہوتا ہے۔ جو عورت کی عزت کی علامت ہو، وہ مسنبولی کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو بہت خاص ہوتا ہے۔ بہت ہی خاص ہوتا ہے۔

سعد کی گرفتاری اور اقبال جرم کے بعد جانے دوڑ سے مصوم ماریہ کی سچ شدہ لائبن کی جو کھائی سے نیچے ایک درخت کی تنہی میں اگلی ہو گئی اور پرندوں نے اس کو نوچا ہوا تھا۔

ماریہ کی بے بس ماں نے خواہ اپنے ہاتھوں سے اپنی بیٹی کو نکل دیا اور اس کے بابا اور بھائیوں نے اس کے جنازے کو نکدھا یا اور اسے منوں میں تلے ڈن کر دیا۔

اگرچہ ان کا تم تو مجھی ختم ہونے والا نہ تھا مگر ان کا لا حاصل انتظار ضرور ختم ہو گیا اور پھر میری لائبا بھی بالکل ٹھیک ہو گئی، اس کے امتحان بھی آ کر گزار گئے جیسے وہ ایک بڑا امتحان آ کر گزار گیا تھا۔

اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب میری مصوم ی گڑبا وہیں بنی۔ اس نے میرنی نظری نہ ٹھہر رہی تھی۔ رانہ نے بڑی جلا جلائی اور منجھئی کے بجانے نکاح کر دیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس سارے عرصے میں لائبا نے ذرا سا بھی اعتراض نہ کیا بلکہ دو میرے ساتھ خوشی خوشی نکاح کی تیاریاں کرتی رہی۔

نکاح والی رات جب سب مہمان سونے چلے گئے اور لائبا اپنے کپڑے بدلنے اپنے کمرے میں آئی تو میں نے اس سے کہا۔

”لائبا بیٹا ایک بات پوچھوں؟“ میری بات پہ



## چوتھی سچ بیانی

### زندگی کا معیار

عظیم الدین انصاری



انٹرنس کی ماری، فواری، اٹھائی ایک لڑکی کی ہجرت تاکہ کہانی

تھا۔ اپنی کی بات قسم ہوتے ہی رانیل نے کہا۔  
 ”عمیر کسی ایک کے جانے سے زندگی قسم نہیں  
 ہو جاتی، اپنی زندگی میں آگے بڑھو۔ ماشاء اللہ جینڈم ہو،  
 برس برس روزگار ہو، اپنا گھر ہے، بس اللہ کا شکر ادا کرو۔ اُس  
 نے جو تمہیں دیا اس پر اکتفا کرو اور جو تمہیں دیا اس کی امید  
 رکھو، کیوں کہ امید پر دنیا قائم ہے۔“  
 میں ان لوگوں کی باتیں سنتے سنتے رو پڑا اور باہمی  
 نے قریب آ کر میرے آنسو صاف کیے اور رانیل نے  
 بھی اُن سے کہا کہ سمجھاؤ اپنے بھائی کو، میں بچپن سے  
 آج تک اس کو سمجھ نہیں پایا، شاید تم سمجھ سکو۔

میری اُس سے ملاقات یونیورسٹی میں ہوئی تھی وہ  
 ہمارا پہلا دل تھا، جب دو دوسرے باہمی آئی اور مجھ سے  
 چین مانگا تھا، جب کہ اُس کا چین اُس کے ہاتھوں میں لگا  
 ہوا تھا، شاید اُسے یاد نہ رہا، اور وہ میں نے صحت اپنے  
 پیگ سے چین نکال کر اُسے دیا تھا۔ اُس نے شکر یہ کہہ کر  
 تھوڑی دیر میں دینے کا وعدہ کر کے سامنے پرانی کھچ پر بیٹھ  
 گئی تھی اور تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی تھی اور مجھے چین  
 دے کر واپس چلی گئی۔

مجھے کوئی فریڈنگ نہیں تھی، جیسا کہ فلموں یا ڈراموں  
 میں ہوتا ہے کہ وہاں نظر میں محبت ہو گئی۔ ایسا میرے ساتھ  
 کچھ بھی نہیں تھا، کیوں کہ مجھے پڑھ لکھ کر اپنے ماں باپ کی

پیار میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے؟ جس شخص  
 کو اپنی جان سے زیادہ چاہا، اُس نے ایسا کیا۔ اُس نے  
 ایسا کیوں کیا میرے ساتھ ہ زندگی میں ایسا کون سا گناہ کیا  
 تھا جس نے، جس کی سزا مجھے اس طرح مل رہی ہے۔ کیا  
 غریب ہونا اتنا بڑا گناہ ہے۔ کیا اس علاقے میں انسان  
 نہیں رہتے۔ یہ سب میں اپنے دوست رانیل کو بتا رہا تھا۔  
 رانیل میرا بچپن کا دوست ہے اور ہمارا رشتہ ایک  
 فیملی کی طرح ہے۔ اُس کی بیوی کو میں بچپن سے جانتا  
 ہوں۔ وہ رانیل کی کزن ہے اور میں اُنہیں باہمی کہتا  
 ہوں۔ میں جذبات میں اتارا نیا بول رہا تھا کہ میری  
 آواز سن کر وہ بھی کمرے میں آ گئیں۔

انہوں نے میری بات سن لی تھی اور سن کر مجھے کہا  
 کہ ”عمیر تم ایسا مت سوچو۔ اُس نے جو کیا تمہارے  
 ساتھ، اُسے اُس کے لیے کی سزا اللہ دے گا۔ وہ کون وہاں  
 ہے تم کو کسی گناہ کی سزا دینے والی اور جہاں تک بات  
 علاقے کی ہے تو ضرور دیکھیں کہ ہم غریب علاقے میں  
 رہتے ہیں تو یہاں انسان کے ہمیش میں جانور ہیں۔ ایسا  
 بھی ہوتا ہے کہ آپریٹل کے لوگ اپنے چہرے پر انسانوں  
 کا نقاب لگا کے مہوتے ہیں۔“

اپنی مجھے سمجھانے جارہی تھی اور میں خاموشی سے  
 بیٹھا اُن کی باتیں سن رہا تھا۔ جبکہ رانیل بھی پر اُس رہا

بیچے بڑ کر دیکھا تو وہ ہی لڑکی میرا نام پکارے میرے بیچے  
 آ رہی تھی۔ میں نے ڈک کر بیچھے دیکھا اور کہا۔  
 ”کی فرمائیے۔“ اُس نے کہا۔  
 ”پہلیں کہیے میرا پتلے ہیں۔ مجھے آپ سے ایک  
 بات کرنی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”OK“ اور میں اس کے ساتھ کہنے  
 میرا آ گیا۔ وہاں اُس نے چائے کا آؤڑ دیا اور بات  
 یوں شروع کی۔

”میرا نام میرین ہے اور ہم ایک نئی ڈپارٹ میں  
 ہوتے ہوئے ایک دوسرے سے بات تک نہیں کر سکے۔

خواب میں پوری کرنا تھی، اس لیے کبھی کسی لڑکی کے چکر میں  
 نہیں پڑا۔ جب وہ چین دے کر جلی گئی تب راجیل نے کہا  
 کہ یار بڑے خوش قسمت ہو تم، اتنی خوب صورت لڑکی  
 نے تم سے چین مانگا، جبکہ اُس کے پاس بھی تھا۔ اس کا  
 مطلب ہے کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے اور میں مسکراتا  
 ہوا راجیل کے ساتھ کہنے میرا پتلے ہوئے کہنے لگا۔

”یہ سب تمہاری سوچ ہے، اُسے ضرورت تھی اور یاد  
 نہیں رہا جو گاہ قریب ہم دونوں ہی کھڑے تھے اور ہم  
 دونوں کا ایک ہی بیگ ہے۔ جس میں ہم دونوں کا  
 کتابیں ہیں، جو کہ میرے پاس تھا اور اُسے لگا کہ میرے



خیر اُس دن سر نے کلاس میں آ کر آپ کا ذکر کیا کہ وہ  
 بہت ڈچین لڑکا ہے، ہمیر نام ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو مجھے  
 تشویش ہوئی کہ بتا کر کہ یہ کون ہے اور جب پتا کیا تو  
 وہ آپ تھے۔ میں نہیں جانتی کہ مجھے کیا ہوا ہے، بس آپ  
 کے بارے میں کچھ پتا کرنا ہے۔ آپ مجھے اپنی جلی کے  
 بارے میں بتائیں۔“

میں نے کہا۔ ”ہم چار بھائی ہیں۔ ایک بھائی  
 اور ایک بہن مجھ سے بڑی ہیں، دونوں شادی شدہ ہیں

پاس ہی ہیں بیوگ۔ اس لیے مانگا اور کوئی وہ نہیں ہو سکتی۔“  
 راجیل اور میں ایک ہی کلاس میں تھے، جبکہ وہ الگ  
 کلاس میں تھی اور ہمارا ڈپارٹمنٹ بھی ایک ہی تھا، بس  
 کلاس کا فرق تھا۔ تقریباً تین مہینے ہی گزرے ہوں گے،  
 اُس دن میں اکیلا بیوگوشی گیا تھا، کیوں کہ راجیل کی  
 طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اس لیے وہ ہائٹنس لگا تھا۔

صبح کا وقت تھا میں کلاس کی طرف بڑھ رہا تھا اچانک  
 بیچے سے آواز آئی۔ ”میر، میر بات نہیں۔“ میں نے

مگر نمبردارنی مرضی ہے، فگے کا انجام بہت بُرا ہوگا۔ اسی طرح دو سال گزر گئے اور پتا چلی نہیں چلا۔ اس میں مہرین ایک دوسرے کے پیار میں باہل ہو گئے تھے۔ پوچھو پوچھو سے فارغ ہو کر مجھے جا بجا تلاش کرنا تھی، جبکہ راجیل کو اپنے آپ کو کاروبار سنبھالنا تھا جو کہ کبڑے سے بٹانے کا کاروبار تھا، میں جا بجا کی تلاش میں محسوس رہا اور اسی دوران راجیل کی شادنی اُن کی کزن نکال سے ہوئی۔

شائلہ کو میں بچپن سے جانتا تھا اور دو مجھ سے دو سال بڑی تھی۔ جب تک ان کی شادنی نہیں ہوئی تھی، میں ان کا نام لہنا تھا اور شاہی کے بعد اسے بھالی کہتا مجھے جب سا لگہ رہا تھا اس لیے اسے بائی کہتے تھے۔ بائی بھی کبھی نہیں اب تم بھی شادنی کرو نمبردار سے دوستی کی تو ہو گئی، تم کب تک ایسے ہی رہو گے۔ میں نے کہا کہ بائی بس دعا کروں کہ جلد سے جلد تم بھی جا بجا ل جاؤ اور پھر میں بھی مہرین سے شادنی کروں گا۔ جا بجا زحمت ماکنا مشکل ہوتا ہے یہ مجھے جب پتا چلا جب میں جا بجا کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ خیر اللہ اذکر کے جا بجا بھی ل گئی، جبکہ مہرین کال اور میسج پر مہرین سے بات ہنوز برقرار تھی، جا بجا ملنے کے بعد میں معروف ہو گیا۔ مہرین سے بات بس رات میں ہی ہوتی تھی۔

ایک دن بات کرنے ہوئے میں نے مہرین سے کہا کہ بس ٹھوڑے دن اور مہرین کو میں بہت جلد ہی کو نمبردار سے گھر بھیج رہا ہوں۔ مہرین کہتا تھا اور مہرین کو غصہ آ گیا۔ "نمبردار اور خدو دست سے میں تم سے شادنی کر دیا گی؟" "میں حیرت میں آ گیا اور کہا۔ کیوں مہرین کہا ہوا۔ اس نے کہا۔" "نمبردار اور ہمارے آپنٹس میں زمین آسمان کا فرق ہے، تم پڑھے لکھے ہو، ذہن ہوا، مجھے تم پسند گی ہو مگر میں تم سے شادنی نہیں کر سکتی، کیوں کہ تم جس علاقے میں رہتے ہو وہاں میں رہتا ہوں، اہل گناہ ہے، کچھ کسٹی میں رہتے ہو اور میں عمر بھر نمبردار سے ساتھ اس کچھ کسٹی میں نہیں رہ سکتی۔ اگر مجھ سے شادنی کرنی ہے تو میرے علاقے میں اپنا گھر یا قلت خریدو جب تو تنگ ہے درد نہ مجھے بھول جاؤ۔"

میں اس کی بات سننے سننے رو پڑا اور یہ کہہ کر، اُس نے لائن کاٹ دی تھی، میں نے پھر کال کی تو اُس نے

اور مجھ سے چھوٹی ایک بہن ہے، اُس کی شادنی میں ابھی دو سال ہیں۔ اس کے علاوہ وہی ابواور بس۔" مہرین بات سن کر اُس نے اپنے ہونٹوں کو بند کیے ہی ہم... کی آواز نکالی، جس کا مطلب اچھا کا تھا، پھر اُس نے مجھے اپنا سٹل نمبر دیا اور میرا سٹل نمبر لے کر چلی گئی۔ میں ٹھوڑی دیر وہیں بیٹھا رہا اور پھر اُٹھ کر کاؤنٹر پر پہنچے، گئے گیا تو پتا چلا کہ ٹیل وادار کبھی۔ خیر اگلے دن راتیل بھی میرے ساتھ تھا۔ جب یہ کہہ میں ہم چائے پی رہے تھے تب وہ اُٹی اور سلام کیا، پھر گئی۔

آپ نے مجھے کال نہیں کی۔ میں نے آپ کے ذہن بہت انتظار کیا۔

میں نے کہا۔ "مجھے باوئی نہیں رہا، آپ کر لیتیں۔" اور وہ مسکرائی ہوئی جاتی۔ "نمبر راجیل نے مجھے چھیڑا۔" "اوسے ہونے میں ایک دن نہیں آیا اور بات یہاں تک آ گئی۔" میں نے راجیل کو سب کچھ بتا دیا۔ راجیل نے مسخ کیا کہ مت کرنا اسے کال، میں نے کہا ہاں نہیں کروں گا۔

رات کے وقت میں راجیل کے گھر سے اسی آ رہا تھا، جب اچانک مہرین کا خیال آیا اور میں نے گھر جا کر اسے کال کرنے کا سوچا۔ گھر پہنچ کر میں نے اسے کال کی اُس نے پہلی ہی سبب پر کال ریسو کر لی، مہرین مہرین کال کا ہی انتظار کر رہی تھی، پھر ہمارا روز کا معمول کا ہو گیا، اسی میسج اور بھی کال پر بات کرنا۔ مجھے پتا نہیں چلا اور میں اُس کی محبت میں گرفتار ہو گیا پھر ایک دن کال پر بات کرتے ہوئے میں نے اسے کہہ دیا کہ مجھے محبت ہو گئی اور وہ حیران ہونے ہوئے پوچھنے لگی۔ "کون ہے دو۔"

میں نے کہا۔ "جس سے اس وقت بات کر رہا ہوں۔" دو دو زور سے اُسی اور کہنے لگی۔

"ممبرو، مجھے بھی۔" اور لائن کاٹ دی۔ میں بہت خوش تھا۔

اگلے دن ٹیویڈرٹی میں، میں اس کے پاس گیا اور کہا کہ آپ نے لائن کیوں کالی تھی۔ اُن نے شہرتا ہے ہوئے مجھے منہ کیا اور کہا ایسے ہی، پھر ہماری محبت چلتی رہی۔ راجیل سب جانتا تھا اور مجھے سمجھا تھا کہ سب فضول ہے، ہم یہاں پڑھے آئے ہیں ہمیں کرنے نہیں۔

نہیں ہو جاتی۔ اس کا انتظار کرنے سے بہتر ہے کہ آگے کی طرف بڑھوں۔ مہرین منہارے معیار کی نہیں ہے اور جس لڑکی کا میں ذکر کر رہی ہوں، وہ راجیل کے ایک دوست کی بہن ہے۔ اس کا ۲۴ سالہ ہے۔ تم آتے ایک بار دیکھ لو، وہ لہو بھر فصلہ کرنا۔" میں نے باجی کو صاف انکار کر دیا، اتنے میں راجیل بھی باہر سے آ گیا اور آتے ہی مجھے گلے سے لگا کر مبارکباد دی۔ میں ان دونوں کو چھٹی بجتی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ کتنا پیار کرنے ہیں یہ مجھ سے، جبکہ میرا ان سے خون کا بھی رشتہ نہیں، بس بچپن کی دوستی ہے۔ تب راجیل کو باجی نے سب بتا دیا اور راجیل نے مجھے اپنی دوستی کی قسم دینی کہ باہر سب سارہ سے شادی کر لو، وہ تمہارا بہت خیال رکھے گی۔ کل اس کی امی ہمارے گھر آئیں گی، اس لیے تم آفس سے واپسی پر کل پھر آنا اور ہزار بارنا طلبہ بھی درست کر لینا۔ میں نے آفس کی دوستی کی قسم پر ہاں کر دی۔ اگلے دن میں گیا تو سارہ کی امی اور بھالی آئے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ مہرین باجی نے مجھ سے بہت گرم جوش سے ملے۔ انہوں نے مجھے پسند کر لیا تھا۔ دو تین دن بعد باجی نے میری امی سے بات کی۔ میری امی بھی مان گئیں۔ مجھ سے میری رضامندی پوچھی گئی تو میں نے کہہ دیا جو آپ کی مرضی۔ اس طرح وہی فارغ التحصیل ہوئی ہوئیں۔ میری امی سارہ کے گھر گئیں اور ہوں ہمارا رشتہ بکا ہو گیا۔ ایک سال بعد میری اور سارہ کی شادی ہوئی۔

راجیل نے مجھے اور سارہ کو شادی سے پہلے ایک بار ملانے کا پروگرام بھی ترتیب دے دیا۔ اس طرح سارہ اپنی امی کے ساتھ راجیل کے گھر آئی اور میں بھی گیا۔ اگلے کمرے میں ہم دونوں کو ایک ساتھ چھوڑ دیا گیا۔ سارہ وہی بہت خوب صورت تھی، مٹی سی، تازہ کی۔ میں اور سارہ دو الگ الگ صوفے پر بیٹھے تھے، کچھ کچھ ٹیٹا آرہا تھا کیا بات کر دیں، بلکہ مجھے راجیل پر غصہ آرہا تھا کہ کیا ضرورت تھی سب کرنے کی۔ جب میں راضی ہوں، سارہ راضی ہے تو کیوں ملوانے کا سوچا۔ خبر میں نے سارہ سے رسی طلب ملک کے بعد بات شروع کی اور اپنے اور مہرین کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ یہ بھی کہ میں راضی نہیں تھا، مجھے راجیل نے اپنی دوستی کی قسم

رہو نہیں کہا اور جب میں نے اسے سچ کیا اس نے جواب نہیں دیا۔ میں اسے سچ پر سچ کر رہا، کال پر کال، مگر سب بے سود۔ اس پینشن میں ساری رات میں سو نہیں سکا۔ اگلے دن آفس گیا۔ آفس سے واپس آتا تو راجیل کے گھر گیا، تب میں نے راجیل کو یہ سب بات بتائی۔ راجیل نے کہا۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا۔" تب باجی بھی ہماری باتیں سننے آ گئی نہیں اور مجھے سمجھانے لگیں کہ اسے صحت بھی ہی نہیں، وہ دنو نام پاس کر رہی تھی۔

باجی کی باتوں کا اثر مجھ پر یوں ہوا کہ میں نے حالات اللہ پر چھوڑ دیے۔ بس دعا کرتا رہا کہ اللہ جو کرے میرے حق میں بہتر کرے۔ ہر روز رات کو سونے سے پہلے دعا لیتے، کونکے کو بھگوانے اور میں سو جاتا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا سب کچھ لٹ گیا، وہ برباد ہو گیا ہو۔ شیدہ بنانا، بال کنوٹا، نئے کپڑے پہننا، کچھ بھی دل نہیں کرتا تھا۔ میری حالت مجھوں کے چھٹی ہو گئی تھی۔ ہر دن آفس ہی سوچنا، آفس کی باتیں سوچنا۔ جب یونیورسٹی کے داخلہ دن کا سوچنا تو چیرے پر مسکان آ جاتی اور جب مہرین کے دو آخری الفاظ میرے ذہن میں گونجتے تو آکھ بھڑائی۔ سلسلہ ایسے ہی چل گیا۔ چھ ماہ گزر گئے، میں پھر بھی مہرین کو کال کرتا، مگر وہ رہو نہیں کرتی تھی۔ میں نے اپنا سب کچھ آئے ہی مان لیا تھا۔ محبت کے بارے میں سنا تھا کہ محبت دور دیتی ہے، مگر اتنا دور دیتی ہے

پر اب محسوس کیا گیا۔ ایک دن آفس سے واپسی پر میں راجیل کے گھر گیا، نوابی مہرین منتظر نہیں۔ مجھے دیکھتے ہی میری طرف خوشی سے پلکیں اور نہ سام نہ دعاؤں نہ کھٹ بٹی کہا۔

"مہرین تمہارے رخصتے کی بات کی ہے میں نے، لڑکی اچھی ہے، سچھی ہوئی ہے، تیز دار ہے، خوب صورت ہے، بلی و ہلی، تازہ کی اور کوری ہے، سب سے بڑھ کر بے دہ ہمارے ہی ملانے کی ہے، تعلیم اس کی انٹرنیٹ ہے، مگر گھڑ اور باشادہ ہے۔ میں نے کہا۔

"رہنے دس باجی مجھے شادی نہیں کرنی۔"

تب باجی نے کہا دیکھو "مہرین" میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی نہیں ہوں کہ کسی کے جانے سے زندگی ختم



جواب گھرنی ہوں اور یہیں سامنے والی گل کے پیچھے کراٹے پر رہتی ہوں۔“

میں نے کہا: ”آزمیں چھوڑوں، کیوں کہ میں اسی جگہ سے گزرتا ہوا جاتا ہوں۔“

وہ میرے ساتھ بانک پر بیٹھ گئی۔ میں آست چھوڑتا ہوا آفس چلا گیا۔ پورا دن انتظار میں رہا کہ مہرین جہاں رہتی ہے؟ میں نے فیصلہ کیا کہ آفس سے راجھی پر آج آفس کے گھر جاؤں گا اور پنا کر دوں گا کہ کیا ہوا ہے آفس کے ساتھ۔ آفس سے آف کرنے کے بعد میں مہرین کے گھر گیا وہ تو گھر پر نہیں تھی۔ آفس کی انکی تھیں۔ میں نے اپنے بارے میں بتایا تو وہ مجھے اندر لے آئیں، پھر مجھے بتایا کہ میرے بیٹوں نے اپنی اپنی پسند کیا شادی کی اور الگ ہو گئے۔ مہرین کے ابو کا کاروبار بلکل طور پر ختم ہو گیا، ان کو ہارت ایک ہوا اور در انتقال کر گئے۔ میرے بیٹوں نے گھر چھوڑ کر حنف ماٹا اور بہت لڑائی جھگڑے کے بعد گھر چھوڑ گیا، اب ہم دوگ جہاں کراٹے کے گھر میں رہ رہے ہیں اور مہرین جاب کرتی ہے میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ آفس کے جہاں سے بھی رشتے آتے تھے، مہرین نے خود منع کیا تھا کہ لڑکا امیر ہو اور اب کوئی رشتہ بھی نہیں آتا۔ یہ سب سن کر میں رو دیا اور مہرین کی باتیں بار بار نہ لگتیں۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اجازت مانگی اور اپنے گھر آ گیا جہاں ساڑھ اور زین میرا انتظار کرتے ہیں۔

میرا بے سب لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ خدا را اسٹینس کے چکر میں مت پڑو، کیوں کہ رقت ایک جیسا نہیں رہتا۔ آگے کے زمانے بڑے اور لمبی کی رات ہوتی۔ مجھے میرے دوست راجیل نے زندگی کی طرف راغب کیا تھا، اس کے ساتھ باجی نے بھی میرا ساتھ دیا تھا، مگر کیا ہر انسان راجیل اور باجی کی طرح ہوتا ہے؟

میري دعا ہے کہ اللہ سب کو راجیل جیسا رحمت دے، جو صرف میرے اسکیلے پن کی وجہ سے میرے ساتھ تعلیم حاصل کرتا رہا، بیچ بے اچھا دوست بھی کسا نعمت سے کم نہیں۔

☆.....☆

دے کر راضی کیا۔ میں نے مزید کہا کہ مہرین آپ کے مقابلے میں کم خوب صورت ہے، مگر میں آست بھلا نہیں پارہا۔ ساڑھ نے میری ساری بات سن کر کہا کہ جوڑے آسمانوں پر بچتے ہیں۔ اگر آپ کا جوڑا مہرین سے ہے تو وہ آپ کو خرد لے گی آپ چاہیں تو انکار کر سکتے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو، مجھے میں مہرین اور آرا میں ردنا سا لگہ رہا تھا اور میں نے کہا کہ میں راضی ہوں۔

اس طرح دو دن بھی قریب آ گیا جس کا انتظار ہر لڑکے لڑکی کو ہوتا ہے، مگر مجھے اس لڑکا کا انتظار نہیں تھا۔ نصب جہاں لے کر جا رہا تھا میں چٹا گیا اور ساڑھ میری ہوتی بن کر میرے ٹکڑے ٹکڑے آگئی۔ ان رات بھی میں بہت رو دیا تھا۔ مہرین کی باہنستی رہی۔ آفس کی بے وفائی اڑانی رہی، مگر میں نے ساڑھ سے انصافی نہیں کی۔ چند ماہ بعد ساڑھ نے خوش خبری دی اور میں بہت خوش ہوا۔ سلسلہ چلنا ہوا اور میں ایک بچے کا باپ بن گیا۔

میرا جاب بہت خوب صورت تھا، بالکل اپنی ماں ساڑھ پر گیا تھا۔ دینی ناک نٹوش، بلائی بیٹی آنکھیں، گورا رنگ، میری اپنی ساڑھ، بھاجی، اور بہنوں کی سفادرت سے اس کا نام زین رکھا گیا تھا۔ دلت کا پتائی نہیں چلا۔ میرا لٹناراجیل سے دیا ہی تھا جیسے پہلے تھا اور مجھے باجی اور راجیل پر بہت پیار بھی آتا تھا کہ ان لوگوں نے مجھے مصیبت سے نکالا تھا۔ مکمل طور پر تو نہیں، مگر کافی حد تک میں مہرین کو بھول گیا تھا۔ زین اسکول جانے کے قابل ہو گیا تھا۔ ایک روز صبح میں زین کو اسکول چھوڑ کر آفس جا رہا تھا تو راستے میں مجھے مہرین نظر آئی جو بلکے عباہ میں تھی۔ اس پکارنگ بہت کالا ہو گیا تھا اور آنکھیں اندر دھکی ہوئی۔ لگ رہا تھا کہ برسوں سے چارے۔ میں آست کیسے بھول سکتا تھا، فوراً بانک آفس کے پاس لے جا کر روکی اور سلام کیا۔ آفس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ میرے سلام کا جواب تو دبا میں نے کہا۔

”کیسی زار اور صبح تیار کی کچی آبادی والے علاقے کے میں روڈ پر کس کا انتظار کرتی ہو۔“ آفس نے کہا۔

”جس کا انتظار کر رہا ہو۔ ایک پرانی بت لکھی میں

## مشہور مصنفین کے مقبول ترین ناول

|       |   |                  |   |                       |
|-------|---|------------------|---|-----------------------|
| 400/- | — | اعجاز احمد نواب  | — | آشیانہ                |
| 600/- | — | اعجاز احمد نواب  | — | جزیرہ                 |
| 300/- | — | شازیہ اعجاز شازی | — | تیری یادوں کے گلاب    |
| 500/- | — | غزالہ طیل راؤ    | — | کانچ کے پھول          |
| 300/- | — | محمد سلیم اختر   | — | یہ دیا بھیجنے نہ پائے |
| 400/- | — | ایم اے راحت      | — | دش کنیا               |
| 300/- | — | ایم اے راحت      | — | ورنہ                  |
| 200/- | — | ایم اے راحت      | — | تعلی                  |
| 200/- | — | ایم اے راحت      | — | بھرم                  |
| 400/- | — | خاتون ساجد       | — | چہون                  |
| 150/- | — | خاتون ساجد       | — | دعوش                  |
| 300/- | — | فاروق انجم       | — | دعواں                 |
| 300/- | — | فاروق انجم       | — | دعزکن                 |
| 700/- | — | انوار صدیقی      | — | درخشیاں               |

آپ کی تمام شکایات سے طلب فرمائیں

## نواب سنتر پبلسٹی کیشنز

1192/1 کوچہ مہراں جامعہ اسلامیہ، لاہور (پونہ) 651-855877

پانچویں سچ بیانی

فیصلے روزانہ کے

نزہت عین ضیاء

سوال کی الجھی راہوں میں ایک سلیبی ہوتی تحریر.....



اکاؤنٹ تھے۔ باس شریف اور عزت کرنے والے انسان تھے۔ وہ اپنی ضعیف والدہ کے ساتھ رہتے تھے جو بلڈ پریشر کی مریدہ تھیں۔ اب وہ چاہتی تھیں کہ باس شادی کر لیں تاکہ انہیں آرام مل جائے۔ انہوں نے ایک بار اذیت میرے لئے باس کے رشتے کی بابت بات چینی کی تھی۔ ابو کو اس سے بجز اوروں کا چاہیے تھا۔ باس ایک چھٹے ہوئے ذہن کے مالک اور اچھی صورت و شکل کے شریف بندے تھے اور میں بھی ایم۔ ایس۔ سی کر کے مناسب دہشتے کی منتظر تھی اور پھر بہت جلد میں باس کی ذہن بن کر ان کے چھوٹے سے گھر آ گئی۔

باس اور ان کی والدہ بہت دین دار لوگ تھے۔ میرے سیکے کا حوالہ بھی اسی طرح کا تھا۔ ان لئے مجھے یہاں آ کر زور بھی پریشانی نہ ہوئی۔ ہمارا گھر جنت کا نمونہ تھا۔ اپنے معمول کے مطابق دن گزارتے رہے۔ شادی کے ایک سال بعد ہی خوش جنت کی ہدایت ہوئی اور پھر ایک سال بعد نیچے بھی ان جہان فانی میں آ گیا۔ اس عمر سے میں باس کی والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔

ہم لوگ بہت امیرانہ نہ تھی پھر بھی اچھی تعلیمی خوش گوہار زندگی گزار رہے تھے۔ نئے بڑے ہونے لگے تو میں نے بچوں کو اسکول کی تعلیم کے ساتھ ساتھ

”اب آپ کو اپنا وعدہ پورا دے تاکہ ان پر کھن لگاتے لگاتے بچوں نے مجھے مطالبہ کیا۔

”ہاں ماما! اب باس میں سوال گنت کیجئے گا“ خوشی نے بھی دو دوہ کا گلاس اٹھانے ہوئے نیچے کی میں باس ملانی۔

”اوکے..... اوکے..... بچو! مجھے یاد سے اپنا وعدہ.....! تم لوگ نائنٹ ٹائٹا گرو۔ گاڑی آنے والی ہے“ میں نے جانے کے کب خالی کر کے مہز پر دیکھتے ہوئے قدرے مسکرا کر کہا، تو دونوں بچے جلدی جلدی دو دوہ بنے گئے، تب ہی باہر بچوں کی گاڑی نے باؤن دیا۔ ”اوکے ماما! اللہ حافظ“ بچوں نے گمان نہیں پر رکھا کہ ایک اٹھا لے۔

”اللہ حافظ! دعا پڑھ کر جانا“ حسب معمول میں نے بار دلا۔ بچے باؤز بندو دعا پڑھ کر باہر کی طرف چل دیے۔

بچوں کے جانے ہی میں نے چادر اوڑھی، پر اس اٹھا کر کاندھے پر ڈالا، گھر لاک کر کے چابی پڑوسی میں رہنے والی سلیکی خال کوئی اور تیز قدم اٹھانی بس اسٹاپ کی طرف چل دی۔ آج ضرور اسکول سے واپسی پر سوئل شاپ جاؤں گی۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ مہری شادی سترہ سال پہلے باس سے ہوئی تھی۔ میرے ابو ایک سرکاری دفتر میں ملازم تھے وہ ہیں پر باس



دینی تعلیم اور قرآن پاک پڑھانا شروع کر دیا۔  
ہمارے گھر کا ماحول بہت اچھا تھا۔ جب کبھی خوشی  
دو پنا لپیٹے میرے ساتھ نماز پڑھتی اور تین سالہ نیچ  
سنگھ شلواری میں بیٹے، سر پر خوشی ٹولی لگائے یاسر کے  
ساتھ مسجد نماز پڑھنے کے لیے جاتا تو ہر کوئی اسے پیار  
کرنا اور دعا میں دیتا۔

یاسر کی دلی خواہش تھی کہ خوشی اور نیچہ دین کی صحیح سمجھ  
بوجھ کے ساتھ مکمل اور مثالی انسان بنیں اور وہ اس بات کا  
ذکر اکثر مجھ سے کرتے اور کہتے کہ میں چاہتا ہوں کہ  
میرے سب سے مکمل اور سب سے مسلمان بنیں اور میں ان کی اس  
بات پر آہن ٹیم آہن کرتی تھی۔

یاسر روز رات کو سونے سے پہلے بچوں کی دینی  
تربیت کرتے اور انہیں مختلف دعائیں، سورتیں اور  
اسلامی واقعات سناتے تھے۔ بچے دلچسپی سے سنتے  
تھے اور یاد بھی کر لیتے۔ اس کے علاوہ یاسر بچوں کی  
تفریح کا بھی بڑا دھیان رکھتے تھے۔ ہر چھٹی والے  
دن ہم بچوں کو لے کر کبھی کنٹینن تو کبھی سندباد اور لال  
دین پارک لے جاتے۔ سی ویو پر بچوں کے ساتھ  
بھاگتے دوڑتے، یاسر خود بھی بچے بن جاتے اور میں  
بھی ان کا پورا پورا ساتھ دیتی تھی۔ ہماری کبھی ہر لحاظ  
سے مکمل اور آئیڈیل ٹیمیلی تھی۔ کہتے ہیں کہ خوشی کا  
وقت بہت مختصر ہوتا ہے تو ایسا ہی ہمارے ساتھ بھی  
ہوا، دن ہوا کی طرح اڑ گئے۔

ایک رات حسب معمول یاسر بچوں کے ساتھ دعائیں  
پڑھ کر خوش گیمیاں کر کے سوئے۔ اس رات یاسر نے مجھ  
سے بہت ساری باتیں کہیں۔ میرے بارے میں، بچوں  
کی تعلیم کے بارے میں۔ مستقبل کے بارے میں اور حسین  
سننے سننے بننے یاسر کہیں کھوتے جاتے، پھر میری آواز پر  
چونک کر دو بارہ گویا ہوتے اور پھر ہم لوگ سو گئے۔

حسب معمول فجر کے وقت سب سے پہلے میں اٹھی  
اور میں نے اللہم بند کیا، پھر میں نے وضو کر کے یاسر کو  
چکایا، لیکن وہ بٹے تک نہیں۔ یاسر کا بے جان وجود کچھ کر  
میں تھوڑا کر کر پڑی۔ وہ رات کے کسی پہر ہم سب کو روتا  
بلکلا جھوڑ کر اپنے خائب حقیقی سے جا ملے تھے۔ وہ ایسی  
جگہ چاچکے تھے کہ جہاں سے میری اور بچوں کی آہیں،

سسکیاں اور خرچنا بھی انہیں واہیں نہیں لاسکتا تھا۔ ہماری  
ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھنے والے یاسر آج بالکل خاموش  
تھے۔ ایک جامہ اور مٹھکن مسکراہٹ ان کے لبوں پر تھی۔  
شاید وہ مجھے اس کا بل سمجھتے تھے کہ میں بچوں کو ان کی  
خواہش کے مطابق تربیت دے سکوں گی جب ہی تو وہ  
اس قدر مطمئن تھے۔

اتنا بڑا احمد سر برداشت کرنے میرے لیے آسان  
نہ تھا۔ میں تو بالکل کھلم کھرا رہ گئی تھی۔ مجھے تو خود کو سینٹا  
مشکل ہی نہیں بلکہ اب تو نامکن لگ رہا تھا۔ میں تو اپنے  
ہوش و حواس کھوئے گئی تھی۔ اور شاید کبھی وہ جی، جب ہی  
خوشی اور نیچہ میرے سامنے آگئے اور میں نے یہ مشکل خود  
کو سمجھایا۔ میرے سامنے صرف اور صرف یاسر کی  
نمائیاں میرے یہ بیٹے تھے۔ ان کا مستقبل تھا۔ میں نے  
اپنا بار اہوا حوصلہ اور ٹولی ہوئی ہمتوں کو جمع کر کے خود کو  
آنے والے وقت کے لیے تیار کیا۔ نہ جانے اتنا حوصلہ



ساری ساری رات جاگ کر خدا کے حضور رو کر اپنے اور بچوں کے لیے دعائیں مانگی۔ الحمد للہ آج میرے بچے جوانی کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔ میری تربیت اور کوششیں رائیگاں نہیں گئیں۔ میرے بچوں کی تعریف خاندان، محلے، اسکول فرض ہے کہ ہر جگہ کی جاتی ہے اور ان کی تعلیم و تربیت کی مثالیں دی جاتی ہیں۔

ناہزی، انکساری، محبت، شائستگی، میرے بچوں کی شخصیت کا خلاصہ تھیں۔ تب ہی تو ہر کوئی انہیں رکھنے کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور جب وہ میری تقریریں کرتا تو میری آنکھیں شکر سے جھپک جاتی اور میں خدا کے حضور جھک کر شکر مانے اور کرتی کہ اس نے مجھے جس امتحان میں ڈالا۔ الحمد للہ اس میں کامیاب بھی راستی اور نمایاں پوزیشن بھی ملی۔

خوشی منظر کے میں تھی اور بیچو نامکتہ کا اس میں تھا۔ میرے بچے جس اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ وہاں کے بچے بھی ایسی گاڑیوں میں آتے تھے۔ زیادہ تر بچے امیر کبیر فیملیوں سے تعلق رکھتے تھے۔ بہت سے بچے پیسے کی زیادتی اور بے تحاشا آزادی سے بگڑ بھی چکے تھے۔

فورتحہ اور فتنہ کاہاں کے بچے آزادی سے موبائل استعمال کرتے تھے۔ پچھلے کچھ دنوں سے خوش اور فوجی موبائل فون لینے کی ضد کر رہے تھے۔ شہر کے حالات بھی آج کل کچھ زیادہ ہی خراب رہنے لگے تھے۔ اچانک ہی کہیں نازنگہ، دو جاتی تو کہیں، ہم بلاست ہو جاتے اور بچوں کی گاڑی راستے میں پھنس جاتی۔ ان حالات میں، میں بہت پریشان ہو جاتی تھی۔ اس لیے وقت اور حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے سوچا کہ اس وقت ان کی سائیکل پر دونوں بچوں کو موبائل گفٹ کر دوں گی، گوکہ میں سائیکل وہاں سے نہیں منانی تھی لیکن..... بچوں کو گفٹ ضرور دے دیا کرتی تھی۔ دونوں کی سائیکل بھی میں آتی تھی، لیکن ایک ہفتہ بانی تھا بھی دونوں کی سائیکل میں۔ آج میری سائیکل لٹنے وہلی تھی۔ اس لیے آج ہی میں نے موبائل لینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ ویسے بھی موجودہ حالات میں موبائل ایک اہم ضرورت بن گیا تھا۔ بچے کہیں بھی ہوں ان سب سے ہیں، اس لیے میں نے بھی ان کی اس ضرورت کو سمجھ لیا تھا۔

اور بہت جلد بھی عورت میں کہاں سے آگئی تھی۔ اب اور امی نے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جانے کے لیے کہا، لیکن میں نے صاف منع کر دیا۔ باس ایک خود دار انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے کسی قابل سمجھ کر ہی اتنی بڑی آزمائش میں ڈالنا تھا اور اب مجھے ہر صورت اس آزمائش کو احسن طریقے سے نبھانا تھا۔

میں خود بھی ایک جوان اور باہمت و باحوصلہ خوب صورت عورت تھی اور اب یہ دو مضموم بچے جنہیں ماں اور باپ ہی کر لینا میری ذمے داری تھی، کئی لوگوں نے مجھے عقیدتانی کا بھی مشورہ دیا لیکن میرے لیے صرف اور صرف باس کی خواہشات اور بچوں کا بہتر مستقبل معنی رکھتا تھا، لہذا آنے والے وقت کے لیے میں خود کو بہتر طور پر تیار کر چکی تھی۔

باس کے دفتر سے ملنے والی رقم میں نے بینک میں فیکس کر دئی، جہاں سے ہر ماہ مجھے ایک معقول رقم مل جاتی تھی۔ گھر سیرا ڈالتی تھا، اس لیے وہاں کے حوالے سے کوئی پریشانی مجھے نہیں تھی۔ عدت کے ختم ہوتے ہی میں نے اسکول میں جا بک کی کوشش شروع کر دی۔ جلد ہی ایک اچھے اسکول میں مجھے معقول سیکری کی جا بک مل گئی۔ خوشی اور ٹھیکہ میں نے شہر کے بہترین اسکول میں ایڈمیشن دلوا دیا۔ میری تنخواہ سے بچوں کی فیس اور گاڑی کا خرچہ اور بچوں کی پڑھائی کے اخراجات نکل جاتے تھے، جبکہ آنے والی رقم سے گھر کے دیگر اخراجات چلتے تھے۔ وقت کے ساتھ میں نے کچھ قرضہ لے کر اوپر کا پورٹن بنوایا تھا اور اوپر ایک شیلی بطور کرایہ دار رہنے لگی تھی۔ یوں آمدنی مزید بڑھ گئی تھی اور آنے والے کرایہ کی رقم میں سے آدھی رقم قرضہ میں چٹائی جاتی تھی۔

میں اپنے بچوں کو ریاضی اور دینی تعلیم، دونوں کے لیے برابر برابر نام دیتی تھی۔ ہمارے یہاں رمضان المبارک میں ظہر کی نماز کے بعد ہم لوگ قرآن پاک کی تلاوت کی، یہ ڈیر سننے اور اپنی غلطیاں سدھارتے اور اپنے تھکا مزید بہتر بناتے تھے۔

اسی طرح سال پہ سال گزرتے رہے، گوکہ پچھلے کچھ سال میرے لیے بے حد دشمن اور صبر آزما تھے۔ میں

# دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ تقریب 27 2014ء



عزیز علی خان، سہ ماہی، سید شاہد حسین، مہتاب اکبر راشدی اور محمود شام آغا



محمود شام آغا



مہتاب اکبر راشدی



سید شاہد حسین



سٹیج پر ایوارڈ دینے والے اور جیتنے والے 2014ء کی دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ جیتنے والے اور جیتنے والے

### خصوصی ایوارڈ یافتگان



حضرت سہامہ رزاقی صاحبہ کو ایوارڈ پیش کیا

عزیزہ امینہ کو ایوارڈ پیش کیا



فرزاتہ طاہرہ، سہلی بیگم اور دروازہ بیگم کو ایوارڈ پیش کیا۔ اس موقع پر سہلی بیگم اور دروازہ بیگم نے بھی ایوارڈ حاصل کیے

### پیشکش کنندگان



فرزاتہ طاہرہ، سہلی بیگم اور دروازہ بیگم کو ایوارڈ پیش کیا۔ اس موقع پر سہلی بیگم اور دروازہ بیگم نے بھی ایوارڈ حاصل کیے



فرزاتہ طاہرہ، سہلی بیگم اور دروازہ بیگم کو ایوارڈ پیش کیا۔ اس موقع پر سہلی بیگم اور دروازہ بیگم نے بھی ایوارڈ حاصل کیے



ادھر میرے ذہن میں وہاں کے سے ہونے لگے۔  
 یہ مشکل پندرہ سولہ سالہ اسفند اور سخی بہ کبھی  
 بائیں کر رہے تھے اور..... اور کتنی آسانی سے اپنے  
 والد بن اور مضمون لڑکوں کو دھوکا دے رہے تھے۔  
 میں نے دونوں باتوں سے اپنا سر تقام لیا۔ بریک فتم  
 ہو گیا تھا اور سب بچہ زکلاں لینے کے لیے چلی گئی،  
 لیکن میں وہیں بیٹھی رہ گئی تھی۔ اسی وقت ایک لمبے  
 کے لیے اسفند اور سخی میں مجھے نیپو کی شبیہ نظر آئی اور  
 میں نے جھرجھری لے کر نوپڑی کی۔ بے شک موبائل  
 وقت کی اہم ضرورت ہے لیکن..... آج کی اس نسل  
 نے اسے کھلو کار و لطیف بنا دیا ہے۔ کھلو تا اس لیے کہ  
 وہ اس سے جس طرح چاہیں کھیل سکتے ہیں پھر لطیف کی  
 طرح اس پر بستے ہیں۔

خدا ناخواستہ اگر میرے بیچ بھی اس طرح..... اس  
 کے بعد میرے سارے بدن پر جیسے کانٹے سے چھینے گئے  
 تھے۔ اللہ نہ کرے۔ میں بے ساختہ بڑ بڑائی۔ جوان بچے  
 تھے۔ دوسروں کو دیکھ کر دل میں وسوسہ جنم لے سکتا تھا پھر  
 شیطان نے ہر وقت درغلخا تا رہتا ہے۔ اگر خدا ناخواستہ  
 میرے بیچ..... اللہ! میں تو مری جاؤں گی۔ میں نے  
 ایک بار پھر جھرجھری لی تھی۔

نب مجھے احساس ہوا کہ آج کل کے والدین  
 چھوٹے چھوٹے بچوں کے ہاتھوں میں موبائل دے کر  
 بے فکر ہو جاتے ہیں اور وہ بوجھنے کی زحمت بھی کوادہ  
 نہیں کرتے کہ بچے اس کا استعمال کس طرح کر رہے  
 ہیں..... اور میں..... میں جانتے بوجھتے اپنے بچوں کو  
 یہ نکتہ نہیں ددوں گی۔ میں اپنی برسوں کی محنت اور زہنت  
 کو کسی صورت واؤ پر نہیں لگاؤں گی۔ نب ہی میں نے  
 فیصلہ کر لیا۔ گو کہ اس فیصلے سے میرے بیچ مجھ سے  
 ناراض ہو جائے، لیکن ان کی کچھ دن کی ناراضگی مجھے  
 منظور تھی۔ میں انہیں مٹا سکتی لیکن..... اپنے ہاتھوں  
 سے انہیں ایسا ختم نہیں دے سکتی تھی کہ جسے وہ کرمیں  
 لے سکوں ہو جاتی۔ میں اپنے اس فیصلے سے بالکل  
 مطمئن تھی اور آج بھی مجھے اس بات پر پورا پورا  
 اطمینان ہے۔

☆.....☆

جب بریک ہوا تو ساری ٹیچرز اسٹاف روم میں جمع  
 ہو کر چائے پینے لگیں اور میں بھی وہیں بیٹھ کر چائے پینے  
 کے ساتھ ساتھ ٹیبلٹ کا پیاں چیک کرنے لگی۔ نب ہی  
 لائٹ چلتی گئی اور میں کا پیاں اٹھائے جالی کی کھڑکی کی  
 طرف آگئی جہاں سے ہوا اچھی آ رہی تھی۔ دوسری  
 طرف نیشنلسٹان اسکول کا چھبھا گراؤنڈ تھا اور اندر سے  
 اس کا نظارہ باہر صاف نظر آتا تھا لیکن باہر سے اندر دیکھنا  
 ناممکن تھا۔ میں کرسی چھینٹ کر کھڑکی کے پاس ہی  
 آ بیٹھی اور دوبارہ کا پیاں چیک کرنے لگی۔ نب ہی  
 کھڑکی کے اس پار ہونے والی مہم ہی گنگو نے مجھے  
 اپنی طرف بل کر لیا۔ ساری ٹیچرز باؤن میں معروف  
 تھیں۔ آواز جالی پہنچانی ہی لگ رہی تھی۔ میں نے  
 مارے تجسس کے اٹھ کر کھڑکی کے پار دیکھنے کی کوشش  
 کی۔ وہ دکلاں نا کتھ کا اسفند تھا اور اس کے ساتھ اس کا  
 کلاں کا دوسرا بچہ سخی تھا۔

”دیکھ سخی! یہ نمبرو اپنے موبائل میں فیڈ کر لے اور  
 پاں ڈرا دل بھر کے ٹیک کر تا اس نمبر کو۔ سالی مجھ سے  
 بدتمیزی کرتی ہے اور باں یہ نمبر اپنے سارے دوستوں  
 میں بانٹ دیا۔“ نبہ آواز اسفند کی تھی۔

”او کے بارہ تو فکر نہ کر..... اور ستا وہ سی ویو والی  
 سے کیسے تعلقات ہیں تیرے..... سخی نے جواب کہا۔  
 ”ارے بارہ وہ تو کھلے کا ہارن گئی ہے، ملتا جانتا ہے  
 اور نہ تو نمبر ہی یہ سم کچھ دن اپنے پاس رکھے۔ اپنی ماما  
 کو غلطی سے میں نے ٹیک کر دیا تھا۔ کس نمبر کی ماما پاس  
 میرا نمبر دے کر شکایت کر رہی تھی کہ اس نمبر سے انہیں  
 کوئی ٹیک کر رہا ہے۔ زرا وہ کبھیس۔ کون ہے۔ میرے پاپا  
 نے نمبر نو لے لیا ہے۔ لیکن..... یہ کہہ کر سخی نے اپنی سم  
 اسفند کی طرف بڑھائی۔

”نسن! بارن سنڈے میرے ساتھ تو ہل پارک چلانا۔“  
 ارے بار..... وہ جگلی سے ملتا ہے پھچھے پڑ گئی ہے  
 ملنے کے لیے اسفند نے سم ہاتھ سے لے کر کہا۔ ساری  
 رات وہ بائیں کرتی رہتی ہے۔ کل تو ماما میرے کمرے  
 میں آئیں۔ میں نے فوراً ہی کتاب آگے کر لی وہ  
 کبھیس کہ میں پڑھ رہا ہوں۔“ اسفند کے جملے کے اختتام  
 پر دونوں زور سے ہنس رہے۔





عارف رمضان

خاندانی انتشار کی آگ میں جہنم والی ایک لڑکی کی داستان الم

•••••

فدا۔ وہ آٹھ بڑی نو کہا اردو بھی اچھے طریقے سے نہیں جانتا تھا۔ وہ بائیں پر نظر ڈالی اور یہ سوچا کہ کبھی جاننے والے کی کال ہوگی رہ بسبب کی۔

دوسری طرف کی آواز کچھ جانی پہچانی سی لگی۔ کال کرنے والے نے اپنا نام بتا کر ابو ذر بن محمد کے چہرے سے اجنبیت ناکب ہو گئی اور وہ اس سے ہوں بات کرنے لگا جیسے کوئی بہت فریبی رہنے وار ہو۔

اب روزانہ ہی وہ دین محمد کو کال کرتا اور گفتگوں باتوں میں مصروف رہتا۔

”ایک دو دست سے، بہت ہی اچھا انسان ہے بلکہ وہ مجھے اپنا جانا کہتا ہے۔“ دین محمد نے گھر والوں کو اس نوجوان کے بارے میں بتایا کہ دونوں اس نوجوان کا نام آصف ہے جو انہیں بس اشاب بر ملا تھا۔

آصف کی بے تکلفانہ اور فطرتانہ باتوں نے دین محمد کو اس کا گروہ بدہ بنا دیا۔ آصف بھی دین محمد کو وہاں کا پبلٹس سمجھتا تو بھی ہمیشہ کا بنا دیا ہوتا۔

ان دونوں کی اپنائیت نے ایک خاص مزہ لیا۔ اب وہ ایک دوسرے کو گھر پر بھی مدعو کرنے لگے۔ کبھی دین محمد آصف کے شہر جاتا تو کبھی وہ دین محمد کے گاؤں آجاتا، دونوں کافی دیر تک بیٹھے کہیں باتیں۔ اس کی باہمی پردہ

”سلام! ہاے مہاں کیسے ہیں؟ کس فلاں شہر سے آیا ہوں اور مجھے دوسرے شہر جاتا ہے۔ یہاں برا کوئی جاننے والا نہیں ہے۔ کہا آپ میری ٹھونڈی نی رہنمائی کر سکتے ہیں؟“ ہاں کھڑے نو جوان نے بڑی عمر کے شخص سے درخواست کی۔ ہاے مہاں نے اس کو فوراً سمجھو مارا پھر اپنی نوجب سے نوجوان اجنبی کی بات سنی۔ نوجوان نے اپنا نام آصف بتایا۔ وہ دوسرے شہر میں کئی کام سے جا رہا تھا راستے میں کسی چہرے سے ان کا جہاں اس کی کوئی جان پہچان نہیں تھی۔ وہ کچھ دیر یہاں رکا تو اس شہر کے بارے میں کچھ معلومات لینے میں مصروف ہو گیا۔ ہاے مہاں جن کا نام دین محمد تھا، جس کی مصورت سے کافی سمجھ دیا، اور بڑے بارے سے اس نوجوان کی بات نوجب سے سننے کے بعد اسے فریبی سمجھ بولیں میں لے گیا۔ ابھر ادھر کی باتوں کے دوران موبائل فونوں کا تبادلہ بھی ہوا پھر وہ ایک دوسرے سے اجازت لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

اب یہ اجنبیت شناسائی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ان کا ایک دوسرے کو الوداع کہنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کے چنگری دوست ہوں۔

ایک دن بعد ہی دین محمد کے موبائل پر ایک اجنبی نمبر سے کال آئی۔ دین محمد کا غلظ ان پڑھ گھرانے سے

میں کام کر رہا اور عمر میں پختہ کی روک آتا جاتا۔

دین محمد اپنی سب سے چھوٹی بیٹی معراج کی شادی کے بارے میں کافی پریشان تھا مگر آصف سے بھی اس کی نسبت غلط نہیں کر سکتا تھا، کیوں کہ اُسے وہ اپنے بیٹوں جیسا سمجھتا تھا۔ معراج ہمیشہ آصف کے لیے کھانا لے کر آئی اور کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا تھا کہ آصف آتا تو معراج گھر میں لاپٹی ہوتی تھی۔ یوں وہ ایک دوسرے کو دل ہی دل میں پسند کرنے لگے تھے۔ معراج کو ہمیشہ آصف کا انتظار رہتا تھا، وہ آصف کی راہ چنی رہتی تھی۔

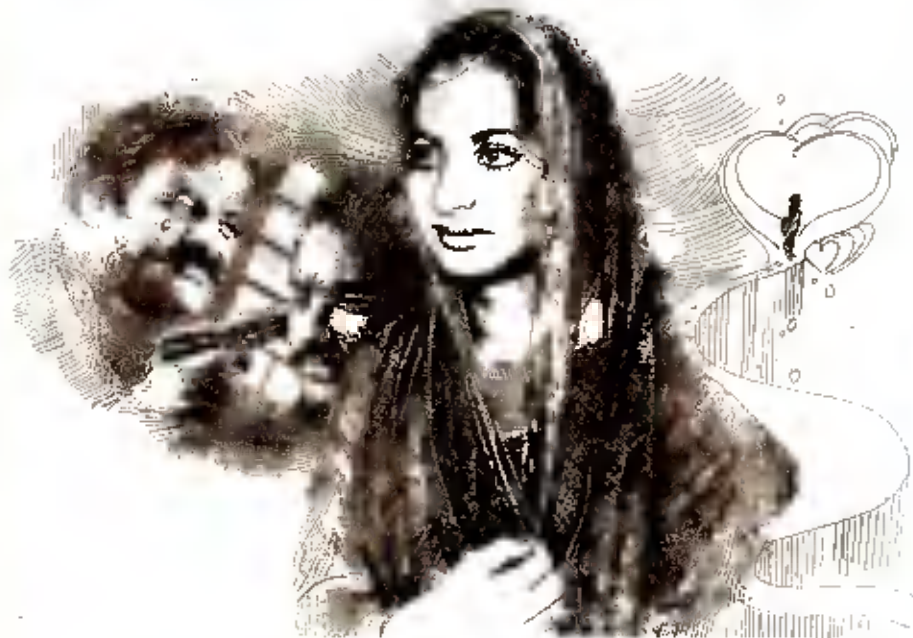
ایسے ہی دن گزرے گئے اور معراج کی منہی محبت پھل پھول کے ایک تادور درخت بن گئی۔ معراج سے اب اور انتظار نہیں ہو پا رہا تھا، اور آخر کار اُس نے ایک دن آصف سے دل کی بات کہہ ہی ڈالی۔ ادھر آصف بھی جیسے اسی انتظار میں تھا، اُس نے بھی غلابری طور پر اپنی محبت کا یقین دلادیا۔ تاہم، آصف کے دل میں کچھ اور چل رہا تھا جسے وہ محسوس نہیں جانتی تھی۔ آصف نے معراج کے منہ سے محبت کے یہ دو جملے سنیے کہ

محمد اپنے کسی بیٹے کے ذریعے بس اسباب تک محدود رہتا۔ دوسری جانب دین محمد کے محلے داروں اور اہل خانہ کو اس کا یوں ایک ایسی نوجوان سے تعلقات بڑھانا کچھ مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی بارہبھائی نے کی کوشش کی گئی مگر بے سود۔ وہ ہمیشہ سب کے اعتراض پر ایک بات کہہ کر ان کا منہ بند کر دیتا۔

”آصف میرے لیے بیٹوں جیسا ہے اور اسے یہاں آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔“

دین محمد خود ایک سلجھا ہوا زمیندار اور اصحاب انسان تھا جس کی وجہ سے کسی کی بھی اس کے آگے نہیں چل سکتی تھی۔

دین محمد اور آصف کے تعلقات کی وجہ سے اس کے گھر والے بہت تنگ تھے مگر ان باتوں سے دین محمد کو کوئی فرق نہیں پڑا۔ اسے آصف پر حد سے زیادہ یقین تھا۔ وہ ہر وقت اس کے اعلیٰ اخلاق کے سن گا رہتا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا ویسے ویسے دین محمد کا اعتماد آصف پر پختہ ہوتا جا رہا تھا۔ اب تو آصف اُس کے گھر پر کئی کئی راتیں بھی بسر کرنے لگا تھا۔ وہ دین محمد کے ساتھ کچھ دن



لے جانے کتا، چلا گیا۔ آج دو گھر والے وقت بہت خوش تھا۔ اپنے شہر تاج کے دو گھر جانے کے بجائے نکلیں اور چلا گیا۔



کچھ سر دیشیوں کے بعد وصف کی آواز نمایاں تھی۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا: "جس کے لیے برسوں انتظار کیا ہے تو وہ دن تو آیا، اور اب اس سے مزید صبر نہیں ہو رہا۔ اس کام کو جلد سے جلد ہو جانا چاہیے۔" دوسری طرف کسی خاتون کی آواز تھی جو اسے احتیاط سے کام کرنے کو کہہ رہی تھی۔ "جلد بازی میں کوئی نقصان بھی ہو سکتا ہے، جہاں ہم نے اتنا صبر کیا ہے تمھوڑا اور صبر کر لو تاکہ معاملات بہتر انداز میں انجام پائیں۔"

آصف کے دل میں نہ جانے کیا چل رہا تھا اور وہ کس سے اپنی راز و راوی شہر کر رہا تھا؟ یہ ابھی تک کسی کو معلوم نہیں تھا۔ دوسری جانب معراج کو ہر چیز میں آصف نظر آنے لگا تھا، اسے اب زندگی کی صحیح معنوں میں زندگی لگنے لگی تھی۔ اب وہ دو دن محمد کی چھوٹی نادان بچی میں وہی تھی۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ اسے والدت سے کہہ دے کہ وہ اب چھوٹی نہیں رہی، سب کچھ سمجھنے لگی ہے مگر وہ کہہ نہیں سکتی تھی۔ لگاؤ و مروت کا خیال رکھتے دیکھنے کی وہ بیٹ بٹھے۔ اب تو آصف نے اس سے ضد بھی کوئی شروع کر دی کہ وہ جلد از جلد اس سے شادی کرنا چاہتا ہے جس کے لیے اس نے اپنے گھر کے کچھ اٹنے سیدھے مسائل بھی بیان کیے کہ اگر وہ اس سے فورا شادی نہیں کرے گا تو اس کے گھر والے اس کی شادی کسی اور کر دیں گے۔ آصف کی اٹنی سیدھی باتوں نے معراج کو کافی حد تک جذباتی کر دیا تھا۔ آخر اس نے بھی وہی عمر میں سخت فیصلہ کرنے کا واہہ کر لیا۔

آصف کی شیطانی چالیں اپنا کام کر رہی تھیں۔ جو وہ چاہ رہا تھا سب کچھ ویسے ہی ہوتا جا رہا تھا۔ معراج کی معصومیت نے وصف پر اندھا اعتبار کیا تھا اور شاید آصف کی طرف سے اسے اس اعتبار کا بہت برا انجام ملنے والا تھا، کیوں کہ آصف کی معراج کے ساتھ بات چیت کے ساتھ کسی اور کے ساتھ خفیہ مبینگر ایک سوالیہ نشان تھیں۔ آخر باتوں ہی باتوں میں معراج کو معلوم ہوا

کس کے پاس کی جہت تھی اور اسے جڑنے جاوے جس اور اس سلسلے میں انہوں نے اپنے بیٹوں سے مشاورت بھی کر لی ہے۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ بھائیوں کے پر زور احتجاج پر اس کے ابا نے اس کے بارے میں اہم فیصلہ کرنے کا سوچ لیا ہے۔

معراج نے وصف کو بتایا کہ آج ابامحلی کے کسی لڑکے کے ساتھ اس کی شادی کی بات کر رہے تھے۔ معراج کے لہجے میں تشویش تھی مگر آصف کو اس بات کا کچھ خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس نے ہاں بولیں میں بات نال دنی۔ معراج نے آصف کو بارہ سے پکڑ کر چھوڑا اور بات کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی تو آصف نے غصے میں کہا: "پھر میں کیا کر سکتا ہوں، کیا تم میرے ساتھ بھاگ جانے کے لیے تیار ہو؟" یہ ایسی بات تھی جس کا معراج نے زندگی بھر سوچا تک نہیں تھا۔ اسے وصف کا یہ رویہ بگاڑنا سا لگا تھا۔ وہ کاتب اٹھی گئی اور گھبرائے ہوئے انداز میں پھٹی آنکھوں سے وصف کا چہرہ دیکھتی وہ گئی۔ اس کے پاس آصف کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ بات سن کے آصف بھی اس کی طرح پریشان ہو جائے گا اور اسے اس کا وشت مانگ لے گا، مگر آصف نے تو دوسرا راستہ چنا تھا جس کے بارے میں معراج کا ٹھکانا داغ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے تو ہمیشہ شادیوں میں دلہن کی طرح خود کو سجا کر ذہنی میں آصف کے ساتھ رخصت ہونے کے خواب دیکھے تھے۔ اس نے رخصتی کے وقت دل کھول کر رونے، ماں کو ایک اچھی بیوی بن کر ہونے کا وعدہ کرنے کا بھی سوچ رکھا تھا۔ آصف کی باتوں نے اس کے سارے ارمانوں کا خون کر دیا تھا۔ اب اسے وہ فیصلہ کرنا تھا جس کے بعد زندگی رسوائیوں کی راہ پر گامزن ہو جاتی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ جس مراد کو چھپنے پر غور کر رہی ہے وہ وہ شکایت، کائناتوں اور بدنامیوں سے بھری ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس راز پر چلنے سے نام صرف اس کا خاندان برباد ہوگا بلکہ اس کی آخرت بھی داؤ پر لگ جائے گی اب چند لمحوں میں اسے فیصلہ کرنا تھا۔ وہ داغ اور دل کو فیصلے کا اختیار سونپ کر خاموشی سے وصف کی طرف دیکھنے لگی۔ آخر دل، داغ پر حاوی ہو گیا اور معراج نے زندگی کا سب

ذہن سے بچے اڑنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ اس نے گھبرا کے خود کو کھینچے ہوئے ابھرا ہوا دیکھا اور کوچ سے اتر آئی۔ کچھ لڑکوں نے آگے بڑھ کر اس کا مختصر سامان اٹھا لیا اور دو پیدل چلنے ہوئے ایک بڑی سی حویلی کے دروازے پر پہنچ گئے۔ دروازے پر بڑا سا تالا لگا ہوا تھا۔ انہی لڑکوں میں سے ایک نے آگے بڑھ کر اسے کھولا اور حویلی میں داخل ہو گیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ واپس آیا اور سب کو اندر آنے کو کہا۔ معراج کی کچھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ دو بہت ہی سب کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اس کی ظاہری حالت سے صاف واضح تھا کہ جیسے وہ اپنے اس فیصلے سے ناخوش ہے اور اب اس کی سزا بھگتنے کے لیے خود کو تیار کر رہی ہے۔ حویلی کا صحن کافی بڑا تھا۔ لڑکے وہیں حویلی میں چھوڑ کر آصف کی ہدایت پر واپس چلے گئے، والہتہ وہ جانے ہوئے حویلی کو باہر سے دہ بار دو تالا لگا کر گئے۔ جس نے معراج کو مزید پریشان کر دیا تھا۔

آصف اور معراج اکٹھے تھے۔ اب معراج کو کچھ حوصلہ ملا تھا۔ وہ ان لوگوں کے لیے برسوں سے نوپ رہی تھی۔ آخر وہ وقت آ گیا تھا کہ جب وہ آصف کے ساتھ اکیلے میں بلا خوف و خطر بیٹھ کر ذہن سارنگی بائیں کر سکتی تھی۔ وہ اسے اپنا چہین بنا لیا جیسا کہ وہی اور ان سے ان کے بارے میں پوچھتا جا سکتی تھی۔ آصف جیسے وہ روزہ دہشت و ہر ہل سونہی تھی اور اپنے ہر خواب میں اسے ہی دیکھتی تھی، آج وہ خواب حقیقت بن گیا تھا۔ معراج کو پہلی بار ایسا لگا تھا کہ اس کا فیصلہ درست ہے۔ وہ بھی اپنی مرضی کی زندگی جتنا جانتی ہے اور اس کا بہن اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ سورج ڈھلنے لگا تھا۔ آسمان پر بادل ٹپکی کر رہے تھے۔ دروازے سے پہلے ہی دستک ہوئی جس نے معراج کا دل زور زور سے ہلکانے لگا۔ آصف نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے انہی لڑکوں میں سے ایک ہاتھ میں شاپر لیے کھڑا تھا۔ آصف نے اس سے شاپر لیا اور معراج کے پاس رکھ کر اس لڑکے کے ساتھ باہر چلا گیا۔ کچھ دیر تک آصف اس سے بائیں کرتا رہا پھر اسے رخصت کر کے واپس ڈھک گیا۔ شاپر میں کچھ کھانے کا سامان تھا اور کچھ دیگر ضروریات کی چیزیں تھیں۔ معراج کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ آصف کی آنے والے لڑکے سے بات چیت کے

راست کا دوسرا پتہ شروع ہوتے ہی وہیں گھر کے گھر سے وہ ہولے نکل کر وہی سڑک پر آگے چلا گیا اور افراد موٹر سائیکلوں پر ان کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ موٹر سائیکل کی روشنی میں معلوم ہوا کہ وہیں گھر کے گھر سے نکلنے والے وہ ہولے آصف اور معراج کے تھے۔ معراج گھبرائی ہوئی خود کو ایک بڑی سی چادر میں سینے آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ دور دور تک کوئی نہیں تھا، وہی کہیں سے کونوں کے بھونکنے کی آواز سن آ رہی تھی۔ جب کوئی آواز معراج کی بائیسوں سے گرائی وہ چونک کر اپنے گھر کی دہلیز کی طرف دیکھی۔ معراج اور آصف ایک موٹر سائیکل پر بیٹھے نو معراج نے آخری بار اپنے گھر کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اسے شاید اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا جسے آصف نے واضح محسوس کیا اور اس خطرے کے پیش نظر کہ کبھی معراج واپس نہ چلی جائے، موٹر سائیکل کی رفتار تیز کرنے ہوئے وہاں سے دور۔ اور دور ہوتا چلا گیا جب کہ معراج نے اس وقت تک اپنے گھر پر نظر نہیں لگائے تھے کہیں جب تک کہ وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔

☆ ☆

معراج ایک بڑی کوچ کے ذریعے دوسرے شہر میں آ چکی تھی جیسے اس نے پہلی بار دیکھا تھا، لیکن اسے شہر کی چکا چوند روشنی سے وحشت ہو رہی تھی اور وہ رہ گھر یا آ رہا تھا۔ اسے گھر سے یوں چلے آنا بہت بڑا لگ رہا تھا۔ وہ خود کو دل ہی دل میں برا بھلا کہہ رہی تھی۔ ”ہاں... وہ بڑی ہے، بہت بڑی۔ اس نے اپنی محبت دینے والی ماں کو دکھ دیا ہے۔ سب سے الگ شہنشاہ بننے والے باپ کو دھکا دیا ہے۔“ اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا۔ وہ انہی خیالوں اور دوسروں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ کسی نے اسے بچے اڑنے کا اشارہ کیا۔ وہ چونک پڑی اور اپنے ارد گرد کے ماحول کا جائزہ لینے لگی۔ اسے احساس تک نہیں ہوا کہ کچھ ہی لمحوں میں وہ اپنیوں سے بیچوںوں میں آ چکی ہے۔ اس کو آصف سمیت سارا کا سارا ماحول اچھین لگا۔ اس کا دل زور زور سے ہلکا رہا تھا۔ وہ حقیقت میں خوف زدہ ہو گئی تھی۔



معراج کے والدین است ذمہ دہم نہ کرنا حال ہو چکے تھے۔ دین محمد کی عمر اگرچہ کافی تھی مگر بیٹی کے اس صدمے نے اس کی عمر میں بیسویں برس کا اضافہ کر دیا تھا۔ شام تک وہ بیٹی کی تلاش میں بھی دوڑھو رہی اور صبر مارا مارا پھر رہا مگر کہیں کوئی معراج نہ پا کر آخر کار اپنی قسمت پر روتا ہوا گھر لوٹ آیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ لوگوں کو جواب دینے کی بجائے خود زمین میں دفن ہو جائے۔ کہتے ہیں کہ انسان خود نہیں مرتا، اسے تو لوگ مار دیتے ہیں۔ دین محمد بھی لوگوں کو نظروں سے نہ جاننے کے لیے راتوں رات گھر خالی کر دینا چاہتا تھا مگر وہ کس کے پاس جاتا؟ اب تو کوئی اس کو اپنے پاس جگہ دینے کے لیے تیار بھی نہیں تھا۔ اس پر زمین باد جو رانی فریخی کے ننگ ہو کر رو گئی تھی۔ دوسری جانب ماں بھی جو روتے روتے تھک چکی تھی۔ اب تو اس کے آنسوؤں نے بھی جواب دے دیا تھا۔ بھائی صبح کے گھر سے نکلے نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ شاہراہ کی ان ٹیڑھی گوارائیں کمری تھی کہ وہ لوگوں کا سامنا کریں۔ معراج چند ہی لمحوں میں بیٹھے بستے گھر کو ویران کر گئی تھی، ایسا ویران کہ تسلیں دہن تسلیں اس نشان کو نہ مٹا پائیں۔

☆.....☆

آفتاب نے کھڑکی کی اوٹ سے سر نکالا تو معراج جیسے بڑا اکراٹھ بیٹھی۔ اسے لگا تھا جیسے وہ اپنی ماں کے گھر پر ہوا اور اب کافی دیر ہو گئی ہے۔ تمام کام ادھر سے چڑے ہیں، مگر پھر اسے احساس ہوا کہ نہیں... اب وہ ان سے سیکڑوں کلومیٹر دور نہ جانے کہاں پر ہے۔ اس کا دل زور زور سے رونے کو چاہ رہا تھا۔ اس کے انتہائی صدمہ کے باوجود آندھ جھلک کر اس کے دشاہروں پر پھیل گئے۔ اس نے دوپٹے کے پلے سے آنسو پونچھے اور پھر خود کو سمجھانے والے انداز میں دلاسار دینے کا کام کوشش کرنے لگی۔

آصف نے آج کسی قاضی سے بات کر کے معراج سے باقاعدہ نکاح کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ معراج بھی بیٹھی چاہتی تھی کہ اپنے اس رشتے کو جلد از جلد پاکیزگی بخشے جس کے لیے اس نے صبح ہی آصف سے بات کی تھی۔ آصف قاضی سے بات کرنے کا کبھی باہر چلا گیا تھا۔ وہ پھر کے وقت آصف لانا تو اس کے ساتھ کچھ اٹرا رہی تھے اور بقول

متعلق پوچھتے مگر اسے کتنا ہی سمجھ کر خاموش رہی۔ وہ آصف کے بارے میں یہ سوچنا بھی مگنا، تحقیق کئی کہ آصف اس کے خلاف بھی کوئی بات کر سکتا ہے۔

رات کے اندھیرے لیے ہو رہے تھے اور محلے کے گھروں میں لوگ بیتاب، بھگا کر سونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ معراج بڑا ایک کونے میں کھلی بیٹھی تھی۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ مسلسل اپنی اماں اور ابا کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ نہ جانے ان کے ساتھ کیا ہوتی ہوگی۔ اسے بھائیوں کا غصہ بھی ڈرا رہا تھا کہ اگر انہوں نے اسے دھونڈ لیا تو قسمت آجائے گی۔ اس کے راز میں دوسروں کے جھگڑ چل رہے تھے جس کی وجہ سے اس کا سر بھی درد کے بارے پھٹ رہا تھا۔ اسے میں دردناکے پر دستک ہوئی۔ وہ منتظرانہ نظروں سے دردناکے کی طرف دیکھنے لگی۔ آصف جو نیند کے سے انداز میں لیٹا ہوا تھا، فوراً اٹھ گیا جیسے وہ نیند میں کم اور انتظار میں زیادہ تھا۔ دردناکے پر ایک خاتون اور بڑی عمر کے دوسرے تھے۔ آصف انہیں اندر لے آیا۔ اس نے خاتون کا تعارف اپنی خالہ اور مردوں کا تعارف خالہ اور ان کے بھائی کے طور پر کر لیا۔ دو تینوں مسلسل معراج کو گھورے جا رہے تھے۔ نہ جانے کیوں معراج کو ان سے خوف آنے لگا تھا۔ اسے ان کی نظروں میں سفاکیت محسوس ہو رہی تھی۔ کہتے ہیں، جسمی نفس انسان کو خطرے سے متعلق خود ہی آگاہ کر دیتی ہے۔ معراج کی کبھی چٹھی جس اس وقت مکمل طور پر بیدار ہو چکی تھی اور اسے آنے والے خطرے کے بارے میں آگاہ کر رہی تھی۔

☆.....☆

کافی دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر وہ تینوں چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد معراج نے کتھ کی سہاس لی۔ آصف دوسرے کمرے میں جا کر سو گیا، جب کہ معراج کو اندر سے دردناکے بند کرنے کی ہدایت بھی کر گیا۔ معراج کو اکیلے میں ڈرتو لگ رہا تھا مگر وہ کبھی بیٹھی چاہتی تھی۔ اس کا اکیلے بیٹے کو دل چاہ رہا تھا۔ وہ دیکھ رہے کے لیے بالکل تنہا رہنا چاہتی تھی۔ اس نے آصف کے جا تے ہی دردناکے اندر سے بند کیا اور دوبارہ بند پر آ کر لیٹ گئی۔ وہ اپنے خیالوں میں تھی کہ نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

# آپ کی زکوٰۃ اور عطیات پھیلانے کی روشنی

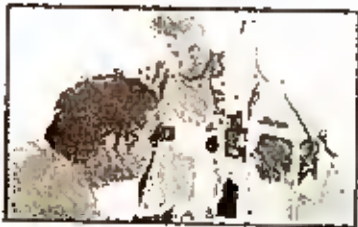
Regd No: LF 19973/1004



MTN 19273-7

## خان (ٹرسٹ) آئی ہاسپٹل

www.khaneyetrust.org | khaneyetrust



الحمد للہ 6 ستمبر 2012ء تک 1580 زکوٰۃ کے مستحق مریضوں کے آپریشن بالکل مفت کیے جا چکے ہیں اور 30 دسمبر 2014 تک 1400 مریضوں کا آپریشن منوف ہے۔

7000 خراب مریضوں کو ذرہ بیک کا پتھر دے چکے ہیں۔  
 انفرجیا 17600 لوگ ایچ ایچ وی چیک کرنا چکے ہیں۔  
 سب اخراجات زکوٰۃ اور زکوٰۃ منجمن سے ادا کیے جاتے ہیں۔

### ڈرٹری اسمیع اللہ خان

سانی الیک ایکیٹاؤری

یہاں کیویرا انڈر آئی میسٹ اور سٹیڈی ڈیپاک کے آپریشن ہوتے ہیں۔  
 آنکھوں کے معائنے کے لیے ڈاکٹر روزانہ صبح 9 بجے سے 3 بجے تک ڈیوٹی دیتے ہیں۔

بند 9 بجے سے 1 بجے تک۔

اتراکو اسپتال ہنڈر ہے گا۔

Account: MCB Farid Gate Branch  
 07380101004106-7  
 Tel 062-2886878

www.khaneyetrust.org

اصف، اس کی خالد بھی تھی۔ انہوں نے اصف اور معراج کو اٹھائے، زخا کر نکاح کی نظر مہ کرنے کے اعزاز میں کچھ ہائیں کہیں، ایک صاف کاغذ پر انگریزی لکوائے اور چلے گئے۔ سب کے جانے کے بعد اصف کی خالد معراج کے پاس آ کر بیٹھ گئیں اور اسے مبارک باد دیتے ہوئے کچھ ضروری عبارات دے لگیں۔ معراج کو ان کی ہائیں عجیب اور برقی لگتی تھیں، ہم دران کی ہائیں سنی رہی۔

سب لوگ حویلی سے چلے گئے تھے اور معراج دل ہی دل میں بہت خوش تھی۔ وہ جیسا چاہتی تھی وہی ہوا باخدا۔ اب وہ اصف کی ہو چکی تھی اور انہیں کوئی ایک در سے تہہ جدا نہیں کر سکتا تھا۔ معراج نے اصف کے پاس بیٹھنے سے پہلے کہا کہ میں تمہاری ہائیں کو چھواؤں تو وہاں کی گورنمنٹ سے کچھ کروانے کے لیے سے تہہ تہہ تھی۔ کچھ دیر ہائیں کرنے کے بعد اصف کسی ضروری کام کا کہہ کر چلا گئی اور کافی دیر بعد اس کی واپسی ہوئی۔ معراج کو لگتی تھی کہ آج اصف است کو ہائیں مانتا ہے اور وہ کہاں چلا جاتا ہے۔

رات کافی گزر چکی تھی۔ معراج کی زندگی میں یہ رات سب سے اہم تھی۔ آج وہ اصف کی اپنی تھی اور اسے اس کی نظر محسوس ہو رہا تھا۔ اصرار اصف بھی اس دن کے لیے بے تاب تھا۔ اصف اور معراج دو سے ایک ہو گئے تھے۔ آج اصف نے معراج کو اٹھایا اور فوری تیار کرانے کا کہا۔ کچھ دیر بعد وہاں کو ایک سفید رنگ کی گاڑی لینے کے لیے آئی اور وہاں اس میں سوار ہو گئے۔ معراج نے پوچھا تھی کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟ مگر اصف نے کچھ بتانے کی بجائے خاموشی اختیار کر لی۔ معراج کے بار بار اصرار پر اصف نے اتنا کہا کہ اب ہماری رہائش ایک دوسری جگہ پر ہوگی۔ معراج کو حیرت ہوئی مگر وہ خاموش ہو گئی۔ گاڑی ایک نلیٹ نما بلڈنگ کے پاس رک گئی۔ اصف نے سامان اٹھایا اور معراج کو ساتھ لے کر بلڈنگ کی تنگ سڑکوں پر چڑھنا ہوا ایک چھوٹے سے دور کردوں کے نلیٹ کا دروازہ کھولی کر اندر داخل ہو گیا۔ بلڈنگ کے نام فلیٹس میں لوگ رہائش پزیر تھے۔ نلیٹ اگر چنگ تھا مگر لوگوں کو دیکھی کہ معراج کو اچھا لگا۔ اب ان کو اکیلے رہنے والا خدایا نہیں سمجھتا ہے گا۔

معراج اور اصف ایک دوسرے کو سنبھالنے کی کوشش کر

کیوں استعمال کر رہا ہے؟ وہ کچھ نہیں سمجھ سکتی تھی۔ اس نے اپنے اندر ہمت پیدا کر کے ان سوالوں کے جواب پوچھے تو آصف نے سب کچھ کھل کر بتایا۔

دو اصل آصف دین محمد کے لیے اجنبی ضرور تھا مگر ایسا نہیں تھا کہ وہ اسے نہیں جانتا تھا بلکہ وہ اسے بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ دین محمد اور اس کا شہر اس کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ وہ کافی دنوں سے وہاں رہ رہا تھا اور دین محمد سے اتفاقاً نہیں بلکہ اس کے ساتھ روادار بڑھانے کے لیے ہی باقاعدہ ایک منصوبے کے تحت ملا تھا۔ یوں وہ اس کے گھر تک رسائی چاہتا تھا۔ اس کی معاونت اس کی خالہ اور خالو کر رہے تھے جو دوسرے شہر میں رہتے تھے۔ دین محمد سے دوستی، اس کے گھر تک رسائی اور پھر گھر میں پہنچ کر اعتماد حاصل کر کے معراج کے ساتھ محبت کی نشانیوں بڑھانا، یہ سب ایک سو بے سمجھے منصوبے کے تحت ہوا تھا۔

☆.....☆

آصف کی خالہ جس کا نام نوران تھا، اور اس کا خاندان فضل یہ سب کچھ کر رہا ہے تھے۔ دو دو اصل اپنی بیٹی کا بڑا معراج سے لینا چاہتے تھے۔ معراج کا بڑا بھائی شاکر نوران کے گھر کے پاس ایک کارخانے میں کام کرتا تھا۔ اس کا گزر روزانہ نوران کے گھر کے سامنے سے ہوتا تھا۔ شاکر شکل و صورت میں کافی اچھا دکھتا تھا۔ نوران کی ایک نوجوان بیٹی ریشماں اس کو روز دیکھتی تھی۔ یوں دن گزرتے گئے اور ریشماں کا شاکر کو دیکھنا بھی چلتا رہا۔ ریشماں کو شاکر اچھا لگنے لگا تھا۔ ریشماں کا باپ فضل بھی اسی کارخانے میں کام کرتا تھا۔ وہ اپنے ابا کو کھانا دینے جاتی تو شاکر کہیں نہ کہیں کام کرتا نظر آ جاتا۔ تہہ بہ تہہ ریشماں نے شاکر سے محبت ہونے لگی تھی۔ ایک دن جب ریشماں نے شاکر سے اعلیٰ محبت کا اظہار کر دیا تو شاکر نے بھی خاموشی اختیار کر کے اعلیٰ ہی ہاں کر دی تھی۔ یہ خاموش محبت وقت کے ساتھ ساتھ مضبوط محبت میں بدل گئی۔ شاکر نے کارخانے کو خیر باد کہا تو ریشماں نے اپنی بڑی بہن کے ذریعے گھر والوں سے شاکر سے شادی کی بات کی مگر اس کے گھر والوں نے صاف انکار کر دیا کہ وہ کسی اجنبی سے اس کی شادی ہرگز نہیں کر سکتے۔

شاکر کو یہ بات بری لگی تاہم اس نے اس پر کسی

رہے تھے مگر ہر بار معراج کو ایسا لگتا تھا جیسے آصف اسے کھنسا ہی نہیں جانتا۔ مگر وہ اسے اپنا وہم تصور کر کے ہر خیالی جھٹکے دیتی۔ دن اتنے گزر رہے تھے اور معراج خوش گئی وہیں کبھی کبھار اپنے والدین کے بارے میں سوچ کر پریشان ہو جاتی تھی۔

دو ماہ کا مختصر عرصہ صبریت گیا تھا۔ ایک دن آصف نے معراج کو گھنٹیں جانے کے لیے تیار کیا اور ایک گاڑی میں دھکا کر نکل پڑا۔ سفر کافی طویل تھا۔ معراج نے حیرت سے آصف سے پوچھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ مگر آصف نے صرف اتنا کہا، جہاں سے آئے تھے۔ اس کے لہجے میں کئی تھی۔ معراج کو آصف کا لہجہ اجنبی لگا تھا۔ رات کا اندھیرا چھانے لگا تھا جب ڈرائیور نے گاڑی سڑک کے کنارے لگائی۔ آصف نے معراج کو اترنے کا کہا تو معراج کو حیرت ہوئی کہ اس اندھیرے میں اور یوں اکیلی سڑک پر کیوں اترنے کا کہہ رہا ہے مگر آصف کے بار بار کہنے پر آخر وہ بچھے اتر آئی۔ باہر اندھیرے میں برے بھرے لیبلہاتے گھیت عجیب منظر پیش کر رہے تھے۔ معراج کو باؤل کا حول مانوں سا لگ رہا تھا۔ آصف نے معراج کو ساتھ لیا اور پیدل چلنا شروع کر دیا۔ معراج کو حیرت ہو رہی تھی کہ آخر آصف کو ہوا کیا گیا ہے۔ وہ اس سے بار بار پوچھتی رہی مگر آصف کا لہجہ ہر بار پیلے سے زیادہ سخت ہوتا جا رہا تھا۔

آخر معراج نے دک کر آصف سے دوڑک بات کرنی چاہی کہ آخر وہ اسے کہاں لے جا رہا ہے؟ تو آصف نے سخت غصے میں جواب دیا کہ وہ اسے اس کے گھر چھوڑنے جا رہا ہے۔ معراج کی آنکھیں چھٹی کی چھٹی رہ گئیں۔ انتہائی غیر متوقع جواب سن کر اس کا گلہ لگنے لگا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب آصف نے کہا ہے۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جس آصف کے لیے اس نے اس قدر قربانیاں دی ہیں، آج وہ ایسا بھی کر سکتا ہے۔ اس نے انتہائی بیٹھے ہوئے لہجے میں صرف اتنا پوچھا، "کیوں؟" جس پر آصف نے جواب دیا کہ اب مجھے تمہاری ضرورت نہیں رہی۔ ہمارا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ معراج کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آصف کیا کہہ رہا ہے، لیکن اس مقصد اور اب وہ اس کو کیوں نہیں رکھنا چاہ رہا ہے؟ اور یہ کہ آصف ہم کا لفظ

## خواتین کی محبوب قلم کار

کئی دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ یافتہ

رفعت سراج، جن کے جادوگر قلم کی کاٹ سے کون واقف نہیں۔  
رفعت سراج، وہ قلم کار، جن کو قلم کی حرمت کا پاس، زندگی سے  
زیادہ عزیز ہے۔

رفعت سراج، وہ قلم کار جنہیں اپنی تحریر سے دھڑکنیں بے  
ترتیب کرنے کا ہنر خوب آتا ہے۔

گلابی کاغذ اور زرد پھول کے بعد.....

نئے شاہکار ناول کے ساتھ، آپ کے روبرو  
بہت جلد ماہنامہ ”دوشیزہ“ ڈائجسٹ میں ملاحظہ کیجیے۔  
بس تھوڑا سا انتظار اور.....



والدین تب بھی ان کو سزا سکھوں پر بیٹھاتے ہیں۔ اولاد انہیں  
 زمین پر بیٹھک دے تب وہ اپنی پتیلیاں ان کے پیروں  
 کے نیچے بچھا دیتے ہیں، انہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔

اس باپ نے تو اپنی ماوان بنی کو معاف کر دیا تھا۔  
 انہیں محلے والوں کا بھی کوئی خوف نہیں تھا کہ وہ کیا نہیں  
 گئے۔ انہیں اپنی بیٹی انہیں مل ہی گئی اور اب وہ اسے کھانا نہیں  
 چاہتے تھے مگر وہ دونوں معراج کے بھائیوں سے خوف زدہ  
 تھے، کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ وہ بھی کبھی اپنی بہن کو معاف  
 نہیں کریں گے۔ اگرچہ معراج کو بھی ان کا زور تھا مگر اس نے  
 صاف کہہ دیا تھا کہ اگر وہ اسے سزا دینا چاہتے ہیں تو دے  
 دیں کیوں کہ وہ گناہگار اور سزا کا مستحق ہے۔

بھائیوں کو باپ نے کسی نہ کسی طریقے سے سبھا بھا  
 کر راضی کر لیا تھا اور وہ بھی معراج کو معاف کر چکے تھے  
 مگر ایک بھائی اب بھی دل میں معراج کے لیے نفرت  
 رکھتا تھا۔ ایک دن اس نے معراج کو اکیلا پارک لگھاڑی  
 سے اس کی گردن کاٹ دی۔ یہ دردناک منظر دیکھ کر ماں  
 بے ہوش ہو گئی۔ معصوم معراج بچھڑ پڑتی اور پھر گر گئی۔  
 یہ ایک ایسا واقعہ تھا جس پر پرانا نات سوگوار تھا۔ گھر کی ہر  
 شے اس پر اتم کساں تھی۔ بھائی کیا غیرت یا جہالت نے  
 معراج کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا۔

آخر معراج کے ساتھ بیٹے والے راتھے کی خبر شاکر کو  
 بھی ہو گئی تھی، جو ریشماں سے شادی کے بعد سے ہی گھر  
 سے مفرد تھا۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ ریشماں کی وجہ سے  
 ہی اس کی معصوم بہن کے ساتھ اتنا بڑا جھگڑا ہوا ہے،  
 بعد ازاں اسے معراج کی موت کی خبر ملی تو اس نے ریشماں  
 کو اس واقعے کا قصور وار ٹھہراتے ہوئے اسے بھی زندگی کی  
 ذور سے آزاد کر دیا۔ یوں شاکر اور ریشماں کی محبت سے  
 شروع ہونے والی اس کہانی کا اختتام دو معصوموں کے دل  
 اور سین کو بچانے کے پھندے پر لگا کر ہوا۔ آج بھی دین محمد  
 کے گھر کے پاس سے گزرنے والوں کو ایسے لگان سے جیسے  
 یہاں صدیوں سے کوئی نہیں رو رہا۔ وہاں کی ویرانی دیکھ کر  
 یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ رشتوں کی بیچان میں اگر گفتگو  
 ہو جائے تو ان کا انجام کچھ ایسا ہیسا بنت بھی ہو سکتا ہے۔  
 دین محمد آج بھی ہر جہتی میں اپنی معراج ڈھونڈ رہا ہے۔

☆ ... ☆

خاص رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ شاکر ہمیشہ کے لیے وہاں  
 سے چلا آیا مگر دونوں کا موبائل پر رابطہ برقرار رہا۔ آخر  
 ریشماں اور شاکر نے محبت کی ریت برقرار رکھنے کے لیے  
 وہ فیصلہ کیا جو بعد میں معراج نے بھی کیا تھا۔ جب نورس  
 کو اس بات کا علم ہوا کہ ریشماں کو بچھا کر لے جانے والا  
 شاکر ہے تو اس نے بدلے کی آگ میں جلنا شروع کر دیا۔  
 آخر کار اس کے شیطانی ذہن نے آصف کے ذریعے گناہ  
 گار بھائی کی سزا اس کی معصوم بہن کو دینے کا منصوبہ تشکیل  
 دیا جس پر عمل کرتے ہوئے آصف نے معراج کی زندگی کو  
 کانٹوں سے بھرا دیا تھا۔ اب معراج سب جان بچی تھی اور  
 آصف کا چہرہ بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اتنے میں آصف  
 نے اس پر ایک اور اورا کیا۔ جسے کہہ کر وہ زمین میں گر گئی۔  
 اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ یہ سنیے سے سلیپ ہو جی۔ اس  
 اپنے وجود سے نفرت ہونے لگی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا  
 کہ وہ آصف کا گھاڑا دے۔ آصف نے اسے بتایا تھا کہ  
 وہ اس کی منگولہ نہیں ہے۔ نہ کوئی قاضی آیا تھا اور نہ ہی کوئی  
 نکاح ہوا تھا۔ وہ سب معراج کو رام کرنے کا گھناؤنا  
 منصوبہ تھا اور جو کچھ معراج کے ساتھ وہ کر رہا تھا ہوتا رہتا  
 وہ سب غلط اور ناجائز تھا۔ معراج پر آن کے آن نہ جانے  
 کتنے پہاڑ توڑے گئے تھے۔ آج اسے وہ سب یاد رہا تھا  
 کہ آصف بار بار گھر سے باہر کیوں جاتا تھا۔

جب ٹولی پھولنی اور لٹی ہوئی معراج نے اسے والدین  
 کی ریلیز پر قدم رکھا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنی بیٹی کی جگہ  
 صرف خشک آنسو ہیں۔ اسے اپنا گھراؤ نہیں لگ رہا تھا۔ وہ  
 جس چیز کی طرف دیکھتی وہی اسے تاراج ہی محسوس ہوتی۔  
 لہاں کو کچھ کہہ معراج زار و نظارہ دوتے ہوئے ان سے لین  
 گئی۔ وہ زندگی میں پہلی بار اس قدر روئی تھی۔ ماں بھی کیا  
 شفیق ہستی ہے۔ اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود جی کو گھٹے  
 لگا کر چوٹی چاری تھی اور روتے ہوئے اسے چپ ہونے کو  
 بھی کہہ رہی تھی۔ معراج کی والدین کی خبر جنگل میں وگ کی  
 طرح پورے محلے میں پھیل گئی۔ دین محمد نے جیسے ہی شاکر  
 اس کی بیٹی لوٹ آئی ہے وہ وہاں نہ رہا جاتا ہوا آیا اور اپنی  
 بیٹی کو گھٹے لگا کر چوستے لگا۔ معراج ان کی گنہگار تھی اس لیے  
 وہ کسی سے نظر نہیں ملا رہی تھی۔ کیا عجیب منظر ہوتا ہے  
 جب بیٹے اپنے والدین کی عزت خاک میں ملا دیتے ہیں،

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

سفید پٹاخ قابل علاج مرض ہے

جہلمی

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

جہلمی زیندی کے دوروں پاکستان کا مستقل پروگرام

ملنی  
ابوار  
ہیڈنر



ASIN EXCELLENCE  
PERFORMANCE WARD



AWARD  
BEST ACHIEVEMENT

0-30: 30:30  
0-30: 30:30  
0-30: 30:30



WARD  
PILLAR OF LEUCODERMA

لاہور

گائیس سپیڈ  
14-27 فروری  
14-27 مارچ  
14-27 اپریل  
14-27 مئی  
14-27 جون  
14-27 جولائی  
14-27 اگست  
14-27 ستمبر  
14-27 اکتوبر  
14-27 نومبر  
14-27 دسمبر  
0300-8566188

پشاور

ہوسٹل ایجنسی  
11 فروری  
11 جون  
11 اکتوبر  
11 نومبر  
11 دسمبر  
0300-8566188

ملتان

ہوسٹل ایجنسی  
28 مارچ 63 اپریل  
28 مئی 63 جون  
28 جولائی 63 اگست  
28 ستمبر 63 اکتوبر  
28 نومبر 63 دسمبر  
0300-8566188

کراچی

گائیس سپیڈ  
13 مارچ 27 اپریل  
13 جون 27 جولائی  
13 اگست 27 ستمبر  
13 نومبر 27 دسمبر  
021-34328080  
0300-8566188

E-mail: syedajmalzaidi@hotmail.com syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

## ساتویں سچ پائی



### مقصود احمد بلوچ

سمت سے آدھس کو زست گاری ہے، ایک محبت بھرنی کہانی



”بھائی آپ سے ایک درخواست ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کہو کیا بات ہے۔“ ذود لڑکی کہنے لگی۔ ”بھائی کیا آپ میری استوری لکھو گے۔“ میں نے کہا۔ ”ہاں جی کہوں نہیں۔“

میرنی ہاں پ وہ بار بار میرا شکر ادا کرنے لگی۔ میں نے اس سے کہا اس میں شکر ادا والی کوئی بات نہیں ہے اور ساتھ ہی مجھے اس کی آواز سے ہوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ سسکیاں لے کر رو رہی ہے۔ میں نے اسے کہا میں ابھی فرنی ہوں تم اپنی داستان مجھے سناؤ۔ اس نے پھر کچھ اس طرح اپنی داستان مجھے سواں لڑکیوں کے ذریعے سنائی۔

میرا نام کشف ہے اور میں نے ایک درمیانے طبقے میں آنکھ کھولی۔ ہمیں دو وقت کی روٹی عزت سے مل جاتی تھی اور آج کل کے اس مشکل ترین دور میں روٹنت کی روٹی بھی مل جائے تو بہت قیمت ہے۔ میرے والد صاحب فضا بنے۔ انہوں نے دکان پر اپنے ساتھ ایک لڑکا بھی رکھا ہوا تھا، جو اب کا شاگرد تھا، باچھڑا کہ لہیں کہ ابو کے ساتھ مدد کر داتا تھا۔ میرے اُن دنوں میٹرک کے امتحانات ہو رہے تھے، میں جس راستے سے اسکول چلتی تھی، اسی راستے پر ہی میرے ابو کی شاہ بھی، ایک دن وہ لڑکا میرے

ایک نہ ایک دن انسان کی زندگی اس کا ساتھ چھوڑ جاتی ہے، لیکن باور بھی کبھی کسی کا ساتھ نہیں چھوڑتا، کاش زندگی کی طرح باور بھی ساتھ چھوڑ جائی، باور کوئی موسم کو ڈھل جاتا تو کبھی نہیں دیکھتی ہیں منہ اٹھائے چلی آئی ہیں۔ کبھی کبھی انسان کسی کی باور میں اٹھا ڈوبا ہوا ہوتا ہے کہ اسے وقت کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ اس روز میں بھی کسی کی ظالم باور میں غرق تھا کہ اچانک میرے سواں کی کھنٹی لگی، میں اچانک چونک گیا، جب سواں کی اسکرین پر دکھاتا تو نمبر اچھی تھا۔ خیر میں نے کال انڈیک کی تو آگے سے باربک۔ آواز میں ایک لڑکی کی بات کرنے لگی۔

”بلو! آپ مقصود بھائی بات کر رہے ہو۔“ میں نے کہا، میں مقصود ہی بات کر رہا ہوں، بھائی میں نے میگزین میں آپ کی استوری (اواس ہے زندگی) پڑھی ہے جو کہ مجھے بہت ہی اچھی لگی ہے۔ میں نے اس کے جواب میں اُن کا شکر ادا کیا۔ میں نے اس سے اس کا نام پوچھا تو اس نے اپنا نام کشف بتایا۔ اپنی بات چیت کے بعد کال ڈراپ ہوئی، ابھی نذر پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ دوبارہ پھر اُس نمبر سے کال آئے گی۔ میں نے کال انڈیک اور پوچھا۔ ”جی اب کیا بات ہے۔“ ذود لڑکی کہنے لگی۔

اس درخت کی بو بہت خوبصورت تھی۔  
 میں کئی پھل لگی جو کہ دل ہی دل میں اس سے محبت  
 کرنے لگی تھی، چنانچہ اس کا رد عمل کیا ہوا مہرے بارے  
 میں، میں نے یہ چیز تو بالکل سوچی ہی نہیں تھی۔ بس دل ہی  
 دل میں اسے اپنا محبوب تصور کرنے لگی تھی۔ ایک دن  
 مہرے ابو جی ہاتھ روم میں گئے ان کا موبائل چار جنگ  
 کے لیے لگا ہوا تھا، میں سوچنے یا کر بار بار موبائل مہر تلاش  
 کرنے لگی، ساتھ ہی ڈر بھی رہی تھی کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو  
 شامت آ جائے گی۔ آخر قسمت نے میرا ساتھ چارہ میں ابر  
 کے موبائل سے اس کا نمبر لکھنے میں کامیاب ہوئی۔

ابو کے ساتھ کسی کام کے حوالے سے ہمارے گھر آ جاؤے  
 مجھے چائے بنانے کے لیے کہا۔ میں جب چائے لے کر اس  
 کو دینے کے لیے اس کے سامنے آئی تو اس وقت میرا دل  
 پیسے مہرے قابو میں نہ رہا۔ وہ بہت ہی خوب صورت  
 شخصیت کا مالک تھا۔ میں ذرا پہلی نظر دیکھنے ہی اُسے اپنا دل  
 دے بیٹھی۔ مجھے ان بات کی آج تک سمجھ نہیں آئی کہ کچھ  
 اجنبی چہرے ایسا تک ہی دل میں کیوں بس جاتے ہیں۔  
 مہرے ساتھ بھی کچھ اس طرح ہی ہوا کہ مناسب کچھ اس  
 اجنبی لڑکے کے حوالے کر بیٹھی تھی۔ میں اسے چائے دے کر  
 واپس تو آ گئی، بس میرا دل مستقل اس کے بارے میں ہی



رات میں سوچ دیکھ کر، میں نے اس کو س کال  
 دی، خود ہی دن دہر کے بعد اس کے نمبر سے کال آنے  
 لگی۔ میں نے کال اٹھینے کی ہڈان سے مجھ سے پوچھا۔  
 ”آج کون ہوا اور مہرے نمبر پر کیوں کال کر رہی  
 ہو۔“ میں نے اس سے صاف جھوٹ بولا کہ میں نے تو کوئی  
 کس کال نہیں کی۔ ایک سے دو دن نہیں اسے اسے خوب  
 لگ گیا، پھر اس کے بعد میں نے اسے ایک سچ لکھا کہ میں

”دوچہ جا رہا تھا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ اس لڑکے کا کیا نام ہے؟  
 وہ کہاں رہتا ہے؟ بہر کیف دن گزرنے پر۔  
 مہرے ابو جی گھر میں آ کر روز کاروبار کی باتیں  
 بتا کر تے تھے۔ ابو کی ہی باتوں سے مجھے اس کا نام پتا  
 چل گیا۔ اس کا نام ہار تھا۔ شکل صورت کی طرح نام بھی  
 مجھے بہت پیارا لگا۔ میں جب بھی اسکول جاتی تو لڑکی  
 شاپ کے سامنے سے گزرتی۔ ہار وہاں موجود ہوتا تھا۔



میں بھی آپ بٹے بٹے ہوں گے، لہذا آپ کو میری قسم آپ اس سے شادی کر لیں۔" میری یہ بات سنتے ہی باہر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں باہر نے مجھ سے کہا۔ "کشف آپ نے اپنی قسم دے کر مجھے شادی کرنے پر مجبور کر دیا ہے، ورنہ میں کسی بھی قیمت پر اس سے شادی نہ کرتا۔" میرے کہنے پر کچھ دنوں کے بعد باہر کی شادی بہت ہی سادگی سے سرانجام پائی۔

باہر کی شادی ہونے کے بعد میں نے اس سے ملنا بہت کم کر دیا اور دنوں پر بھی بات بہت کم ہوتی تھی۔ حال اس کے باہر مجھ سے بلا سے گلے گلوتے کرتا رہتا۔ کشف تم بے دانا ہو۔ تم مجھے چھوڑ گئی ہو اور اپنی طرح کی باتیں وہ کہتا رہتا۔ میں اسے ہر بار یہی کہتی تھی۔ باہر میری جان ہی بات نہیں ہے کہ میں آپ کو چھوڑ گئی ہوں یا میرا بیچارہ جو بنا تھا، بات یہ ہے کہ آپ کی اب شادی ہو گئی ہے آپ زیادہ سے زیادہ ناگم اپنی بیوی کو دیا کر دو۔ میری یہ باتیں سن کر وہ خاموش ہو جاتا۔ وقت اپنی رفتار سے گزر رہا۔

باہر کی شادی کے ایک سال بعد اللہ پاک نے باہر کو جائیداد میں دیا، چونکہ بالکل باہر کی کا پنا تھا۔ جب مجھے اس کی خبر ملی تو مجھے بھی بہت زیادہ خوشی ہوئی، کبھی کبھی انسان کی زندگی میں یہ خوشیاں بھی خاموشی سے ہی ملتی ہیں، پھر اس کے بعد ساری زندگی دن دن پڑتا ہے۔ باہر کے ساتھ بھی اس طرح ہوا۔ جب مجھے باہر کے ساتھ گزارے ہوئے وہ ملی یاد آتے ہیں تو میرا دل آگ گھونٹے لگ جاتا ہے اور آنکھوں میں آنسو ہی آنسو ہوتے ہیں۔ میں اپنی کہانی کی طرف آتی ہوں۔

ہوا کچھ اس طرح کہ ایک رات تقریباً 12 بجے کا ناگم تھا۔ باہر کی کال آئی کہ کشف میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں، میں نے پوچھا۔ "کب؟"

باہر نے کہا۔ "ابھی اور ابھی وقت ہے۔"

میں نے کہا۔ "باہر آپ باتیں تو نہیں ہو گئے ہو۔ یہ بات آدھی رات کو کیسے ممکن ہے کہ میں آپ سے ملوں۔" باہر میرے گالوں سے اگلے گالوں میں رہتا تھا۔ قاضی نے زیادہ نہیں تھا، لیکن باہر اپنی ضد پر قائم رہا، آخر کار میں نے ہی ہتھیار ڈال دیے اور کہا۔ "ٹھیک ہے آپ آ جاؤ۔"

تھوڑی دیر گزارنے کے بعد پھر میرے گھر پر کال آئی۔ "کشف میں آپ کے گھر سے باہر گزرا ہوں، پلیز

کشف ہوں، اور آپ کا وہاں بہراؤ کے وہاں سے لیا ہے اور ساتھ ہی میں نے اپنی محبت کا اظہار بھی کر دیا کہ باہر میں تم سے بے نیاز محبت کرنے لگی ہوں، جب میں نے آپ کو پہلی دفعہ اپنے گھر دیکھا تھا تو اپنا دل بارہمچی تھی۔ میری یہ تمام باتیں سن کر باہر خاموش رہا اور اس نے کسی بھی قسم کا کوئی اظہار نہیں کیا۔ اس کی خاموشی پر میں بہت پریشان ہوئی کہ اللہ خیر کرے پتا نہیں اب کیا ہوگا۔ ذرا بھی رہی تھی کہ سو سکتا ہے باہر کو یہ سب اچھا نہ لگے ہو اور وہ اب کو بھی نہ بتا دے۔ تھوڑی دیر بعد باہر کا منہ آ گیا۔ میں نے تیار ہوتے ہی اس کو کال کی، سلام دعا کرنے کے بعد باہر نے مجھ سے پوچھا۔

"کشف جو کچھ آپ نے سنا میں لکھا ہے، کیا یہ بات سچ ہے۔" میں نے کہا۔ "ہاں باہر، یہ سچ ہے، میں تم سے بہت زیادہ محبت کرتی ہوں۔"

میرا یہ بات سنتے ہی باہر نے کہا۔ "اگر آپ کو مجھ سے محبت نہ ہوگی تو کیا مجھے آپ سے محبت نہیں ہو سکتی ہے۔ مان ڈیویر آگ کر دوںوں طرف جھل رہی ہے۔"

ہم سے محبتوں کی نشانیں نہ ہو سکیں اتنا جانتے ہیں تمہیں چاہتے ہیں اسی طرح تمہاری محبت دن بدن پروردان پڑھتی رہی اور نوبت ملاقات تک پہنچ گئی اور پھر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

پہلی ایک دوسرے کی محبت میں گم ہوئے تین سال کا عرصہ بیت گیا۔ ایک دن باہر سے میری ملاقات ہوئی تو باہر نے باتوں ہی باتوں میں مجھے ایک نئی بات بتائی۔ باہر نے کہا۔ "کشف میری معنی مجھ میں میری گزرتی ہے، ہوئی تھی، لیکن میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا ہوں، اب شادی کروں گا تو اس آپ سے دوسرے نہیں۔"

پہلے تو یہ سن کر مجھے ہر قیامت بہت گئی، پھر دل کو سمجھایا کہ میری بچہ ہے باہر پریشانی کا کارنہ ہو جائے، میں نے باہر سے کہا۔ "آپ کی معنی نہ ہوئی ہوئی تو میں آپ سے ضرور شادی کرتی، لیکن اب نہیں۔ ہم ایک دوسرے سے چھار کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے لیکن تمہاری منگنیترہی ایک عورت سے اور میں بھی ایک عورت ہوں اور ویسے بھی وہ آپ کے بچپن کی منگنیترہی ہے۔ اس کے دل

دینا ہی اُجڑ گئی۔ شادی کے بعد میں نے اس سے خود کو جان بوجھ کر علیحدہ کر لیا تھا کہ اس کی گھر بلونڈنگی سٹارٹ ہو اور اب اللہ نے میرے محبوب کو مجھ سے جدا کر دیا تھا۔

ہمارے گاؤں کی کچھ عورتیں اعلانِ شہنے کے بعد باہر کے گاؤں جا رہی تھیں، میری امی بھی ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوئیں، ان کے ساتھ میں بھی اپنے محبوب کا آخری دیدار کرنے کے لیے اس کے گھر پہنچی۔

باہر کے گھر میں کمرام برہا تھا۔ اس کی جولان موت پر ہر آنکھ اشک بارگئی۔ جب میں اس کے گھر میں داخل ہوئی تو میرا محبوب جا رہا تھا۔ جا رہا تھا۔ جب اس کے منہ سے ایک عورت نے جا رہی تھی تو اس کا چہرہ دیکھتے ہی میں اپنے آپ کو سنبھال نہ سکی اور بے ہوش ہو کر گر گئی۔ مجھے نہیں پتا کہ کس نے میرے منہ میں پانی ڈالا، جب مجھے ہوش آیا تو میں پھر روئے گی، آخر کار وہ وقت بھی آ گیا جب اس کو غسل وغیرہ دے کر جنازے کے لیے تیار کر دیا گیا۔ جب میں نے اس کو آخری دفعہ دیکھا تو خود پر قابو نہ پاسکی اور اس کے جسم کے ساتھ لپٹ گئی اور ادھیڑا بچاؤ پھارنے لگی۔ چائیس کس ظالم نے مجھے اس کی سمت سے جدا کیا مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔ جنازے کے بعد میرے باہر کے کوسٹوں میں مٹی میں دفن دیا گیا۔

باہر اور میری محبت ایک پاکیزہ محبت تھی، مجھی تو اس کو کشف ہو گیا تھا کہ وہ جلد ہی اس دنیا سے جائے گا۔ اسی لیے اس دنیا سے جاتے ہوئے میری تصویر اپنی آنکھوں میں بسا کر چلا گیا۔ آج باہر سے پھرنے میں سال ہو گئے ہیں، لیکن اس کی یادوں سے نہیں گئی، میرے گھر والوں نے بے اندر در باہر کے شادی کروا دیں، میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اسی طرح چھٹی بیویوں کی لیکن شادی نہیں کروا دی، جب باہر سے میری شادی نہیں ہو سکی تو پھر کسی سے بھی نہیں۔ بس اب تو ایک ہی کام ہے اس کی یاد میں آنسو بہا سکتی ہوں اور اس کے لیے دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

میری یہ اسٹوری جو بھی پڑھے میری اس سے اپیل ہے کہ وہ دعائے مغفرت لازمی کرے، تاکہ میرے محبوب کو ایصالِ ثواب ملتا ہے۔

آپ دروازہ کھولو۔" میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھول دیا۔ رات دو بجے کا وقت تھا۔ باہر نے میری طرف غور سے دیکھا اور اس طرح محسوس ہونے لگا جیسے مجھے آنکھوں کے راستے خود میں اتار رہا ہو۔

میں نے کہا۔ "باہر کیا بات ہے آپ آج اتنے زیادہ پریشان کیوں ہو اور ساتھ گھبرائے ہوئے بھی لگ رہے ہیں۔" باہر نے بس مجھ سے اتنی ہی بات کی کہ کشف آج میرا دل بہت چاہ رہا تھا کہ میں آپ سے ملوں، چائیس کیوں ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ تمہارا آخری دیدار ہو، اس لیے آپ کو مجبور کیا۔ جب باہر کی میں نے یہ باتیں سن کر پڑی۔

میں نے اس سے کہا۔ "باہر آپ آج کس طرح کی باتیں کر رہے ہو، کیا ہوا ہے آپ کو؟ گھر میں تو سب خیریت ہے؟" وہ کہنے لگا۔ "بس سب خیریت ہے۔" اس کے بعد باہر نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور باتے وقت بس اتنا کہا۔ "کشف اپنا بہت سارا خیال رکھنا اللہ حافظ۔" میں نے دروازہ بند کیا اور واپس آ گئی اور اس سوچ میں ڈوب گئی کہ اللہ خیر کرے یہ آج پتا نہیں باہر کو کیا ہو گیا ہے، بس اتنی ہی باتیں کر رہا تھا۔ اسی طرح سوچتے سوچتے رات کو باقی حصہ بھی گزر گیا۔

صبح ہو گئی، موزوں نے اذان دی۔ میں نے چشمہ کیا اور نماز پڑھ کر باہر کے لیے بہت ساری دعا میں کرنے لگی۔ نماز سے فارغ ہو کر اپنے روزمرہ کے کام میں مصروف ہو گئی۔ صبح کے آٹھ بج گئے تھے، جب میرا چھوٹا بھائی علی رخصت دروازہ گھر آ یا اور ای کو تانے لگا کہ باہر کا انتقال ہو گیا۔ جب اس کی آواز میری سماعت سے گرائی تو ایک دفعہ مجھے سب کچھ گھومتا ہوا نظر آیا، کچھ تو مجھ پر سکتا غامدی رہا۔ اس کے بعد جب ہوش سنبھالا تو میں نے بھائی سے کہا کہ یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو اور ایک زوردار چیخ بھی بھائی کے منہ پر اوردیا۔

کیوں اس طرح کا مذاق کر رہے ہو، کیوں جھوٹ بول رہے ہو۔ لیکن بھائی نے کہا۔ "باجی اللہ کی قسم میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ باہر کا رات گوا کی کمیٹیف ہوا ہے اور وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ لیکن میرا ذہن اس بات کو قبول کرنے کو تیار نہ ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد بتا رہے گاؤں کی مسجد میں اس کے انتقال اور نماز جنازہ کا اعلان ہونے لگا، لیکن مجھے پھر بھی یقین نہ آیا۔ جب میں نے اس کے قبر پر کال کی تو اس کے قبر پر اس کے دوست نے اس خبر کو کسٹرم کیا۔ میری تو جیسے

## آنٹھویں سچ بیانی



شایدہ تشکیل

حیرت دم میں ذہنی خرابی کی شکار ایک ماں کی شرتوں کی کہانی

آنسوؤں سے لبریز ہوئیں، شاید میں نے ان کی کسی  
ذمہ داری اور کسی ذمہ کو تیار نہ کر دیا تھا؟  
میرے بہت پوچھنے اور کریدنے پر انہوں نے بہت  
حفاظت انداز میں اپنے اندر چھپے ہوئے کچھ نم میرے گوش  
گزار کیے کہ ان کے ہنستے ہنستے گھر میں آرامی نے کیسے  
ڈہرے جھالے؟

انہوں نے اپنی کہانی کچھ یوں بیان کی کہ دس سال  
پہلے اپنے شوہر کے اچانک انتقال کے بعد اپنے رہنمائیوں  
کے ساتھ وہ اس گھر میں رہتی تھیں، ان کی ایک بیٹی ہے  
جس کی شادی در شوہر کی زندگی میں ہی کر چکی تھیں۔  
دونوں بیٹے اپنی اپنی نوکری میں مصروف رہے۔ دونوں  
ماں کے فرما بھر وار اور ذمہ سنبھالنے کے ساتھ رہے۔

جب تینوں بیٹے چھوٹے تھے تو انہوں نے کچھ  
حالات کی وجہ سے ایک اسکول میں نوکری شروع کی تھی  
اور اب تک وہ اپنی انکسپنڈنٹ کے ساتھ رہتے ہیں۔  
شوہر کی وفات کے بعد عدالت پوری ہوئے ہی اللہ  
تعالیٰ نے فوراً اگلے دن ہی خدیجہ کو کبھی نہ زہارت اور مرد کا  
انتظام کر دیا اور وہ اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ عمر بھر  
رہیں۔ وہاں سے وہیں آ کر بیٹوں کی شادی کرنے کا  
ارادہ کر لیا اور اللہ تعالیٰ نے وہ مرحلہ بھی بخوبی حل کر دیا۔

میں روزانہ یونیورسٹی جاتے ہوئے صبح کے وقت  
ایک فیمنٹ بزرگ مگر کافی فعال (Active) خاتون کو  
دیکھا کرتی جو روزانہ میرے گھر کے سامنے والے اسکوائر  
سے نکل کر رکشا کی تلاش میں اسٹاپ پر موجود ہوتی  
تھیں۔ ان کی اداؤں اور بیان آنکھوں نے مجھے ان  
سے بات چیت پر مجبور کر دیا۔ ایک دن گفتگو کے دوران  
انہوں نے مجھے اسے گھر آنے کی دعوت دی جسے میں  
نے خوشی خوشی قبول کر لی، کیوں کہ میں خود بھی ان سے  
تعلیمی ملاقات کی منتہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ ان کی اداؤں  
آنکھوں کے پیچھے بقیہ کوئی کہانی پوشیدہ ہے۔

ایک شام میں گھر پر کافی بوریت محسوس کر رہی تھی۔  
تب اچانک مجھے بزرگ خاتون یاد آئیں اور میں اسی  
سے اجازت لے کر ان کے گھر کی جانب روانہ ہوئی، ان  
کے گھر میں ان کے علاوہ کوئی اور موجود نہیں تھا، وہاں بھی  
ایک عجیب سی اداؤں چھلکی ہوئی تھی۔ گھر کے تمام  
دروازے اور کھڑکیاں یوں کھلے ہوئے تھے جیسے کسی کی  
آمد کے منتظر ہوں۔ باتیں ہوتی رہیں، وہ مجھ سے میری  
پڑھائی کا پوچھتی رہیں اور جب باتوں ہی باتوں میں  
میں نے ان سے ان کے اکیلے پن کی بات کی تو پہلے تو وہ  
خاموش ہو گئیں اور پھر کچھ توقف کے بعد ان کی آنکھیں



شکایت ہے؟ پھر ابھی ایک سال پہلے اس بنتے بنتے گھر میں گویا بھونچال سا آ گیا جب بڑا بیٹا اچانک بلڈ پریشر پائی ہونے کی وجہ سے گروں کی بیماری کا شکار ہوا۔ وہ بیٹا مجھ سے بہت قریب اور محبت کرنے والا تھا۔ وہ اپنے دوستوں سے ہمیشہ کہا کرتا، ”میری امی، میری سب سے بڑی مددگار ہیں جن کے بغیر میں رو ہی نہیں سکتا۔“ وہ منٹوں میں گھر کے تمام مسائل کو حل کر لیتی ہیں۔“ یہ سب میں نے اس کی وفات کے بعد اس کے دوستوں کی زبانی سنا، کیوں کہ وہ بہت کم گواہ اپنے اندر

بہت خوب صورت اور خوش کارنامہ تھا وہ۔ دو ذول ہونیس سا تھا رہی تھیں، کیوں کہ وہ خود پکانے کی شوقین تھیں لہذا تمام Cooking خود ہی کر لیا کرتیں۔ ایک سال بہت خوشیوں میں گزارا تو چھوٹے بیٹے نے اچانک علیحدہ ہونے کا پروگرام بنالیا، جسے انہوں نے خوشی اور صبر سے قبول کر لیا۔ بڑا بیٹا ساتھ ہی رہا۔ اسے اللہ تعالیٰ نے دو بیٹیوں کی نعمت سے نوازا۔ بہت محبت اور پیار سے وقت گزارا رہا۔ چھوٹا بیٹا بھی بگھڑا آ جا، لیکن یہ نہیں آتی تھی، آج تک معلوم ہی نہیں ہوا کہ ان کو ان سب سے کیا



**قائد اعظم زیارت میں**

کوئٹہ اور زیارت میں قائد اعظم کے علاج کے جو مقامی انتظامات کیے گئے تھے وہ بہت معقول تھے اور جو ان کے ماہر مصلحین تھے وہ ہمارے ملک کے چوٹی کے زکوٰۃ تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں انگریزوں کے دل میں کوئی شک و شبہ نہ ہوا اور جو جانا چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ قائد اعظم کی شدید حالت کو سینہ راز میں رکھا گیا۔ اس کے متعلق جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ کارروائی صرف قائد اعظم کی دلی خواہش کے احترام میں کی گئی ہوگی۔ آپ جانتے ہیں کہ ان کی تمام زندگی اپنے ذاتی معاملات کے جوہر کو خورواخانے کی نگرانی ہو گئی تھی اور اپنی ذاتی تکالیف اور پریشانیوں کو تنہا سنبھالنے کے عادی ہو گئے تھے اور انہیں ہرگز یہ ہندو نہیں تھا کہ ان کے ہلکے مرض کی اطلاع سے ان کے تعینت مندر اور وہاں شاد قوم کو پریشان کیا جائے۔

(صدر قلمی طمان کی بے تحاشہ سپاہی سے اقتباس)

ہی سمت کر رہے والا انسان تھا۔ وہ شام ایک قیامت سارے خاندان پر نوبت پڑی۔ اس کا ایک بیٹا 5 سال اور ایک 3 سال کا تھا۔ بچوں کو خوشی نہیں ہونے دی کہ ان کا تاشفق اور پیارا باپ دنیا میں نہیں رہا۔

انہیں دوسرے گھر میں دوستوں کے پاس بھجوا دیا تھا، کیوں کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ یہ معصوم بچے حارثی زندگی باپ کی پھینچا باتیں بھول کر صرف میں چہرہ کفن اور پھولوں میں لپٹا اور نہیں۔ بچے کی وفات کے بائیس دن بعد سو کے والدین اس گھر لے جانے کے ارادے سے آئے اور اُس نے خود شاید اپنی بہتری اور بھلائی سمجھتے ہوئے اپنے والدین کے ہاں چلے جانے کا ارادہ ظاہر کر دیا اور بیکار سمیت سب چلے گئے۔ شاید اللہ تعالیٰ نے اس کام میں بہتری لکھی ہوگی سب کے لیے جو یہ ہو گیا۔

اتنے بڑے گھر میں ایک مہینہ تو قریب میں نے بالکل جاگتے اور باہر کا دروازہ بھی کھلا رکھتے ہوئے گزارا اور اپنے رب کے حضور ہمت و طاقت اور صبری مانگ اور اس مانگ نے مجھے یہ سب عطا کر دیا، کیوں کہ سب کچھ اُس ذات باری تعالیٰ کے حکم اور رکھتے ہوئے

نصیب کے مطابق ہوتا ہے۔ اللہ ہی وہ برگرید و ہستی ہے جس نے تمام کائنات کا نظام سنبھالا ہے اور اپنے بندوں کی بہتری کے لیے ہر کام اپنے وقت پر انجام پاتا ہے۔ اس لیے ان کو سب کے کہنے کے باوجود کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔

دوسرا بیٹا بھی بھگتا ہوا رہا۔ کبھی کبھی والے دن چکر لگتا۔ اس بھی اس کے ساتھ بیٹے کی قبر پر دعا کرتی۔

بچھلے ہفتے "مہرز دے" پر شام کے وقت گھر کی کھڑکی سے بیٹے کی آواز آئی کہ "ماما باہر آ جائے۔ یہاں اچھی ہوا چل رہی ہے۔" میں نے اندر آنے پر اسرار کیا مگر جواب لہی میں ملا۔ میں باہر گئی تو اس کے ہاتھ میں پھولوں کا ایک گلدستہ تھا جو وہ اپنی بھتیجیوں کے اظہار کے لیے لایا تھا اور مجھے سر پر انداز کر کے لیے باہر بلا یا تھا۔ میں نے اسے گلے سے لگا کر پیار کیا اور گلدستے لیا۔ وہ باہر سے ہی چلا گیا، میرے دل میں ایک جوک میں لکھی کہ اب اولاد کے پاس آتا کبھی وقت نہیں رہا کہ وہ روگھڑی بیٹھ کر ان کا حال پائس کے مسائل پوچھ سکیں؟ جبکہ جی جو کہ بڑے خاندان میں رہتے ہوئے اپنے گھر کی تمام ذمہ داریاں پوری کر کے بیٹھے کی اور پیرا آتی ہے اور اتوار کی شام سے پہلے چل جاتی ہے۔ ان خاتون کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے جنہیں وہ بہت پروا نہ تھی اور صبر سے پوچھ رہی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ اب ایک ماں صرف ایک "گلدستہ" کی مستحق رہ گئی ہے؟

اللہ تعالیٰ تمام بچوں کو ہدایت اور رہنمائی دے کہ کل کو ان کو بھی اسی عمر پر آتا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ اللہ بھی بھی ان بچوں کو کسی آزمائش میں نہ ڈالے کہ جب بھی ماں کا دل ہی تو بے مگا اور روئے گا۔

وہ ماں سب کے لیے دعا گو ہے۔ اپنے بیٹے، بیٹی، بہو، پوتے، نواسے۔ سب کے لیے اپنے رب سے بھلائی اور ان کی خوشیاں مانگتے ہوئے اس کے ہونٹ نہیں تھکتے۔ وہ شکر ادا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس جہل کیا ہے کہ وہ محنت کر کے اپنی زندگی گزار رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو کسی کا تھکان نہ کرے اور ہمت، طاقت اور صحت کی دولت سے نوازے، جائے کب آتکھ بند ہو جائے۔

نویس سچ بیانی

## عادت کی صحبت

فاطمہ بتول

خاموشی کی سزا بھگتتے، والی ایک لڑکی کی عجاہان

www.paksociety.com

ہوش سنبھالا تو اپنے ارد گرد غربت ہی غربت دیکھی۔  
والد صاحب پنشن تھے، مگر مستقل مزاجی نہ ہونے کی

میرا نام فاطمہ ہے۔ میں نے خاندان کے  
ایک مذہبی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ جب میں نے



کرنے پر بھند ہو گئے۔

میرے والد نے ان کی یہ بات بھی مان لی اور اسی وقت گاڈن کے مولوی صاحب کو بلا کر میرا نکاح عابد کے ساتھ کر دیا گیا اور چھ مہینے کے لیے ایک سال کا وقت لے لیا۔

میرے والد ان کی زمینیں اور دولت دیکھ کر۔

سب کچھ بھول گئے۔ انہوں نے میرے دادا جان سے

مشورہ کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔ نکاح کے بعد دادا جان کو خبر ہوئی تو وہ سخت ناراض ہو گئے۔ انہوں نے ان

سے صرف ایک بات کہی کہ اگر انسان بکری بنے بھی جاتا ہے تو وہ نین لوگوں سے مشورہ ضرور کرتا ہے۔ تم

نے بیٹیا دے دی اور ہمیں بتایا تک نہیں۔ اس بات پر

ضرور ہمارا پورا خاندان ہم سے ناراض ہو گئے، مگر

میرے والد کو کسی کی پروا نہیں تھی۔ انہوں نے لڑکے

والوں کو کہہ دیا تھا تمام چیزیں اولاد کے کپڑے کھانا

وغیرہ آپ لوگ کریں گے۔ میرے والد عابد کی

تقریبیں کر کے نہ ٹھنٹے تھے۔ عابد نے مجھے موہاگل

لے کر دیا۔ ہم گھنٹیوں رات کو نون پر بات کرنے۔ سارا

دن صبح پر بات ہوئی۔ بیٹھے میں ایک دو بار عابد ہمارے

گھر آتا تو والد صاحب اور والدہ اس کی خدمت میں

کوئی کسر نہ چھوڑتے۔

دیکھنے ہی دیکھتے سال گزار گیا۔ عابد کے گھر

والوں نے دل کھول کر دوپہہ خرچ کیا۔ عابد اسی کو رقم

دے دیتا تھا اور وہ ہم لوگ خوش چلک کرتے جاتے

تھے اور نینتیا کپڑے اور دیگر اشیاء خریدتے تھے۔

چیسے کم ہونے تو ہمیں عابد کو نون کرو دینا تو وہ مزید پیسے

پیسے بھیجتا دیتا تھا۔

وجہ سے ہمیشہ گھر میں تنگی رہی۔ اللہ زندگی دے

ہمارے دادا جان کو، انہوں نے زندگی کے ہر سوز پر

ہماری بہت مدد کی۔ والد صاحب کو پڑھا، ان کی

شادی کی سحر ان کا جب بھی جاہنا کام کرنے چلے

جاتے، وہ نہ فادغ گھر میں بیٹھے رہتے۔ دادا جان

دو پہر کو کسی کے ہاتھ ہنر داہن وغیرہ بھیج دینے۔ والد

صاحب نے جب دیکھا کہ ہمارے دادا جان داہن

وغیرہ بھیج دینے ہیں تو انہوں نے کام پر جانا بالکل

چھوڑ دیا۔ دادا جان کے گھر کسی بچے کو بھیج دینے کہ

آج یہ بھیج دوں آج وہ بھیج دوں۔

دادا جان کا کوئی مستقل کاروبار نہیں تھا۔ محنت

حزور کی کرتے تھے۔ دادا جان وفات پا چکی تھی۔

میرنی امی گاڈن کی سبھی سادی عورت تھی۔ انہوں

نے بھی ہماری تربیت اور مستقبل کے بارے میں نہیں

سوچا تھا۔ ہم پانچ بھینس ہیں، ان میں میرا نمبر دوسرا ہے۔

بڑی بھینس کی شادی گاڈن میں ہوئی تھی۔

میں دنیا کی باتوں اور غربت کے باتوں وقت

سے پہلے جوان ہو گیا۔ جب میرے ابو کو ہوش آ گیا کہ

بیٹا کے بارے میں کچھ سوچتا ہے۔ میرے ابو کی ایک

عادت ایسی تھی کہ سادے خاندان والے ہم سے دور

ہوتے چلے گئے۔ وہ یہ کہ اگر کسی کی طرف کرتے تو

اسے آسٹونوں کی بلندیوں تک پہنچا دیتے اور کچھ

عرصے بعد اس شخص سے ناراض ہو کر اسے زمین کی

پتھریوں تک لے آتے۔

والد صاحب کی انی عادت نے میرنی بھی زندگی

حیران دو گئی کہ جس عابد کی تعریفیں کر کے میرے امی ابو نے جھٹکتے تھے، اس کا گھر انتہائی سادہ اور دو گئی ٹٹی کا بنا ہوا تھا۔ مگر بسبب چیزیں مجھے اچھی لگنے لگیں، کیوں کہ عابد بہت اچھے اخلاق کا ملک تھا۔ وہ بہت پیار کرنے والا شخص تھا، ہماری زندگی بہت اچھی گزارنے لگی۔ جیسے میں نے پہلے کہا کہ میرے والد کی عادت تھی کہ وہ پہلے آدمی کی تعریفیں کر کر کے اسے آسمان پر لے جاتے، پھر کچھ دنوں بعد اسی شخص کو زمین کی پتلیوں تک گرا دیتے تھے۔ یہی کچھ میرے گزشتہ شوہر عابد کے ساتھ ہوا تھا۔

ابھی وہاں شادی کو چارواہ ہوئے تھے کہ ایک دم میرے والد نے عابد میں کپڑے نکلانا شروع کر دیے۔ وہی عابد جس کی تعریفیں ہر آنے والے سہانے کے سامنے کی جاتی تھی۔ اب وہی عابد دنیا کا سب سے نکلا اور کھنڈ بن گیا تھا، ہر آنے والے کے سامنے عابد کی کئی کوتاہیاں بتائی جانشیں۔ ایک با دو حد ہی ہو گئی۔ میں ایک ماہ بعد ملنے کے لیے امی کے گھر آئی تو امی ابو نے مجھے گھر بٹھایا اور صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ اب تم اس گھر میں واپس نہیں جاؤ گی۔ میں دن بعد جب عابد مجھے لینے آیا تو امی نے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ عابد کافی دیر دروازہ بہاتا رہا۔ میرے نمبر پر کال کر دیا، مگر میرا سوا بل ابو مجھ سے لے چکے تھے۔ ابو نے عابد سے ملنے سے انکار کر دیا۔ وہ بیچارہ میرے دادا ابو کے پاس گیا کہ مجھے بتائیں تو سبکی کہ میرا قصور کیا ہے؟ دادا ابو نے ایو کو بلا باور سمجھا یا کہ تم کہا کرتے ہو، کیوں بچی کی زندگی تباہ کرنی ہے۔ اسے کچھ سمجھو۔

مگر میرے ابو صرف ایک بات کہتے کہ مجھے وہ اچھا نہیں لگتا۔

میری تربیت اس قسم کی ہوئی تھی کہ میں اپنے حق میں کچھ بول بھی نہ سکتی تھی۔ جو امی ابو کہتے مجھے ماننا پڑتا۔ میں ایک فیڈی بین کہ زندگی گزارنے لگی تھی۔ چھ ماہ کا عمر گزار دیا، اس عمر میں عابد نے کسی کس کا دروازہ نہیں ٹھکنے باور کس کس کے آگے نہیں دوبا کہ میرا قصور تو مجھے بتائیں، کس چیز کی کمی وہی میں نے اپنی بیوی کو، کس جرم کی سزا مجھے دے رہے ہیں؟ مگر میرے

والد پر کسی بات کا اثر نہ ہوتا، بلکہ جب عابد آتا، تو والد صاحب گھر سے باہر نکل جاتے تھے اور اگر راستے میں ملتا تو والد صاحب دامن بدل لینے تھے۔ آخر ایک روز میرے والد نے عابد سے طلاق کا مطالبہ کر دیا، جسے عابد نے سختی سے دکر دبا کہ مر جاؤں گا، مگر طلاق نہیں دوں گا، مگر میری شکل صورت، کچھ خاص نہیں تھی، مگر عابد مجھ سے نفرت کر پیا کرتا تھا جس کا احساس مجھے اب ہو رہا ہے۔ میں ایک بچے کی ماں بھی بننے والی تھی۔ آخر والد صاحب نے عدالت سے رجوع کر لیا۔ عابد نے یہ شرط رکھی کہ اگر میری بیوی ناظرہ عدالت میں بیان دے دے کہ میں عابد کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تو میں اسے طلاق دے دوں گا۔

عابد کو اپنے پیار پر یقین تھا کہ میں کبھی ایسا بیان نہیں دوں گی مگر..... میرے امی ابو نے سختی سے کہہ دیا کہ تم عدالت میں یہ بیان دو گی کہ میں عابد سے طلاق چاہتی ہوں۔ عابد بھی عدالت میں موجود تھا، امی ابو کے کہنے پر میں نے عدالت میں وہی کہا جو مجھے بتایا گیا، عابد کے دل پر کیا گزری ہو گی، میں نے اسی وقت عابد کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے، مگر میں بے حس ہو چکی تھی۔

آخر مجھے طلاق ہو گئی، طلاق کے کچھ عرصے بعد میں نے ایک بچے کو جنم دیا۔ آج میں اپنے امی ابو کے گھر زندگی گزار رہی ہوں، مجھے نہایت انصاف ہے کہ میں اپنے امی ابو کی عادت کے سمیٹتے چڑھ گئی۔

مجھے آج تک سمجھ نہیں آتا کہ میرے ساتھ یہ سب کیوں ہوا؟ شادی کے وقت بھی میں نے ماں باپ کی عزت کا پاس رکھا لیکن انہوں نے ہی میری اور میرے بچے کی خوشیاں چھین لیں۔ شاید یہ میری بزدلی تھی۔ مجھے اپنے حق کے لیے آواز اٹھانی چاہیے تھی۔ وہ بے شک میرے ماں باپ تھے لیکن میں عابد کی بیوی اور اس کے ہونے والے بچے کی ماں بھی تھی، لیکن میرے والد کی ہی ضد اور اتانے کا ہاتھوں ہاواہی زندگی برپا ہو گئی۔ ابھی کبھی خاموشی بھی سزا مان جاتی ہے اور شاید یہ ہی میرا قصور تھا۔

☆.....☆



## دسویں سچ بیان

بانہا کر دوہا انگناہ

نصرت سمرقراز



ماکر دو گناہ کی سزا پانے والی ایک اورست کی جبران کن کہانی



بچے سے زمین مٹی بچھ لہنا سے اور اس دوران بعض اوقات ظالم کے ساتھ ساتھ مظلوم بھی اپنے ناکر وہ گناہوں کی سزا اوصول کر لہنا ہے یعنی کہیوں اور گھن دونوں پس جانے ہیں۔

تسہد طو لیا ہونا جاری ہے مگر کیا کروں بنانے کا مفہد پس بکلی سے کہ ہم صفائی طہن کر بھی صرف ظالم کی نشان دہی کر سکتا ہے اور دو بھئی اپنی جان پر کھیل کر لیکن مظلوم کو انصاف دانا اس کے کس میں نہیں ہوتا۔ ہم تو ہمیں سچائی اور حقانیت مٹھوں پر کھینچنے چلے جاتے ہیں اور دونا کرتے ہیں کہ مظلوم کی زندگی اپنی طو لیں ہو جتنا ہمارا نظام انصاف کا راستہ طو ل ہے۔ چشہ درانہ ذمہ دار ہاں ادا کرنے ہوئے بعض ایسے واقعات علم میں آئے ہیں کہ دل چاہتا ہے کہ اس میں سچ کہاں اس کے نادر مینا کے لیے غر پر کہا جائے تاکہ وہ معاشرے کی سفاکیوں سے لاشم نہ رہ جا میں بواضہ جو آج میں ظلم بند کرنے جاری ہوں گی برخصیفت ہونے کے باوجود ایک انسان مظلوم ہوتا ہے۔

واقعہ جہاں سے شروع ہوتا ہے کہ مجھے اپنے اختیار کے خواہشیں انڈیشن کی گور اسٹور سٹا کے لیے پاکستان کی دس گھنٹی اور کامساب خواہشیں کا اثر تو نہ کرنا تھا کہ زندگی

جب میں نے ایم اے میں پرمٹرم ڈیپلومریجیکٹ سلبکٹ کہا تو میرے ارادے بہت بلند تھے اور فلم کے ذریعے معاشرے کو سدھارنے کے عزائم میں بہت متکلیف تھی لیکن جیسے جیسے دنیا کی حیثیتوں سے شناسائی ہوئی اور در بایے صحافت میں غوطے لگائے تو معلوم ہوا کہ یہ تمام بلند ہاا ارادے رہت کی دپوار ثابت ہوئے اور کبے بعد دیگرے مہار ہونے چلے گئے۔

حقیقت کچھ یوں ہے کہ ہم معاشرے کا مکروہ چہرہ سامنے نولا سکتے ہیں مگر اس چہرے کی کراہیت دور نہیں کر سکتے۔ ہم ظلم کے خلاف آواز بلند کر سکتے ہیں مگر ظالم کا گر جان پکڑنے کی صلاحیت ہم میں نہیں ہے۔ ہم ظلم سینے والوں کی آواز خون دل سے صغیر فرط اس پر کھینچنے کی صلاحیت ضرور رکھتے ہیں مگر مظلوم کو انصاف کی منزل تک نہیں پہنچا سکتے کہ اس منزل کا راستہ اس نذر و جببہ اور طو ل ہے کہ عموماً ظالم ظلم کرنا رہتا ہے اور مظلوم انصاف تک پہنچنے پہنچنے اپنی ابدی آرام گاؤنگ تک پہنچ جاتا ہے اور سکون سے سو جاتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالم کی رسی دراڑ کرتا ہے مگر بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ نمانی کو نمانت ظالم کی رسی دراڑ کرنے کے لئے ایک دم اس کے پاؤں کے

ہے؟ شاید کوئی اور سوچا ہوتا تو یقیناً مجھے اپنے کام سے کام رکھنے کا مشورہ دنت میں ملتا جو اکثر ایسے اوقات میں میرے تجربے میں آتا رہتا ہے، مگر شاید گورا سنووری بننے کا شمار اور خوشی ہی تھی کہ جیلر نے مہربانی فرما کر یہ مہرٹہ اُس کے بارے میں بتایا بلکہ میری ذاتی درخواست پر اُس سے کچھ دیر بات چیت کرنے کی اجازت بھی مرحمت فرمادی۔

ابتدا میں تو وہ کچھ بھی اپنے بارے میں بتانے کے لیے تیار نہ تھی، مگر شاید یہ میرے نرم لہجے اور اچھا کا اثر ہی تھا کہ اُس نے اپنی المناک داستان مجھ سے شیئر کی۔ اُس کی کہانی سن و غن اُسی کی زبان میں سچی کہانیاں کے قارئین کے لیے ہمیں خدمت ہے۔

میرا نام شہزادہ بی بی ہے۔ میں اپنے ماں باپ کی سب سے اولاد ہی، لہذا میری پیدائش پر وہ دونوں کافی خوش تھے۔

کے مختلف شعبوں میں اپنی ذمہ داریاں بحسن و خوبی کامیابی کے ساتھ نبھاتی رہی ہوں۔ اسی زمانے سے میں نے اسکول پرنسپل، منیجر، اینگری، ٹی وی آرٹسٹ، وی بی، مول انجینئر پائلٹ، بائی ناز ڈاکٹر زاہد جیلر خواتین کی اسٹ مرٹ کی۔ آج جو واقعہ میں آپ کو سنانے جا رہی ہوں وہ سینٹرل جیل کراچی کی شعبہ خواتین کی ہیڈ جیلر کے انٹرویو کے دوران میرے ظلم میں آیا۔

میرا بنیادی مقصد تو کامیاب پاکستانی عورت کا انٹرویو کرنا تھا، مگر میری نظر ایک ایسی عورت پر پڑی جو پاکستانی تو تھی، مگر کامیاب نہ تھی، جنہی تو زمین پر کھٹے اپنے سینے سے لگائے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایسی پابندیت اور وہ پرائی ٹی کی مین اُس کی طرف متوجہ ہوئے بنا نہ رہ سکی اور اپنے موضوعات بہت گرجیلر سے یہ پوچھنے پر مجبور ہو گئی کہ یہ عورت کون سے اور یہاں کیوں بیٹھی



رات انساں کو درد اٹھا۔ ابا اپنی رحمتی سنبھالتا ہوا کمرے سے نکلا اور داوی سے بولتا ہوا کہا کہ میں داوی انساں کو لینے جا رہا ہوں، میں کمرے میں نئی نو لٹائن، درد کے مارے زب زب رہی تھی۔ میں نے آستے گلاس بھر کر پانی پلا یا نو وہ داوی۔ ہمیشہ خوش رہو جانا۔ پھر وہ آخری جملہ تھا جو میری ماں نے مجھ سے کہا تھا، پھر رات انساں آگئیں اور اس نے مجھے دھکا دے کر کمرے سے باہر نکال دیا اور کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

مندر کمرے سے آئی ماں کی چیخوں کی آواز میرا دل رپلا رہی تھی۔ میں کمرے آج مجھ بھی تھی۔ مجھے لگا دانی ماں میری ماں کو مار رہی ہے، جیسی تو وہ زور رہی سے اور داوی وہ لٹائن کو مار رہی تو رہی تھی۔ میں نے داوی سے پوچھا، رات انساں کہا کر رہی ہے تو وہ بولیں۔ داوی انساں سہارے نے بھائی کو دنیا میں لے کر آئے تھی۔ بھائی نو کیا تو ماں انساں بھی چلی تھی۔ داوی انساں نے باہر آ کر اعوان کہا اللہ کی مرضی اور ابا بھی اللہ کی رضا پر خاموش ہو گیا۔ مرضی تو اللہ کی تھی مگر انسانوں کا عمل دخل بھی تھا کہ نہیں، یہ پوچھنے والا کوئی نہیں تھا۔ سوگ تک سٹلے والوں نے خواب کھانا کھانجا۔ شاید زندگی میں پہلی مرتبہ ام داوی پوٹی نے پیٹ ار نہایت مگر کھانا کھانا تھا۔

لٹائن کو کمرے جو خندان تھا کہ رات کو درد دہا۔ دروازہ کھلا تو دیکھا ابا کے ساتھ ایک عورت خوب گونگا کناری کا زون برفی لیاں پہنے کھڑی ہے۔ تیز خوشبو کی مہک میرے نختوں تک پہنچ رہی تھی۔ وہ گھر میں داخل ہوئی تو لٹائن نے پوچھا، کون ہے؟ ممبر ابو بولا۔ تیری بی بی ہو ہے اور مجھے کہا۔ تجری ماں سے داوی در ستر بننے پر راکر بولیں۔ "آئے بانیے ظالم بھی تو تیری بی بی جبر کا سوگ بھی ختم نہیں ہوا تو درستی لے آیا۔"

ابا بولا۔ "انساں سوگ نمن دن کا ہوتا ہے اور آج چو خندان ہے۔" داوی سردی کوئی عدت نہ ہوئی نہیں وہ آزاد ہے اور ابا کو اپنے مطلب کی ہر بات خوب از بر تھی۔ ایک بار پھر جدی دن اور رات نئے ابا اور ابا ماباں کا وظیفہ۔ جیسے جیسے میں بڑی ہوئی تھی۔ مجھے پتا چلا رہا کہ بی بی ماں بہت چالاک ہے۔ ماں تو سارا دن کام میں لگی رہتی تھی اور رات کو ابا کی خدمت میں حاضر رہتی

یہ خدا کی مرضی ہی تھی کہ نین سال اکلوتا رہنے کا اعزاز بھی مجھے حاصل ہوا، ابا میری ماں کے پر حضور کو کر چپا تھا۔ صبح معنی میں جوہر کا غلام تھا۔ دو نین سال کی عمر ہی کیا ہونی ہے۔ مجھے نو کچھ باوند تھا۔ یہ سب باتیں تو مجھے میری داوی کے ذریعے معلوم ہوئیں جو کہ نا بیجا تھیں مگر کان اور زبان تو رکھتی تھی۔ دراصل میری بد قسمتی کے دن وہیں سے شروع ہوئے جب لٹائن دو بار دامید سے ہوئیں۔

میرے ابا کا رگنی خاص ذریعہ ادنیٰ نو نہ تھا، روزانہ کیا بناؤ پر وہ چند دے لگا کر لانے تھے۔ گھر میں افراسی خدا داوی کی تم بھی، لہذا انہوں نے کس کس ہم نافذ نہیں کرنے تھے۔ کھانے بنے اور داوی حاصل کرنے کی کوئی عمدہ غذا نہیں میسر تھی۔ پچھل فرسٹ وغیرہ تو آماں سے تارے نو کر لانے کے سزا دے تھا۔

میرنی داوی کے مطابق میں نین سال کی تھی مگر ایک سال کی تھی تھی۔ بہار نا بجا داوی جا رہی تھی تھی جس اور ابا کو ایشیا بی رہتی تھی۔ داوی جانی تھیں ہر رات تیرا ہوا وظیفہ نہ وہ جیت ایسی پابندی سے او کرتا تھا جیسے بی وظیفہ اسے سبوحا جنت تک لے جائے گا۔ بہار حالہ ہوئی کے ضنون تو اسے بار نہ رہے، مگر نہ جانے کس مولوی کی بہ بات اسے ضرور از بر تھی کہ وہ عورت جس کا خاندان اسے جانے اور در صبح کر دے تو سز بزار فرشتے ان پر رات بھر لعنت بھیجتے ہیں، شاید وہ مولوی بہ بنانا بھول گیا تھا کہ چہ باہ کی حامل بیوی کو دن میں نین وقت کا کھانا کھانا بھی خاندان کے فرائض میں شامل ہے ہر درد نہ کھیل نو ہر درد جانور بھی کھلا کرتے جن۔ بہر حال ماں کو پیٹ بھر کر روٹی نو نصیب نہ تھی، علاج کے لیے روٹی کہا خاک تھی، جو کچھ گھر میں ہوتا وہ جبر کو اور داوی کو کھلا دینا، ابا نو باہر سے کھانی کر آتا اور رات بھر شوہر ہونے کا فرائض وصول کرتا کہ اسے اس وصولی کا نو قانوناً حق حاصل تھا۔ وہ کوئی عزم نو نہ تھا کہ انساں اس کی رپورٹ تھانے میں درج کرانی کہ کس طرح میرا جائز شوہر میری بی بی کا باپ اسے زندگی کے آخری کنارے کی طرف لے جا رہا تھا۔

داوی بتاتی تھیں میں چار سال کی تھی جب ایک

گھر پر غربت نے اپنے پر پھیلانے ہونے سے نورا رو کے گھر کو دولت کی دیوٹی نے اپنے پردوں تلے چھپا ہوا تھا ابے میں یہ کون دیکھتا ہے کہ یہ دولت کہاں سے آئی ہے۔ وہ شراہی ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر جرائم میں بھی ملوث تھا۔ جب یہی نہ اپنی پڑھ ہونے کے باوجود دولت اس کے گھر کی باندنی تھی۔ اس نے رشہ و بے کے ساتھ ہی پھیل اور مٹھانی کے نوکر سے، نئی اماں کے جوڑے، اماں کا سوٹ ٹخن بنی تھیں اور نورا اور باہرچی خانے میں صہنہ بھر کر راشن ڈلو کر نئی اماں سمیت اماں کا بھی سٹہ بند کر دیا اور وہیں میں بیٹے کی بد قسمتی سمیت کمر سسرال کی فہد باشتت میں آگئی یہ عقدہ بعد میں کھلا کہ اس سے پہلے بھی وہ گھر کا خرچہ اپنی یا کرنا تھا یعنی نواں دودھ کے گھاس بھر کر یا کو چیک کر لیتی تھی۔ یہاں بہت بھر کر کھانا ز ضرور کھاتا تھا مگر اس کھانے کا خرچہ بھی سوو کے ساتھ وصول کیا جاتا تھا۔ میں نے نہ مرد کو عورت کے حصول کے لیے ابا کا خوشامد از طرز عمل ہی دیکھا تھا مگر یہاں نواں حصول کے لیے خوشامد از کے بجائے دشنام طرز عمل اختیار کیا جاتا تھا۔

شہزادی کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو نپ بہ رہے تھے۔ باج کوئی نکاح نامے پر دستخط کے بغیر یہ کام کرے نورا نے بھر میں اس کی تھوٹھو بولی ہے۔

تھانے میں رچوت ورج کرانی جالی ہے مگر کچے کاغذ پر اگوتھا لگانے کے بعد مرد بند کمرے میں کتنا با اختیار ہوتا ہے یہ میرا دل ہی جانتا ہے اور میرا جووان کا گواہ ہے۔ میں بھی کمرے میں جانے سے انکار کرتی تو مہری سانس کہتی۔ جالی بی جا نہ مرد کا حق ہے دو جیسے چاہے اسے استعمال کرے۔

شاوین شدہ زندگی میرے لیے عنوت خانے سے کم تھی۔ وہ گھات گھات کا پالی ہے کچے عمر کا مرد اور میں تازک ہی تھی، بہرات وہ مجھے یہی آواز سے گزرا کہ ہر دن میں دعا کرنی کہ اللہ اس دن کی رات نہ آئے پھر ایک دن کی ایسی کالی رات آئی کہ میں اس عنوت خانے سے نکل کر اس زندان خانے میں آگئی۔ اس بات کا گواہ نہ پورا گھر ہی تھا کہ میں اپنے خاندان کے ساتھ نہایتی میں جانے سے گھبراہٹی تھی اور یہی دوسرے ناکردہ گناہ کا

نہی جب کہ نئی ماں تو سارے گھر کا کام بھگے کر دانی تھی اور خود سارا سارا دن بڑی سوتی رہتی تھی اور رات کو اپنی خدمت اور باہر کی خدمت نووہ بس اپنی ہی کرنی کہ رات کو دودھ وہ اپنے ہاتھوں سے گرم کر کے ابا کو پلائی تھی اور اپنا مزے سے خزانے بھرنا سو جانا تھا۔ یہ بات نو بہت سالوں بعد مہرئی کچھ میں آئی کہ سارا دن کام کاج کو ہاتھ نہ لگانے والی اماں رات کو دودھ کا گرم گلاس اپنے ہاتھوں سے ابا کو کیوں پیش کرتی ہے اور وہ دودھ لانا کون ہے جسے پی کر اپنا تھیل سو جاتا تھا اور پھر اماں باہر مچھن میں چار پانی ڈال کر مزے سے سو جاتی تھی اماں کی اس کارروائی کے باوجود ایک نہ وہ پورے چھ بچے اس کے پیدا ہوئے، جن میں سے نین داہنی کو پیار سے ہو گئے۔ خود نووہ جو کک کی جٹی تھی جو ہر بار والی کے ہاتھوں زندہ رہی تھی۔ ویسے رکھا جائے تو یہ والی بھی پورے گاڑاں کی عورتوں کے لیے ملک الموت سے کم نہ تھی۔ سخت استخوانی ہاتھ اور سخت مردانہ چہرہ اور بھاری آواز۔ بڑی نسبت کی چینی زچہ بونی جو اس کے ہاتھوں بچہ حج سلامت ان رہا میں آجاتا اور وہ خود بھی زندہ رہ جاتی۔

ناہیا راوی کا وجود میرے لیے کسی دولت سے کم نہ تھا۔ وہ آنکھوں سے ناچنا ضرور تھی مگر دل کی بیٹھی۔ دل سے ات سب رکھائی دیتا تھا۔ نئی ماں کا میرے ساتھ ناروا سلوک اور ابا کے ساتھ اس کا سلوک بھی مگر وہ لاچار کچھ کر سکتے بہکار نہ تھی۔ جب دن بھر کی تھکی باری رات کو میں سوئے لیکن تو واہی اپنے نرم نرم مہراں ہاتھوں سے میرا سر سہلائی اور میں نیند کی بر سکون واہیوں میں پو جاتی۔

مہری حقیقی بد قسمی کے دن نو تب شروع ہوئے جب واہی اپنے نرم ہاتھوں والے دجوو کے ساتھ منوں منی آؤڑھ کر سوئیں۔ اس وقت تک میں چودہ سال کی ہو چکی تھی۔ واہی کی آنکھ بند ہونے کی دہرئی کہ رازہ نے اپنا رشہ دوبارہ میرے گھر بھیج دیا جو وہ پہلے بھی واہی کی زندگی میں بھیج چکا تھا مگر انہوں نے صاف منع کر رہا تھا کہ ابھی مہری وہی بہت چوٹی ہے مگر نئی اماں نو چالاک ہونے کے ساتھ ساتھ لا چکی بھی تھی۔ ہمارے



واحد گواہ ظہر آیا گیا۔

کھانے کے بعد وہ جو سلوک میرے ساتھ کرتا تھا اگر عرض بھی دیکھ لیتا تو کاتب آہٹتا۔

میں راز سے قدموں خالی ہوتے لے کر باورچی خانے میں داخل ہوئی تو لائٹ آچکی تھی۔ میں نے بیٹھ جھونے کے لیے نکالا کھولا دیکھنے کا بیجا کچا حصہ نیچے گزارا یہ کیا ہے میں نے گھبرا کر بیٹھ دکھ دی یہ تو چھینکی کا سر ہے، مجھے سنے آگئی، چھینکی کا پکلا ہوا اعضاء اور سر، میں بھاگ کر کمرے میں آئی، دیکھا تو میرا خاندان اپنا پیٹ پکڑے الٹیاں کر رہا تھا، اسی اثناء میں درد دارہ بجا۔ میری سانس اور دھڑکنے والے گھر میں داخل ہوئے، اسی وقت تک اٹھیاں کر کے رازد کی حالت غیر ہو چکی تھی، اسپتال پہنچتے پہنچتے اس نے دم توڑ دیا۔

میری سانس نے داہلا کر دیا کہ بھولنے کیلئے گھر میں موج پا کر میرے بیٹے کو کھانے میں زبردے کر بلاک کر دیا، اور نہ دانا بنا کتا، نہ کسے جنت میں جانا۔ وہ بھی اس رات جب کہ گھر پر کوئی تھا بھی نہیں۔ میری چھینکی والی حقیقت کی کہانی ایک سن گھڑت داستان بانی تھی۔ نوز پوئیس بھی آگیا اور مجھے میرے ہی خاندان کے نکل کے اثرات میں یہاں لے آئی۔

سانس سمیت سارے گواہ میرے خلاف تھے اور ثبوت یہ تھا کہ میں اپنے خاندان کے ساتھ خباثی میں جانے سے ذریعہ تھی۔ درج بات کیا تھیں نہ میں شرم کے مارے بنا سکتی تھی، نہ ہی کسی گواہ کو اصل حقیقت جاننے سے سزاوار تھا۔ میرا اٹت مارنے کا کوئی ارادہ نہ تھا، مگر قدرت نے اس سے اتفاق سے لے لیا تھا اور میں نا کر، گناہ کی مراد بھگت رہی ہوں۔ میری بیانی گواہ اور ثبوت کے بغیر کسی عدالت میں ثابت نہیں ہو سکتی تھی۔ وکیل کرنے کے وسائل میرے پاس نہ تھے، یہاں تک کہانی سنا کر شہر ادنیٰ پھوت پھوت کر دوئے لگی۔

میں بحیثیت ایک صحافی کامیاب خواتین کا انٹرویو کرنے نیشنل چینل تھی۔ ایک بد قسمت جنت حوا کی بیٹی داستان اپنے ساتھ لے کر واپس لوٹ آئی کہ اس کی بیانی سوائے اللہ کی عدالت کے کسی اور جگہ بغیر ثبوت اور گواہ کے ثابت نہیں کی جاسکتی تھی۔

☆.....☆

اُس کا بی رات میری سانس سمیت پورا گھر کھائی شادی میں گیا ہوا تھا صرف میں اپنے خاندان کا مشق سہم لینے کے لیے تھا گھر میں وہ جو تھی۔ میں مر جانے کا جو سلسلہ توڑتی تھی گھر کی گواہ نہ کی، بہت میرے اندر ہرگز نہ تھی گھر میرے ہاتھوں میرے خاندان کی موت واقع ہوئی لیکن اس میں ذرہ برابر بھی میرا قصور نہ تھا لیکن یہ ماننے کے لیے کوئی تیار نہ تھا اور یہی میری گواہی تو ایک تو وہ ہے ہی آدھی اور عظیم عورت کی تو آدھی گواہی بھی نہیں دیتی۔

سارا گھر بشمول میری سانس کے اپنے بیٹے کی موت کا ذمہ دار مجھے ظہر بار تھا۔ میری کہانی نے ایک نہ سنی، سو میں چپ چاپ مجرم قرار دے دی تھی۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ اُس رات جب رازہ گھر آیا تو اس کے ہاتھ میں قہقہے کی تھیلی تھی جو اس نے مجھے پکڑتے ہوئے کہا۔ "جانا جلدی سے اسے پکڑ کر روٹی بنا کر لے آ سنا تھل کر کھانا کھاتے ہیں اور پھر اُس نے مجھے آنکھ مارنی اور میں لرز کر رہ گئی۔ پھر حال مرئی کیا نہ کرتی، میں اُس کی تلافی اور شرفی ہوتی تھی۔ اسے مجھے ہر طرح سے اسپتال کرنے کا قہقہ حاصل تھا اور پھر وہ ہو گیا جس کا میں نے خواب میں بھی سنا ہوا تھا۔

میرا جو ہر دن کے رات میں نہ ڈھٹنے کی دعا مانگا کرتی تھی، میری ساری زندگی کا بی رات پر محیط ہوئی۔ میری بے گناہی کا کوئی گواہ کوئی ثبوت نہ تھا اور میری بات کا کسی کو یقین نہ تھا کہ میں تو ویسے ہی اپنے خاندان سے ڈر رہی تھی اور پناہ مانگتی تھی اسی لیے مجھ پر الزام تھا کہ میں نے اُسے عدم کی راہ دکھادی، مگر یہ تو قدرت کا کھیل تھا میں تو خود خواہ ہی بیچ میں بیس تھی۔

دراصل اُس اندھیری رات میں لائٹ کے بغیر جو تیر میں نے اُسے دکھا کر کھلایا تھا اُس میں پکانے کے دوران نہیں سے ایک چھینکی گئی۔ میرے فرشتوں کو اس بات کا علم نہیں ہوا اور میں نے روٹی کے پرات کے ساتھ وہی تیر ڈالی کہ اپنے خاندان کے آگے رکھ دیا۔ لائٹ ابھی تک آئی نہ تھی، موسم تھی بھی اپنی طبعی عمر پوری کر کے بچھ چکی تھی۔ میری پتا نہیں خوش قسمت تھی کہ بد قسمتی کے اپنے خاندان کے اصرار کے باوجود آنے والے وحشتانہ گھونٹوں کا چاپ نے میری جھوک منادی تھی۔ پیٹ بھر کر کھانا

## گیارہویں سچ بیانی

### محبت کی کائنات

عبدالغفار عابد



موبائل فون سے منم لینے والی ایک عورت کی عبرت خیز کہانی

•••••

جینا شروع ہوئی۔ میں نے کال ریسیو کی، دوسری طرف سے ایک لڑکی بول رہی تھی کہ کیا آپ غفار صاحب بات کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ جی میں غفار رہی بول رہا ہے۔

”آپ کون ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”میں نسیم بات کر رہی ہوں، پورے دلاستہ، مجھے آپ کا نمبر سعید بھائی نے دیا ہے، دراصل میں نے اپنا داستان آپ سے لکھوانی ہے۔“ میں نے کہا۔

آج صبح سے بارش پوری تھی، موسم بہت خوش گوار تھا۔ یہ بارش کے آخری دن تھے۔ آج میں نے اپنے دوست سعید کے ساتھ پورے والا جانا تھا۔ جہاں کی ہریالی اور تازہ رنگہ سبز والوں کو سوہ لینا اور آنکھوں کو خیرہ کرتا ہے۔ میں بارش کے رکنے کا انتظار کر رہا تھا تاکہ اپنے دوست سعید کے پاس پہنچ جاؤں۔ بارش اب کافی حد تک رک چکی تھی۔ میں نے اپنا بایک باہر نکالی ہی تھی کہ میرے موبائل کی گھنٹی



آئی۔ میں نے ادا کے کیا تو ایک لڑکابت کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”آپ کون۔“

لڑکا بولا۔ ”میں شہزاد بول رہا ہوں۔“ میں آپ کا کلاس فیلو ہوں اور میں بہت ترہا ہوں اور آپ سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ دوستی جو کسی پائیزہ رشتے میں بدل جائے۔ اگر آپ نے مثبت جواب دیا تو میں آپ کو پانے کی پوری کوشش کروں گا۔“ میں نے فحیر سوچے، مجھے ہاں کہہ دئی۔ تقریباً مینہ بھر ہمارا بات چیت ہوئی، سواکان پر ہوئی رہی اب شہزاد مجھ سے ملاقات پر زور دینے لگا تھا، پھر ایک روز ملنے کا وعدہ کرنے کے بعد ہم نے کالی فٹیم کر دی۔ دوسرے دن ہم ایک کمنے میں ملاقات کر رہے تھے، وہ یعنی شہزاد بار بار مجھے تسلی نہ سنی جانے دیکھنے کی کوشش کرتا۔ ملاقات کے بعد ہمارا محبت میں مزید گرم جوش آگئی تھی، اسی طرح وقت گزرتا رہا، ہم دنوں پر باتیں کرتے، SMS کرتے، میں اس کی محبت میں اس اندر ڈوب گئی کہ جب تک میں اس سے بات نہ کر لیتی تھکے جین نہیں آتا تھا۔ اب تو کسی چیز میں دل نہیں لگتا تھا، اسی طرح ہماری محبت پر ان چڑھتی گئی، لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ شہزاد میرے ساتھ دھوکا کر رہا ہے۔ شہزاد کو میری اولت اور میرے جسم سے پیار تھا، محبت تو برائے نام ہی شہزاد کی اصلیت کا مجھے اس وقت پتا چلا جب وہ تھان میں جھ سے ملنے کی ٹکر مار کرنے لگا۔ اب گھر والوں کو میری شادی کی ٹکر لگ گئی۔ میں نے B.A کر لیا تو ابونے کہا کہ اب تعلیم کو ختم کر دو اتنا ہی بہت ہے۔ ہم تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں شہزاد کی لڑکے سے محبت کرتی ہوں، وہ میرا کلاس فیلو ہے اور شہزاد سے ہی میں شادی کرنا چاہتی ہوں۔

گھر والوں نے کہا ٹھیک ہے۔ پہلے لڑکاکم دیکھیں گے اس کے بعد فیصلہ کریں گے۔ میں نے کہا کہ میں کس ہی شہزاد کو گھر بلا لیتی ہوں، میں نے یہ خوشخبری شہزاد کو سنائی کہ گھر والے مان گئے ہیں۔ آپ ابو سے مل لیں۔ شہزاد نے کہا کہ پہلے ہم دونوں ملتے ہیں۔ میں نے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے بعد میں، میں آپ کے گھر والوں کو ملوں گا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے اور یوں میں اس سے ملاقات کے لیے پہنچ گئی۔ سب سے پہلے اس کو میں نے شادی والی خوش خبری سنائی، لیکن شہزاد بہت میری س تھا

”میں تم سے سعید بھائی کے پاس ہی جا رہا ہوں، وہاں پہنچ کر آپ سے رابطہ کرتا ہوں۔“ نسیم نے ادا کے کہہ کر کال کاٹ دی۔ میں نے اپنی بائیک لی اور سعید کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے سعید کو نسیم کی کال کے بارے میں بتایا۔ سعید نے کہا کہ ہاں شہزاد بھائی میں ہی آپ کا نمبر اے دیا تھا، دراصل وہ اپنی کبانی لکھنا چاہتی ہے۔ وہ رشتے میں میری کمزور ہے۔ آج میں نے ادا سے دالا جانا ہے، سوچا آپ کو ساتھ لے چلوں، نسیم اور آپ کی آنے سامنے بات ہوگی تو زیادہ بہتر ہے۔ نسیم کو میں نے بتا دیا ہے کہ تم دونوں آ رہے، نسیم نے ہم سے ملنے کا پروگرام بنا لیا ہے۔ ہم بات رہی کر رہے تھے کہ اتنی دیر میں چائے آئی، نسیم نے چائے پی اور ٹھیک ایک گھنٹے بعد ہم نسیم کے پاس پہنچ گئے۔ سعید نے میرا اور نسیم کا تعارف کرایا۔

غنا صاحبہ مجھے سعید بھائی نے بتایا کہ آپ کہاں ہیں لکھتے ہیں، میں چاہتی ہوں کہ یہ کہاں شائع ہوتا کہ وہ لڑکیاں جو جذباتی ہو کر محبت میں غلامی قدم اٹھا لیتی ہیں وہ ایسا کرنے سے گریز کریں اور اپنے ماں باپ کے تجھانے پر انہیں غلام نہ سمجھیں کیوں کہ وہ ہمارے جیسے ہوتے ہیں اور ماں باپ سے بڑھ کر جھلا کون اور لڑکا جھلا چاہ سکتا ہے۔ میں نے کہا۔ آپ مجھے اپنی داستان سنائیں، میں اس کو کہاں کی صورت میں لکھنے کی پوری کوشش کروں گا، تجھ کوئی دیر خاموش رہنے کے بعد نسیم نے اپنی داستان سنانا شروع کی، آجیے ہم سب نسیم کی داستان نسیم کی زبانی سنتے ہیں۔

میں جس گھر میں پیدا ہوئی وہاں دولت بہت زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں تھی۔ میں چار سال کی ہوئی تو والدین نے مجھے اسکول میں داخل کر دیا۔ مجھے پڑھائی کا بے حد شوق تھا، جب میں نے میٹرک کیا تو اوپر نے مجھے کالج میں داخل کر دیا، کالج کا ماحول دیکھ کر میں بھی اس ماحول میں ارا ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ مجھے یہ دوا نہیں لگی، مینتے مجھے چاہے ہوتے میں نے کسی ایک دن میں نے ادا سے کہا کہ مجھے موبائل کے کر دیں ادا نے فوراً میری خواہش پوری کر دی۔

دن گزارتے F.A میں میری فرسٹ پوزیشن آئی، تھراڈ ایئر میں ابھی میرا دوسرا دن ہی کی مجھے کال

اور خاموش رہا، مجھے بڑی حیرانگی ہوئی۔ میں نے شہزاد سے پوچھا۔ ”کیا آپ کو خوشی نہیں ہوئی۔“ تو شہزاد کی آنکھوں میں آنسو آنا شروع ہو گئے۔

”میں زب اٹھی۔“ میں نے کہا۔ ”شہزاد سچ بتاؤ آخر بات کیا ہے۔“ تو شہزاد اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا کہ ”میرے بھائی جان جو کبھی ہوا ہے بہت غلام ہوا ہے، لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ آپ سے مجھے واقعی محبت ہو جائے گی۔ میں تو دلت کر رہا تھا، چاہتی تھی چاکا کتاب سے محبت ہوگی اور شہزاد کی بات سن کر کہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہیں جو پر سکنت طاری ہو گیا۔ شہزاد نے کہا کہ میں درد بھرا کا باپ بھی ہوں، میں نے شہزاد کی ہانسی نہیں دہرائی گھبرا کر اپنے والدین کو سب کچھ بتا دیا۔ جہاں میری شادی والدین کی کرنا چاہتے تھے وہاں میری شادی ہوئی۔ آج میں اپنے گھر بہت خوش ہوں، بے عیب حادث اور میں شگفتہ سے گھر میں ہر وقت رونق لگی رہتی ہے۔ یہی محبت کی کبک لیکن ابھی باقی ہے۔ میں آج بھی شہزاد کو جب یاد کرتی ہوں تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ میرے مہاں چچو دلتی لکڑی منڈن میں اپنا کاروبار کرنے میں فریج کا، میری شادی کو تقریباً سات سال کا عمر گزار رہا ہے۔ ایک روز میری امی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تو مجھے ہرے شوہر اقبال امی کے ہاں چھوڑ آئے امی کے ہاں آئے ہوئے تھے میں دن ہوئے ستر کر ایک دن میں اپنی چھوٹی بہن نسرین کے ساتھ بازار گئی تو مجھے شہزاد کی یاد آئی۔ شہزاد نے کہا کہ تم میں نے آپ کی محبت میں سب کچھ چھوڑ دیا، یہی سچے اپنا گھر ہے۔ اگر آپ مجھے سہارا بنا جائے جس تو میں حاضر ہوں۔ میں نے شہزاد سے کہا کہ ”یہ بات سن کر ہے۔ اور شکر ہے کہ میں آپ جیسے شخص سے مخلوق رہی جو میرے لیے اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ سکتا ہے۔ وہ کسی روز مجھے بھی چھوڑ سکتا ہے۔ یہ کہہ کر میں اپنی بہن کے ساتھ گھر آ گئی۔ قسم کی یہ کہانی لکھے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ یہ دونوں طرف سے ایک دہنی جذبہ تھا جو دقت گزارنے کے ساتھ ساتھ تم ہو جائیں انا ضرور ہوا کہ قسم نے عمل سے کام لیا اور کوئی بدی نہ ہو کر کمانے سے لگتی رہی سنبھل گئی روزانہ وہ پہلے والے بہت ٹھوکر کھا کے منہ کے بل ہی کرتے ہیں۔“

کیا

خدا نے آپ کو

حسن کی

دولت

سے نوازا ہے؟

کیا آپ کو

لباس

پہننے کا سلیقہ آتا ہے؟

تو پھر آپ

سچی کہانیاں

کے سرورق کی زینت کیوں نہ بنیں؟؟

آج ہی ہمارے فونو گرافر سے رابطہ قائم کیجئے۔

021-34939823-34930470

روز شہزاد 10 آدم آرکائیو شہزادیت روز گرامی۔



مکالمہ خصوصی

ارشاد علی ارشد



پاکستان کے لیے ایک نیا دور کا آغاز ہے اور اس نئے دور میں ہمیں اپنی قوم کو متحد کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک موقوفہ اقصیٰ اسرار بحری مجوبہ داستان

قسط نمبر 17

مجزئیہ افسانہ کا خلاصہ

مکمل ایک نیا دور کا آغاز ہے اور اس نئے دور میں ہمیں اپنی قوم کو متحد کرنے کی ضرورت ہے۔ جو اپنے ماں باپ اور بھائیوں اطہر اور بظہر، ایک بہن سکھان اور محبت میں جاگم، غیر شادی شدہ یعنی وہ کہہ کے ساتھ، زندگی گزار رہی ہے۔ سکھان کو اپنے کنبہ سارو کی نیلوسارو کی محبت ہوگئی ہے، مکملی محبت اور محبت کے خواہے سے باہر کرنے ہوئے اپنی بہن سکھان کو سفید چہرے کی اور کو اپنی سبھی طاقت سے پرہیز کر رہی ہے تاکہ اس میں مجاہدین اسلام کو ایک لشکر رکھانی ہے۔ محبت ہو، بشیر کا ہاتھ رکھ کر سکھان کو مسلمانوں کے عقیم ہاشمی اور اسلام کے کارنامے بتائی اور رکھانی مکملی سکھان سے وعدہ کرتی ہے کہ وہ سزاؤں سے اس کے دشمن کے سلسلہ میں گھر والوں سے باہر کرتی ہے۔ مکملی کے بھائی اطہر کی اپنی زندگی سے اپنے شادی کرنا چاہتی ہے۔ مکملی اس دوران میں سزاؤں کے کمر اس سے ملنے چاہتی ہے۔ ایک ہا سکھان کا دل سے توت، اپنی بہن سے زچہ پروری ملنے رکھا کہ پتا چاہے وہ اپنی راہنما سے دکھ کر بہن کر اب اور پھر ایک ہا، جب سکھان اپنی ماں کے ساتھ جا رہی ہوئی ہے اور پروری ہاشمی اور باہر وہی حرکت کر رہی ہے، اس دوران میں سکھان کو اپنے سنی مشقی خاطر نکالے دیں، سے کرنے کا لہذا کہتا ہے، ایک روز وہیں میں سوتا ہے کہ پروری ملنے رکھا، مکملی کا راستہ تک لپکا ہے۔ مکملی اس کو برا بھلا کہتی ہے تو وہ صدمت ٹھہرا، اس کے لیے ہاتھ اٹھا ہے لیکن مکملی اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔ پروری اللہ رکھنے کا لڑائی کے ساتھ اس سے لڑتی ہے مکملی کو اس کے لیے ہاتھ اٹھا ہے لیکن مکملی اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔ پروری اللہ رکھنے کا لڑائی کے ساتھ اس سے لڑتی ہے مکملی کو اس کے لیے ہاتھ اٹھا ہے لیکن مکملی اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔

پروری اللہ رکھنے کے چہرے میں مکملی اس کی خواہشات پرانی کہتی ہے، یہاں سے مکملی نے ہی چہرہ اللہ رکھنے کی رائے سے اسے لئی کر رہی ہے۔ مکملی کو پروری کے کئی کے الزام میں گراؤ گراؤ پاتا ہے اور پھر سکھان کے لیے میں آ کر بتاتی ہے کہ پروری اللہ رکھنے کے بلا سے بننے پر پروری سنسنی سے اسے پیغام بھیجا ہے کہ اگر سکھان کے لیے جو پروری اپنی کاورشہ قبول ہے تو ہم مکملی کو بھائی کے بعد اس کے قانون سے، اپنی ذرا دیکھتے ہیں، وہی دوران میں لہری لہری اٹھنے لگا، مکملی سے کوئی نہیں کے لیے بلا یا پاتا ہے۔ مکملی اسے لپکا، ہم کو بین تمام کا لفظ کہنے کے بلا نہ تھی ہے اور وہ قانون سے، کے ٹھیک نکل جاتی ہے۔ مکملی کے سبب اس سے مخالف ہو کر مخالف راہ سے لے کر جو ہیں آتا ہے جہاں مکملی کے قانون سے کوئی اپنے دماغ سے ٹھہرتے ہیں۔ مکملی نے اسے اور سے پروری حاصل کرنے کے بعد اپنے کمر اتنی ہے۔

مگر آ کر اسے پتا چاہے کہ اس کا لہذا کے باعث جا رہی ہے لگتے گی اب، پھر کچھ دن بعد اس کے اہل انکسار ہو جاتا



ہے، جبکہ اس کا بھائی، باپ کی موت سے پہلے ہی مدین چلا جاتا ہے۔ اس کا دروازہ اس کی شانزدہواں ہے جو مانی ہے۔

مکھنٹی اور بلاول نے اپنے بیٹے کا نام معاویہ رکھا ہے، معاویہ چار سال کا ہو گیا ہے لیکن بائیس برس کا ہونے کی عمر ہے۔ مکھنٹی کے ساتھ اکثر ایشیا ہوتا ہے، وہ بھی وہاں کہیں نہیں ہے اور پھر یہ فرسوں طریقے سے اور ان کو توت کے وقت وہاں سے کوسوں دور چلا گیا ہے۔

جب مکھنٹی کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ خود کو انجانی آرام اور ہیروزم میں پاتا ہے۔ کچھ روز بعد دروازے پر دستک ہوتی ہے اور کمرے میں ایک دینو جو ان اور پھر مری یا دقاری ایک خاتون اور نینو اور جیک میں نہیں ایک خوب صورت لڑکی اندر داخل ہوتے ہیں۔ آہستہ آہستہ کمرے میں لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور وہ سب قطعاً مبرا ہاتھ ہاتھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان مکھنٹی کے ساتھ وہاں کے حالات واقعات وہاں کرتا ہے کہ کس طرح، وہ لوگ لاہور میں اور بلاول کے کمرے سے موجود ہے اور مکھنٹی انہیں بے ہوش کی حالت میں لٹا چکی۔ مکھنٹی اس سے کہتی ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ مکھنٹی کو اپنا شوہر بلاول اور بچہ معاویہ یاد آتا ہے، وہ سچی ہے خاندان والوں کے بارے میں جاننے کے لیے اس کا لہو کا ہرگز ضرور ہونا ہے لیکن اس سے پہلے وہ اس کے خاندان کے اہل و عیال میں انہیں پہچاننا چاہتی تھی، اس لیے وہ اس دن کے ساتھ اس کی جب تمام لوگ نہیں جترام کے ساتھ آگے بڑھ کر اس کے کمرے میں بیٹھتے ہیں تو مکھنٹی کو ایک خالی حفرہ پورا چاہیے تھی جب سب لوگ اکٹھے ہو گئے تو مکھنٹی انہیں ہنود صیب کے بارے میں سمجھاتی ہے کہ مکھنٹی آتا ہے کہ بڑے کھٹے لوگ جاؤں، نسل پھول، پھیل کسی اور فریڈ کیمپے، قدس مجھے ہیں، دنیا کے بارے میں عقیدے تو جدید یعنی ہیں پھر وہ اسے اسلام کی بات سمجھاتی ہے اور ان لوگوں کو اسلام کی دولت دیتی ہے۔ مکھنٹی کی بات سے دلکش لڑکی جاتی ہے اور وہ لوگ اس کے خلاف ہو جاتے ہیں، قربان مکھنٹی کو گھر چھوڑنے سے تیار ہے، لیکن اس کو لوگ اسے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ مکھنٹی وہاں سے فرار ہو کر اکل پیر کے گھر چلا جاتی ہے۔

نہیں مکھنٹی کو اس کے گاؤں پھر اور پھر چھوڑ آتے ہیں۔ راستے میں وہ سزاؤں کے کھیلوں کے قریب خود کو کھا کر گرجاتی ہے، سزاؤں جیسے ہی اسے آگے جانے کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ مکھنٹی کو آگے کر جبران رو چاہتے ہیں، سزاؤں کو اپنے گھر لے جاتے ہیں، سزاؤں کو مکھنٹی کو گھر سے نکل جانے کو کہتا ہے کہ کہیں اس کی جہ سے کوئی مصیبت ان پر نہ آ جائے۔ سزاؤں مکھنٹی کو روکنے کی کوشش کرتا ہے مگر مکھنٹی گرجاتی ہے اور اپنے گھر پہنچ جاتی ہے۔

مکھنٹی کو نیند نہیں آسکتی ہوتا ہے کہ گھر کا دروازہ دہری طرف چلا جا رہا ہے۔ وہ بھاگ کر کمرے سے باہر نکل جاتی ہے اور کچھ جاتی ہے کہ پھر وہ لوگ والوں کو اس کے لڑتے کے آگے کی اطلاع دیا گیا ہے۔ گاؤں کے لوگ دروازہ توڑ کر گھر میں داخل ہو جاتے ہیں اور مکھنٹی کو گھر لیتے ہیں۔ وہ وہاں لوگ مکھنٹی کے دیکھے ہمارے تھے مگر اس وقت ان کے چہرے پر اچھبت اور ہنسی تھی۔ وہ لوگ اس سے کہتے ہیں کہ تو یہاں کیوں آئی ہے؟ تیرا جو ہے کتنے گھر بنا ہو گئے۔ وہ کہتے ہیں کہ گھر ہے۔ یہاں ہے کوئی اور کھانڈے کو گھر دار گھر سے باہر نکال دیا جائے۔ مکھنٹی کمال لوگوں کی باتوں میں گر کر ہلکا کر رہا تھا، وہ چاہتی تھی کہ اس وقت جب وہ بیانیہ اور انشویہ تھی۔ مکھنٹی پر بے ہوشی پیدا ہو گیا تھا، یہ مگر اس نے زبان پر چپ کا لالہ لگا دیا تھا۔ اسی وقت وہ بدلی مشاققہ بال ڈال دیا جاتا ہے۔ وہ مکھنٹی کو دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ آج تو میرا گھر کے بھاگ جانگ آئے ہیں، یہاں وہ دم اللہ ترخان کی دہی مکھنٹی آگیا ہے۔ وہ بدلی کے ارادے اور تیرو دیکھ کر مکھنٹی خوف زدہ ہو جاتی ہے۔ مکھنٹی کو دسیوں سے آگے کہ گھر کے ساتھ وہ ڈال دیا جاتا ہے۔ مکھنٹی نے کتنے پر مہینے چائے سے ہی طرح ڈھی ڈھالی ہے۔ آج ایک دہی ٹوٹ جاتی ہے اور مکھنٹی کا ہاتھ لگا لگاتی ہوتی ہے ہوش ہو جاتی ہے۔

مکھنٹی کو جب ہوش آتا ہے تو وہ ایک بنگلہ میں ہوتی ہے۔ وہ صحت کے اطمینان سے اور ایک صحت مند ہے۔ مکھنٹی کا دل مطمئن تھا وہ سوچتی ہے کہ یہ جڑیں ایک جگہ سے دوسری جگہ ہاؤسنگ ہوئی ہیں، اللہ تعالیٰ کی منشا ہے۔ حالات جس جگہ پر لے گئے ہیں چلتا ہو گا۔ تب مکھنٹی کا ذہن صحت پھر آتا ہے اور مکھنٹی جبر سید پر علی شاہ و رحمت اللہ علیہ کے سزا پر واقع گزارا شریف میں خود کو موجود پاتی ہے۔

مکھنٹی حراز پر موجود لوگوں کو پھر پر علی شاہ کے حالات زندگی بتاتی ہے اور کہتی ہے کہ پھر صاحب سے صحت کا حق یہ ہے کہ ان کی تعلیمات پر عمل کیا جائے۔ آج ہمیں وہ دھڑوں میں جنس میں، پندرہ ہزار سے مت مولوں کے حق میں گھے گزارا کر فرے دگتے ہیں اور حق دیکھ کی بات تانے والوں سے درد ہمارے ہیں خدا اور اسلام کو گھبے اور پچھلے۔ یہ کہہ کر مکھنٹی وہاں سے چل پڑتی ہے۔ سزا کے بارے میں وہ ایک شخص کو دیکھتی ہے جو ٹھنڈوں میں سرد ہے، یہاں تھا اور لوگ اسے پھیر پھیر کر جا رہے تھے۔ مکھنٹی کہتی ہے کہ تم لوگ پھر پر علی شاہ کے سزا پر جلا ہے، سزا پر جانے والوں کو ایسی حرکتیں نہ کرنا، یہیں رہتے ہیں۔ تب مکھنٹی ان کو ہڈوں کے ساتھ جینے جاتی ہے۔ اور ایک بزرگ شخص کو پانی لانے کا کہتی ہے۔ وہ کو ہڈوں کو آؤں مکھنٹی کو خود پر جی راستان سنا تا ہے جس کی جہ سے وہ اس

مال میں حرار پر سوچو رہے۔ جب مکملی اسے کہتی ہے کہ "جب کاروان زندہ رہن ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے معرفت سونے کی بجائے اسلام سے فرمایا۔" اسے سنی اور تجھ سے منافقانہ انگارہ بگڑا کر معاف نہ کر سکا، مجھے اپنی معرفت کی تم ہے مجھ سے۔ ایک بار بھی سانی آتھا تو میں معاف کر دیتا۔ مکملی کہتی ہے تو کیا ہم آدوں سے بھی رہے ہیں؟ ہمیں تو امت محمدیہ ﷺ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ جو سران اللہ آدوں کو معاف کرنے کے لیے تیار ہیں، انہوں نے حرار پر معاف کر کے معاف نہیں کرے گا میں اس کے لیے نہیں صدق دل سے معافی مانگتی ہو گی۔"

(ادراپ آگے بڑھے)

"مہم میں مانگوں گا اپنے اللہ سے۔" اور صدق دل سے تائب ہو جاؤں گا۔ کوڑھ زدہ شخص کا لہجہ دیکھ کر مجھے یقین ہو چلا کہ وہ ضرور تائب ہوگا۔

پانچس کرتے ہوئے ہم بہت سست روٹی سے حرار کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ابھی ہم حرار سے بہت دور تھے۔ میں نے رفتار بڑھانے کا سوچا مگر پھر رک گئی۔ بڑے میاں پانی کا بھرا کنوڑا لے آئے تھے۔ میں نے اس کے ہاتھ سے کنوڑا لیا اور راستے کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ بڑے میاں مجھے پر جنس لگاؤں سے دیکھ رہے تھے۔ میں یہاں بیٹھ جاؤں گا۔ کوڑھ زدہ شخص نے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

جی بیٹھ جائے۔ کہتے ہوئے میں نے اول و آخر وہ دھڑکیٹ پڑھا اور درمیان میں ایک بار سورۃ فاتحہ اور تین بار سورۃ اخلاص پڑھ کر پانی پر پھونک ماری۔ پانی کا کنوڑا کوڑھ زدہ شخص کو دیتے ہوئے میں نے کہا۔

روٹی لے کر جہاں رخم ہیں، وہاں پانی لگاتے رہنا۔ لیکن ہو تو حرار پر جا کر غسل کر لیں۔ غسل کرتے وقت تھوڑا سا دم شدہ پانی دوسرے پانی میں ملا دیتا۔

ٹھیک ہے۔ اس نے کنوڑا لینے کے بعد کہا۔ آپ نے مجھے معاف کروایا۔ میں نے سنا ہے حقوق العباد اللہ تعالیٰ تو حقوق اللہ سے بھی بڑے نہیں ہوتے۔

"میں نے آپ کو معاف کر دیا ہے۔ آپ بھی مجھے معاف کر دیں۔" میں کہہ کر کھڑی ہو گئی اور اسے بتایا۔





”اب میں چلتی ہوں۔“ مہر کی طرف سے دو مطمئن ہوا تو میں واپس مزگئی۔

میں نے ابھی تو زنی رو رہی تھی کہ کسی شخص نے مجھے پکارا۔  
”دیکھنی.....“

میں نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا۔ ایک اور آواز سنانی دئی۔  
”ارے رمضان دور دیکھو مگھنی۔“

میں نے دیکھا لوگوں کی بھیڑ کو چرنے ہونے دو اشخاص مہر کی طرف بھاگے چلے آ رہے تھے۔ میں نے انہیں پہچان لیا تھا۔ دو مردانہ رنگ کے چوہوں مشافی کے بندے تھے۔ میں نے جھنجھاکا سوچا۔ ”لوگ ہاں نہیں آدگے۔“

اگلا خیال مجھے ہوا کہ ان کے ہاتھ آتے کا مطلب ہے میں بھر سے مہر اور مگر کے ظالم چوہوں کے حجرے میں پہنچ جاؤں گی۔ مہرے دل نے ذہن کو تھمرا دیا۔ بھاگ مگھنی۔ ذہن نے فیصلہ کیا، خود کو بچانے کے لیے میرا بھاگنا ضروری ہے۔ جس طرف لوگوں کی زباں بھینچ رہی ہیں اس طرف بھاگ پڑی تاکہ بھیڑ میں گم ہو جاؤں۔ ریے بھی بہان کی مخالفت سمٹھی۔ بھاگنے ہوئے میں نے مگر کو دیکھا وہ بھی مہر سے لڑتا تھا۔ میں بھاگ پڑے ہیں۔ ہمارا ورمبانی نالغہ نظر پاسو مہر کا تھا۔ وہ کوڑھ ڈور شخص سے ہی اٹھی پندرہ بیس بیس بچھے تھے۔ لوگ مجھے یوں بھاگتا ہوا دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔  
”اے بی بی کیوں بھاگ رہی ہو۔“  
”زکو کیا شکل ہے۔“

”تم کیوں بھاگ رہی ہو۔“ لوگوں کی متفرق بانیں مہر کے کانوں میں پڑی تھیں، مگر میں ڈکی نہیں۔ ایک بہتر سی امید ضرور دیکھی کہ اسے سارے لوگ ہیں۔ میرا دفاع کر رہے ہیں اور میں چوہوں کے آدھوں کے ہتھے چڑھنے سے بچ جاؤں گی، مگر دوسرا خیال زباں دہنی تھا۔ جب کہیں چلتی ہیں تو ہر کسی کو اپنی جان کی لگڑ ہوتی ہے اور مجھے یقین ہے چوہوں کے آدھی بیالہ رہیں بندے کرانے سے بھی باز نہیں آئیں گے۔ میں نے مگر کو دیکھا، اور لوگ کوڑھ ڈور شخص کے ذہن سے گزر رہے تھے۔ دھتکا کوڑھ ڈور شخص اٹھا اور وہ میں سے ایک کو ڈور بچ گیا۔ اور لوگ ان کی توجہ نہیں کر رہے تھے۔ کوڑھ ڈور شخص چونک کر اس کی تاگی سے لڑ گیا تھا۔ دوسرا شخص بھی اسے سامنے پر پڑنے والی چاک ایک آنت کو دک کر جرت سے بچنے لگا۔ میں خود چرت سے رک گئی تھی۔ شاید کوڑھ ڈور شخص مجھے کچھ پکارا تھا۔ درجنے ہوئے بولا۔  
”بھاد مگھنی بھاد۔ (بھاگ مگھنی بھاگ) اس کی چٹنی ہوتی آواز نے مجھے اپنی مارک پوزیشن کا احساس دلا باہر میں بھر

سے بھاگ پڑی۔ پیچھے کا آخری منظر جو میں نے دیکھا وہاں بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ مجھے درجانے کا موقع مہر آ چکا تھا۔ میں نے تیزی سے در پڑنے کی بجائے مگر کی جانب رواں دواں ہو گئی جس کا مجھے کچھ پتا نہیں تھا۔

☆.....☆

میں جب چوہوں کے بندوں سے بھاگ کر ننگی نوزد میں کرنی منزل واقع نہیں تھی۔ ہموار ماہوار واسنوں پر رکھی بھائی وہی اور میں سب کی پشت سے سرنگے سوچ رہی۔ جب متفرق سوچوں کے گھوڑے ادھر ادھر بھاگے تو خود بخود منزل کا یقین ہوتا چلا گیا۔ جب ذہن میں منزل واضح ہوئی تو میں نے ان پر لٹکتے سے سوچا اور نلے کہا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ اٹکل فیہم نے جوتلفا، مجھے، ہاتھا۔ اس میں ایک لاکھ کی خطیر رقم موجود تھی۔ مگر جانے ہونے میں نے لٹا کر اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔ جب رستم سے بڑی چارہری کی توتلفا چارہ کے کوٹنے میں رکھ کر اسے گاٹھ دے دی تھی۔ گاؤں میں بڑی بوڑھی عورتیں اسی طرح بے محفوظ کیا کرتی ہیں۔ چارہ حال میرے جسم پر ہے جو بوڑھی اس لیے مجھے بھی محفوظ ہے۔ ان بہنوں نے مجھے اب کا مہر بنا شروع کیا تھا۔ میں نے تکی کی کراہی ادا کیا۔ اپنے لیے کپڑے اور کچھ دوسرا سامان خرید اور راولپنڈی کے متوسط ہوٹل میں مگر کرانے پر لے لیا۔

اب میں راولپنڈی کی اڈالہ جیل کے مگر کرنی اور راز سے کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے نظریں اٹھا کر جیل کی بڑی بڑی دیواروں کو دیکھا اور ایک ٹولہ سامنے کھینچی۔ اس جیل میں مہر وغیرت مند بھائی مظہر وقت کے کھنڈر میں زندگی

کے ہون پر بے کر رہا تھا۔ مجھے بڑی مشکوک سے ملاقات کا رشتہ دیا گیا تھا۔ شاید ڈھائی تین سالوں میں مظہر بھائی کی پہلی ملاقات آئی تھی۔ ایک بڑی آندوا لے کر اجڑا پوکس مین کے ہمراہ چند راہداریاں پاس کر کے میں ایک کمرے میں پہنچی گئی۔ اس کمرے میں سامنے جیل کا کمرہ تھا، بڑی بڑی سلاخوں اور جالی والا دروازہ کمرے۔ "میں اس وقتوں میں صرف تیس منٹ میں "مونی تو آندوا لے کر مجھے ٹھکانے لکھے میں کہا۔ جاتے ہوئے دروازے کے پاس ڈک کر بولا۔ صرف تیس منٹ میں تیرے پاس آکسویں منٹ میں، میں آؤں گا۔ تمہیں باہر ہونا چاہیے۔ میں نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔ وہ چلا گیا۔ میرے اندر جذبات کا ایک طوفان اٹھ رہا تھا۔ جی رتوں کے سارے مناظر میری آنکھوں میں مجھد ہو گئے تھے۔ وحیم اللہ ترکھان کا بیٹا بتا پھر میرے سامنے آکر اڑا۔

تیز راج، غصے اور غیرت سے لبالب بھرا ہوا میرا اہم اللہ۔ ٹھنڈے اور دھبے مزاج کی ماں خود شہد۔ میرے دل کے ساتھ کی سامنے سگھان اور پھوپھو۔ فرما رہا رہا رہا کی زندہ مثال روزوں بھائی مظہر اور مظہر۔ میری اکلوتی جیتی بھائی رانی۔ میرا دگر میں اس گھر کے اندر کئی خوشنادر کھلکھلائی بہاریں آرتی گئی۔ ہر طرف خوشیوں کے پھول برستے تھے۔ بھتیوں کی شہنشاہ آرتی گئی اور پارکی ہوا میں چلتی تھیں، مگر ایک غصے سرور کے سارے نکات لبو لبان ہو گئے۔ ہاتھوں سے خوشیوں کے پالے گر کر چکنا چور ہو گئے۔ بہاریں فرماں میں بدل گئیں، رقت کے شجر پر غموں کے پھول اُگنے لگے۔ سورج کی مٹھی نکریں آگ برساتے لگیں۔ بیٹا بتا گھر سے رسا مانی، در پہل اور غلٹ کا کڑھ بنا گیا۔ حالات کی سکتی ہواؤں نے اس کے باسیوں کو خزاں و رسد و پتوں کی طرح اوڑھ لیا۔

میری آنکھوں میں آنسوؤں کی کہ جہاں جیسے لگیں۔ جیل کا کمرہ، دھندلانے لگا۔ میں نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا، جالی کے اس پار کا منظر ابھی خالی تھا۔ ابھی تک مظہر بھائی نہیں آتا تھا۔ میرے اندر کی آگ کے شعلے جل کر کوئلہ بنا کر شروع ہو گئے تھے۔ سوچوں اور یادوں کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ جی چاہا کہ اٹھ کر بھاگ جاؤں۔ ایک ایسی رینا میں چلی جاؤں جہاں ایسا کچھ نہ ہو۔ میرے تعاقب میں ماہی کی سوچیں اور باریں نہ آسکتیں بائیں پلچرے اس کیفیت میں چلی جاؤں جس میں مجھے اپنے آپ کا ذرا بھی ہوش نہیں تھا۔ نہ شہزاد کی آنکھیں، نہ رشتوں کی کوئی پہچان تھی۔

میرے دل کے سارے زخم مل اٹھے تھے۔ میرا اندر سگھ رہا تھا اور باہر کر اور رہا تھا۔ میرے بیان میں زبردست ارتعاش اٹھا اٹھا۔ میں گن گن تھا کہ میں اپنے وجود کا بوجھ سہل نہ سکتی اور پھر بڑی آہستہ نے مجھے اپنی طرف منوچ کر لیا۔ میں نے چہرہ اٹھا کر دیکھا۔ ملاخوں کے اس پار جالی کو پکڑے ہوئے تھے جی باندھے رکھ رہا تھا۔ میں میکا کی انداز میں کھڑی ہو چکی تھی۔

"میں مٹھتی..."

"بھائی... میں اس طرف بھاگ پڑی۔ چند میٹر کا فاصلہ میں نے بھاگ کر طے کیا۔"

"مٹھتی... شو..."

"مظہر بھائی..." میں پتھر کر الفاظ دم توڑ چکے تھے۔ سانس کا انداز چھڑا، تیزی پکڑ چکا تھا۔ دل کی دھڑکن بڑھے جا رہی تھی۔ رقت جیسے گرم مٹی تھا، مظہر بھائی نے روزوں ہاتھوں کی کھلی ہوئی ہتھیلیاں جالی پر رکھ دیں۔ میں نے اس کے ہاتھوں پر جالبوں کے اس پار اپنے ہاتھ رکھ دیے۔ ٹھنڈی کے ان نکات میں بڑبائیں چپ ہو گئیں اور آکھیں برسنے لگی تھیں۔ ہتھ دیر کر کے میں آہیں اور سسکیاں کو گئی تھیں، پھر مجھے خیال آیا میرے پاس صرف آدھا ٹھنڈے ہے۔ میں نے در پنے سے آکھیں صاف کیے اور خود کو سنبھالا۔ میرے دیکھا دیکھی مظہر بھائی نے جی آنسوؤں سے بھیجا چہرہ صاف کیا۔ میں نے گلو کیر مجھے میں کہا۔

"... یہ کیا ہو گیا مظہر بھائی۔ ہمارے ہتھے بستے گھر کس کی نظر لگ گئی ہے؟"

"تائیں مٹھتی قسمت ہمارے ساتھ بڑی اندر ہناک کھیل کھیل ہی ہے۔"

"مجھے ہو مظہر بھائی؟"

”اب بالکل ٹھیک ہوں گی۔ آج صبح میں اپنے سامنے کچھ کر بھر سے بی اٹھا ہوں۔“  
 ”نہ تم کسی ہو مٹھنی؟“

”آپ کے سامنے ہوں مظہر بھائی۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ ان نے میری ہر طرح کی حفاظت کی ہے۔“ تھوڑے سے توقف کے بعد میں نے کہا۔

”آپ کو کبس نرس گئی تھیں گھر کے کسی فرد کو کبھنے کے لیے، آج سکون مل گیا ہے۔“  
 ”نہ میرا درگزر گئی تھیں؟“

”ہاں بھائی! وہیں سے پتا چلا کہ آپ ازبالہ جبل میں فید ہو۔“  
 ”مٹھنی میں نے چوہدری راجہ کی لاش گندے نالے میں پھینک کر اسے مہر دادگر والوں کے لیے نشانِ عبرت بنا دیا تھا، مگر خود ہمیشہ سکون ہی رہا۔ صُطن میں ایک پھانسی ہی ایک لٹی تھی۔ اس کی چھن مجھے ہر لمحہ مضطرب اور پرسکون رکھتی تھی۔ آج مجھے سامنے دیکھ کر سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔ میں اب بننے مسکراتے تختہ دار پر لوگ جاؤں گا۔“  
 ”بہنیں بھائی نہیں۔ انشاء اللہ آپ کو چھائی نہیں ہوگی۔“

”مٹھنی مجھے سزائے موت سنائی جا چکی ہے۔ میں ممکن تھا کہ چھائی کے پھندے پر لڑا جا جا، مگر جج میں جمہوری حکومت کا تختہ الٹا گیا ہے۔ اس سے بہت سے کام آگے بچھے ہو گئے ہیں۔“

”مجھے پتا ہے بھائی کہ آپ کو سزا سنائی جا چکی ہے، مگر میں سر پر ہم درت میں اچلی کر رہی گی۔“  
 ”مٹھنی شاید اس اچلی کا بھی کوئی فائدہ نہ ہو۔ میں نے خود اپنی پیشی پر ہی افرار جرم کر لیا تھا۔ اس بات کو چھوڑ دو میری بہنیں۔ یہ تیار۔ کہنے چوہدری راجہ نے انٹوا کر کے نہیں کہاں رکھا تھا، میں نے نوان کے دونوں گھر اور فارم باڈن سارا دکھ لایا تھا، مگر ہاں تم کہیں نہیں تھیں۔“

”بھائی! وہ کہہ نہ مجھے پہلے ہی مہر دادگر سے نکال کر لے گیا تھا۔“  
 ”مہر دادگر سے باہر مظہر بھائی برنی طرح چونک پڑا۔ کہاں مٹھنی؟“

”ہاں بھائی! مہر دادگر میں ان نے مجھے نہیں رکھا تھا۔ کہنے ہوئے میں نے مختصر مظہر بھائی کو سارا فتنہ سنا یا۔ اس رد داد میں سے وہ تمام باتیں جو میرے سامنے غیر معمولی اور غیر مرئی طور پر رونما ہوئی تھیں، حذف کر دی تھیں۔“  
 ”مجھے اٹکل نہیں مہر دادگر چھوڑ گئے تھے۔ بہت عظیم انسان ہیں، اٹکل نہیں۔ میں جتنے بھی دن ان کے گھر رہی انہوں نے مجھے سزا نہیں سے بڑھ کر چاہا۔ میں سیدھا اپنے گھر گئی تھی، جانے ہی مجھے پتا چلا وہاں تالا لگا ہوا ہے۔ آپ ازبالہ جبل میں ہیں اور گھر والوں کا کچھ پتا نہیں۔“ میں نے جانی کے گول گول سوراخوں سے مظہر بھائی کی انگلیاں پکڑ کر کہا۔

”بھائی! اسی کھلاں، پھو، پھو، مظہر بھائی اور بھائی سب کہاں ہیں۔ سب فہمک تو ہیں؟ آپ کو کتنے فتنے ہیں؟“  
 ”مٹھنی نہیں پتا ہے ابہا کے شریک (پچا کے بٹے) کا پی عرصہ پہلے مہر دادگر سے ردا ت ملے گئے تھے۔ جس نے گھر والوں کو راتوں رات نکالا اور ردا ت کی راہ لی۔ میرا پرگرام تھا کہ انہیں کھلی مخلو ظنکا نے رہنچا کر بھر تھیں تاش کر دیں گا۔ ردا ت پہنچے تو انہیں پہلے سے حالات کا ظم ہو چکا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر پریشان ہو گئے اور نکل جھانکنے لگے، بلکہ چا چارحت اللہ نے نور اوح الفاط میں کہہ دیا کہ نوز ہم چوہدری کی دشمنی اول نہیں لینا چاہیے۔ میں نے ان پر رعت بھیجی اور اسی سے مشورہ کرنے کے بعد سو باڈی را دی، سو باڈی میں اسی کی خالد کی کافی بڑی فیملی رہائش پذیر ہے۔ اسی کی خالہ 80 سال کی عمر میں بھی حیات ہیں۔ ہم سبھا سو باڈی پہنچے، ہر لوگ مالی طور پر اسنے مستحکم نہیں تھے، لیکن نہیں خندہ چشتانی سے ملے۔ میں نے راتے میں ہی گھر والوں کو تار با تھا کر فی الحال ان سے اصل صورت حال پوئندہ اور مئی جانے۔ کسی سنا سب موقع پر پتا ر با جائے گا۔ اگر انہوں نے بھی ہمیں رکھنے میں جیل جنت کی تو کوئی تیسرا لھکا نہ ہمارے پان نہیں تھا، مگر انہوں نے سبھا سوال ہی نہ ہمارے بارے میں پوچھا۔ میں نے انہیں بتایا۔“

”مٹھنی رحت چا چا کے ہاں رک گئی ہے۔ مجھے معلوم تھا ان لوگوں کی رحت چا چا کے سامنے گئی نہیں۔ در خاصوس

ہو گئے مگر کلی طور سے مطمئن نہیں ہوئے تھے، کیوں کہ درواہ کے جنازے میں شریک ہونے تھے اور انہیں پتا تھا کہ تم نے جو بددی اندھ رکھا کوئل کیا ہے۔ بہر حال یہ بھی قسمت تھا کہ انہوں نے مزید نہیں کر دیا۔

تین چار دن بڑی مشکلوں سے گئے۔ دن رات میرے دل درواغ میں تمہاری شبیہ مسلط رہی، مجھے کسی جلی چھین نہیں تھا اور میں جو تپ گھٹنے، یہی سوچتا رہتا کہ تمہیں کہاں تلاش کروں۔ گھر والے الگ سے پریشان تھے، ہم ایک دوسرے سے پوچھتے تو نہیں تھے، مگر ہر کسی کی آنکھ میں ایک ہی سوال نمودار دکھتا تھا۔ کھنٹی کہاں ہوگی؟ پانچویں دن میں نے پھر ہیرا درگر جانے کا حتمی فیصلہ کر لیا۔ میں نے سوچا ابھی جو بددی غنا اور مشتاق ہوتی ہیں۔ میں ان دونوں کی بونی بونی کر دوں گا مگر اپنی بہن کو بازیاب کر کے چھوڑوں گا۔ میں نے انہیں بتانا کام کی تلاش میں راولپنڈی جا رہا ہوں۔ میں سو باہ سے نکل آیا۔ راستے میں مختلف سوچیں میرے گرد گھیرا انگ کرنے لگیں۔ میں نے سوچا آج میں تو قتل سو باہ اور الگ بھی میرے گھر والوں سے ٹھک آ جاؤں گے۔ معافی طور پر درگھی غیر منطقی ہیں۔ تین افراد کا اضافی بوجھ کیسے برداشت کریں گے۔

”تمہیں اڑا دکا۔“

”ہاں مکھی!“ روات سے جب ہم طے تو رانی بھائی نے آگے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ ان لوگوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں مگر میرا ہے۔ میں اپنے ماں باپ کے گھر جاؤں گی۔ دو دو ہیں سے ملکہ ہوگی تھی، میرا چاہتا تھا کہ جو بددی رانی کی طرح اس کے بھی نگوڑے کر دوں، مگر مجھے اسی نے روک لیا اور رانی کو جانے کی اجازت دے دی تھی۔

”اور“ میرے منہ سے بے اختیار بنگار نکلا، پھر بھائی اس کے بعد کیا ہوا۔

میں نے پہلے کچھ پیسے کمانے کا سوچا مگر راولوں کو ملکہ کرائے کے مکان میں رکھ سکوں۔ راولپنڈی جانا میرے لیے خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس لیے میں نے مگر انوار کا زرخ کیا، مگر جو بددی کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ شوٹی قسمت مگر انوار الہی پاس پر مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ تمہانے میں مجھے جیسے ہی موقع ملا، میں نے اظہر بھائی کو خط لکھ بھیجا اور اسے ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ ساتھ ہی اسے جلد لوٹ آنے کی تاکید کی اور کچھ روپے سو باہ بھیجنے کی درخواست بھی کی۔ دو دن بعد اظہر بھائی وہی سے لوٹا تو گھر والوں کو میری گرفتاری کا پتا چلا۔ وہ سب روپے بیٹے اظہر کے ساتھ میری ملاقات کو آئے۔ میں نے پہلی چشمی پر ہی اقرار جرم کر لیا تھا۔ اس لیے میری سزا نے سوت لینی تھی، مگر میں نے یہ بات امی کو نہیں بتائی۔ میں نے اظہر سے درخواست کی کہ اب رہی رانی مت جاؤ، گھر والوں کو سنبھالو۔ ان سے مجھے تسلی بخش جواب دے ہوئے کیا۔

”مزگھر نہ کر مدظہر میں انہیں سنبھال لوں گا۔“

”مدظہر پتر میری مکھی کا کیا ہوگا۔“ اچانک امی نے روتے ہوئے پوچھا۔ ان کے الفاظ اور آنسوؤں نے میرے دل رگھو نسا رسید کیا۔ مجھے اسے اقرار جرم پر بہت چھتکا ہوا۔ مجھے تمہانے سے بھاگ کر اپنی بہن کو دکھانا سہا چاہیے تھا۔ تمہارا ذکر چیز اتوں کوئی بھی خود بر غنزل نہ رکھ سکا۔ سبھی وہی آواز میں رونے لگے تھے۔ میں نے اظہر سے کہا۔

”اظہر بھائی آپ پہلی فرست میں مکھی کے اغوا کی ایف آئی آر کٹوائیں جو بددیوں کے خلاف اور اپنے تئیں مکھی کی تلاش کرنے کی کوشش کریں۔“

اظہر نے میرے سامنے ہر کام کی باہی بھری تھی، مگر جب سسرال رانی کے پاس گیا تو سب کچھ بھول گیا۔ دو دن بعد اس نے کمال دیکھا، یہ بیوی رانی کو لے کر واپس رہی بھاگ گیا۔ یہ خبر مجھے امی اور سکھانے نے آنسوؤں کے سج سٹانی تھی۔ میرے ساتھ ان کی وہ ملاقات بھی آخری ثابت ہوئی۔ اس کے بعد مجھے ملنے کوئی نہ آیا۔ منظر بھائی کو بھر کا خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھیں چمک گئی تھیں۔ دو مجھے رکھ رہا تھا۔ میں نے دل پر منہ کا پتھر رکھ لیے تھے۔ میں فظہ رانیوں سے اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ میں نے مضبوط لٹھے میں کہا۔ آگے بولو اظہر بھائی۔

مجھے موت کی سزا سنائی جا چکی تھی۔ میں جیل پہنچ گیا تھا۔ جیل میں میرے مراسم چند ماہی گرامی غنزلوں کے ساتھ جڑ



گئے۔ میں نے بھی نقل کیا تھا۔ وہ بھی اپنے علاقے کے بارڈر فنٹھتے کو اس لیے میرا بچہ دوہرا بھی نہیں میں جا تم تھا۔ خیر تجربہ دہر افضل عرف کا و دونوں ہی اہم بندے تھے۔ پھینچے ہوئے غنڈے اور ایک بڑی سیاحتی پارٹی سے وابستہ تھے۔ مخالف پارٹی کے انہوں نے آٹھ دس بندے مار دیے تھے۔ ان کے پیچھے بہت بڑے بڑے ہاتھ تھے، مزائے موت ہونے کے باوجود انہیں مکھن سے بال کی طرح نیل سے نکال لیا گیا تھا۔ ایک دن وڈرس مجھے ملنے آئے اور بولے۔ ہمارے بار کچھ کام بنا۔

میں نے ان کے چہرہ کی طرف دیکھا۔ منیر گجر بولا۔

”کیا دیکھ رہے ہو میرے بار۔ لیفٹیننٹس سہم پر۔“

”لیفٹیننٹس تو ہے بار۔ پروسج رہا ہوں جس میں اس شخصیت میں دیکھنا چاہیے ہائیں۔“ میری بات سن کر اس نے بلند قبچہ

لگایا۔ اس کی قمی میں کالوٹھی شریک تھا۔ وہ کالو سے بولا۔

”لوکر لوکل۔“ شخصیت ان نے پھر سے بلند قبچہ لگا ڈالا۔ ”اے میری جان ہم تو دن رات بہت اور زندگی کا کھیل کھیلتے ہیں۔ ہم کب رہے ہو جس شخصیت۔ اے سہم چند بار۔ کام بول۔“

”میں نے کہا سہرا اور آخر میں جو ہدروئی نازنا کی ایک شخص ہے۔ چوہدری راجا کا بڑا بھائی اسے اٹھاتا ہے۔“

”ہیں۔“ کالو نے اسے کہا جیسے یہ کام اس کے لیے انتہائی معمولی نوعیت کا ہے۔ میں نے کہا۔

”کالو اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ ساہنہ و پنجاب کے چف فشنر تک پہنچے ہیں ان کی۔“ کالو دہر منیر گجر نے ایک بار

پھر قبچہ لگایا۔

”کالو نے کہا۔“ لے لیجی گجر ہم تو اسے بڑا بہادر سمجھتے تھے پراسا کا حال رہے کہ ہمیں چوہدری نازنا سے ڈر رہا ہے۔

”اے سہم نظر تو نے ڈراں کا بھائی کراو بارڈر میں ڈر رہا ہے۔ ہم اسے اٹھا جس کے ہمیں خیر سے کمان پر لکیر بنا سکیں گے۔“

آئی تھی۔

”نہیں گجر اسے مارنا نہیں ہے۔ صرف اٹھاتا ہے۔ اس سے مجھے کچھ پوچھتا ہے۔“

”کیا پوچھتا ہے۔ ہمیں بتاؤ ہم ان کے گلے میں انگلی ڈال کر سب کچھ اٹھا لیں گے۔“

”دہنیں بار کھٹا کرو۔ میں بتا دوں کہ تم لوگوں کوئی اگال اسے انوار ڈکرو۔“

”چند گجر شہزادہ جو بکتا ہے ہاں لے بار۔“

”ٹھیک ہے کالو۔ میں منظر اُتھو دو تین ڈوں تک چوہدری کو اٹھا کر تجھے اطلاع دیے ہیں۔ وہ پلے گئے۔“

”میں اہل نہیں کہہ سکتا خدا۔ کچھ کچھ ضرور کہنا گے۔ ایک ہفتہ بعد وہ پھر مجھے ملے اور خوش خبری سنائی کہ میرا وریہ

وڈس چوہدری نازناں کا بھائی بنا چکا ہے۔ اب اگلی بات بتاؤ اس کا کیا کرنا ہے۔“

میں نے اب تک ان سے اصل بات پوچھ دو رکھی تھی۔ اب تاہم ضرور ہی غنا میں نے کہا۔ ”گجر ہم دو ڈوں پیر سے بہترین

دوست، ٹھیک اسرار دہر دو، مجھے امید ہے تم دونوں میری لاج رکھو گے۔ کہنے ہوئے میری آنکھیں ڈبڈبائی تھیں۔ انہوں

نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ گجر بولا۔

”اے سہم نظر۔ ہم غنڈہ ہفت لوگ ضرور ہیں پر اردوں کے یار ہیں۔ جس سے باری لگتی سمجھ لگتی، پھر جان بھی

پائی جائے تو پیچھے نہیں ہٹے ہیں، دیکھتے نہیں، ہوسہارے کہنے پر ہم نے مراد گجر میں جا کر چوہدری کو انوار کر لیا ہے۔“

یہی بات تو مجھے دلاسا دیتی ہے گجر۔ میں نے آنکھیں صاف کرتے ہوئے آہستہ بنانا۔ میری جھولی بہن تانھنی کو

چوہدری راجا میں نے انوار کیا تھا۔ وہ ڈاؤن سے منطقی انجام کو پہنچ چکا ہے۔ اب چوہدری نازنا میں مانا سکتا ہے کہ کتنی کہاں ہے۔

”اے اچھا اصل ماجہ دہر ہے۔“ گجر نے ہنکارا بھرتے ہوئے کالو کی جانب دیکھا۔ میں نے کہا۔ ”میرے باروں

چوہدری سے ہر صورت پوچھنا ہے۔ منطقی کہاں ہے۔“

”میرے یار ڈگرتے کہ چوہدری نازنا کراسا کا باپ بھی بنائے گا کہ ہمیں مکھنی کہاں ہے۔“

و اچلے گئے مجھے ڈھارس ہوئی کہ مکملی تیرا تاج مل جائے گا، مگر مقدر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ دو دن بعد مجھے پتا چلا کہ اور گھر دونوں مارے جا چکے ہیں۔ جس مخالف سیاسی پارٹی کے انہوں نے دس بندے گرانے تھے۔ انہوں نے بدلے لے لیا تھا۔ اس کے بعد مجھے کوئی ٹھنڈے نہیں آبا۔ گھروالوں کو شاید علم ہی نہیں کہ مجھے لڑنا بال جمل نکل کر آیا گیا ہے۔ میرے دل و راسخ میں واحد بد جو تھا کہ پتا نہیں تو کہاں اور کس حال میں ہوگی۔ آج یہ بوجھ بھی اتر چکا ہے۔ اب فکر ہے نوانی، سکھان اور پتو چھوکی۔

”آپ فکر نہ کریں مظہر بھائی۔ میں یہاں سے سبھا سو پاوا جاؤں گی۔ ان کا پتا کروں گی اور چار پانچ دنوں تک انتہا اللہ ہم سب آپ کو بخشنے آئیں گے۔“

”اللہ کرے مکملی رہیں سو پاوا میں ہی ملیں۔“ مظہر بھائی نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ اب تک وہاں قیام پزیر ہوں گے، وہ کہیں مظہر بھائی۔

مکملی جیسے حالات ہم برنوں تھے۔ ان ٹیم ہاک دنوں میں اپنا خون سفید ہو گیا تھا۔ مظہر نہیں رشتہ و بیاباں میں بے سروسا ہائی کی حالت میں چھوڑ کر دین بھاگ گیا تھا۔ دو چور دور کے رشتہ داروں سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ان میں طویل عمر سے تھک بنا دیں گے۔

”یہ ضرور ہائی میں مظہر کو وہ خالہ خدیجہ کے گھر میں ہی ہوں۔ سکھان پڑھی کبھی سمجھ دار لڑکی ہے۔ مجھے یقین ہے اس نے تمہیں ڈکرنی کر لی ہوگی اور گھر کی کثافت خور کر رہی ہوگی۔“ میری بات پر مظہر بھائی خاموش ہو گیا۔ میں نے کہا۔

”وہ بار اچا کر مجھے کم از کم ان کے سوجھ بوجھ کا پتا تو چل جائے گا۔“

”تمہیں سو پاوا اتنا ہے مکملی۔ تم کبھی وہاں گئی ہو۔“

”نہیں مظہر بھائی، کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ امی وہ دینا بار گئی بھی نہیں، مگر ساتھ کبھی سکھان ہوئی تو کبھی پھو پھو۔ آپ مجھے راستہ بنا دیں، میں کتنی جاؤں گی۔“

”مکملی تم یہاں سے سبھی نہیں آ جاؤ۔ وہاں سے تمہیں برا راستہ سبھاہ کی نوایا ہائی کس مل جائے گی۔“

خالہ خدیجہ سبھاہ انہیں نہیں ہے بلکہ مضافاتی گاؤں ساہنواں میں ہے۔ ساہنواں جانے کے لیے سبھیں سو پاوا سے با آسانی فوراً دینا مل جائے گی۔ سنا ہے اب رکھے بھی شروع ہو چکے ہیں۔ ارکان۔“

”چل بسنی اماات کا وقت ختم ہو چکا ہے مظہر بھائی کی بات اور چورنی رہ گئی۔“ موٹی تو تندر والا کنبھیل آ جا رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف اتنا ہی نظروں سے دیکھا۔ شاید پانچ راکس منت مزید مل جائیں مگر وہ سیات لہجے میں بولا۔

”چل کرے (لاہری) آواہا خند توں (ست) 2 منت زو (زارہ) ہو گئے ہیں۔“

میں نے مظہر بھائی کی طرف آواہی سے دیکھا۔ اس کا چہرہ بالکل سیات اور پرچم کے جذبات سے خارن ہو گیا تھا۔ میری آنکھیں پر نم ہو گئی ہیں۔ ٹیل کا منظر دھندلا ہونے لگا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

”رب راکھا بھائی۔“ کہتے ہوئے میں سڑ گئی۔

”رب تیرا حفاظت کرتے رہتا۔“ مجھے عقب سے مظہر بھائی کی آواز سنائی دی، میں نے ول میں آئین کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔



باہر کے مناظر بصیرت افزا رہے مگر میں آنے والے حالات میں الجھی ہوئی تھی۔ گاڑی کی رفتار اور مخصوص آواز مجھے اس کی طرح لورناری نے لگائی، میں نے سینٹ کی پشت سے سر نکال کر آنکھیں بند کر لیں۔ زندگی کے لمبوں پر حالات کے اچھے ہوئے پیوند بڑھتے جا رہے تھے۔ گاڑی راولپنڈی سے نکل کر روات میں داخل ہوئی تو مہر واہنگری یادوں نے وہ بوج لبا۔ مظہر بھائی نے بنا ہاتھا۔ روات سے آگے مندرہ پھر گجر خان اور اس کے بعد سو پاوا کا جھونا سا شہر آئے گا۔ گاڑی چلتی رہی، ڈنگی وہی، مناظر پیچھے سرکتے رہے اور میں سوچوں کی داؤں میں جھکتی رہی۔ رات سے پہلے میں خالہ خدیجہ کے گھر

سادنواں پہنچ کر اسی کے سینے میں چھب کر رو رہی تھی۔ کبھی دھماکا میں سکھاں کا مضموم چہرہ ابھرا تا اور کبھی چھو چھوکی بانہیں ذہن میں چلنے لگتی۔ گھڑی رک۔ جتنی بھی عمر مجھے دھیان نہیں تھا۔ کلینر کی آواز نے مجھے جھونکا دیا۔

”بانجی سو باوا آ گیا ہے۔“

میں نے بوکھلا کر اوجھڑا دیکھا۔ دائیں بائیں گاڑیوں کا ڈش اور بندوں کی چیل بہل نظر آئی۔ میں نے کلینر سے پوچھا۔ ”یہ کون سا اسٹاپ ہے؟“

”سو باوا اس اسٹاپ ہے۔ جی۔ تھوڑا سا ٹونف کے بعد پھر بلا۔“ بانجی سو باوا ہی آخری اسٹاپ ہے۔“

”میں نے دو چاند دست کیا، چادر سے بدن کو ڈھانپا اور نیچے اتر آئی۔ گاڑی کا کلینر ہاتھ میں ہوا چپک کر دبا ہوا۔ میں نے اسے مخاطب کرنے ہوئے پوچھا۔

یہاں گاڑی سادنواں جانے کے لیے گاڑی کہاں سے لے گئی۔ بہری آواز سن کر اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ وہ چودہ پندرہ سال کی عمر کا لڑکا تھا۔ چہرے پر رومانی کے نونور ہال اور نوجوانی کی شانوائی بہت بھلی لگ رہی تھی۔ دو گندے سے کپڑوں اور اٹھتے ہوئے بالوں میں بھی خوب صورت دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے لفظ بھر سر کھجا یا پھر دائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”دباں چلی جائیں۔ وہیں سے مختلف گاڑیوں کے لیے رکشے اور پتھن مل جائیں گی۔“

”بھائی مجھے سادنواں جانا ہے۔“ میں نے ایک بار پھر اسے باز دہائی کرانے ہوئے کہا تاکہ میں غلط راستے پر نہ چلی جاؤں۔ ”بانجی دباں سے کھڑ بوت، چند امیرا، چیرا، سر جلال شاہ، سادنواں۔ تمام وہ باتوں کی سوانی مل جائے گی۔“ اس بار اس نے تفصیل بتائی نہ مجھے بہت پارا لگا۔ میں نے عبت سے کہا۔

”بہت شکر یہ بھائی خوش رہو۔“ میں نے دیکھا اس بار اس کے چہرے پر خوش گواہ مسکراہٹ رنگ گئی تھی۔ وہ شاید کچھ کہنا چاہتا تھا مگر میں اسے مطلوبہ مقام کی طرف چل پڑی تھی۔

خلیفہ گریز خان کی تحصیل سو باوا ایک چھوٹا سا شہر ہے جہاں ضرورتاً زندگی کی ہر چیز مہتر تھی۔ سو باوا کا بازار دروایتی بازاروں جیسا تھا۔ دکانوں کی بھرمار تھی مگر کبھی نہیں تھی۔ بانجی سائیکل، موٹر سائیکل، تانے، رکشے اور پیدل چلنے والوں کا کافی رش تھا۔ دکانوں کے سامنے پر زنی بانوں کی بھی گئی تھی۔ سادنواں کی سبک چینی کے لیے مجھے زیادہ تک و دہنیں کرتا پڑی۔ پرانے ماڈل کی کھئی بانری نور و دھن کے قریب لڑکا آواز بس کس دبا تھا۔ کھڑ بوت، سادنواں آ جا ڈھی سادنواں جانے والے۔ میرا رخ اس کی طرف ہوا تو وہ لپک کر میری جانب آ یا۔ ”بانجی کہاں جاتا ہے۔“

”سادنواں۔“

”بھئی جی بھئی۔ دو سو بار اس کم میں ابھی چلے ہیں۔“ اس نے گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں اتنے دسوار ہوئی تو وہ پھرت چلنے لگا۔ آ جا ڈھی کھڑ بوت، سادنواں جانے والے۔ ذرا تھوڑے پر اتار پڑا نے ہوئے گھڑی کر گاڑی کو تھوڑا سا آگے بڑھا یا تو باہر سے کلینر چلایا۔

”اسٹادو رک کے۔۔۔ دو سو بار اس آ رہی ہیں۔“

و مگن جیسے ہی نکل ہوئی کھڑ بوت نے دروازہ بجائے ہوئے کہا۔

”جیل اسٹادو ڈیل اسے۔“

مجھے ذرا تھوڑے کے غضب میں سینٹ ملی تھی۔ یہ خوافین کے لیے مخصوص سبٹ تھی، میرے ساتھ ایک نہیں بیٹیس سال عورت اپنے چار سالہ بچے کے ہمراہ بیٹھی ہوئی تھی، اس کے ساتھ دو دو جوان لڑکیاں براہ ران تھیں، بانجی و مگن کی تمام سبٹوں پر مردوں کا بیٹھ تھا۔

گاڑی چلنے ہی میں نے نٹنی عورت کو دیکھا۔ وہ فیول صورت عورت تھی، بیٹے کو اپنی گود میں بٹھانے کی تاکم کو کوشش کر رہی تھی۔ وہ بیک بیک کر کھڑا ہوا جاتا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

”بانی بھی ساؤنڈز آواز جا ہے، میں پہلا بار جارہی ہوں اور۔“  
 ”اوسے تمہیں ساؤنڈز آواز جا ہے۔“ مہر کی بات کا نتیجہ ہوئے وہ فوراً جبکہ کہ بولی۔ میں بھی ساؤنڈز آواز جاں گی، میرا  
 نام تلفظ ہے۔ یہ میرا بیٹا ہے فاروق۔ بڑا شیطاں ہے، جی اور ساؤنڈز آواز کس کے گھر جارہی ہو۔ وہ ان اسٹاپ بولنے لگی  
 تھی۔ آواز بلند کی اس لیے دونوں نوجوان لڑکیاں بھی اسے دیکھنے لگی تھیں۔ اس نے سلسلہ کام جاری رکھنے ہونے کہا۔  
 ”میرا نام کونسا ہے۔“ غور نے بتایا نہیں۔“

”میرا نام کونسی ہے۔“ میں نے آواز دہری رکھتے ہوئے کہا۔  
 ”مکھنسی نو کس کے گھر جارہی ہے۔“ اس نے فوراً سوال و ابواب پھر جواب سے بغیر بولی۔ ”نو اکیلی ہے باجپے سرو  
 بھی ہے؟“ تلفظ انبند اور جے کی باؤنی صورت تھی۔ میں بچپن تا وہی مٹی کراس سے بات ہی کہوں کی۔ دونوں لڑکیاں تلفظ کی  
 طرف اشارہ کر کے جس رہی تھیں۔ تلفظ نے فاروق کو گرویس و باتے ہونے دو بار دہرا دیا۔  
 ”مکھنسی نو ساؤنڈز آواز کس کے گھر جارہی ہے۔“

”وہاں میری خالہ کا گھر ہے۔“ میں جواب دینے کے بعد شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ دو بال سے کھال اتارنے والی  
 عورت تھی، اس لیے مجھے وہ ضرور خالہ کا گھر و وار ہو ضرور پوچھے گی، مگر اس بار ان کا چہل چل کر کھڑا ہوا تو وہ اسے ڈانٹنے  
 لگی۔ میں نے تصویر کی ہی مزید کہوت لی اور اپنا وہ بیان باہر کر لیا، نگر بنا آ وھا گھنڈہ بعد کنڈ بکتر نے آواز لگائی۔  
 ”چل یعنی ساؤنڈز والے۔“

”اوسے گاڑی رکھنا آواز ہے نہیں۔“ تلفظ نے فوراً کہا۔ کنڈ بکتر نے آواز لگائی۔  
 ”اسنا گاڑی روک کے۔“ بندے اتارنے میں یہاں۔“  
 گاڑی کے جا تے ہی تلفظ کی گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔  
 ”اے مکھنسی نو نے بتایا نہیں تیری خالہ کون ہے؟ اور تو آئی کدھر سے ہے۔ ہم نے پہلے تو تمہیں ساؤنڈز آواز نے  
 جاتے نہیں دیکھا۔“

”میری خالہ کا نام خدیجہ ہے اور میں پہلی بار یہاں آئی ہوں۔“  
 ”خدیجہ کون؟“ اس نے پوچھا پھر خوشی بولی، وہی جس کا پچھلے سال انتقال ہو گیا تھا۔ تلفظ کی بات سن کر مجھے دھچکا  
 لگا۔ میں اس شخص دیکھ میں کسی کو اسے اس کہوں بنا۔ میں خود نہیں جانتی تھی پچھلے سال مرنے والی خدیجہ بھائی خانوں میرنی  
 خالہ تھی یا کوئی اور۔ میں نے بات ماننے ہوئے پوچھا۔  
 ”تلفظ بانی آپ کا گھر کہاں ہے۔“ وہ فوراً بولی۔

”میرا گھر وہی خالہ منگروے کے ساتھ والا گھر میرا ہے۔“ اس نے ہاتھ نہجانے ہوئے جواب دیا۔ تصویر دور چلنے  
 کے بعد اس نے سرخ آبنیوں والے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔  
 ”مکھنسی وہ رہا ہنہارنی خدیجہ خالہ کا گھر۔“ میں نے ایک نظر مکان کی طرف دیکھا اور اس کا شکر بوا کر کے اس طرف  
 چل پڑی، پچھلے سے تلفظ نے آواز لگائی۔

”اوسے میں کونسی۔“ میرے گھر ضرور آ۔ آج شام کو ہی آ جا۔“  
 ”جی ضرور آؤں گی۔“ میں نے جواب دینے ہوئے قدم تیز کر دے سا، اب وہ مجھے ہی نہ آ جائے۔

سرخ آبنیوں والا مکان میرے سامنے تھا۔ میرنی کیفیت بک کنت بدل گئی تھی، وہ دل زور زور سے ہنسنے لگا تھا۔  
 تلفظ کی قسمت کی ساری شگفتگی مجھوں میں غائب ہو چکی تھی۔ ذہن میں سیکڑا خیالات آند آئے تھے۔ نہجانے کون ہی  
 خبر سننے کوئے، یا پھر شہر قسمت کی دیوئی مہربان ہو جائے۔ میں اسی کے سینے میں لگ کر گزشتہ برسوں کے سارے غم  
 بھلا دوں۔ وہ آواز کھلا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوئی تو سامنے چار پائی پر خالہ خدیجہ کے اکلے نے بیٹے بھائی نور کو بیٹھے ہوئے  
 پایا۔ نور بھائی ہا کے جنازے میں شرکت کے لیے مہر داؤنگر آئے تھے، مجھے دیکھنے ہی اس نے فوراً پاؤں چار پائی سے نیچے



لٹکائے اور چلے جاتا کر کھڑے ہو گئے۔

”آؤ آؤ عاصمی! ہم اللہ سے وہ کہتے ہوئے میرے قریب چلے آئے، پھر کمرے کی طرف منہ کر کے آواز لگائی۔

”عائشہ..... عائشہ دیکھو عاصمی آئی ہے، خالد خورشید کی بیٹی مہر داہگر والی۔“ اگلے چند لمحوں میں سارے گھر والے میرے گرد جمع ہو چکے تھے۔

میری سلاٹھی کچھ بی بی امی، سکھان اور چھو بچھو کو دھمکتی رہتی تھیں، مگر ان میں سے ایک بھی کہیں نظر نہیں آئی، حال احوال پوچھنے کے بعد میں نے ائی کا پوچھا تو جواب ملا۔

”عاصمی ہم نے خالد کو بہت روکنا چاہا تھا مگر وہ بھائی مظہر کے جاتے ہی واپس جانے پر اہلہ تھی، پھر بھی ہم نے انہیں بھنڈا ایک ماہ تک روک رکھا، لیکن ایک ماہ بعد وہ سکھان اور چھو بیٹھوسیت یہاں سے چلی گئی تھی۔“

”نور بھائی انہوں نے کچھ بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہیں۔“

”کس کو کوئی بات نہیں ہوئی۔“ نور نے سوچتے ہوئے کہا، پھر مردے شخص اپنی بیوی عائشہ کی طرف کرتے ہوئے بولا۔

”کیوں عائشہ نہیں خالد نے کچھ بتایا تھا۔“

”نہیں عاصمی۔“ واضح کچھ نہیں کہا۔ ہاں البتہ جانتے تھے اتنا ضرور کہا تھا کہ مظہر بڑھ کر واپس لپٹائی میں شامل کیا ہے۔ ہم نے انہی کے پاس جانا ہے۔“

میں نے سر اٹھا دیا۔ ”مظہر بھائی تو اذیالہ جیل میں قید ہے، ائی نے ایسا کب کہا، ہوگا اور کہا بھی، وہ تو اصل بات بتانے میں کوئی بھروسہ ہی نہیں رکھتی۔“

”عاصمی تو کہاں گئی؟ سنا ہے تمہیں مہر داہگر کے کسی چوہدری نے انہوں کو لیا تھا۔“ عائشہ عاصمی کے لہجے میں طنز تھا۔

”بھائی، جس چوہدری نے مجھے انہوں کا مظہر بھائی نے اس کے جسم کے دس ٹکڑے کر کے مہر داہگر کے گتے سے نالے میں پھینک دیے تھے۔“ میں نے غصے میں جواب دیا۔ میرے لہجے کی کوئی اور بھائی نے محسوس کر لیا تھا، وہ خود راہ لے۔

”بی بی ماہ نور جلد ہی جاؤ عاصمی کے لیے کچھ کئی پانی کا بندوبست کرو۔“

”میں نور بھائی جیسے جانا ہوگا۔“

”ارے ایسے کسے عاصمی اتنی دور سے آئی ہو۔ سوکھے منہ کیسے جانے دیں گے۔ ماہ نور جاؤ بی بی۔ زکس تم بھی جاؤ بی بی کے ساتھ فوراً کھا تیار کرو۔“

نور بھائی کے بے حد اصرار پر میں نے دو چہرہ کا کھانا ہاں کھا یا اور نظیر کی نماز ادا کرنے تک لگ آئی۔

۵۰

میں ایک بار پھر انجان منزل کی راہی بن کر جسم کا بوجھ سے انتہا سمٹ دھکے لگتی تھی، سست اور نڈھال قدم چہرہ حرکت آئے اٹھنے لگے۔ ذہن میں کوئی واضح منزل نہ ہو تو راہوں سے پوچھا نہیں جاتا، بس جدوجہد کو مزہ آئے ہی جانب قدم بڑھتے رہتے ہیں۔ میرا داغ کھن پکڑ رہا ہوا تھا۔ ساری سوچیں ایک ہی گرواب میں گھومنے لگی تھی۔ گھر والے کہاں ہوں گے،

بظاہر ان کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ میری طرح وہ بھی بے منزل کی مسافر تھیں، کہاں گئی ہوں گی؟ کئی پتہ کب ہو جاوے گا اس حوضی آئے لے اُڑتی ہے۔ انہیں وقت کے ستم گزیدہ حالات کہاں تک رہتے ہوں گے؟ آخر کس نے انہوں نے ڈیرہ لایا ہوگا،

کیوں کہ یہ ایک دو دنوں کی بات نہیں تھی۔ سالوں بیت چکے تھے، مگر کہاں؟ یہ سوال میرے ذہن میں ہنسنے کی طرح برسنے لگا تھا۔ اہی، سکھان اور چھو بچھو کا ہم پر بے رحم جسم میں تھیلے ہو کر پھینچنے کی طرح دکھنے لگا تھا۔ جس حالت سے میں گزر رہی تھی وہ دیکھی جاتی تھی۔ ساہنزاں ویران اور بے رونق سا گاؤں تھا۔ یہاں لوگوں کا بہت رش تھا۔ جوان، بوڑھے،

بچے، مرد و زن، آتے جاتے لوگوں کو دیکھ کر میں نے تمبیہ اُٹھ کیا کہ آگے یا تو کوئی شادی ہے یا پھر ماتم۔ دوسرا خیال زیادہ تو ہی تھا۔ لوگ عام طریقوں میں تھے۔ میں بھی انہی لوگوں میں شامل تھی۔ کسی نے مجھ پر کوئی نوچ نہیں دی۔ میں نے ساتھ چلتی ہوئی عورتوں کی ٹوٹی میں سے ایک عورت سے پوچھا۔

”خالد! بڑے سارے لوگ کہاں جا رہے ہیں۔ آ کے کوئی ”وت“ ہو گئی ہے کیا؟“ میرے سوال پر نبی کی تمام عورتوں نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ ان کے دیکھنے کے انداز سے میں سمجھ گیا میرا قبائل قطعی غلط ہے، میرا حال میں جواب سننے کے لیے خاموش رہی۔ در عورت ہوئی۔

”لگتا ہے تم کسی دوسرے علاقے سے آئی ہو۔“ عورت نے پُر سوچ نظریں میرے چہرے پر جماتے ہوئے پوچھا، پھر ہوئی۔

دو سائے سر جلال شاہ کا گواڑ ہے، گاؤں میں سر جلال شاہ کا مزار بھی ہے۔ آج وہاں عرس ہے۔ سارے لوگ عرس پر جا رہے ہیں۔ عورت نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ اب میرا ان سے علیحدہ ہونا بہتر تھا۔ اگر ساتھ چلنی رہی تو بہت سے سوالات کا سامنا کرنا پڑتا۔ میں نے قدم آہستہ کر لیے۔ ایک دو نے ہلٹ کر پیچھے دیکھا مگر کہا کچھ نہیں۔ میں نے سوچا، راستہ سر پر کھڑی ہے۔ سو بارہا جانے جانے شام ہو جائے گی۔ رات کہاں بسر کرواں گی۔ سر جلال شاہ کا مزار میرے لیے بہترین پختہ تھا۔ عرس کی برقیوں، اینڈینڈیا وغیرہ میں دنوں تک جا رہی رہیں گی۔ ان دنوں میں، میں کچھ بہتر پلاننگ کر سکتی تھی۔ میں سر جلال شاہ کے مزار پر پہنچی تھی۔ یہاں دو سب کچھ پورا تھا جو ان قسم کے عرسوں پر چھوڑا ہوا کرتا ہے۔ اچانک میں ایک طرف لوگوں کا الگ جگہ نظر آ رہا تھا۔ میں اس طرف زرا قریب ہوئی تو چار چلانے والے لوگوں میں ایک شخص پر سوزا ڈال دیا۔ وہ لوگوں کے ہاتھ پیرا تھا۔ اس کے گرد لوگوں کی کافی جھینگر ہوئی تھی، میں خاموشی سے لوگوں کی بھیڑ میں ایک طرف رہا۔ تب تک لگا کر بیٹھ گیا۔ پُر دروازہ ہوا کے دوش پر لہرائی ہوئی میری ساعت سے نکلنے لگی۔ مجھے ایسے لگا جیسے ہاں لوہا بنا رہی ہے۔ میری آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ آنکھیں بند ہونے ہی سے ہوا کی آواز سنانے آ کر آہوا۔ پھر سے اندر سے ایک ہوک آنچی اور پورے جسم کو پیرنی ہوئی باہر نکل گئی۔

سوز پھرتی تھی دل نہ پھر جا کی لیزاں صبح بجز کے نہ

علم پڑھیاتے اوب نیواں کھیا کی لیزاں علم نوں پڑھ کے نہ

میری بند آنکھوں سے فتنہ جاری ہونے لگے۔ سلطان ہاسو کے کام پر توجہ دینی میرے روٹھنے کھڑے ہو گئے۔ چہرہ آنسوؤں سے تھپکھا جا رہا تھا۔ میری پوری فتنہ کام پر مرکوز تھی۔ اور حیرت باری راگ میں اٹھا مھر برآ تھا جا بار با تھا۔

چلے گئے نے راج وئی نہ کھیا کی لیزاں چلباں وڑ کے نہ

جاگ بنا زو وچکے نہ باہو پاؤں لال ہووے گز کرا کے نہ

یہ مصرعہ جاگ کی طرح میرے جسم پر برسا۔ میرے منہ سے بے اختیار اس کی نقل ہوئی۔ الفاظ سے مضبوطی اپنی پوری جڑ نکات کے ساتھ میرے اندر آزمنے لگے۔ دودھ کو وہی میں بدلنے کے لیے ضروری ہے جتنا ہے کہ روہ میں پہلے خود اس دہی یا کسی ملائی جائے۔ دودھ میں ملانے والی چیز کو جاگ کہتے ہیں۔ بنا جاگ کے دودھ کھیا دہی میں نہیں بدلنا چاہیے اسے فہاں اباں کہہ رہی ہے کہ وہی کر دیا جائے۔ مسلمان کے لیے اپنے ایمان میں جاگ ڈالنا ضروری ہے اور وہ جاگ ہے عرس رسول ﷺ۔ حج بھی ہو، زکوٰۃ بھی ہو، نماز بھی ہو، سب کچھ ہو کر دل میں عرس رسول ﷺ نہ ہو سارے عمل راجیاں ہیں۔ عمل کو مراع تک پہنچانے کے لیے دل میں عرس رسول ﷺ ضروری ہے۔

میرنی آجیں مسکوں میں بدلنے لگیں۔ مجھے اپنے چار سواک پر اسرار ماہا۔ محسوس ہونے لگا تھا۔ میں ہولے ہولے کہتے ہی جاں مار حیر پڑھنے والے کی نے پورے عروج پر بھی۔ آواز کی ہر سوزنی بلند ہوں کو مچھو رہی تھی۔

نہ منن میرا پڑھے پڑے جو بن درزی رہاں لیزاں نہ

ان لیزاں رہی گل کھنی با کے حہ راساں ملنگ نصیراں نہ

میرے گردنا ہوا پر اسرار ہاں پھیلنے لگا۔ میرنی مسکایاں جنہوں میں بدلنے لگیں، میں ہوش کی دنیا سے نکل کر دہوش کی ادنیٰ میں چلی گئی۔ میرے پاؤں نھر گئے تھے اور ہاتھ نچھوڑا ہوا بلند ہو گئے۔ درباری راگ کی لے دو بارہ اٹھائی تھی۔

نہن نہیں میرا ہر ذرے بڑے جیویں در زنی دباں لیراں بنو۔

میں اٹھ کر دھال ڈالنے لگی۔ اس بار نے کی اٹھان نہالی تھی۔ دنیا جہاں کا کرب آواز میں سمٹ آیا تھا۔ میرے سر سے حرکتے قدموں میں جیسے بلبلاں بھگتی تھیں۔ آچھلنے کودتے میرا سانس پھولنے لگا تھا۔ شاید ارد گرد لوگوں کا شور بھی بلند ہونے لگا تھا، مگر مدہوشوں کو ہوش والوں کی خبر نہیں ہوتی۔ آج بھی کی دنیا بھی بڑی کرب انگیز ہے۔ برصغیر میرے خون کی گردش کو جلا بخش رہا تھا۔ اچانک ہی ٹھنڈی آواز میری سماعت سے ٹکرانی۔ چمن، دچمن، چمن میرا تھرکی جسم تھم گیا۔ پاؤں کو جیسے ریک لگ گئی۔ لہجوں میں، میں مدہوشی سے ہوش میں لوٹ آئی۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو سیکڑوں آدمیوں کو اپنے ارد گرد دائرے کی شکل میں کھڑا پایا۔ کسی نے میرے پاؤں کے قریب ٹھنڈی پھینک دیے تھے۔ دیکھنے والاں کو شاید بنا ٹھنڈوں کے دھال کا لطف نہیں آتا۔ ایک دو ٹھنڈے تھے جو چوہدری اللہ رکھانے اپنی حویلی میں میری جانب پھینکے تھے، بد لے میں دو گز نیچے زمین میں جا پہنچا۔ اب ایک بار پھر میدان میں ٹھنڈے پڑے ہوئے تھے۔ میڈیم خانم کے کونٹے پر میں نے بیچتے ٹھنڈوں کی بہت سی آوازیں سنی تھیں۔ ام سے ایک بار میں نے کہا تھا۔ ام مزار کے ٹھنڈوں اور کونٹے کے ٹھنڈوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اگر ٹھنڈا دینا ہے تو ایسی ہی مزار کے ہانڈھیں۔ آج اس بات کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آچکا تھا۔ لوگ مجھے دیکھ رہے تھے اور میں ٹھنڈوں کو گھور رہی تھی، ٹھنڈے نہ زمین پر تھے نہ میری آنکھوں میں بلکہ دونوں کے درمیان خلا میں پڑے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں مقام سوچنا تھا۔ زمین یا پھر آسمان۔ زمین پر ملے گئے تو کبھی میرے پاؤں تک نہیں آسکتے۔ آنکھوں تک رسائی حاصل کرنی تو معتبر ہو جائیں گے۔ کام باہو پڑھنے والا بھی تھم گیا تھا۔ جب میں نے جبکہ ٹھنڈا دھاغے تو دوپوری طاقت سے پڑھنے لگا۔

الف اللہ چنے دی بونی میرے من دچ فرشد لانی بنو  
فنی ان بات دا پائی بلبا ہر رگ ہر جانی بنو

میں نے ٹھنڈا ہانڈھ کر دباں پاؤں زمین پر مارا۔ چمن کی آواز بھری دچھریاں پاؤں مارا۔ چمن کی آواز پھر بھری۔ پاؤں کی اڑتی زمین پر زور سے مارنی آواز کچھ تیز ہوئی۔ چمن۔ باہاں اور پھر دباں پاؤں اوپر تلے زمین پر پاش کیے تو ٹھنڈا رسائی طرح پہنچے گئے۔ چمن، چھنا، چمن، دچمن۔ اب زمین پر پاؤں مارنے کا تسلسل بڑھنے لگا تھا۔ ٹھنڈوں کی چمن چھنا چمن میں کسی اضافہ ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی میں مدہوشی میں گئی تھی۔ کلام باہو جاری تھا۔

اندرو بونی منٹک پچا! تے جان بھلڈتے آلی بنو

میرے اندر بھی عشق دالی بونی پھبت پڑی تھی۔ بہت جلد میں ہوش مندوں سے مدہوشی میں چلی گئی۔ مجھے انداز نہیں ہوا کہ میں کئی دیر تک ریتا شا کرتی رہی۔ مجھے ہکا سا محسوس ہوا تھا جیسے لہرا کہ زمین پر گر پڑی ہوں۔ گرنے کے بعد باقی سارے احساسات مٹنے چلے گئے تھے۔ جب ہوش آیا تو چند صبر توں کو خود پر تھکے آیا۔ آنکھیں کھولنے ہی تو دہرا پیچھے کو نہیں۔ دو تین پوزوں میں تو سر تھمیں، ایک میراں ہانڈھ میری پیشانی پر آ یا ساتھ ہی آسانی آواز سنائی دئی۔  
”طبیعت کیسی ہے بیٹا؟“

میں اسنے بدن میں اٹکی ہی تمکاٹ کے سوا کوئی دوسری غیر معمولی چیز محسوس نہیں کر رہی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے جواب دیا کچھ دیر بعد مجھے جیتے ہوئے واقعات یاد آئے۔ میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔

دوسری عورت ہوئی۔

”کلی رہو بیٹی یہاں نہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ آرام کرو۔“

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ یہ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ ہر قسم کے ساز و سامان سے عاری۔ فقط فرش پر چٹائی تھی۔

میں نے دیکھا میرے گلے میں چار مختلف موتیوں کی لانا پڑی ہوئی ہیں۔ ہر دوں میں ٹھنڈا نہیں تھے۔ میں نے فوراً لاما میں آثار ناچا میں تو قریب نہیں ہوئی عورت فوراً ہوئی۔

”رہنے دے بیٹی۔ ہر صاحب کے کلم پر ام نے پہنائی ہیں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھا مگر میرے ہانڈھ کے

نہیں۔ میں نے مالا میں اُارتے ہوئے کہا۔ ”نہیں مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے اُتار کر چاروں مالا میں عورت کو خنداں اور کھڑکی ہو گئی۔

میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”تاہم کہا ہے۔“ جواب ملا۔ ”صبح کے چھ بج رہے ہیں۔ میں جواب سن کر بڑکھ پڑی۔ میں نے بے احتیاطی پوچھا۔ ”کہا میں پورے رات یہاں بیٹھی رہی ہوں۔“

”ہاں بیٹی! ہم نہیں دربارے اُتار کر یہاں گھر لے آئی تھی۔ بہر صاحب کا حکم تھا آپ کی خدمت کی جانے۔“ اس کا جواب سن کر میں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

”بہر صاحب کون ہیں؟“

”یہاں کے سجاد نشین ہیں بیٹی۔ کہا وہ یہاں آئے تھے۔“

”نہیں بیٹی انہوں نے صرف مجھیں وہاں دربار میں وصال ڈالنے دیکھا تھا، اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ہم چاروں نے کیا۔“

”بیٹھ جاؤ بیٹی میں مشتاقا لانی ہوں۔“

”نہیں مجھے اب جانا ہے، میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا عجب سے وہی عورت بولی۔

”بیٹی کچھ کھانی لے۔ پھر چلی جانا۔“

جانے دے زیب النساء، بہر صاحب کا حکم ہے، زکے نو خدمت کرنا جا چاہے تو جانے دینا دو کناست۔

میں جلدی سے باہر نکل آئی، چلنے ہوئے میں نے اپنے آپ پر دھیان دیا، وصال ڈالنے وقت جس ہمارے گھر میں وہی تھی۔ اس سے بیان میں بکا سا درد اُتار دیا تھا، اس کے علاوہ کوئی غیر معمولی چیز مجھ میں نہیں ہوئی، کیڑے، پلہیرہ، دوپٹا، چادر کبھی کبھو بے کاد رہا تھا۔ سخی کر چاروں کے پلو سے بندھی فٹم بھی جوں کی توں موجود تھی، میں نے سکون کا سانس لیا اور قدم تیز کر دیا۔ میں جلد سے جلد اس سڑک سے دور ہو جانا چاہتی تھی، کافی درجے کے بعد میں نے سوچا کسی سے پوچھ کر سو بازا کے لیے گاڑی پکڑی جائے، ایک واٹر کیر سے میں نے پوچھا۔

”سنو بیہانی مجھے سو بازا جانا ہے۔ یہاں کوئی گاڑی۔“ میری بات کاٹ کر وہ بولا۔ ”تمہو آگے چلی جاؤ۔ کھڑ پوٹ سے دھینک مل جائے گی۔“ وہ بہت جلدی میں تھا کہنا ہوا اپنی راہ میں ہولیا۔ میں اس طرف چل پڑی جس طرف اس نے

اشارہ دیا تھا۔

خصوصیات، ثقافت و دلچسپی میں اُتار جاتا تمام ویسٹ کبساں ہوتے ہیں، ساڈزاں پھر سر جلال شاہ اور اب کھڑ پوٹ، ہم دو تیس ایک جیسے نئے نئے صرف نام کا فرق تھا۔ دھینک کی تلاش میں، میں نے اُتار دھر نکا ہیں دوڑا میں تو ایک شخص پر نظر پڑنے ہی میں محاورے نہیں حقیقتاً اچھل پڑی۔ وہ شخص مخالف سمت میں جا رہا تھا، میں نے غور سے اسے دیکھا، وہی حال و حال، اچھے بوئے بال، پاؤں میں ہوائی چوہل، مٹے کڑے اور حال میں سنسنی۔ بال وہی ہے۔ بالکل وہی ہے، دھیرے دل نے خوشی کا نغمہ لگا دیا۔ میں اس طرف بھاگ پڑی۔

عبداللہ..... ر عبداللہ بھاگے ہوئے میں نے اسے آواز دی، وہی، میری آواز اس نے سن لی تھی، وہ ہلٹ کر مجھے دیکھ رہا تھا، میں بھاگتی ہوئی اس کے نزدیک پہنچ گئی اور کھڑکی ہوئی سانس بحال کرنے لگی، اس نے مجھے دیکھ کر اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا اور بولا۔ دھت تیرے کی، کہتے ہوئے دوڑ دوڑ سے ہٹ پڑا۔

کل ہی نکلا۔

میں کبھی وہ مجھے دھتکار رہا ہے۔ مگر ایسا نہیں تھا، وہ میرا ہاتھ پکڑ کر زمین پر بیٹھے ہوئے بولا۔

بیٹھ بیٹھ نہیں بیٹھ جا سکتی۔ وہ کہنے ہوئے بیٹھ چکا تھا، میں خود بخود اس کے ڈوڑ سے اس کے ساتھ بیٹھنی چلی گئی۔

☆.....☆

(اس جرت انگیز اور سراز پھرے ناقابل فراموش  
سلسلے کی اگلی کڑی آئندہ مارچ میں)



دیار غیر سے زندگی کی تصویریں

پروفیسر سے پہلی کتاب

دیار غیر سے پہلی کتاب



ملک عاشق حسین مساجد

ماں کے پیار کے احسان کا اچا گر کرئی ایک نڈا سرا انگریز

تھا جس سے ان کی گزر بسر بہتر انداز میں ہو رہی تھی۔  
 پروف علی چوں کہ ناراض ہوتا تھا، اس لیے اس نے  
 اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے گھر کے ساتھ ہی ایک  
 باغ بہالباہا، وہ مساراوان پوہوں کی حفاظت اور زرخیز خاں  
 میں مصروف رہنا۔ اس نے کچھ برتنے بھی پال رکھے  
 تھے۔ کبوتروں اور مرغیوں کا اسے بہت ہی شوق تھا۔ فوج  
 میں ملازمت کے دوران اس نے آرنی آڈنورم میں ایک  
 ڈاکو میٹری فلم دیکھی تھی جو برتنوں کے بارے میں تھی۔  
 اس فلم میں ایک ایسی مشین دکھائی گئی تھی جو انڈوں سے  
 چیزے نکالتی تھی۔ اس نے کھیل سے فرمائش کی اب کی بار  
 وہ پاکستان آنے کو چاہتا تھا۔ لے والی مشین ضرور ساتھ  
 لائے۔ جہاں جہاں نے اپنے والد کی فرمائش پوری کر دینی  
 اور چڑنے کا لے والی مشین لے آئے۔  
 وہ ایک عجیب و غریب مشین تھی اور وہی عجیب و  
 غریب مشین دیکھنے کے لیے گاؤں کے لوگ ان کے گھر  
 آ جا رہے تھے اور صوبے دارنی زبیدہ بیگم بڑے فخر سے ان  
 کو وہ مشین دکھا کر اور اس کی خوبیاں بتا رہی تھی، جہاں ان کو  
 سنی تھی اور ایک ہی دفت میں سکڑوں بچے نکلتے آئے تھے۔  
 ہوسف علی نے مشین کو آزمائے کے لیے پورے  
 پچاس انڈے اکٹھے کر کے مشین میں رکھ دیے اور پھر ان

سارا اولن گاؤں کے مردوں، عورتوں اور بچوں کا  
 ریٹازڈ صوبہ دار ہوسف علی کے گھر آ جانا لگا رہا۔ کوئی  
 آ رہا تھا اور کوئی جا رہا تھا۔ ہوسف علی کے گھر بچے کا سا  
 تھا۔ اس کے گھر کا ہر فرد خوش و خاشاک تھا۔ وہ ہر آنے  
 والے کو خوش آمدید کہنے اور اپنے پر صوبے دارنی زبیدہ  
 بیگم ہر ایک کو دروازے پر آ کر ایک مسکراہٹ سے خدا  
 حافظ کہتی۔ صوبے دارنی کے گھر تو کسی کی شادنی تھی اور  
 نہ ہی کسی بچے کی ساگر تھی، مگر پھر بھی ان کے گھر میں  
 خوشیوں کی بارش اترا آتی تھی۔

ہوسف علی کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں۔ چنا جیل  
 سب سے بڑا تھا۔ ہوسف علی نے فوج کی ملازمت کے  
 دوران جیل کی تعلیم دہریت پر خصوصی توجہ دی، انہوں نے  
 تعلیمی میدان میں کامیابیاں تخلیق اور پھر مزید تعلیم کے  
 لیے وہ یورپ چلا گیا۔ وہاں تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس  
 نے جرمنی میں ملازمت کر لی اور پھر اسے وہاں کی شہریت  
 بھی مل گئی، مگر وہ اپنے گاؤں، گھر، والدین اور بہنوں کو  
 نہیں بھولا تھا۔ وہ ہر سال ان سے ملنے پاکستان ضرور آتا  
 اور رشتے داروں، عزیزوں کے لیے جتنے بھی لاتا۔ اس  
 عرصے میں ہوسف علی ریٹائر ہو گیا اور گاؤں میں آ کر  
 رہنے لگا۔ جیل ہر باگہر دلوں کو ایک مستقل رقم بھی بچنا

”کیسا دقت آ گیا ہے..... کیسی کیسی نئی باتیں  
 دیکھنے میں آ رہی ہیں۔ مجھے خود سمجھ نہیں آ یا کہ یہ کیسے ہو گیا  
 ہے۔“ پھر ان کی بیٹی بھی خاموش ہو گئی اور کوئی مزید سوال  
 نہ کیا۔ انہوں نے دل کر چوزوں کو اگلے میٹر سے باہر نکالا  
 اور پھر ان کو زمین پر چھوڑ دیا۔ تازک تازک چوزوں کو  
 دیکھ کر سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

چار دن بعد یوسف علی ان چوزوں کو بارش میں لے  
 گیا۔ بارش کیا تھا، ایک بڑا سا پولٹری فارم تھا، جہاں کٹے  
 بھرتی مرغیاں اور ان کے بچے بے پتہ بھاگ دوڑ کیا  
 کرتے تھے۔ انڈوں بڑوں کی مرغیاں بھی اپنے اپنے  
 چوزوں کو لے کر یوسف علی کے بارش میں آ جاتی تھیں اور  
 سارا دن کوزا کرکت اور سخی کریدہ گرائی اور اپنے بچوں  
 کے پیٹ کی آگ بجھاتیں۔ مشین، بھن بھائی بھی ان میں  
 شامل ہوجاتے اور خوب لڑائی جھگڑا کرتے اور اودھم  
 مچاتے اور سخی مساتھے پھار پھار کی طرح ٹیبل کر زمین

سے چوزے نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ مخصوص وقت گزرنے  
 کے بعد یوسف علی نے مشین کے اندر جھانکا تو اس کا چہرہ  
 گلاب کے پھول کی طرح کھل اٹھا، وہ خوشی سے چٹایا۔  
 ”زبیدہ!..... اوھر آؤ جلدی سے۔“

زبیدہ دوڑی دوڑی ہوئی آئی تو یوسف علی بولا۔  
 ”سب بچے نکل آئے ہیں، ایک انڈا بھی خراب نہیں  
 ہوا۔“ زبیدہ کا چہرہ بھی چوزوں کو دیکھ کر خوشی سے کھل  
 اٹھا۔ وہ چوزوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”یہ کتنے تازک، پیارے اور خوب صورت ہیں۔  
 آپ دیکھتے ہیں کہ ان میں سے کتنے سرخ ہوں گے اور  
 کتنی مرغیاں؟“ دونوں میاں بھوی اور ان کی بیٹیاں بھی  
 خوش تھیں۔ ایک بیٹیا نے یوسف علی سے پوچھا۔

”ایا جان! انہی مشین میں رکھ دینے سے آپ بھی  
 بچے کیسے بنیں گے؟“ یوسف علی کی سمجھ میں بھی یہ بات نہیں  
 آتی تھی۔ وہ کچھ دیر اس سخی میں الجھا اور پھر اتنا کر بولا۔



اگلی صبح چوزے باغ میں بیٹھے تو انہوں نے ایک دوسرے چوزے سے ذوق سے ڈونے ڈونے بوجھا۔  
 ”بھائی! کیا آپ بتائیں گے کہ ماں کے کہنے ہیں؟“  
 اس چوزے نے زوردار اور دلچسپ لہجہ لگایا۔  
 انہوں نے دل پر گہرا آری سے جھل گئی۔ مگر پھر بھی اس نے ورد بھرے لہجے میں اپنا سوال پھر دہرایا۔  
 ”ہاں، بھائی! بتائیں نا، ماں کہا ہوتی ہے؟“  
 اس چوزے نے انہوں کی طرف دیکھا تو اسے اس کی سیم ہی صورت پر ترس آ گیا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔  
 ”ماں! کس ماں نے بھائی کو بھائی کہا ہے۔“

اس جواب سے انہوں نے جھلکے بغیر نہ پڑا۔ اس نے پھر ان کی سنت ساجت کی اور نہایت ہی جد بائی سا ہو کر کہنے لگا۔ ”بھائی! بتائیں نا، ماں کہا ہوتی ہے؟ ماں کس کو کہتی ہیں؟“

دوسرا چوزہ پہلے تو مسکرایا پھر بولا۔ ”بات یہ ہے انہوں نے بھائی! تم بن ماں کے سیم لوگ نہیں جان سکتے کہ ماں کہا ہوتی ہے؟“ انہوں نے کہا ”سیم“ بالفاظ خاص۔ اس نے پوچھا۔ ”سیم کس کو کہتے ہیں؟“  
 ”سب سے بد نصیب مخلوق ہوتی ہے یہ۔“  
 دوسرے چوزے نے کہا۔ ”مگر ہم سیم اور بد نصیب کیوں ہیں؟“ انہوں نے پھر سوال کیا۔

”انہوں! ہم تم تو مرغی، مرغے ہیں۔ یہ انسان بھی سیم اور بد نصیب ہم سے بڑھ کر نہیں ہوتے ہیں۔“  
 اس چوزے کی باتیں سیکھنے سے تم سے انہوں کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ پا اور وہ خاموش اور اداس ہو گیا۔ واٹ کو اس کی ڈر بے میں بیٹھے ہوئے جنوں سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے پوچھا۔

”جنوں! کچھ بتا چلا۔۔۔۔۔ ماں کہا ہوتی ہے؟“  
 ”نہیں۔۔۔۔۔ جنوں! سنجید و سادہ ہو کر بولا۔  
 ”میں نے بھی ایک دوسرے چوزے سے پوچھا تھا۔“ جنوں بولا۔ ”وہ کہتے تھے۔“ سیم ابگ نہیں جان سکتے کہ ماں کہا ہوتی ہے اور سیم وہ بہتا ہے جس کے ماں باپ نہ ہوں۔ جنوں کی لفت میں ایک نئے لفظ کا اضافہ ہو گیا تھا۔  
 ”جنوں! اب باپ کہا ہوتا ہے؟“ اس نے پوچھا۔  
 ”میرے خیال میں ایک ماں ہوتا ہے۔“

کریدنے اور کیزے کوڈرے کھانے میں لگے رہتے۔  
 دن نو ان ہنگاموں میں گزر جاتا۔ مگر جب شام ہوئی تو مشین چوزوں کو ایک انجنا سا تلخ احسان بے چین کر دیتا۔ کیوں کہ ارد گرد سے آنے والی مرغیوں کے بچے چل چل کر آتے اپنی اٹی ماڈن کے پردوں میں جا کر دیک جاتے۔ مگر مشین ماں کی کوکھ سے پیدا ہونے والے چوزے سیم اور بے آسرا بچوں کی طرح غم زد اور اداس لگتا ہوں سے ان کو کھتے رہتے۔

☆.....☆

یوں ہی چند دن گزر گئے، اب وہ چوزے بلا سے ہو گئے تھے اور ان کی شکلوں سے نرا اور ماو کا فرق واضح ہو گیا تھا۔ یوسف علی اور اس کے گھر والوں نے چند چوزوں کے نام بھی رکھ لیے تھے، خاص کر ان کے جو سیم و طرار تھے۔ وہ جنوں، جنوں، پرنس اور گورنی کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ ایک شام یوسف علی نے جب چوزوں کو ڈر بے میں بند کیا تو انہوں کو در بیک بند نہ آئی۔ اس نے اپنے پان بیٹھے ہوئے چوں کو آہستہ سے آواز دی، ایندھا سے لگی نہیں آئی تھی اور وہ بھی سمجھی مٹی سوچوں کے اتانے بیٹے میں مصروف تھا۔ وہ دوسری آواز پر چونکا اور پوچھا۔ ”کیوں جنوں۔۔۔۔۔ کیا بات ہے؟“

”یہ جو باغ میں دوسرے چوزوں کے ساتھ نہیں بڑی بڑا“ یہاں لگھوٹی پھرتی ہیں، وہ ان کی کیا گئی ہیں؟“  
 جنوں کچھ دبا دبا سوٹی دبا، پھر کہنے لگا۔  
 ”سچ بات تو میں نہیں جانتا۔ مگر کہتے ہیں کہ یہ ان کی ماں کی ہیں۔“

”ماں۔۔۔۔۔ جنوں کی حیرت سے جیسے چیخ نکل گئی۔“ مگر یہ ماں کہا ہوتی ہیں؟“ جنوں نے پوچھا۔  
 ”جنوں۔۔۔۔۔ میں نہیں جانتا۔“ جنوں نے دلدھے ہوئے منہ سے کہا اور چپ ہو گیا۔  
 ”جنوں۔۔۔۔۔ جنوں۔۔۔۔۔ جنوں نے اسے خورنگا مارا۔  
 ”کیا ہے؟“  
 ”کل کسی دوسرے چوزے سے پوچھیں گے کہ ماں کہا ہوتی ہے؟“  
 ”ہاں، ہاں، جبکہ ہے کل کسی سے معلوم کر کے۔“

☆.....☆

چوڑوں پر جھینے کی جرأت نہ ہوئی اور وہ منہم پرئس کو لے  
اڑی۔ اس المناک سانحے پر منوں کی زبان سے صرف  
چند لفظ نکل سکے۔

”چوڑوں! پرئس ہم سے ڈر چلا گیا ہے۔“

”ہاں..... بہت ڈر، نہ جانے کہاں؟“ جنوں

نے کہا اور ان کی آنکھوں میں آنسو بھرا ہے۔

☆.....☆

چنوں، منوں اور پرئس۔ اس چوڑے کی عبادت کو  
گئے تھے۔ جب اسے مٹی نے زخمی کیا تھا۔ اب اس کی  
ماں ان کے پاس پرئس کی مغربت کے لیے آئی تھی۔ وہ  
اٹکھا، انہوں نے اسے جانے کی باتوں بولا۔

”کاش! تارا جی بھی ماں ہوئی۔ تو خیر بھائی  
پرئس ہوں نہ جانتا۔“

”تمہاری ماں ہے بھئی!۔“ مرغی نے کہا۔ اس  
کے لب و لہجے میں گہرا طنز تھا۔ ”تارا جی ماں.....“ دونوں  
نے حیرت سے بیک آواز ہو چکے۔

”ہاں بھئی! وہ جو صوبے دار صاحب کے  
برآمدے میں لوہے کی بڑی سی الماری رکھی ہوئی ہے  
..... وہی تمہاری ماں ہے، اس سے پوچھو کہ اس نے  
تمہارے بھائی کی حفاظت کیوں نہ کی؟“

یہ کہہ کر مرغی نے چلی گئی، مگر ان دونوں کو ایک نئی  
ابھین میں ڈال گئی۔

☆.....☆

اس بات خاص بہت ناہودنی۔ صوبے دار صاحب  
نے چوڑوں کو تنگ میں کھلا جھوڑا۔ جنوں اور جنوں، رات  
نہرا کر بڑے گرد چکر کاٹنے دے اور جنوں جنوں کرنے  
رہے۔ صبح ہوئی تو صوبے دار صاحب یہ کہہ کر حیران رہ گئے کہ  
منوں..... مشین کے پاس مرزا بے باک، جنوں مشین کے گرد  
چکر کاٹ رہا ہے اور جسکی ہول آواز میں چوڑوں جنوں کر رہا  
ہے۔ مشین پر بڑے بڑے کٹان لگے ہوئے ہیں۔ جسے دوسرا ہی  
رات اس کے گرد گھومتے اور چوڑوں مارنے رہے تھے۔

صوبے دار صاحب کو دیکھ کر جنوں جنوں ہو گیا اور  
انتیں ایں۔ دیکھئے گا، جیسے وہ ان سے پوچھ رہا ہو۔

”صوبے دار صاحب! تارا جی ماں کوئی کیوں ہے؟“

☆.....☆

”مگر یہ کہا ہے؟“

”اپنے بچوں کو دھوپ نہیں کھنے دیتا شاید۔“

منوں نے ایک لمبی ”ہوں“ کی، ایک آدھری اور

خاموش ہو گیا۔

☆.....☆

اگلے روز دونوں دن بھر اواس، اراس سے  
رہے..... چند دنوں بعد ایک واقعہ رونما ہو گیا۔ مشین  
چوڑے اور دوسرے مٹلے داروں کی مرغیاں اور چوڑے  
باغ میں حسب معمول دانا ڈنکا اور کڑے کوزے چک  
رہے تھے کہ ایک لمبی کہیں سے باغ میں آگئی۔ دو چانگ  
ایک بڑے سے چوڑے پر چھٹی اور اس کی گنگ بڑی،  
باغ میں کھلی کھلی گئی۔ چوڑے، مرٹے اور مرغیاں! دوسر  
آخر بھاگنے لگے..... چوڑے کی ماں نے جو اپنے نئے کو  
بچنے چاہنے دیکھا، وہ چوڑے سے لپکی اڑا لیا بھری کہ  
سیدھی مٹی کے منہ پر گری اور چوڑے اور بچے مارا مار کر اسے  
جا کر ڈرا۔ آخر مٹی نے چوڑے کو چھڑا کر اس کی ماں کو  
دوبچ لیا، اسے میں ہسٹ مٹی اور آبا۔ مٹی اسے دیکھنے  
ہی اپنا شکار بھوڑا، ڈوم دبا کر بھاگ گئی۔ ہسٹ نے زخمی  
مرٹی اور چوڑے کی مرہم پٹی کر دی..... مٹی کے بھاگ  
جانے کے بعد ہوش نہ کھانے آئے اور چوڑوں بولا۔

”منوں! اب پتا چلا ہے کہ ماں کس کو کہتے ہیں۔“  
”ہاں بھائی جنوں!“ منوں نے کہا۔ ”ماں جان  
دے کر گئی اپنے بچے کی حفاظت کرتی ہے۔“

”پاکل ٹھیک کہا تم نے، ماں اپنے بچوں کو بچانے  
کی خاطر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتی ہے۔“  
چنوں نے اس کی تائید کی۔

☆.....☆

ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ باغ میں چوڑے حسب  
معمول خرداک کی تلاش میں ادھر ادھر پھردے تھے۔  
جنوں اور منوں کے ساتھ پرئس بھی تھا۔ ایک ایک چیل  
انسان کی بلندی سے آئی، چھبھا مارا اور پرئس کو اپنے  
پچوں میں دو بچ، یہ جاوہر جا..... جنوں، منوں کے ہوش  
کم ہو گئے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہوا؟ وہ دونوں زرا  
سنبھلے تو کہا دیکھتے ہیں کہ تمام مرغیاں اپنے اپنے بچوں کو  
پڑوں کے نیچے چھپائے بیٹھی ہیں۔ چیل گواڑوں والے



## پرہیز سے دوسری کہانی

تذکرہ ناولیہ حقیقیہ

نور یہ جاوید

ایک ایسی کہانی جو خود اپنی اوت کا سبب بن گئی

یعنی ہوئی گئی کہ ایک مجلس میں جج کی آواز آئی۔ ہم بھاگ کر آئے۔ کئی گئی ہوئی تھی۔ ہم ہنسنا اٹھا کر اسے صحن میں لائے۔ تب سے اس کی یہی حالت ہے۔  
مجھ سے اپنی بیوی کی یہ حالت دیکھی نہیں چارہ ہی تھی۔ میں چار پانی کے اس ہنسا اس کے منہ پر پانی کے چھینے مارنے لگا۔ وہ کچھ بگڑے ہوئی میں آئے گئی تھی چھراں نے آجسٹا ہنسا پانی آکھیں کہوں۔

”کہا ہوا عالم؟ تم ٹھیک ہونا؟ جسے ہی اس نے آنکھیں کھولیں، میں نے بے تابی سے اس کی طبیعت کا پوچھا۔ میری طرف نہ دیکھ کر وہ وہ شرمناک ہو گئی اور جلدی سے ہر اہانہ پکڑ لیا۔ اور کہنے لگی۔  
”ظفر بلز مجھے اس گھر میں نہیں رہنا ہے، اس کمرے میں نہیں رہنا۔“ وہ بہت ڈرنی ہوئی تھی۔  
میں نے چار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور پوچھا۔  
”کیوں نہیں رہنا؟ کیا ہوا ہے؟ تمہیں اتناں باہر بی بیوں سے کوئی شکایت ہے؟“

فی الوقت میں جب میرے ذہن میں آئی تھی، کہوں کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ہماری شادی کو صرف دو ماہ ہوئے تھے اور کچھ لڑکیاں جلدی ایڈجسٹ نہیں ہونیں سسرال میں اور بھی کبھی

میں ایسی کام سے تنکا بار اٹھانا تھا۔ کچھ کام کی بر پٹائی تھی کہ آج کل کاروبار ٹھیک نہیں چل رہا تھا اور کچھ پر پٹائی تھی اپنی بیوی عالمہ کی تھی۔ ہماری سادگی کو صرف دو ماہ ہوئے تھے۔ ہم بہت خوش باش زندگی بسر کر رہے تھے مگر کچھ دنوں سے عالمہ نے عجیب و غریب فرسین شروع کر رکھی تھیں۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میں جیسے ہی گھر میں داخل ہوا تو میری چار جوان سہیلیاں اتناں اور دو چھوٹے بھائی ایک چار پانی کے ارد گرد تھیں تھے۔ ایک نو مجھے اپنے کاروبار کی بر پٹائی تھی اور پھر جس طرح میری اماں سہیلیاں اور بھائی چار پانی کے نزدیک کھڑے تھے، اس منظر نے میرے حواس چھین لیے، میں نثر بنا بھاگتا ہوا چار پانی کے نزدیک پہنچا۔

”بھائی وہ نہیں نا بھائی کو کیا ہو گیا؟“ میری بیوی نے بی بیوں سے رو دہی تھیں۔

”اماں کیا ہوا عالمہ کو؟“ عالمہ نے سہیلیاں سے پوچھا۔  
اس کی ہلکی گرز رہی تھیں۔ وہ گردن کو دائیں بائیں ہلا کر کچھ بول رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر۔  
میں بھی گھبرا گیا۔

”کہا پتا پتہ۔“ اچھی معنی کھاتا کھا کر اپنے کمرے میں

کاہر و بار بھی ٹھیک نہیں جا رہا میں الگ گھر کیسے؟“  
 ایک طرف تو مجھے اپنی ماں اور بہنوں کا خیال تھا  
 کہ انہیں اکیلا چھوڑا کر میں کیسے کوئی اور گھر لے  
 لوں، کیوں کہ مجھے چاہتا تھا کہ انہاں یہ گھر نہیں بیٹھے  
 دیں گی اور نہ ہی خود یہاں سے کہیں اور رہنے پر  
 راضی ہوں گی اور دوسری طرف مجھے اپنی بیوی کی فکر  
 کھائے جا رہی تھی۔ کچھ دنوں میں اس کی طبیعت  
 کافی خراب ہو چکی تھی۔  
 ”بھائی پلیز ہم اکیلے رہ لیں گے، ویسے بھی مدثر  
 اور بشر ہمارے ساتھ ہیں تا۔ آپ بھابھی کو لے کر کسی

سسرال والوں کی طرف سے بھی کچھ مسائل پیدا  
 ہو جا جا کرتے ہیں۔  
 ”نہیں یہاں سب بہت اچھے ہیں، مگر اس گھر میں  
 کوئی آسیب ہے جو یہاں مجھے نہیں رہنے دے رہا۔ پلیز  
 نظر آج تو اس نے میرا گھر دبانے کی بھی کوشش کی ہے۔  
 پلیز نظر مجھے الگ کر دیں۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے  
 برنی طرح روننا شروع کر دیا۔  
 ہم سادہ لوح لوگ تھے۔ آسیب و غیرہ کے متعلق  
 کافی باتیں سن رکھی تھیں، اس لیے یقین کرنے میں  
 زیادہ وقت نہیں لگا۔



اور گھر میں رشتہ ہو جائیں۔ ہم سے بھابھی کی یہ  
 حالت نہیں دیکھی جا رہی۔“  
 انہاں اور بہنوں کے اصرار پر میں نے کرائے کے  
 مکان کے لیے کوشش شروع کر دی کہ تھوڑے کرائے پر  
 کسی مناسب سے مکان کا بندوبست کروں اور جب  
 عالیہ ٹھیک ہو جائے تو وہاں لانا کے پاس آ جاؤں۔

”ہاں جزو کہہ تو کیا حالت ہوئی میری ٹوں کی۔ اللہ  
 جانے کس بد بخت کی نظر لگ گئی، تو اب سے الگ گھر لے  
 رہے۔“ انہاں تو عالیہ پر صدمہ تو ہادی جاتی تھیں۔ بیوی  
 یہ حالت دیکھ کر، دھڑکنی رو رہی تھیں۔  
 ”مگر انہاں آپ کو چاہیے میرے پاس اتنا سرمایہ  
 نہیں ہے۔ ابھی شادی پر تو اتنا پیسا خرچ ہوا ہے اور

نہا، جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ میں مستقل عالیہ کی بیماری کے متعلق سوچ رہا تھا۔ کئی روز علاج کو گزر گئے تھے آج بھی عالیہ بابا نے آنا تھا۔ کچھ ہی دن بعد عالیہ بابا آ گئے اور عالیہ کے ساتھ کمرے میں جا کر دو روز بند کر لیا۔ آج نہ تو عالیہ کے چہنچہ کی آواز ہی آ سکی۔ نہ ہی عالیہ بابا کی کوئی آواز۔ مہراول پر گھبراہٹ ہی طاری ہونے لگی۔ ان سے پہلے کہ میں اندر جاتا۔ عالیہ بابا باہر آ گئے۔ انسانی گھبرائی ہوئی حالت میں بار بار کندھے پر رکے دوہال سے اپنا ماتھا خشک کر رہے تھے۔

”کہا ہوا عالیہ بابا؟ عالیہ ٹھیک تو ہے؟“ مجھے عالیہ بابا کی حالت تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔

”بہت سی خطرات کا سبب تھا، ضد میں آ کر اس نے عالیہ کی جان لے لی۔ میں کبھی بہت مشکل سے جان بچا پایا ہوں۔“

انہاں نے یہ سنتے ہی اپنی دفت بینی ڈالنا شروع کر دیے اور سید بھئی کمرے کی طرف بھاگیں۔ میں جو عالیہ بابا کی بات پر ہوش و حواس کھو چھا تھا، اندر کی جانب بھاگا۔ عالیہ بندہ براؤنڈ میں لیٹی ہوئی تھی، اس نے جلدی سے اُسے دیکھا کہ عالیہ کا رنگ پیلا زرد ہو رہا تھا، جیسے کسی نے اس کے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ میں نے اس کے ہاک کے آگے ہاتھ رکھا مگر وہ سانس نہیں لے رہی تھی۔ نہیں بھی چپکے کی۔ ہمیں بغین ہو گیا کہ عالیہ مر چکی ہے۔

میری بہنوں اور لڑکیوں کا خوف سے مہر حال تھا اور مہرا تو وہ حال تھا کہ کونو بدوں میں اپنی ہونٹیں دوہینے ہوئے سینے شادنی کا اپنی بیوی سے محبت ایک فطری امر تھا۔ مجھے بغین ہی نہیں آ رہا تھا کہ جادو سانس نہیں تھکتا۔ خبر شام ہونے سے پہلے ہی ہم نے اس کی مدفن کا بندہ بست کر دیا۔ عالیہ کے گمراہ لہجے نے اسے حال میں ہمارے گھر بیٹھے۔ وہ بھی سادہ اور شریف لوگ تھے، ہماری طرح انہیں بھی بغین آ گیا تھا کہ عالیہ کی موت آسب کی وجہ سے ہوئی ہے۔ لڑکیاں اپنی خوف زدہ بیویوں کی تکی خوانی کے ذریعہ بعد ہندی خال کے گھر چلی گئیں اور میری بہنیں اور بھائیوں کو بھی ساتھ لے گئیں۔ انہوں نے مجھے بھی چلنے کو کہا مگر مجھے اس گھر

کرائے کا مکان ڈھونڈنے میں مجھے کافی دقت پیش آ رہی تھی۔ اسی طرح مسلسل دن روز گزر گئے۔ عالیہ کو اب دور سے بھی پڑنے شروع ہو گئے تھے، کبھی وہ خود کو مارنے لگی، کبھی گھر کے برتن توڑ دیتی، کبھی ادھیٹی آواز میں ردا شروع کر دیتی۔

ایک دن عالیہ کی اپنی مہرے سامنے روڑیں اور مجھ سے کہنے لگیں کہ کسی عالیہ بابا سے رجوع کروں، وہی اس مسئلے کا حل نکال سکتا ہے۔ میں پہلے بھی بنا چکا ہوں کہ ہم متوسط گھرانے کے سادہ لوح لوگ ہیں، لہذا جس ردا پر کوئی لگا تا ہم چل پڑنے۔ مجھے بھی ان کی باتوں میں وزن نظر آتا ہے۔ میں نے اپنے ایک جاننے والے سے بات کی۔ اس نے ایک پینچے ہونے والی عالیہ بابا کا مجھے کارڈ دیا جس پر لکھا تھا کہ ہر کام سو فیصد گارنٹی کے ساتھ، مہرئی کچھ امید بندھی اور میں نے ان عالیہ بابا سے رابطہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ بیوی کو لے کر میرے آستانے پر آ جاؤ، مگر میں نے انہیں بنا با کہ مہرئی بیوی کی حالت ایسی نہیں کہ اُسے آستانے پر لاسکوں، لہذا آپ گھر شرف لائیں اور گھر آ کر علاج کرنے کا ایک سے دس لے لیں۔ عالیہ بابا نے مجھے لیا کہ وہ 50 ہزار لیں گے۔ چون کہ رقم بہت زیادہ تھی مگر مجھے عالیہ کا علاج ہر صورت کر دانا تھا۔ میں نے بیویوں کی پردائیس کی اور عالیہ بھری۔ جس دن میں عالیہ بابا کو گھر لایا اس دن میں نے نوٹ کیا کہ عالیہ بہت پریشان تھی۔ اس دن اُسے معمول کی طرح دودے بھی نہیں پڑے، مگر میں ان سب باتوں کو عالیہ بابا کے آنے کی برکت سمجھ رہا تھا۔ مجھے خوشی بھی ہو رہی تھی کہ عالیہ جلد ہی ٹھیک ہو جائے گی، مگر ایک بات جو مجھے کٹکک رہی تھی وہ یہ تھی کہ عالیہ کے علاج کا دورانیہ بڑھانا جا رہا تھا۔ پہلے عالیہ بابا مہرے سامنے ہی کچھ پڑھ پڑھ کر عالیہ پر دم کرتے مگر اب اکیلے کمرے میں انہیں عالیہ کے ساتھ دو دو گھنٹے گزار جاتے۔ اس دوران اندر سے عالیہ کے چہنچہ کی آوازیں بھی آئیں مگر ہم باہر بیٹھے یہ دعا کرتے رہتے کہ عالیہ پر سے آسب اُتر جائے۔ اس روز صبح سے ہی نہ جانے کیوں مہراول پریشان

میرے چہرے کے اُڑے رنگ اور آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ خود بھی تھوڑی دیر کے لیے گھبرا گئی۔  
میں نے بغیر بولے وچپن میں پڑی چار پائی پر اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور آہستہ آہستہ اُسے ساری بات بتادی۔ پہلے وہ منہ کولے میری باتیں حیرت سے سنتی رہی جیسے اسے یقین ہی نہ آ رہا ہو، مگر کچھ ہی دیر میں وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بہت ضیاء کے

میں عالیہ کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا، سو میں نے کاروبار کا بہانہ بنا کر سہولت سے اُسے نہیں منع کر دیا۔  
میری زندگی کا وہ دن سب سے زیادہ تکلیف دہ تھا، جس دن مجھے عالیہ کی موت کی حقیقت کا علم ہوا۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی میں آج صرف اس بات کے لیے تڑپتا ہوں کہ کاش وہ دن میری زندگی میں نہ آیا ہوتا یا میں بھی انساں کے ساتھ پنڈی چلا گیا ہوتا۔ کاش مجھے حقیقت کا علم نہ ہوتا۔ اس حقیقت کا علم مجھے عالیہ کے مرنے کے ٹھیک دس دن بعد ہوا۔

برصغیر کی عظیم ڈراما نویس  
**فاطمہ ثریا بجیا** کی زندگی کی کہانی  
سیدہ عفت حسن رضوی کی زبانی  
ایک معرکہ دارا کتاب



شائع ہو گئی ہے

ہوا کچھ یوں کہ میری طبیعت اس دن بہت خراب تھی، اس لیے میں اپنی دکان پر نہیں گیا۔ گھر میں ہی آرام کر رہا تھا کہ مجھے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ پہلے تو میں سمجھا کہ میرا دم سے مگر دروازہ مسلسل کھٹک رہا تھا۔ چار دن چار بجے اُنٹھ کر دروازہ کھولنا پڑا۔ سامنے ایک لڑکی نقاب میں لکڑی تھی، اس نے پہلے مجھے سلام کیا۔

”جی فرمائیے! میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
مجھے شش و پنج میں دیکھ کر اس نے اپنا نقاب اُتار دیا اور بولی۔  
”ظفر بھائی میں رضیہ ہوں عالیہ کی سب سے اچھی سہیلی۔“

پھر مجھے یاد آیا کہ اسے میں نے اپنی شادی پر عالیہ کے گھر دیکھا تھا۔ مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر ایک بار پھر بولنے میں پہل آئی۔

”ظفر بھائی اندر آئے تو کہیں نہیں گئے؟“ میں نے چپ چاپ رات چھوڑ دیا وہ خود ہی بولتی بولتی اندر آ گئی۔  
”عالیہ کہاں سے ظفر بھائی؟ کافی دن سے میری اس سے بات ہی نہیں ہوئی تو نون پر۔ سوچا جا کر خود ل آؤں۔ وہ موضوع تو شادی کے بعد سرسالی کو اتنا پیاری ہو گئیں۔“ وہ بلا تکان بولتے ہوئے صحن کی میں رک گئی۔

”کیا بات ہے ظفر بھائی؟ آپ کی طبیعت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی اور عالیہ کہاں ہے؟ گھر میں اتنی خاموشی کیوں ہے؟“



طرح کا ڈراما کرنی مجھے فون کر کے ضرور بتائی کہ آپ لوگ آہستہ آہستہ الگ گھر کے لیے راضی ہو رہے ہو۔

مجھے اس کی ذہنیت پر بہت افسوس ہوتا۔

میں نے کئی بار کوشش کی کہ آپ کو حقیقت سے آگاہ کر دوں مگر اس نے مجھے قسم دہی تھی کہ اگر میں نے آپ کو باس کے گھر والوں کو بتا دیا تو خود کو نقصان پہنچائے گی، پھر جب کچھ دن پہلے آپ نے عامل بابا سے اس کا علاج شروع کر دیا تو ایک دن مجھے اس کا فون آیا وہ فون پر بہت دوری تھی، کیوں کہ عامل بابا کو پتا چل گیا تھا کہ اس پر کوئی آسیب نہیں، لہذا عامل بابا نے ڈراما دھمکا کر اس سے سچ اگھوایا، پھر اس دن کے بعد عامل بابا نے اس کی عزت سے کھیلتا شروع کر دیا۔ عامل بابا اسے ڈراما دھمکاتا تھا کہ اگر اس نے کسی کو بتا دیا تو وہ اسے کیس میں دکھانے کے لائق نہیں سمجھو گے۔ وہ آپ کو سب کچھ بتانا چاہتی تھی، مگر وہ ڈر گئی تھی کہ وہ آپ کی نظروں میں گر جائے گی، مگر میں اسے بار بار کسالی دہی کہ وہ آپ کو اعتماد میں لے کر سب کچھ سچ بتا دے پھر اچانک میرا اس سے رابطہ ختم ہو گیا۔ میں نے سو ہاٹل پر کانی کوشش کی مگر نمبر بند ملا۔ میں بہت شرمندہ ہوں ظفر بھائی اگر میں آپ کو بتا دوں تو شاید یہ سب نہ ہوتا۔

میں مہم کلیم کی نصیحت پر بنا کھڑا تھا۔ وہ خود ہی معذرت کر کے دروازے سے باہر نکل گئی۔

مگر میرا سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں محمد ہر وہی تھیں۔ میں وہیں دروازے کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ کوئی عورت کیسے اتنا بڑا کھیل کھیل سکتی جس میں اس نے اپنی عزت بھی گنوا دی، وہ بھی شخص ایک الگ گھر کے لیے۔ وہ مجھ سے تو کہنی ایک بار بات تو کرتی۔ مگر کاش اتنا بڑا کھیل نہ کھیتی، اس کھیل نے اسے الگ گھر کیا دیا تھا، اس نے تو اس کی جان ہی لے لی تھی۔

کاش وہاں کھیل نہ کھیتی۔

بادجو میں بھی خود پر کنٹرول نہیں کر پایا۔ نافر یا آدھا گھنٹہ ہم دونوں چپ چاپ روئے رہے پھر وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ دو جب تک ہنسی وہی مجھے محسوس ہوتا وہ باک شاد وہ مجھے کچھ بتانا چاہتی ہے مگر بتا نہیں پاری۔ میں دروازہ بند کرنے کے لیے اس کے پیچھے دروازے تک آیا وہ جیسے ہی دروازہ سے باہر قدم رکھنے لگی ایک دم پھر رک گئی اور پیچھے مڑ کر مہرئی جانب دیکھا۔

”ظفر بھائی میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔“ وہ دوڑوں ہاتھوں سے اپنی انگلیوں کو مڑھڑائی تھی، جیسے اسے بات بتانے کے لیے الفاظ نزل رہے ہوں۔

”جی ہاں۔“

”ظفر بھائی غالب پر کوئی آسیب نہیں تھا۔“ الفاظ سچے کہ جسے میرے سر پر ہم پہنا تھا۔ میں پاگلوں کی طرح اس کا منہ کئے جا رہا تھا اور پھر دروازے پر کھڑے کھڑے ہی اس نے مجھے پوری بات بتا دی۔

”ظفر بھائی دراصل غالب کا شروع سے ہی خواب تھا کہ جہاں اس کی شادی ہو وہ لڑکا اکیلا ہو اور وہ ان کے ساتھ گھر میں اکیلا رہی، مگر اس کی قسمت میں آپ بنے اور آپ کی پہلی بھی تھی۔ وہ مجھے بتاتی تھی کہ آپ سب لوگ بہت اٹھے ہیں، مگر پھر بھی وہ گھر والوں کے ساتھ ایڈجسٹ نہیں کر پاری گی۔ شادی کے فوراً بعد اس نے مجھ سے بات کی کہ وہ آپ سے کہہ کر الگ گھر میں رہے گی، مگر جب اس نے دیکھا کہ آپ اپنی ماں اور بہنوں سے بہت پیار کرتے ہیں تو اس نے مجھے اپنے منصوبے کا بتا دیا کہ وہ کس طرح آپ کے ساتھ الگ گھر میں رہ سکتی ہے۔ جب اس نے مجھے بتا دیا کہ وہ آپ سب اور جن وہ نمبر کا ڈراما کرے گی اور وہیں ہی حرکتیں کرے گی اور کہے گی کہ اس گھر میں آپ سب ہیں جو مجھے مارنا چاہتے ہیں تو آپ اسے الگ گھر لے کر دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ میں نے جب اس کا منصوبہ سنا تو لرز گئی کہ غالب الگ رہنے کے لیے کس حد تک جا رہی ہے۔ میں نے اسے بہت سمجھا مگر وہ اپنی ضد کی پکی تھی۔ وہ جس دن اس



آپ کی ڈیلی لائف میں جس کا ہے ایک اہم رول...

وہ ہے

# ہاشمی اسپیگھول

بھوسی



**Mohammad Hashim Tajir Surma**

E-mail: [hashmi@comp.net.pk](mailto:hashmi@comp.net.pk) Web: [www.hashmijuma.com](http://www.hashmijuma.com)  
All rights reserved. All other trademarks are the property of their respective owners.



SILCC 1736



## پردیس سے تیسری کہانی

### گائیکوں کی زمین

شعبان گھوسہ



گھر سے بھاگی ہوئی ایک بے بنی لانی کی عبرت خیز داستان

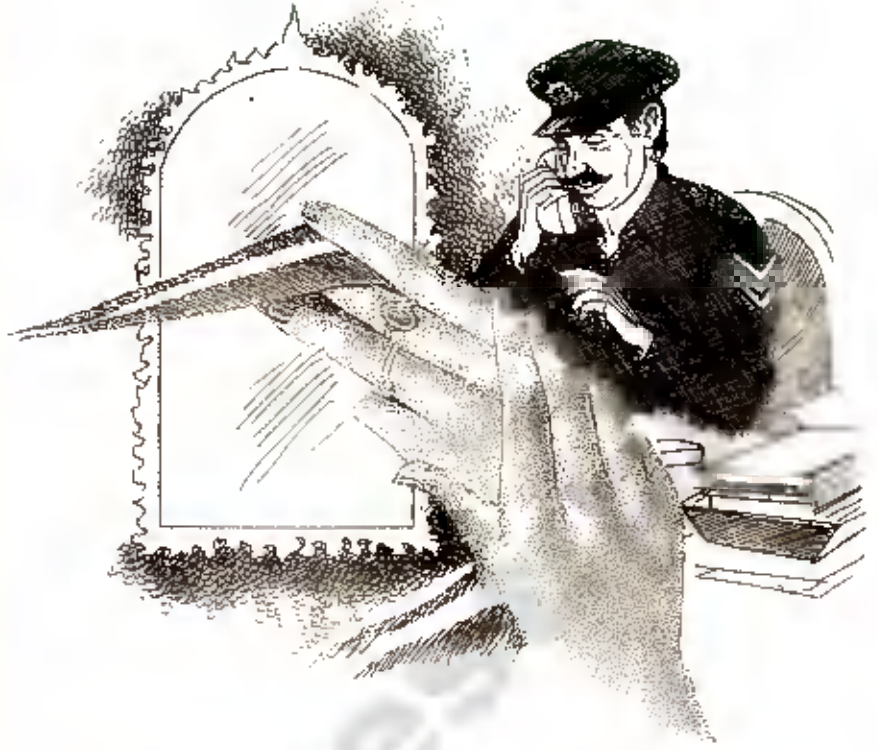
•••••

سے حفاظت رہے۔

پنہیس چپکلی سے جموں پڑائی صاف نظر آتی تھی جہاں سمیڑی ڈوبتی تھی، ان لمبے میں اگر لڑکی کے ساتھ بات کرنے ہوئے دیکھا جاتا تو لڑکی کے ساتھ ساتھ میرنی بھی شامت آجاتی۔ یہاں کے رہنے والے کسی نمبر مرد کو اپنی عورت کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اپنی بدنامی سمجھنے سے اور دوسرے کچھ غیر دونوں کو کارہی کر دینے سے، یعنی دونوں ان کی دو تالی بندوں کا شکار ہو جانے یا پھر اس شخص کو معاوضہ یعنی مٹانی زبان میں اس کو (چٹنی) بولنے ہیں، وہ ادا کرتا پڑتا تھا، جو ایک طرح سے غیر لڑکی سے بات کرنے کا زمانہ، باجان بجانے کا ہر جانہ تھا، مگر میں اس مضموم لڑکی کو دیکھ میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لیے میں ان کی سے بات کرنے کی ترکیب سوچ رہا تھا کہ کسی طریقے سے لڑکی سے بات ہو جائے اور مجھے ان کی بدنامی کا سبب معلوم ہو سکے۔

میں صبح سویرے کوئٹہ ہینڈ کارڈر سے بذریعہ سڑک روانہ ہوا اور شام کو حضرت آباد پہنچ گیا، جہر میں غمانے اظہار دے کر سیدھا اپنے بڑے بھائی کے گھر چلا گیا۔ وہاں نماز و خوراک میں فریٹس، وہاں دیکھا ہاتھ لگانے کے بعد سو گیا۔ صبح اٹھا تو بھائی نے ناشتا بنا کر کہا تھا۔ میں ناشتا کر کے تھانے

میں اس لڑکی کو ہمیشہ کی طرح ندی کے کنارے بیٹھا ہوا پاتا تھا۔ جہاں پیلاڑی آب شادوں سے آتا صاف ستھرا ٹھنڈا پانی سبک ریزائی سے رواں رہتا اور اس میں اس کا گھس بڑا اٹھا لگتا۔ دو جب ندی پر پانی بھرنے کے لیے آتی تھی، نو نہ جانے کئی سوچوں میں گم رہتی تھی۔ وہ ہمیشہ ہی پریشان ہی نظر آتی تھی اور کبھی کبھی تو اس کی آنکھوں سے آنسو کی ٹڑیاں نکل کر گالوں کو چھو لیتی تھیں۔ میں اس لڑکی کو ہوں پریشان دیکھ کر خود بھی پریشان سا ہو جاتا تھا۔ چوں کہ میں حساس طبیعت کا مالک تھا، اس لیے لڑکی کی پریشانی مجھ سے دیکھی نہیں جانی تھی۔ میں دل میں سوچتا تھا کہ اس مضموم ہی لڑکی کو ایسی کوئی پریشانی یا دکھ لاحق ہے، جو ہوں ندی پر بیٹھ کر پانی کو گھورتی رہتی ہے اور آفسوڈی کی لڑیاں اس کی آنکھوں سے رواں رہتی ہیں۔ میری تجویز یہ تھی کہ میں اس لڑکی سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا، کیوں کہ پاس ہی ندی کے کنارے پران کا جموں پڑائی بنا گھر واقع تھا، جس میں زندگی کی شاہد بنی کوئی سداست مہسر ہو، جسے دیکھ کر انسان کے چہرے پر خوشی کی سرخی دوزے۔ اس جموں پڑائی نما گھر کو چاروں طرف سے چھتاریوں کی چادر بھاری بنا کر چھپانے کی کوشش کی گئی تھی، تاکہ کوئی جانوروں



پہرے لگاؤں میں جمہورپنڈی نما ایک ہوئی تھا اور منشی کے گارے سے تہی دو دو کا میں نہیں، اسی جمہورپنڈی نما ہوئی سے ایک کب جائے پی کر میں نے ہوئی کے مالک سے اپنی مطلوبہ چیز کی کا پتا پر پچھا اور اسی طرف پیدل روانہ ہو گیا، اندھیرا پھیلنے والا تھا، میں جلد سے جلد اپنی جگہ پر پہنچنا چاہتا تھا، پولیس چونکی پٹ فیڈر کی نال کے ساتھ تہی ہوئی تھی۔ یہاں رہنے کے بعد آہستہ آہستہ مجھے علاقے کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو گیا تھا اور یہاں کے لوگوں کے بارے میں بھی کافی حد تک معلومات حاصل ہوئی تھی۔ یہ علاقہ تقریباً سارے کا سارا پیمانہ تھا۔ تعلیم تو نہ ہونے کے برابر تھی ایک دو اسکول تو تھے، اس میں بھی علاقے کے سرداروں نے اپنے ڈیرے بنائے ہوئے تھے یا پھر بھجڑ، بکر پولی اور گائے بھینسوں کے بازے بنائے ہوئے تھے۔ اگر کسی دن بھولے سے استاد یا بچے

پہنچا تو تھانے والوں نے مجھے 238 آرڈینی کارمراسلہ تھارایا۔ میں تھانے سے روانگی لکھوا کے جائے تعینات کی طرف روانہ ہو گیا۔

جعفر آباد سے سبزی پنہور کی طرف ایک کھنڈاروں کے علاوہ کوئی اور سوارتی نہیں جاتی تھی اور وہ بھی مسافروں سے بھری ہوئی تھی، اللہ کا نام لے کر میں بس پر سوار ہو گیا، گورنمنٹ کی مہربانی سے روز نہ ہونے کے برابر تھے۔ جگہ جگہ پر پتھر اور گڑھے بنائے ہوئے تھے، اس سے اچھا ہوتا روڈ کچا تھی، رہتا تو تم از کم جھلکے تو کم لگتے۔ ہر جھلکے پر مہر جھیت سے لگ کر پیچھے آ جاتا تھا اور میں اپنے جھگے والوں کو دل سے دعا میں دے رہا تھا۔

اللہ اللہ کر کے چار بجے کے قریب میں اپنی منزل پر پہنچا، سبزی پنہور ایک چھوٹا سا پس ماندہ گاؤں تھا، جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر جمہورپنڈی نما گھر بنے ہوئے تھے۔



تھا اور میرے اندر اس کے بارے میں جاننے کا جتنس  
اب اور بھی بڑھ رہا تھا۔

دوسری صبح جب میں ڈیوٹی پر پہنچا تو خود بخود میری  
نظرسن جو بیوی کی طرف اٹھ گئیں، اس لڑکی اور بیوی  
عورت کے ساتھ وہی مجھے کیس نظر نہیں آ رہا تھا، میں  
چوکی سے کمری نکال کر باہر لان میں بیٹھ گیا۔ آج مجھے اس  
لڑکی سے اس کے بارے میں پوچھ کر پتا چلتا تھا، تو وہی  
بعد لڑکی ہنگامے کے لڑکی کے کنارے پر آ گئی۔ میں نے  
اپنے ساتھی کو بلایا کہ وہ چوکی کا خیال کرے، میں نے  
اس لڑکی کی طرف اشارہ کیا کہ میں اس کے پاس جا رہا  
ہوں اور تم ذرا دھڑا دھڑا خیال رکھنا۔ میں جب لڑکی کے  
پاس پہنچا تو وہ اپنے خیالوں میں غم پائی کی طرف گھور گھور  
گرد کی رہی تھی اس مضموم لڑکی اور اس کی حالت دیکھ کر  
مجھے اس پر ترس آ رہا تھا۔ میں لڑکی سے مخاطب ہونے  
کے لیے بات کرنے کا سرا ڈھونڈ رہا تھا اور لڑکی کے ام کا  
تو مجھے پتا ہی نہیں ہے اس سے بات کیسے کروں۔ میں  
نے بہت کر کے لڑکی سے کہا: ”زیرانی ملے گا۔“

وہ ایک دم تے ایسے اچھلی بیٹھے اس کو کسی بچھو یا سانپ  
نے کاٹ لیا ہو، وہ بہت گھرائی ہوئی اور خوف زدہ لگ رہی  
تھی۔ اور میرے پاس پکارنے اور جاکھ یہ میں آنے پر بار بار  
اُدھر اُدھر کھینچی گئی کہ میں کوئی دیکھ کر نہیں آ رہا۔

”میرے پاس تو کوئی ایسا برتن نہیں صاحب جس  
سے آپ کو میں پانی دوں۔“

کوئی بات نہیں، آپ منگے کے دھکن میں پانی  
ڈال کر دوں۔“ اس نے نہی سے منگے کے دھکن  
سے پانی نکال کر دے دیا۔

”آپ کا نام کیا ہے“ میرے پاس پوچھنے پر وہ ذرا  
گھبرائی۔

”تم جی میرا نام..... ام کوئی نہیں ہے۔“

”کیا آپ کے ماں باپ نے آپ کا کوئی نام  
نہیں رکھا۔“

میں نے کہا: ”بھائی یہ بتاؤ وہ آدمی آپ کو کیوں  
مارتا ہے۔“

”جی وہ مجھ کو نہیں مارتا ہے صاحب۔“ اس نے مجھ  
سے ایک دم جھوٹ بولا، کیوں کہ یہ تاشا میں دیکھ چکا تھا۔

اسکول آ بھی جاتے تو ان کو بھیج کر بیویوں کے درمیان بیٹھنا  
پڑتا تھا۔ پتھر بھی آتے تو بھی بہت گھر غائب رہتے۔ جس  
دن پتھر نہیں آتے تھے، اُن دن سردار کا کمد اور بیویوں کو  
بھیج کر پاں چرانے کے لیے بیچ دیا کرتا تھا۔

گڈوں کے اکثر غریب کسان ان ہی سردار کے  
یہاں بھگتی بازی کرتے تھے اور کچھ ان کے ہی گھروں  
میں کام کاج کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پالتے تھے۔  
یہاں کے لوگ اکثر ”زن“ اور ”زیمینوں“ پر بھگڑا  
کرتے اور سر مٹھنے پر آ جاتے تھے۔ ہر سردار نے اپنے  
اپنے گوریلے پال رکھے تھے، دن بویارات، لوٹ مار،  
موٹر سائیکل، ٹریکٹر، چھینٹ کی واردات ہر روز ہوتی تھیں  
اور انوار بڑے گاوان، کئی وارداتیں عام تھیں، پتھر یا ہر  
شخص اپنے پاس رائل رکھنا فخر سمجھتا تھا۔ ان کے پاس  
دو وقت کی روٹی کھانے کے لیے ہوتا، ہو لیکن وہ رائل  
ضرور اپنے پاس رکھتے تھے۔

☆.....☆

صبح جب میں ڈیوٹی کے لیے اٹھا تو اسی قریبی  
جمو پتھی نما گھر سے لڑکی کی چیخوں کی آوازیں آ رہی  
تھیں، جمو پتھی پولیس چوکی سے قریب ہونے کی وجہ  
سے لڑکی کی چیخیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ میں چوکی  
سے باہر نکلا اور جمو پتھی کی طرف دیکھنے لگا، چوکی سے  
جمو پتھی صاف نظر آ رہی تھی۔ ایک آدمی برنی طرح  
اُس لڑکی پر تشدد کر رہا تھا اور ایک بوڑھی عورت لڑکی کو  
چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

یہ سب دیکھ کر مجھ سے رہائشیں جا رہا تھا۔ میں ایک  
دم تیز قدم اٹھاتا جمو پتھی کی طرف جانے لگا تو مجھے  
میرے ساتھی نے روک لیا۔

”یار یہ بان کا گھریلو مسئلہ ہے، کیوں مہمیت  
اپنے گلے میں ڈال رہے ہو، اس کے کہنے پر میں وہاں  
چوکی کے اندر جا کر بیٹھ گیا۔ تو خودی دیر بعد جب میں باہر  
نکلا تو دیکھا کہ لڑکی ہنگامے کے لڑکی کے کنارے بیٹھی اپنی  
باک صاف کر رہی تھی۔ اُس کی باک سے خون بہ رہا  
تھا۔ اور وہ برابر روئے جا رہی تھی، تو خودی دیر بیٹھ کر وہ  
لڑکی پانی سے پھر ایسا سا سر پر رکھ کر وہاں جمو پتھی میں  
چلی گئی۔ لڑکی کا یہ حال دیکھ کر مجھے اُس پر برا ترس آ رہا

ساتھ اُس نے کھانا لے لیا، پھر میں نے اُس سے کہا کہ تم تھوڑی دیر کے بعد برتن لے جانا، لیکن وہ وہیں بیٹھ گئی اور اُس نے کہا: "میں صاحب کھانا آپ ابھی کھا نہیں، بعد میں نہیں آسکیں گی۔"

"کیوں؟"

"اُس لیے کہ میرے مرد گھر آ جائیں گے۔"

میں نے کہا: "مگر ان سے ڈرنی کیوں ہو؟" یہ سن کر وہ سوچ میں پڑ گئی اور کچھ دیر بعد بولی۔

"اُس لیے کہ میں ان کی اپنی نہیں ہوں۔ آپ بہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اب اس دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں ہے۔ میں نے اپنی تادیلی کی وجہ سے اپنے خولی رشتے کھو دیے ہیں۔ اپنی چھوٹی سی پھول تھی، اپنے ماں باپ، لیکن بھائی سب، جس کی سزا میں آج پارٹی ہوں اور آج میں اس آدی کے ساتھ رہ رہ رہوں۔ میرے تھیلے والے ہم دونوں کے خون کے پیاسے ہیں۔"

میں نے کہا: "وہ بھلا کیوں۔" یہ سن کر اُن کی آنکھوں میں آنسو نریں گئے اور اُس نے جھٹلائی آنکھوں سے کہا: "کیوں کہ میں گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی ہوں۔" میرے منہ سے ایک دہڑاؤ گر گیا۔

"بنا ب کیا کہہ رہی ہو؟"

"ہاں صاحب میں گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی ہوں۔ اس سے پہلے بھی میری شادی ہوئی ہے اپنے چچا زاد کزن سے۔"

"اُن کا مطلب یہ ہے تم نے اس شخص سے نکاح پہ نکاح کیا ہوا ہے۔" اُس نے گردن جھکا کر کہا۔

"جی صاحب۔"

"اُسی کہا تجھ کو، آج پڑتی تھی کہ تم اس شخص کے ساتھ ہاپنوں کو چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہوئی ہو۔"

"صاحب جی۔۔۔ فی الحال تو میں جاری ہوں کل آ کر نسلی سے اپنی کہاں بناؤں گی۔ ابھی میرا آدی آ جانے گا۔" یہ کہہ کر وہ برتن سمیت گرجو نیوزی کی طرف چلی گئی اور میں آنے والی کل کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔

دو پہر کا دفت تھا۔ میں چوکی سے باہر پشاد رخت کے نیچے ہوا خوری کر رہا تھا کہ دو سامنے سے آئی ہوئی نظر آئی۔ وہ میرے فریب آ کر زمین پر ہی گھٹی۔ حال

"صاحب میں جاری ہوں، میرا آدی آ جائے گا۔"

"دیکھو مجھ سے گھر آؤ مت، میں آپ کو کچھ نہیں کر دوں گا۔ میں آپ کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں، وہ آپ کو اس طرح بے دردی سے کیوں مارتا ہے، میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ میں ان سے بات کر دوں گا۔"

"پاپر صاحب جی ایسا مت کرنا، وہ مجھ کو اور بھی زیادہ مارے گا۔"

"اچھا ٹھیک ہے میں اُس سے بات نہیں کرتا، پر مجھے اپنے بارے میں ضرور بتاؤ گی۔"

جی صاحب جی، جب موقع ملا تو آپ کو ضرور بتاؤ گی۔ اچھا اب میں چلتی ہوں صاحب جی، یہ کہہ کر وہ سٹکا اٹھا کر نیوزی سے گھر کی طرف چلی گئی اور میں وہاں اپنی چوکی پر آ گیا۔

پہلے تڑوہ نڈی کے کنارے کچھ دیر بیٹھ جانی چھی، لیکن پھر اُس دن کے بعد سے اُس نے دہاں پر بیٹھنا بھی چھوڑ دیا۔ میں جب بھی اُس کی طرف جانے کی کوشش کرتا، وہ سٹکا اٹھا کر نیوزی سے چھوڑتی کی طرف چلی جاتی، اس کے یوں چلنے جانے سے میں پریشان ہو جاتا تھا۔ کچھ دنوں بعد میری زیوٹی تھیل ہونگی اور میں شام کو زیوٹی سرانجام دینے لگا۔ ایک روز میں شام کو زیوٹی پر پہنچا تو تھوڑی دیر بعد وہ کپڑے اٹھانے نڈی کی طرف آ رہی تھی۔

میں ہمیشہ کی طرح کرسی نکال کر باہر بیٹھ گیا، وہ مجھ کو دیکھ کر پریشان ہوئی اور ایک دم ٹپک گئی، میں کرسی سے اٹھ کر اندر بیٹھ گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ لڑکی میری وجہ سے پریشان ہو، میں نے یہ سوچ کر لڑکی کا پیچھا کرتا چھوڑ دیا تھا کہ کم از کم بیچارن کو کپڑے دھونے اور پانی بھرنے کی تو آزادی ہو، اگر وہ اپنے بارے میں نہیں بتانا چاہتی تو کیوں میں اس کو تنگ کر دوں، میں نے اس لڑکی کا خیال دل سے نکال دیا، ایک دن میں چوکی کے باہر کرسی ڈالے بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے اس لڑکی کی آواز سنائی دی۔

"صاحب جی۔" میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو لڑکی کو اپنے پیچھے کھڑا پایا۔ وہ مجھ سے مخاطب تھی۔

میں نے کہا: "جی تم کون ہیں۔"

"وہ صاحب جی میں آپ کے لیے چادل کی روٹی اور ساگ لائی ہوں، وہ آپ کھا لیں۔" میں نے شکر یہ کہ

تے گلے آ کر میں بیٹے آگئی۔ کہنے ہیں باپ کا گھر ایک  
 جہی کے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ ہوئی ہے، جہاں درخورد  
 محفوظ رکھیں ہے، یہی سوچ کر میں بیٹے آگئی تھی لیکن مجھے  
 یہاں بھی بے روزگاری سے ٹھکرا رہا تھا۔ ابو نے صاف  
 صاف گفتگو میں کہہ دیا۔

”نیراجنا سزا اب وہاں پر ہے۔ اس گھر سے نیرا  
 جنازہ ہی لگنا چاہیے۔“

یہ کہنے ماں باپ میں جو مجھے جیتے جی جنم کے  
 عذاب دکھیل رہے ہیں۔ میں نے دل ہی دل میں  
 سوچا اور پھر میں نے ذکھ اور غصے میں آ کر خودکشی  
 کرنے کی کوشش کی۔

گھر میں ابھڑے ہوئے بھائی کی تارتھی، ان کو پکڑ  
 لیا، لیکن گھروالوں نے مجھے مرنے ہی نہیں دیا، ماں کو ابو  
 میرا ہاتھ بکڑ کر سسرال چھوڑ آئے۔ ظلم کا سلسلہ پھر اسی  
 طرح جاری رہا اور مجھے کوئی راستہ سوچ نہیں رہا تھا اس  
 سے جان چھڑانے کا۔ ایک روز میں گھر کے پاس ہی نکلے  
 سے پانی بھر دی تھی اور پانی ہی دریاں کھینچوں میں کام  
 کر رہا تھا، انہی نے اشارے سے مجھ سے پانی مانگا میں  
 نکلے سے پانی بھر کر اس کے پاس لے گئی۔ وہاں نے

پانی پی کر برتن میرے حوالے کیا اور مجھ سے حال احوال  
 پوچھا اور میں سٹکا اٹھا کر وہیں گھر آ گئی، پھر میں جب  
 چھٹی شام کو نکلے سے پانی بھرنے آئی تو وہ اپنی زمبوں پر  
 کام کرتا ہوا ملتا۔ اس طرح روز ہمارے پاس ہونے لگیں،

میں اپنے دل کی ساری باتیں دریاں سے کرنی، اس  
 دریاں میں چپت سے برتنی اور ایک بھول سی جہی کو جنم  
 دیا، میرے دل پر ظلم کا سلسلہ چلا رہا، گھر کا کام اور کھینچوں  
 میں سارا دن کام کر کے میں اپنی جہی کو دفت بھی نہیں دے  
 پارہی تھی۔ میری جہی انتہائی کمزوری کا شکار ہو گئی۔ ایک

دن میری جہی بہت بیمار ہو گئی۔ میں نے اپنے سسر اور  
 شوہر کو نہیں کھڑی تھی کہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ یہ  
 بہت بیمار ہے، ورنہ میری جہی مر جائے گی، لیکن ان  
 ظالموں کو مجھ پر اوردن ہی اس جہی پر کرنی تھی، اب میں جہی  
 کو اٹھا کر بیٹے آگئی۔ جہالت کی انتہا تھی۔ میری جہی کو  
 رو دانی رے کرنا لیا گیا، جہی بخار میں تپ رہی تھی، میں  
 نے انی ابو کی نہیں کہیں کہ مجھے اپنے شوہر سے طلاق دلاؤ

احوال کے بعد اس نے اپنی کہانی اس طرح شروع کی۔  
 میں نے جب ان دنوں میں آنکھ کھولی تو میرا نام  
 آس، بکھار گیا، گھر میں غربی بہت تھی۔ امی اور سارا دن  
 کھینچوں میں کام کرتے تھے۔ میرے بعد چار بھائی اور  
 تین بہنیں پیدا ہوئے۔ جب میں کھنڈی بڑی ہوئی تو امی  
 ابو کے ساتھ کھینچوں پر کام کرنے جانے لگی۔ ہمارے گھر  
 کے سامنے دوسرے محلے کا ایک گھر تھا۔ میں جب بھی امی  
 ابو کے ساتھ کھینچوں پر کام کرنے جاتی اور انہاں اپنے گھر  
 کے سامنے کھڑا ہوتا، ہر روز ہم رزق کی آنکھیں ایک  
 دوسرے سے چار ہوئی تھیں، ان پر نظر پڑنے ہی میں  
 اپنی آنکھیں جہی کر لیتی۔ وہاں اپنی بیوی، دو بچوں اور  
 اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتا تھا، وہ بھی ہماری طرح  
 کھینچوں میں کام کرنے تھے، وہاں کار کھینچا جھٹھا لگتا  
 تھا، لیکن جہاں شرم کی وجہ سے میں اس سے نظریں ہم ہی  
 ملانی تھی، پھر جب میں کھنڈی اور بڑی ہوئی تو میرا رشتہ  
 میرے چچا اور کزن کے ساتھ کر با گیا اور ایک سال بعد  
 میں بیاہ کر اپنے چچا کے گھر آ گئی۔

کچھ تھنے تو سکون سے گزرے۔ اس کے بعد گھر  
 کی ساری ذمے داری میرے اوپر آئی۔ گھر کا سارا  
 کام مجھے کرنا پڑا تھا۔ گھر کا کام نہیں ہوا تھا کہ کھینچوں  
 پر سے باہر آ جاتا تھا۔ کھینچوں میں کر لہر کے بیلوں کی طرح  
 کام لیا جاتا تھا، ماں اور نندہوں کی تو چھٹی ہو گئی تھی۔ وہ تو  
 بس اپنی مرضی کے کام کرتی تھیں۔ شوہر جتنے سو رہے ہی  
 کام کے لیے نکل جانے تھے تو رات کو ہی ان کی باتیں  
 ہوتی تھی۔ میں کام کر کے جب تھک جاتی تو رات بھی  
 میرے لیے کسی غذا نہ تھی۔ تم نہیں ہوتی تھی۔ گھر میں کھنڈی  
 کی چند چار پائیاں تھیں، جس پر سسر، ماں اور نندہ  
 قبضہ جما کر سو جاتے۔ شوہر اگر سوز میں ہوتے تو اپنے  
 ساتھ سونے دینے، اگر نہیں ہوتے تو مجھے لات مار کر بچے  
 گرا دیتے، میں مجبوراً چادر بچھا کر وہیں زمین پر ہی  
 سو جاتی۔ خون کا رشتہ ہونے پر مجھے بھی میرے ساتھ  
 غبروں بیسار تاز کیا جاتا تھا۔ اگر کھنڈی تھکی سے اپنے اس  
 باپ سے اپنی تکلیف کا ذکر کر بھی دینی، تو وہ دن میرے  
 لیے کسی غذا سے کم نہیں تھا۔ ماس، مسر، دوپور شوہر  
 مار مار کر میرا تازہ حال کر دیتے تھے۔ ایک دن مار چپت

آگے کہا ہوگا؟ میں داناہل کا ہاتھ پکڑے اس کے ساتھ لگ کر چل رہی تھی اور داناہل بھی میرا ہاتھ پکڑے تیزی کے ساتھ اخیان رانسون کی طرف دوں دواں تھا۔

اب میرا اسی علاقہ ختم ہو چکا تھا اور صبح ہونے والی تھی۔ سورج اپنی دروہلی کرکٹیں پہاڑوں کی چوٹیوں اور پہاڑوں کے سر پہاڑوں پر کھینے کو تھا کہ مجھے دور سے پہاڑوں کے نیچے کچھ چھو پہاڑ نظر آئیں جو ہرے بھرے کھنبوں کے بیچ ابنا دو ہزار ایل فریب منظر پیش کر رہی تھیں۔ وہیں کھنبوں میں مرغیاں اٹنے چھوٹے چھوٹے چنڈوں کو لیے میرے گردی تھیں اور گائے چھینیس چارو کھانے میں مست تھیں۔ فرگوٹوں کی ٹولیاں ادھر سے ادھر بھدکنی بھر رہی تھیں۔ میں نو اس حسین منظر کو دیکھ کر اس میں ہی کھدی گئی تھی کہ جاکے مجھے داناہل نے شہ کا دے کر چونکا دیا۔ "کہاں کھو گئی ہو؟" اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، داناہل مجھے لیے ہوئے ایک چھو بیڑی فرا کرے جس میں داخل ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں پر دو خائین بچی ہوئی تھیں، جوڑے پروردی پکاری تھیں۔ ان میں سے ایک نے مجھے ہٹنے کو کہا اور میں ایک طرف ہو کر اس کے سامنے کی طرف بیٹھ گئی۔ داناہل پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ انا سا ستر کے میں بہت تکلی تھی۔ ان میں سے ایک خاندان نے مجھے آرام کرنے کو کہا اور وہ مجھے اپنے ساتھ ایک دوسری چھو بیڑی میں لے گئی۔

چھو بیڑی کے اندر دو زمین پر چھوڑ سے بنی، دوٹی چٹالی چھٹی ہوئی تھی۔ دو آرام کرنے کا کمرہ چلی گئی اور مجھے اس فرش پر لیٹنے ہی خندا گئی۔ شام کے وقت جب میری آنکھ کھلی تو میری نظر میں داناہل کا دواش کر رہی تھیں۔ مجھے بڑے زبردستی بھوک بھی گئی ہوئی تھی۔ میں نے چھو بیڑی سے ہی داناہل کو آواز دہائی تو ایک بڑھی عورت میرے پاس آئی۔ میں نے داناہل کا پوچھا تو اس نے انکار میں سر ہلایا، جیسے کہ اسے کچھ نہیں معلوم۔ میں نے اس کو کہا کہ شہید بھوک گئی ہوئی ہے، مجھے روٹی لاکر دو۔ لڑھی اس نے مجھے روٹی لاکر دے دی میں نے خود سا کھانا کھا اور بڑھی اس میں برتن لے کر واپس چلی گئی۔

میں کھانا کھانے کے چھو بیڑی سے باہر نکلی تو مجھے باہر مرد ہی مرد نظر آئے۔ ان سب کے کانہوں پر کلا شگوف، برافٹس اور ہندو فیس لگی ہوئی تھیں۔ میں ڈر کر

پر دو نہیں مانے، پھر میں نے اپنے گھر والوں کو دیکھی وہ کہ اگر ختم نہ مجھے وہاں دوبارہ بھیجا اور اس سے طلاق نہیں، بلوئی تو میں گھر چھوڑ کر نہیں اور چلی جاؤں گی۔

شام کو شہر مجھے لینے آئے تو امی ابو نے مجھے زبردستی ان کے ساتھ بھیج دیا۔ دوسرے دن میں داناہل سے لٹی اور اس سے کہا کہ وہ مجھے جہاں سے کہیں دور لے جائے۔ داناہل بھی اس شرط پر رضی ہوا کہ ہم بچی کو نہیں لے جائیں گے۔ میں نے داناہل کی نہیں کی کہ بچی میرے بغیر سر جائے گی۔ اس کا کوئی خیال رکھنے والا نہیں ہے، لیکن داناہل نہیں مانا۔ میں نے مجبور ہو کر داناہل کو کہا کہ کل شام مجھے آکر لے جائے۔ داناہل نے رات کا وقت دے دیا۔ میرے پاس اور نو کچھ خانا نہیں، بس دو نمین جوڑے پہنوں کے تھے، اس کی گھڑی بانہہ کر داناہل کا اختیار کرنے لگی۔ گھر والے سارے سوچتے تھے۔ میری بچی مسلسل رو رہی تھی، ان سے ہکا سا بھاری تھا میں نے ایک گولی میں کر بچی کو پلاؤں اور آخری بار اسے اپنی چھالی سے لگا اور اسے ساڑا۔ جب میں گھر سے باہر نکلنے لگی تو میری معصوم بچی کی رونے کی آواز مجھے پھرتے لگی، لیکن میں گھر سے باہر نکل چکی تھی۔ ہن اپنی بھلی بچی کو چھوڑ کر میں آ زاد و فضا میں سانس لینے کے لیے چل چکی تھی۔

میں اور داناہل جب گھر سے نکلے تو باہر طوفان باد و باران اپنی شدتوں پر تھا، جیسے ہم آگے بڑھ رہے تھے دو طوفان کی شکل میں داخل چکا تھا، طوفان میں سنی ریت اُڑ رہی تھی اور ساتھ ہی زردوں کی بارش بھی ہو رہی تھی۔ مجھے درہ کرانی بھول گئی بچی کی باراد رہا تھی، چونہ جانے کس حال میں تھی۔ مجھے تڑپ بھی نہیں تھا کہ کوئی است کرے میں لے بھی جائے گا باد بارانی بارش میں بھینکنی رہ گئی، انا عبرا گھر پہننے کے ساتھ ساتھ بجز نار سے پاؤں میں چپک گئی تھی، جس سے تیز چلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ ہماری کوشش تھی کہ جتنا جلد ہو سکے ہم گاؤں سے دور نکل جائیں۔ بجلی کے کوندے لو گھر کے لیے دھرتی کو روشن کرنے تھے اور پھر وہ بارو وہی تاریک پھا جاتی تھی۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوئی جارہی تھیں اور میں پوری طرح خوف زدہ بھی گئی کہ نہ جانے



دنوں سے زیادہ ایک جگہ پر نہیں رہنے۔ ہم گم نام سی زندگی گزار رہے تھے، مجھ سے دنیاں نے کہا کہ میرا یہاں سے دو گئی اور جگہ پر ایک دوست ہے۔ اگر میں اپنے قبیلے کے درمیان رہوں گا تو ہو سکتا ہے میرے قبیلے میں سے کوئی شخص ہم دونوں کو مار نہ دے۔ دنیاں اپنے قبیلے میں سے مجھے یہاں لے آئی، اس جگہ کا صرف دنیاں کے دوست کو پتا ہے۔ جو بڑھی محبت ہے، وہ دنیاں کے دوست کی جاننے والوں میں سے ہے۔ یہاں دنیاں نے کاشکاری کے لیے کسی مرداوستے زمین لے لی ہے اور ساتھ ساتھ زمینوں پر مزدوری بھی کرنے لگے ہیں۔ دنیاں کو اپنے گھر والے بہت یاد آ رہے تھے اس بات کو لے کر دنیاں اور مجھ سے لڑائی کرتا ہے۔

میں نے اپنے سادے، ابھی کے راتے کھوہے ہیں اپنے گھر والے، اپنی محسوس پتی۔ میں اب کیا کروں۔ صاحب جی، میرے لیے نہ سوال میں لکھتے تھے اور نہ کہنے میں ہے۔ میں بہت مجبور ہو کر واپسی کی سادہ کشتیاں چلا کر لگی ہوں۔

صاحب جی میرے لیے ہر جگہ کاموں کی زمین ہے۔ گھر سے ان لیے لکھی تھی کہ شاید دنیاں کے ساتھ خوش رہوں گی، لیکن یہاں بھی میرے لیے کوئی کٹھ نہیں ہے۔ میں نور پور رہ رہی ہوں۔ مجھ کو گھر سے بھاگنے پر میرے گھر والوں نے مجبور کیا۔ اگر مجھے کسی سے ذرا سنا بھی سکھ لیا تو میں ہرگز گھر سے باہر نہیں نکلتی۔

مجھے پتا ہے صاحب جی، میرے قبیلے والے مجھے ڈھونڈنے پھر سے ہیں اور وہ مجھے ایک نہ ایک دن ضرور مار دیں گے، یہ کہتے ہوئے آسمان کے آنکھوں سے آنسوؤں کے موٹی ٹکڑیاں اس کے گالوں پر بہ گئے۔

”کیا تمہیں معلوم ہے نکاح پر نکاح کر کے تم جرم اور عہد کی مرتکب ہوئی ہو اور قانون کے مطابق تمہیں اس کی سزا بھی ہو سکتی ہے۔“ میں نے قدرے سردی سے انداز میں اس سے کہا۔ میری بات سن کر اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

”میرا خیال ہے تم نے کافی سزا بھگت لی ہے اس لیے انسانیت کے تاجے میں تمہاری مدد کے لیے تیار ہوں۔ میں تم کو شہر لے چلتا ہوں۔ تم وہاں ہر طرح سے

واپس جمہوریت میں آگئی۔ میں اللہ اللہ کر رہی تھی کہ دنیاں مجھے کہاں لے آتا ہے۔ دونوں کے بعد دنیاں آ اور مجھے قبیلے کو کہا۔ میں نے دنیاں سے پوچھا، ”آپ دونوں سے کہاں گئے۔“ اس نے کسی بات کا جواب نہیں دیا، اس نے اٹھا کہا کہ یہاں سے جلدی نکلو ہم بہت لبت ہو گئے ہیں، میں نے کپڑوں کی کٹھڑی جو بندھی ہوئی رکھی تھی اٹھالی اور دنیاں کے ساتھ چلنے لگی۔ کافی دور چلنے رہنے کے بعد میں نے دنیاں سے پوچھا، ”اب کہاں جانا ہے۔“ دنیاں نے کہا۔ ”یہ دوسرے قبیلے والے ہیں، دوسرے گاؤں میں میرے جاننے والے اور میرے قبیلے کے لوگ ہیں۔ وہاں پر ہم زیادہ محفوظ رہیں گے۔“ اب دنیاں مجھے کسی اور کے گھر لے آئے، شاید کسی سردار کا گھر تھا۔ چار دیواریں گارے کی مٹی سے بنی ہوئی تھی اور اندر بھی بچھا نما گھر تھا، گھر کے چاروں طرف در چے بنے ہوئے تھے۔

وہ دن بعد دنیاں ایک مولوی صاحب کو لے آ جاؤ گاؤں کسی مسجد کے پیش امام تھے۔ سفید چوڑے پہنے، سر پر خاک کی کپڑی اور کھنٹی واڑھی اور پھر ہم دونوں کا کھانا پڑھا دیا گیا۔ میں اسی بیچلے پر کام کرنے لگ گئی۔ دنیاں ہم سے دو گنا دن بعد سے ملنے کے لیے آ جاتا تھا۔ میں نے ان سے اپنے گھر والوں کا پوچھا تو اس نے بنا با کہ ہمارے گھر والوں کو ہڈی سے بھاگنے کا پتا چلا تو دو لوگ اپنی زمین اور گھر چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے ہیں۔

دنیاں نے مزید بنا با کہ میرے قبیلے والے ہم دونوں کو ستا رہے ہیں اور وہ ہمارے خون کے پیاسے ہیں۔ کسی نے ہماری خبری کر دی ہے اور اس نے میرے قبیلے والوں کو بتایا ہے کہ ہم اس گھر میں پناہ لے ہوئے ہیں۔

رات کے دو بجے کا وقت تھا۔ کہ مجھے باہر شو کی آواز سنائی دی، پھر ایک دم فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ اس دوران دنیاں بھاگتا ہوا میرے پاس آ اور مجھے کہا کہ بھاگو، ہم پر حملہ ہو گیا ہے۔ میرے ساتھ باقی گھر والی خواہن کو بھی پھیلے راستے سے باہر نکالا گیا۔ دوسری صبح پتا چلا کہ میرے چاچا اور دو گناں اس حملے میں مارے گئے ہیں۔ ہمارا جتنا حرام ہو چکا تھا۔ اس کے بعد ہم ایک دو

خفقار ہوگی۔" اس نے کہا۔

"نہیں صاحب، جی، بس یہی مہربانی ہے۔ باقی تو میں ایک دن اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں مارنی چاہوں گی! بھگت سارنی عمر ڈھکے کے ان کا تنوں پر چلتی رہوں گی۔" اس نے اپنی راستان عالم ستانے کے بعد کھانے کے برتن کھینچے اور اپنے جھونپڑی نما گھر کی طرف چلی گئی۔

راست کے نظر مایا نہیں بچے کا ہفت تھا۔ میں اور میرا ساتھی چرکی پہ موجود تھے کہ ایک دم جھونپڑی کی طرف سے قازنگ کی آواز آئی۔ میں نے اور میرے ساتھی نے رائفل سنبھالی اور جھونپڑی کی طرف بھاگے۔ میں نے اندھیرے میں قازنگ شروع کر دی۔ ہماری جوانی کارروائی سے لڑم فرار ہو گئے۔ ہم جب جھونپڑی میں پہنچے تو وہاں اور اسی خون میں لٹ پت، ناپ رہے تھے۔ میں نے فوراً کھانے اٹھا دی۔ گاڑی پہنچنے سے پہلے ہی دونوں دم توڑ چکے تھے۔ ضروری کارروائی کے لیے لاکھیں فرنی شہر کے سول اسپتال لے گئے۔ ان کے بعد میں نے راسنادر کو بلا کر اسپتال روانہ کیا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ میں ان کے ساتھ کوئی معاملہ نہ ہو جائے۔ میں نے کہا "آپ جیسے جگہ وغیرہ کا بتانا نہیں، پوچھیں اسے خود تلاش کرنے لگی۔" اسپتال روانہ کیا کہ گھروالوں کو بلا کر جہاں وہاں دونوں گھرانوں نے لاکھیں لینے سے انکار کر دیا، پھر ہم نے مل کر اسپتال روانہ کیا جتنا زہر چھوڑا کرتا ہے۔

میں آج بھی اکثر سوچتا ہوں کہ یہ جہالت کی انہنا ہے۔ لوگ اپنی ماں، بیٹیوں، بیٹوں کے ساتھ ظلم کی انہنا کرتے ہیں۔ ماں باپ کا گھر بیٹیوں کے لیے پناہ گاہ ہوتی ہے اور وہاں برود خرد کو محفوظ رکھی انہنا کرتی ہیں۔ اگر ان کے ہاتھ کچھ میں گھر والے ان کا ساتھ نہیں دیتے گے اور ان کو بوجھ سمجھیں گے، تو پھر بیٹیاں کہاں جا رہی ہیں؟ میں تو بس اتنا کہوں گا کہ اگر ہم اپنی بیٹیوں کو نظر انداز کر دیا شروع کر دیں گے تو وہ پھر اسی ہی کی طرح گھر سے نکلنے پر مجبور ہوں گی۔ لیکن ساتھ ہی بیٹیوں سے بھی یہ کہیں گے کہ ایسا تمہارا حق ہے۔ پہلے اپنی ماں سے اپنے خاندان کی عزت کا خیال رکھیں کیوں کہ کہاں سے دکھانہ کبھی واپس نہیں آتا۔

# ... اور



کاشی پتہ بان

نوجوان شاعر کاشی پتہ بان کا خوبصورت شاعری سے سجا مجموعہ کا نام۔۔۔۔۔

## شائع ہو چکا ہے



تم نے سونا بنا کے مٹی سے

مجھ کو مٹی کے بنا کر دیا ہے۔  
وہ شہزادہ رہی کہاں کہاں کے قارئین کے لیے خصوصی  
اسکا ذہن، کتاب کی نسبت میں کتاب آپ کے  
ہاتھ میں نہ کہنی ڈاک خرچ اور نہ کوئی دوسرا خرچ۔  
پاکستان بھر سے صرف ایک S.M.S انہنا کال  
مجھے کتاب کی بے دلیز تک پہنچانی جائے گی۔

## کتاب لے کے:

الفریڈ پبلشرز، دو بازار، کراچی  
دلیل اور دو بازار، کراچی  
مٹی کتب پبلسٹن دو بازار، کراچی

0307-2089080

## واپس لے لے

# آزمائش تجزیاتی

## اسلم فاروقی



یہ مسئلہ عدالت کو جہان کی سرگزشت۔ وہ اپنے ملک سے عداوتوں کا نام و نشان من  
دریغ چاہتا تھا۔ اس مصر کے مال افس نے تو یہ سب کچھ یاد رکھیں، جو اس شخص ہوا

جہان سنا جو صلہ رکھنے والے نے جہان کی زوداد و آخری کرنی

### مذمتہ افسانہ کا خلاصہ

عمران اور اسلان دو بھائی ہیں ایک دوسرے سے شد بد محبت کرنے والے تباہت جہالت مند اور باغی عزت والا کے لیے زمانے سے  
جانے والے۔ یہ دونوں ہمہ الامانی، رنے کے ساتھ بہت زیادہ جہاں بلی بھی ہے جہاں بہت بھگد اور سوچ بچھ کر بچنے کرنے والا۔  
عمران ٹالیک دوست راشد ہے جس کی سند میں لائیں پہنچی ہیں۔ عمران اور اسلان راشد کی لائیں پر سند کی ہیر کے لیے جانتے ہیں۔ ستر  
کے دو دن میں اس لائیں کا راشد کی لائیں پر نام کرنے والے ایک ایسے نام بیٹا نام نہیں اور اس کے ساتھ اس سے جھگڑا ہے۔ ستر راشد کی لائیں میں  
اس کی لائیں کو غیر برائی کام کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ راشد نہیں پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس نکل کے بعد راشد کے پاس  
دھمکی آ میرضون آئے ہیں جس سے امتداد دیا ہے کوئی کسی دے جرائم پیشہ کرور کا آلا کا دے۔ راشد کے کھر حملہ کرنے والوں کا عقلمن  
ایک ایرانی علی اکبر مشیدی سے ہے جو ایک بین الاقوامی گینگ کا زان ہے۔ راشد کا مراد ہو جاتا ہے اور مشیدی کے ذریعہ عمران اور  
اسلان کی ایسے شائستہ کو کھر سے انحرار کر کے لے جاتے ہیں۔ دوسری طرف پولیس عمران کو کھانے لے جا کر شدہ کھنگرے گا کھانے پھانسی  
ہے۔ کھانے میں عمران پر شدہ بدنامہ کا سلسلہ باقی ہوا ہے کہ اسلان اسے ماضیوں کے ساتھ اسے وہاں جھڑانے آیا ہے۔  
عمران جب کھر پکڑتا ہے تو اس کے کھر ایسے خصوصاً چھوٹا بھائی عدان اس کی حالت پر سخت پریشان ہو جاتا ہے۔ اسی وہ عدان میں  
پولیس عمران کے کھر پر ڈھکرتی ہے اور اس کے کھر سے بہرہ منی مراد کو کھتی ہے۔ عمران کی والدہ کا انتقال ہوا جاتا ہے۔ اس کے والد  
بھی اس نام کے باعث آئی کی چھوڑ کر موت کے سہان ہو جاتے ہیں۔ عمران اور اسلان تم سے خود حال نئے جہان ان کے چھوٹے بھائی  
عدان پر شدہ سزا ملائی ہو گیا تھا۔ اس باب سے کھر منی کے بعد ان کی وہ بہت گروں اور پولیس سے جنگ چاری ہوئی ہے کہ انہیں  
سلطون ہونے کے بعد عدان میں اس کا کھس بننے والا پیر حرمی پولیس کے ماتھل گیا ہے۔ انہیں اطلاع دینی ہے کہ شائستہ نے خود کو کھتی  
کر لیا ہے۔ عمران اور اسلان اپنی ممان کے انوکھا کھ مشیدی سے اپنی میں شائستہ کی ڈھب بازی کا مطالعہ کرتے ہیں۔ عمران اور  
نبو شائستہ کو کھتی کرنے کے نام کھان کے لائیں پر پھینچ جاتے ہیں کھر شائستہ حاکم نانا کے کھنوں کو کھتی کے پھیلے ہی فرار ہو جاتی  
ہے۔ جہود حاکم نانا کو پکڑ کر دیا ہے۔ اور دونوں حاکم نانا کے سب سے ضروری کا کھانے کے کو پھانے سے کھ جاتے ہیں۔ مشیدی  
فون کر کے ان کا کھانے میں سے ایک پر ڈھکائی کا کھانہ کھتے کھر عمران اسے نکل دینے سے انکار دیتا ہے۔ کھنوں پر مشیدی اور  
عمران کی کھن کھائی ہوئی ہے۔ مشیدی اسے ہلکے پاں دیتا ہے اور ملٹری اسٹیبلشمنٹ اس کے پیچھے لڑ دیتا ہے۔ اسی دوران میں عمران  
کا ایک دشمن ٹی بلون عمران سے ملتا ہے۔

پانچ سو چھ سو شہدائی کا آؤں ہے لیکن اصل میں وہ عمران کے لیے کام کر رہا ہے۔ انبار میں ہر چہوش ہے کہ صرف تاجی کا رنگ اور تاجی مہر لہو پر راہبوت کو ہوش میں پر اسرار طور پر آؤں کر دیا گیا ہے۔ عمران اس اہمیت سے واقف ہے کہ آؤں ہونے والا دراصل "تاجی" کی ایک نفاک اور فونی وکین ڈاؤن تھا۔ جو کرشتہ بائیس برس سے پاکستان میں تھم رہا۔ وہ بے خطرات و غبار کو سمیٹا کر تاجی چاہے جس اور اس سے جس ان کے ذہن میں صرف انگلیش روزانہ سے کے چیف ایڈیٹر اور کالم نگار و کارکن کا کام آتا ہے۔ عمران اس کے ذہن کو کر کے ملاقات کے لیے کھات اور اپنے ہمراہ ہاشم کو بھی لے جاتا ہے۔

عمران دھار گھس گاؤں پہنچنے پر مجھے ہی کے بارے میں بتاتا ہے کہ کبھی اس لوگوں کی دشمنی شہدائی سے ہوئی اور لوگ انسان کو مراد سمجھتے رہے۔ جب کہ وہ وہاں کی قبائلیوں میں ہے۔ جب دھار گھس آؤں اپنے گھر آجائے اور "تاجی" کی قید میں رہنے کے واقعات کی تفصیل بتاتے ہیں۔

دو دن عمران کو بتاتا ہے کہ اس کی بہن شائستہ کا پتہ چل گیا ہے اور وہ تفصیل بتاتے مگر آ رہا ہے۔ غریب شائستہ کے تعلق بتاتا ہے کہ وہ آؤں چل میر پور خاص میں گئی ہے۔ عمران اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شائستہ کی تلاش میں میر پور خاص کے لیے روانہ ہو جاتا ہے۔

میر پور اور اجائی فونی علاقہ اور چار گھنٹا ڈیڑھ ہے۔ چار وقت اور ملین کا راستہ ہے۔ عمران میر پور اور گھس گاؤں کی پتہ سے اور شائستہ کے تعلق بتاتا ہے کہ وہ چار گھنٹہ کی قید میں ہے۔ میر پور اور لوگوں کو کھنسی دینا ہے اور کہتا ہے کہ اگر اس چوٹی کی تلخ مسدود







# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائٹ لٹک ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

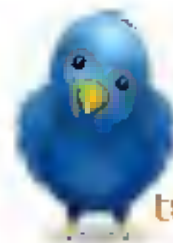
# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”جہاں میں یہی تو طے کرنے آیا تھا۔ نام نہیں بنا دوں گی۔“  
 ”ہم اپنی کارروائی دو بجے کے بعد ہی کریں گے۔“ میں نے کہا۔ ”اس وقت عمو باہل کا اسٹاف بھی اتنا مستعد نہیں  
 ہوتا اور کمروں میں مقیم لوگ بھی گہری نیند میں ہوتے ہیں۔“  
 ”ٹھیک ہے دلیرا! بلوچ نے کہا۔

”پھر میں ایک بجے تک یہاں پہنچ جاؤں گا۔“  
 وہ جانے کے لیے اٹھا تو میری نظر تھور پر پڑی۔ وہ نہ جانے کس وقت خاموشی سے کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔  
 بلوچ کے جانے کے بعد تھور نے کہا۔ ”بھیا! کہاں جانے کی تیاری ہے اور وہ بھی اتنی رازداری کے ساتھ؟“  
 ”تم نے سن تو لیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟“ میں مسکرایا۔  
 ”میں نے صرف اتنا سنا ہے کہ آپ دو بجے کے بعد بعد کسی ہوٹل میں کوئی کارروائی کریں گے۔“ تھور نے مزہ بنا کر  
 کہا۔ ”مشید ہی کے ایک کرائے کے قافلے کا سرانجام ملے۔“ میں نے کہا۔  
 ”وہ شیراز میں مقیم ہے، ہم اس کے چیکر میں وہاں جا رہے ہوں۔“  
 ”اور آپ نے مجھ سے مشورہ کرنا تک گوارا نہیں کیا۔ مجھے وہ وہ کی کبھی کسی کی طرف نکال کر بیٹیک راپا؟“ اس کے لہجے  
 میں شکایت سے زیادہ احتجاج تھا۔ ”کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میری موجودگی کی وجہ سے آپ کا کام بگڑ جائے گا؟“  
 ”الحق یہ تو تم؟“ میں نے بس کر کہا۔  
 ”ابھی میں نے صرف بلوچ سے بات کی ہے، میں نے یہ کب طے کیا ہے کہ میں وہاں آئیلا جا رہا ہوں، ظاہر ہے،





میں نم سے بھی شکار دروں کا اور ہاشم سے بھی۔ ہم سب مل کر بی بی پلاس زینب وہاں سے۔

”نوبھیر میں ہاشم بھائی کو بھی بلا ہی لوں۔“ تھوڑے ہی عرصے میں بھیدگی سے کہا۔

”اس کے ہانسنے سے پہلے ہی ہاشم کمرے میں داخل ہوا، نمودار میں کر بلا۔“ ادرے میں نے آپ کا نام لیا اور آپ آگے۔“

میں نے ہاشم کو بھی بتایا کہ ہم آج کی سمن پر جا رہے ہیں۔

”میرے خیال میں رہاں زیادہ بھینز بھاز مناسب نہیں رہے گی، میں اور تیمور ہوں گے لارنج میں بیٹھ کر آپ کا انتظار کریں گے بلکہ آپ اب اس کمرے کے سائل ڈرن پر میرا بیویور کا نمبر ڈال کر کے اسے اپنا جب میں ڈال نہیں اور اس کا اسیکر ان کریں تاکہ ہمیں صبرت حال کاظم رہے۔“

”اسٹیج آن کرنے میں ایک خدشہ یہ بھی ہے کہ اگر اضافی طور پر ہوں گے کسی ملازم یا عورت سہارا کی بات ہو گئی تو ہمارا شکار خور چو کنا ہو جائے گا۔ تم فکر مت کرو، میرے فون کا نمبر ڈرن بہت حساس ہے اور وہ وارڈ گرد کی آوازوں کو بالکل واضح انداز میں سچ کر لیتا ہے، پھر اس وقت تو بالکل سنا نا ہو گا، صرف میری بلوچ باس نمبر ملکی کی آواز ہوگی۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ ہاشم نے کہا۔

”تیمور! تمہارے ایک شجر کی ضرورت پڑتی گی۔“ میں نے کہا۔

تیمور کھسکا ہوا کہہ بولا۔ ”آپ دروں شجر اپنے پاس ہی رکھ لیں، یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے کی بات ہے؟“

☆.....☆

اس مشن کے لیے ہاشم نے لینڈ کرورز کا انتخاب کیا تھا، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس گاڑی کا انجن بہت مضبوط ہوتا ہے اور سری اور ایم بی جی کو اس کی سٹیوں کے نیچے ہاشم نے خفیہ خانے بنا رکھے تھے اور ان میں ہر طرح کا اسلحہ تھا، اب درست ہے کہ ہمیں ہوں گے اندر اس کی ضرورت نہیں پڑ سکتی تھی، لیکن ہوں گے باہر بھی کسی قسم کی صورت حال سے واسطہ پڑ سکتا تھا۔ لیکن یہ وہ فکری اکیلا نہ ہوا ہوں گے اور اگر شہیدانی بااں کی اپنی کر سئل تنظیم کے کچھ آدمی موجود ہوں۔

ہم رن سنٹ کے اندر اندر شہرین پہنچ گئے، وہاں ٹیم سب پر حسب معمول نمودار تھا، ان کے ساتھ ہاشم بیٹھا تھا۔ میں اور بلوچ گاڑی کی عملی نشست پر تھے، ہمارے جھوسوں پر اس وقت بہترین سوٹ تھے، جیسے صاف جھوس ہو رہا تھا کہ بلوچ کوٹ میں خاموشی اور سمن جھوس کر رہا ہے۔

نمودار گاڑی کو سدھا ہوں گے بلوچ میں لے گیا، اس نے ہمیں رہاں ڈراب کہا اور گاڑی ہوں گے کے مکان کے دروازے کی طرف بلا حارنی۔

گت پر کھڑے ہوئے دربان نے ہمیں سلام کہا، جواب میں بلوچ نے دربان کے ہاتھ پر پانچ سو روپے کا نوٹ رکھ دیا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو ہوں گے میں ہارنی فون سے زیادہ رہنی تھی، گاڑی کو کھڑک بھی خاصا مستعد اور چاق چو بند لگ رہا تھا۔ میں نے جب سے سئل فون نکالا اور گاڑی کی طرف دیکھے بغیر ہاشم کا نمبر ملا تا ہوا گفت کی طرف دیکھنا چلا گیا۔ بلوچ میرے پیچھے پیچھے اس کو سب انداز میں چل رہا تھا جیسے میرا سکر ہٹنی ہو۔

ہوں گے میں داخلے کے وقت بھی اس نے بہت سست فیز حرکت کی تھی، وہ ایکسپریس گزرنے کی بجائے وہاں کھڑے ہوئے سیکورٹی گاڑی سے بغل گبر ہو گیا۔ گاڑی بھی شا جاسے جاتا تھا اس لیے وہ میں اس سے خوب کھل کر باتیں کرنے لگا۔ ان کی گفتگو کے دوران میں، میں نے اپنا سئل فون اور جاہاں وغیرہ ایکسپریس سے ہونے آئینڈ پر ہمیں اور خور بھی ایکسپریس گزرنے بغیر در سری طرف جا کر جاہاں اٹھا لیں اور بلوچ کی طرف دیکھا۔

اس نے جلدی سے کہا۔ ”سودی سر بہ سندن بعد ملا تھا ان لیے۔“ پھر وہ سیکورٹی گاڑی سے ہاتھ ملا کر تیزی سے میرے پیچھے آ گیا۔

ہم گفت کے نزدیک پہنچے تو وہاں پہلے سے ایک امریکن لڑکی اور دو مقامی افراد موجود تھے۔

گفت میں سوار ہونے کے بعد جب لڑکی نے پانچویں فلور کا نمبر دیا تو میرا ہاتھ کھڑک کیوں کہ میں بھی پانچویں فلور پر



جاٹا، وڈاں مردوں میں سے ایک نے چھٹے اور دوسرے نے آٹھویں فلور کا بین دیا تھا۔ لفت میں اس وقت لفت ڈالنے بھی سوچو نہیں تھا، ممکن ہے رات کے ان پہراں لوگوں کی زبونی آف ہو جاتی ہو۔

لفٹ پانچ سو فلور پر پہنچی ذرا لڑکی باہر نکلی، ہم بھی لفت سے باہر آ گئے، ہمیں کمر نمبر پانچ سوسات میں جاٹا، لڑکی کا رخ اسی طرف تھا جہاں کمر نمبر پانچ سوسات تھا۔

یہ ایک نئی پریشانی کھڑی ہو گئی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر ان لڑکی سے پوچھا۔ "ایکسکو زی مس؟ کہا آپ بتا سکتی ہیں کہ روم نمبر کیا تھا، وہاں کس طرف ہوگا۔ میں یہاں پہلی دفعہ آیا ہوں۔" میرا لہجہ خالص امریکن تھا۔

"روم نمبر کیا تھا، وہاں؟" لڑکی زبرد بڑبڑائی۔ "مجھے فائدہ سہاں میں جا ہے، آپ کا سٹلو یہ روم اس کے سامنے یا پھر برابر میں ہوگا۔" اس نے جواب دیا، اس نے روم نمبر پانچ سوسات کا نام لیا تو میری کنوپی پھٹک سے اڑ گئی، اس کا مطلب تھا کہ یہ لڑکی بھی اس کمرے میں جا رہی تھی۔

وہی انگٹس نوبل جی بھی سمجھ لیا تھا، تو اس سے کہیں زیادہ انگٹس نہ صرف سمجھتا تھا بلکہ بول بھی لہتا تھا۔

اس کے چہرے پر بھی پریشانی کے اثرات تھے۔

میں نے مسکرا کر لڑکی کا شکریہ ادا کیا اور چلنے لگا۔ لڑکی لہرائی، مل کھائی، ہم سے آگے چل گئی۔

بلوچ نے کہا۔ "یہ ہمارے لیے پریشانی کی بات نہیں بلکہ آسانی ہو گئی۔" دوسرے گٹی میں بول رہا تھا۔ "اب ہمیں کمرے کا دروازہ کھولنے میں بھی کوئی دشواری نہیں ہوگی۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے قدم بڑھانے لگا۔

دوم نمبر پانچ سو آٹھ اس کمرے کے عین سامنے تھا جس میں ہمیں جاٹا تھا۔

ہم کمر نمبر پانچ سو آٹھ پر پتھر گئے، لڑکی نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی، اندر سے کوئی ہماری آواز میں بولا۔

"کون ہے؟"

"انگلی،" لڑکی نے جواب دیا۔

ہم یہ ظاہر نہ کرنا چاہتے تھے کہ وہ کمرے کی طرف دیکھ دے تھے لیکن بنیادی ساری توجہ اس لڑکی کی طرف تھی۔

فواد ہی دروازہ کھل گیا اور کسی نے خفیف سا دروازہ کھول کر اس بات کی تصدیق کی کہ دروازے پر واقعی انگلی ہے یا پھر کوئی اور ہے۔ دو دن سے کا رخ ایسا تھا کہ اندر سے رکھنے والے کی نظر ہم پر نہیں پڑتی ہوگی۔

ان نے انگلی کے لیے دروازہ کھول دیا۔ اس وقت اس کی نظر ہم پر پڑی، انگلی اندر داخل ہوئی اور اس سے پہلے کہ دروازہ بار بند ہوگا، بلوچ بھی کی طرح لپکا اور دروازہ کھولنے والے کو دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ میں بھی لپک کر ان کے پیچھے اندر داخل ہو گیا۔

میں نے اس کے دروازہ بند کر دیا اور فواد ہی اسے لاک کر دیا۔

یہ سب چند لمحوں میں ہو گیا، لڑکی نے توجہ کے لیے منہ کھولا لیکن میں نے لپک کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اس کی توجہ پر لپکا سا ایک ہاتھ رکھ دیا، دوسرے ہی لمحے اوپر نیچا ہوں میں جھول گئی، میں نے اسے دو تلی سے بند پر پھینک دیا۔

بلوچ اس شخص سے گھم گھماتا تھا، ان نے روم میں گھسنے ہی بری طرح جگڑنے کے سے چکر ادا کر دیا تھا۔

وہ لہباڑا امریکن تھا، اس کے جسم پر چھک کی طرح گھنے بال تھے، ان وقت وہ صرف ایک برس داڑھا ڈاڈ میں لہوئی تھا۔

جسم پر زبان تک نہیں تھی، اس کے سر کے بال بہت گھنے اور بڑا ڈان تھے اور جسم کسی گیند سے کی طرح مضبوط تھا۔

میں نے آج ایک ریل اور لوڑکا لایا، وہ اس سے کہا۔ "بس رک جاؤ، درندہ..... میں نے اپنا جملہ اہورا جھوڑ دیا۔

دیواروں کے گرد دیوں ساکت ہو گیا جیسے چالی سے چلنے والے کھلونے کی چابی ختم ہو گئی ہو لیکن اس کے چہرے پر خوف یا دہشت کے آثار نہیں تھے۔

"کون ہو تم لوگ اور یہ کون سا طریقہ ہے کسی کے کمرے میں داخل ہونے کا؟" وہ درشت لہجے میں بولا اور ہنسی کی پشت سے اپنے ہونٹوں سے سینے والا خون صاف کیا تھا۔

بلوچ نے اس کے چہرے پر خاموشی زور دار کر داری تھی، مجھے یقین تھا کہ اس کا ایک آدھ دانت بھی مل گیا ہوگا بلوچ کی ان کمرے سے دو ٹائٹس آباٹھا ہرنے وہ یقیناً بلوچ کو بھی لگتی کرتا۔

ایسا خون دیکھ کر زورہ آپنے سے باہر ہو گیا اور صبح کر بولا۔ "میں پوچھ رہا ہوں کہ تم لوگ کون ہوا اور یہاں کیا لہنے فٹے ہو؟" پھر وہ طنز بھری لہجے میں بولا۔ "اے جیسے میرا نام ہو نہیں کے لا کر میں محفوظ ہے۔"

پھر میں نے اسے غیر محسوس انداز میں ہینڈ کی سائیڈ ٹیبل کی طرف سرکے دیکھا۔

"اپنی جگہ سے حرکت کر دو گے نہ کوہ پڑنی زریوز کی طرح بکھر جائے گی۔" میں نے کزخت لہجے میں کہا۔

"تم آخر ہوں؟" میں نے آگے ہلا کے اس کے منہ پر پھینک مارنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش مجھے مچھی پڑی۔ اس نے ذیک قدم پیچھے ہٹا کر دوسرے پیر سے پیرتے پیرتے پھر ہولناک رسید کر دی، جس فوجیل کر کر کے کی دہوار سے نکرا ہوا۔ میری آنکھوں کے آگے نیلے پینے دائرے سے دھس کرنے لگے اور اب محسوس ہوا جیسے سانس لینے میں اٹک گیا ہو، میں نے سر ہٹک کر اپنے اوسان بحال کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ کئی چیز اڑتی ہوئی میری طرف آ رہی ہو، جس غیر شعوری طور پر بیٹھ گیا۔ وہ غیر ملکی فٹا جس نے مجھ پہ چھلانگ لگائی تھی لیکن اب ریوار سے کرا کر میرے ہی اوپر زہیر ہو گیا تھا۔

میرنی حالت اب ندرے سنبھل چکی تھی۔

میں نے ان کے دانتے بال اپنے دائیں ہاتھ سے پکڑ کر انہیں بے رحمی سے کھینچا اور جب اس کا پیر میرے سامنے آ باز میں نے اس کے چہرے پر اپنی زور سے کھینچا اور اس کے کئی دانت ٹوٹ گئے۔ ان کے طاق سے کسی زخمی زرنے کی کسی غرابت تھی اور اس نے مجھ کو بارہ جا کرنے کی کوشش کی لیکن یہ جملہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی اندھا نم جان، وہ کابے دھن کر مارنے کے لیے ہوا میں لالچی چلانا۔

میں نے بیٹھے ہی بیٹھے اسے اپنی روزوں ٹانگوں کے ذریعے زور اجمال دیا، پھر میں نے اچھیل کر کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن مجھے احساس ہوا کہ کبھی مجھ میں وہ ذراہ نہیں ہے جس کے ذریعے میں بیٹھے بیٹھے اچھیل سکوں۔

"کیا نام ہے میرا؟" میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

میرا نام ابلیتی ہے۔" وہ دانتے ہوئے بولا۔ "اور تم لوگوں کو ب حرکت بہت مچھی پڑے گی، میں سہارا سے ہی ملک کے اعلیٰ حکام کے کہنے پر یہاں آباٹھا اور یہاں ٹیلی کمیونی کیشن کے شعبے میں سربراہی کرنا چاہتا تھا، میرا سفارت خانہ ایک طوفان برپا کر دے گا۔"

"اچھا تو اس بہت درجگی۔" بلوچ نے کہا۔

"یہ بتاؤ تم یہاں کس کی دعوت پر آئے تھے؟"

"لیکن میں نہیں کہوں بناؤں تم مجھ سے یہ سوال کرنے والے ہوتے کون ہو؟"

رہ فرش پہ بیٹھا، دانتھا، جواب میں بلوچ نے اس کے سینے پر زور دار لات رسید کرنی اور اہت کے برلا۔ "سوال کرنے کا حق صرف ہمیں ہے۔"

وہ اچھیل کر سائیڈ ٹیبل کے پان گراہ، ہیں اس کا سیل ڈن رکھا ہوا تھا، اس نے ہاتھ ہلا کر سبیل نوٹ اٹھانے کی کوشش کی لیکن بلوچ کی ردی لات لائے اسے زور بارہ زمین پر بھیٹک دیا۔

"تم یہاں ٹیلی کمیونی کیشن کے شعبے میں سربراہی کرانی کرنے فٹے ہو؟" میں نے طنز بھری لہجے میں پوچھا۔

"تم کیا کہو گی کیشن کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

"میں اسٹیشن (Slates) میں اپنی ٹیلی کمیونی کیشن سمیٹی چلا رہا ہوں، اس نے وہ بارہ ہینڈل کی پشت سے منہ سے بیٹے والا خون صاف کیا۔"

"بلوچ! میں نے کہا۔" اس کے کمرے کی چلائی لہ۔" یہ جملہ میں نے زورہ میں دیا کہا تھا۔"

بلوچ نے پہلے اس کی الماری کھولی، اس میں کپڑوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ صرف ایک سوٹ تیس تھا۔ بلوچ نے وہ بریف کیس نکال لیا۔ ایڈی ٹریپر کہ ہوا۔ ”تم بریف کیس رکھ دو، اس میں میرے انتہائی ضروری ڈاکومنٹس ہیں اور میرے برائے کا پلان ہے۔“

”فاسوشی سے لڑنا جگہ پرے رہو۔“ میں نے ذہت کر کہا۔ پھر بلوچ نے بیڈ کے سائیزریک پر رکھا، وہ ایپ ٹاپ اٹھایا، اس کا کور بھی اس کے نزدیک ہی پڑا تھا، اس نے ایپ ٹاپ کور میں ڈال کر اپنے کندھے پر لٹکا لیا۔

”وہ کچھ تم لوگ اچھا نہیں کر رہے ہو!“ ایڈی نے کہا۔

”اس ایپ ٹاپ میں میرا انتہائی اہم ڈیٹا ہے۔“ ایڈی نے بڑبڑائی انداز میں کہا۔ ”میرا فارت خانہ تمہیں چھوڑے گا نہیں۔“

”اب یہ کیوں کرے تو اس کے منہ میں کچھ کاغذات فموس ڈیٹا۔“ میں نے بلوچ سے انگریزی میں کہا تھا کہ ایڈی بھی سمجھ جائے۔ ”اور اس کے ہاتھ پیر بھی باندھ دو۔“

”میں تو کہتا ہوں تاکہ اس کی کٹوری میں ایک گولی اتار دیں تاکہ یہ کبھی بولنے کے قابل ہی نہ رہے۔“

”تم اس بھرے ہندے ہوٹل میں مجھے گولی نہیں مار سکتے۔“ اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

”تم فکر مت کرو، میرے رپولور پر سالٹس چڑھا ہوا ہے۔ کبھی کوکانوں کا انجن نہیں ہوگا۔“

”ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے بلوچ!“ اس لیے تلاشی ذرا جلدی لے لو۔“

بلوچ نے اپنی جیب سے واٹھی سالٹس نکال کر مجھے دے دیا اور ہوا۔ ”اب اگر ذرا سی بھی آواز گالے تو اس کی کٹوری میں گولی اتاری دینا میری ہے۔“

یہ کہہ کر وہ پھر تلاشی میں مصروف ہو گیا۔

اس نے بیڈ کے سائیزریک تو پہلے ہی دیکھ لیے تھے، پھر بلوچ نے جیک کر بیڈ کے پیچھے کی کوشش کی۔

یہ اس کی غفلت تھی کہ وہ بیڈ کے نیچے جھانکتے وقت نہ صرف ایڈی کے بالکل نزدیک ہو گیا بلکہ اس کی طرف سے

بالکل بے پروا بھی ہو گیا۔

ایڈی ایسے ہی کسی سوئیچ کی تلاش میں تھا۔

اس نے سمجھ کر بلوچ کی گردن اپنے دونوں مضبوط ہاتھوں میں جکڑ لی اور غرا کر ہوا۔ ”اپنا رپولور پینک دو سبز پیر دور نہ تیار ہے اس سائیکل کی گردن میں، اجس کی تلی کی طرح توڑ دوں گا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بلوچ کے جسم کو پلٹ کر اپنی ذحال بنالیا۔ ”جلدی کرو۔“ وہ غرا ہوا۔

”میرے پاس بھی وقت بہت کم ہے۔ مجھے لوگوں کی گردن توڑ کر بہت تسکین ملتی ہے۔ دینا بھر میں انڈر ولڈ کے لوگ مجھے ”گردن توڑ جگڑ“ کے نام سے پکارتے ہیں۔“

اس کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ مجھے محسوس ہوا، یہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ کبھی گزرے گا۔

بلوچ کا رخ صحت کی طرف تھا اور وہ ایڈی کے جسم پر تقریباً پلٹا ہوا تھا، اس صورت میں نہ وہ اپنے ہاتھوں سے کام لے سکتا تھا، نہ اس کی گرفت سے اپنی گردن چھڑا سکتا تھا۔

میں نے مجبوراً اپنا رپولور فرش پر پینک دیا۔

اس وجہ کا مشتق میں بلوچ کا رپولور بھی گر گیا۔ ایڈی نے فوراً وہ رپولور اٹھا لیا اور بلوچ کو اپنے جسم سے سانس کی طرف نکیل کر خود پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بیٹھنا چاہتا تھا اور نہ اپنی پھرتی کی توقع کسی عام آدمی سے نہیں کی جاسکتی۔

بلوچ نے تلاشی کے بعد اس کا بریف کیس، ایپ ٹاپ، سیل فون، والٹ سب ایک ٹیکہ کے غلاف میں بھر کے اسے سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

”اب تم بتاؤ کہ تم کون ہو اور یہاں کیا لینے آئے ہو؟“ ایڈی غرا کر ہوا۔ ”تمہارے ساتھی کے رپولور پر بھی سالٹس فٹ ہے اس لیے فائر کرنے میں مجھے کبھی کوئی مشکل نہیں ہوگی، جلدی کرو، میرے پاس بھی وقت کم ہے۔“ اس نے

ریوالور اور اکر کہا۔

بلوچ اب کافی حد تک سنبھل چکا تھا اور اوشو کے کھڑا ہونے پر ہاتھ اٹھائی دھاوا۔ ”تم وہیں لیٹے رہو۔“ بلوچ ایک مرتبہ پھر لیٹ گیا لیکن مجھے اس کے چہرے پر شدید غصے اور بے بسی کے تاثرات نظر آ رہے تھے۔

اچانک کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی، میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔  
”کون ہے؟“ ایڈی نے درشت لہجے میں پوچھا۔

”دروازہ کھولو ایڈی۔“ باہر سے کوئی خاص امریکن لہجے میں بولا۔ ایڈی کے چہرے پر چمک سی نمودار ہوئی اور اس نے پھرتی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

دوسرے ہی لمحے تین آدمی دھناتے ہوئے کمرے میں گھس آئے۔ میں باپس ہو گیا، میرا خیال تھا کہ آنے والے تیور اور باہم ہوں گے، میرا سٹیشن اب بھی آن تھا اور وہ ہماری ایک ایک بات سن رہے ہوں گے۔

”کون تو تم؟“ آنے والے نے پوچھا، وہ بھی امریکن ہی تھا، پھر اس نے زمین پر لیٹے ہوئے بلوچ کو دیکھا اور بولا۔ ”ایڈی! تم نے تو دشمنوں پر پہلے ہی قابو کر لیا ہے۔“

بلوچ غیر محسوس طریقے پر کھسکا، اس ریوالور تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے اچانک وہ ریوالور اٹھا کر میری طرف پھینک دیا۔ میں جانتا تھا کہ بلوچ نے اپنی پنڈلی پر کوئی ٹھہرا ہوا ہتھیار رکھا، ہوا گیا اس کے پاس کوئی دوسرا ریوالور بھی ہوگا۔

ایڈی سمیت اب دو چار ہو گئے تھے اور یہ ایک وقت ان ”شارپ شوٹرز“ سے نہیں منٹ سکتا تھا۔

ریوالور تو میرے ہاتھ میں آ ہی چکا تھا..... میں نے کمرے میں چلتے ہوئے واحد امریکی سپورٹ گن نشانہ بنایا۔ کمرہ دوسرے ہی لمحے تاریکی میں ڈوب گیا۔ پھر گولی کی آواز کے ساتھ ہی اک کرب ہاک انسانی چیخ بھئی سنائی دی۔ گویا بلوچ بھی ایکشن میں آ گیا تھا۔ گولی لگنے ہی ان لوگوں نے بھی شاید کسی قسم کی حرکت نہ کرنے میں بہتری نہ تھی۔

دوسرے ہی لمحے میں ایک جست میں کمرے سے باہر تھا۔ بلوچ بھی چھٹل کی طرح رینگتا ہوا باہر آ گیا تھا۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ اس کے ہاتھ میں تھے لاؤ خلاف بھی تھا جس میں اس نے ایڈی کا سامان بھرا تھا۔

مجھے یہ فکر بھی تھی کہ نارتھ کی آواز سن کر ہوش کی سیکورٹی کا عملہ حرکت میں آ جائے گا۔

کمرے میں جو لوگ موجود تھے وہ باہر نکلنے کی جرات نہیں کر سکتے تھے۔ ان لوگوں نے اوپر آنے سے پہلے لفٹ میں ایک اسٹوپل پینسا کر اسے روک لیا تھا۔ مجھے ذہن پر بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سن آ رہی تھی۔

ہم دونوں کچھ دور تک کرا لٹک کرتے رہے، پھر تاج کی پردا کیے بغیر اٹھ کر بھاگے، وہ کوری ڈور آگے جا کر اٹھریزنی کے حرف ”ٹا“ کی شکل میں گھوم گیا تھا۔

ہم دوسری طرف کمرے میں تھے کہ ہمیں زینے پر بہت واضح طور پر بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔

اب ہم لفٹ کے ذریعے بھی نیچے نہیں آ سکتے تھے کیوں کہ لفٹ تک پہنچنے کا راستہ بھی زینے کے پاس ہی سے گزرتا تھا۔

میں نے ایک کمرے کے دروازے کے پنڈل پر ہاتھ رکھا تو دروازہ اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔

اندر کمرہ کی بناوٹ کچھ ایسی تھی دروازے اور کمرے درمیان چھوٹا سا ایک کوری ڈور تھا، کمرے میں کوئی بلی کی آواز میں ہنساتا مجھے احساس ہوا کہ یہ کرا خانی نہیں ہے بلکہ اس میں کوئی ٹھہرا ہوا ہے۔ دوسرے ہی لمحے مجھے نسوانی آہنی کی آواز سنائی دی اور کوئی عورت بولی۔ ”دیکھو کمال! اتھاری خاطر میں نے اچھا ہتھیار سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ اب تم مجھے دھوکا دینے کا تصور بھی مت کرنا ورنہ میں اپنی جان داؤدے دوں گی۔“

”کیسی باتیں کرتی ہو سارا؟“ کسی مرد کی آواز آئی۔ ”میں بھی ملتان کی بھری جا کیر چھوڑ کر آیا ہوں لیکن تم فکر مت کرو۔ میرے اکاؤنٹ میں اتنا روپیہ ہے کہ میں یہاں کوئی بہت اچھا اور بڑا کاروبار کر سکتا ہوں، پھر میرے باہمی زیادہ دن مجھ سے ناراض نہیں رہیں گے۔ ہاں تمہارے تو چوہدری کرم دین اور تمہارے بھائی کلبا زیاں اور وہ نظریں لے کر تمہاری تلاش میں گھوم رہے ہوں گے۔“



میرے پیچھے پیچھے بلوچ بھی اندر آ گیا تھا۔ اس نے دروازہ بولٹ کبانو ٹھکی سی آواز آئی۔  
سائر خوف زور لہجے میں بولی۔ ”کمال! دروازے پر کوئی ہے!“  
”دروازہ لاک ہے۔“ کمال نے کہا۔

”آخرون ہو سکتا ہے؟“ پھر وہ کچھ خوف کے بعد بولا۔ ”تم گھبراؤ مت، میں دیکھتا ہوں۔“  
کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی، پھر کسی کی بہت خفیف سی آہٹ سنائی دی۔  
میں نے ہلکے جھپٹے ہیں اپنے ننگی ہونٹوں سے دیواروں کا لگا لگا اور ایک دم اس کو رینڈور سے نکل کر اس کے سامنے آ گیا۔  
آنے والا مجھے دیکھ کر ہلکا ہلکا رہ گیا، رہا اور دیکھ کر گواہ سے سکتے ہو گیا۔  
بلوچ نے جب لگائی اور اس عورت تک پہنچ گیا جو نہ کھول کر چہنہ ہی والی تھی۔

بلوچ نے اس کے منہ پر اپنا ہاتھ لگا دیا اور سناک لہجے میں بولا۔ ”اگر تمہارے قلعے سے زرا سی بھی آواز نکلی تو میں  
نہایتی کسوڑی آؤ اور اس کا۔“  
عورت کیا وہ نہیں بائیس سال کی خوب صورت اور پرکشش لڑکی تھی، بلوچ کو کچھ گورہم کر رہی اور اس کی چیخ طعن  
میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔

”کنگ..... کون ہو؟“ کمال نے جلا کر کہا۔ ”سائرو..... کو..... میں ذرا دینی..... اپنے..... ساتھ نہیں..... لا جا  
ہوں..... بلکہ..... بیانیٹی مرضی سے..... آئی ہے۔“ کمال نے رک رک کر کہا۔  
”خاموش رہو۔“ میں نے اسے جھڑک دیا۔ ”یہ تمہارا اور سائر کا معاملہ ہے، ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں کہ تم اسے  
انوار کے لائے ہو یا خود ہی تمہارے ساتھ آئی ہے۔“  
”پھر..... تم..... لوگ..... کون ہو؟“

”کچھ بد معاش ہمارے پیچھے ہیں۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔  
”میں نہیں بکھڑے کے لیے یہاں بنا، چاہے ہماری ذات سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“  
میری بات سن کر کمال کی جان میں جان آئی اور وہ دلہل سانس لے کر بولا۔ ”لیکن میں کبھی نہیں کروں کہ تمہیں  
سارو کے باپ باس کے ہاتھوں نے نہیں بھیجا ہے؟“  
”ابھی یقین کر لو کہ اگر تمہیں ان لوگوں نے بھیجا ہوتا تو ہم جب تک اپنا کام کر کے واپس جا چکے ہوتے تم سے اتنی  
دیر بات چیت نہ کرتے۔“

بلوچ نے بھی سارو کے منہ سے ہاتھ ہٹا دیا تھا، دراصل ابھی تک سہمی ہوئی تھی اور گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔  
بلوچ نے معذرت خواہانہ انداز میں سائر سے کہا۔  
”سوری میڈم! مجھے بد وقت اختیار کرنا پڑا اور نہ آپ چیخ کر ہوئی کی سیکورٹی کو یہاں اکٹھا کر لیں۔“  
”اگر یہ بات ہے۔“ کمال نے کہا۔

”تو آپ لوگ جب تک جاہیں برساں پھر رہ سکتے ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“  
اچانک میرے تیل فون کی بیل بجی تو کمال نے چونک کر مجھے دیکھا، میں نے جب سے تیل فون نکال کر دیکھا، وہ  
باشم کی کال تھی۔ میں نے آن کاٹن دیا کہ تیل فون کان سے لگایا۔

باشم نے رنٹوش لہجے میں پوچھا۔ ”کامران صاحب! کہاں ہیں آپ لوگ؟“  
”ہم ابھی ہوٹل میں ہی ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔  
”تمہیں معلوم نہیں ہو سکا کہ ہم کس مشکل سے اپنی جان بچا کر وہاں تفرار ہوئے تھے؟“  
”مجھے ظاہر نہیں ہوئی۔“ باشم نے کہا۔  
”میں تو یہ سمجھتا رہا کہ آپ نے رنٹون کو قابو میں کر لیا ہے اور.....“

”ہم نے قابو میں کر لیا تھا لیکن اچانک ہی پانسہ پلٹ گیا ہے۔“ میں نے کہا۔  
 ”ہر حال، ہم نے آپ کا راستہ صاف کر دیا ہے، اب آپ بھی وہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔“ ہاشم نے کہا۔  
 ”ٹھیک ہے، ہم یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں، غم ہمارا انتظار کرو۔“  
 ”ہم بہت پہلے آپ تک پہنچ چکے ہوتے لیکن بلوچ سے اچانک رابطہ منقطع ہو گیا۔“ ہاشم نے کہا۔  
 ”ساتھ لائن کٹ گئی یا پھر بلوچ کے سیل فون کی بیٹری لو ہوئی، اس صورت میں ہم آپ کو کال بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اس سے وہ کس چیز کا ہو جائے۔“

”ٹھیک ہے“ میں نے کہا۔  
 ”تم ہمارا انتظار کرو۔ اگر ہونٹل کی سیکورٹی آڑ سے متاثر ہو تو ہم فوراً ہی باہر آ جائیں گے۔ اگر ہمیں آنے میں آدھے گھنٹے سے زیادہ لگے تو تم لوگ اوپر آ جانا یا نئے کال کر لینا میں اپنا سیل فون واہریشن پر لگا دیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

کمال بہت خود سے میری بات سن رہا تھا، اس کے چہرے پر ایک مہر خوف کی پرچھائیاں نمودار ہو رہی تھیں، اس نے جھکتے ہوئے پوچھا۔ ”کوئی پوئیس وغیرہ کا پتہ تو نہیں ہے جناب؟“  
 ”اگر ہو بھی تو تمہیں نگر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔  
 ”پولیس سے ہم نہیں گئے تم نہیں۔“ پتھر میں نے طوفان کیا۔  
 ”تم اپنا سیل فون چیک کرو، اس کی بیٹری لو ہے یا پھر لائن کٹ گئی تھی۔“  
 ”میں نے ابھی اپنا سیل فون چیک کیا ہے وہاں ’بلوچ‘ نے کہا۔  
 ”اس کا بیٹری لو (Low) ہو گیا ہے، اسی لیے ان لوگ گھروں کو کچھ معلوم نہیں ہوا۔“  
 ہونٹل میں داخلے سے پہلے ہاشم نے بلوچ کے سیل فون پر کال کر کے اسے جیب میں رکھنے کو کہا تھا تاکہ ان لوگوں کو ہمارے بارے میں معلوم ہو سکے۔

اب سائز کے چہرے پر بھی اطمینان تھا اور کمال بھی مطمئن نظر آ رہا تھا۔  
 اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو میرے ساتھ کمال اور سائز نے بھی چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔  
 میں نے کمال سے کہا۔ ”ہم لوگ ہاتھ روہم میں چلے جاتے ہیں باہر یا تو ہونٹل کی سیکورٹی کے لوگ ہوں گے یا پھر ہمارے دشمن ہوں گے۔“ پھر وہ کچھ تو وقت کے بعد بولا۔ ”کوئی نہیں ہو، ہم ان لوگوں کے ساتھ بہت اعتماد سے بات کرنا اور سختی سے اپنی لاعلمی کا اظہار کرنا بلکہ تھوڑا بہت خضہ بھی دکھانا تاکہ راست کے اس پیران لوگوں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔“

”میں نے بلوچ کو ہاتھ روہم میں جانے کا اشارہ کیا، پھر خود بھی ہاتھ روہم میں گھس گیا لیکن میرے کان پر وہی طرح سے باہر کی آوازوں پر تھوڑے بلوچ کی طرح میں نے بھی اپنا ریموڈ اور کال لیا تھا۔  
 آخری لمبے کو بلوچ کو کھینچے کہ اس خلاف کا خیال آیا جو وہ دشمنوں کے کمرے سے لایا تھا اور اب سائز کے بیڈ پر پڑا ہوا تھا، وہاں کی کسی تیزی سے باہر نکلا اور دیکھا لیکن نیکے کا خلاف لے کر پھر دہشت گردوں میں آ گیا۔  
 اسی وقت دروازے پر پھر دستک ہوئی، کمال نے جھٹکا کر پوچھا۔ ”کون ہے بھئی؟“  
 ”ہونٹل کی سیکورٹی؟“ باہر سے آواز آئی۔ ”دروازہ کھولے۔“

کمال نے شاید دروازہ کھول دیا تھا، دوسرے سے لے کر دروازہ دروازہ آواز میں بند ہونے کی آواز آئی، پھر کمرے میں ایک سے زائد افراد کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔  
 ”کون ہو تم لوگ؟“ کمال کی گھبراہٹ ہوئی آواز سنائی دی۔ ”ابے اتنی جلدی بھول گیا؟“ مجھے ایک اجنبی آواز سنائی دی۔  
 کمال بگاڑ کر بولا۔ ”دشمن..... دشمن..... بھائی.....؟ آپ؟“

”تو کیا سمجھتا تھا کہ سائزہ کو لے کر آئے گا اور ہم چپ کر کے بیٹھ کر رہیں گے۔“

”جو کچھ شفیق بھائی! سائزہ راجی مرضی سے آئی ہے، میں نے اسے انخواہ میں کیا ہے۔“ کمال نے سنبھل کر کہا۔

”یہ کہانی تو بعد میں پولیس کو تیری لاش سنانے کی یا پھر سائزہ کی لاش با“ پھر گرج کی ایسی آواز خانی دی جیسے کسی نے اپنے رپوٹ اور کا سٹیٹیج بنایا ہو۔

میں نے بلوچ کو اشارہ کیا اور ایک دم ہاتھ روم سے نکل آیا۔ ”اچھی جگہ سے حرکت مت کر۔“ میں گرج کو بولا۔

”ورنہ تمہاری کھوپڑی تریز کی طرح پتھر جائے گی۔“

”نت۔۔۔۔۔ تم کون ہو؟“ رپوٹ اور روبرو ٹھک ٹھک کر بولا۔

”پہلے کچھ نواز مین پر ڈال دو۔“ میں نے اس کے رپوٹ اور کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے دو ساتھی یا تو خالی ہاتھ تھے یا پھر انہوں نے کوئی ہتھیار رکالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ”جلد کرو۔“ میں گرج کو بولا۔

میرے گرج دار کھمانہ لکچے سے پھر آ کر اس نے رپوٹ اور زین پر ڈال دیا۔

”آب۔۔۔۔۔ کون ہیں بھائی؟“ اس نے شکستہ لکچے میں پوچھا، اس کا سارا غصہ ہوا ہو گیا تھا۔

”پولیس۔۔۔۔۔ میں نے ڈیپ کر کہا۔“ مسٹر کمال نے مجھے پہلے ہی اطلاع دی تھی کہ کچھ لوگ ان کی جان کے دشمن ہو رہے ہیں، میں ابھی اتفاقاً دھڑ سے گزر رہا تھا کہ مجھے ان کا خیال آیا اور میں ادھر چلا آیا، اب بتاؤ تم لوگ کیا چاہتے ہو؟“

”سر آج ہی انصاف کریں۔“ شفیق مراد! احتجاج بنا گیا۔ ”یہ میری بہن کو درخا کر۔ خراب سے یہاں لا لیا ہے۔“

”تمہاری بہن کوئی سنگھی بچی ہے کہ اس کے درغلانے پر یہاں آئی؟“ میں نے سچ لکچے میں کہا۔ ”اور اگر تمہیں کوئی شکایت ہے تو تم پولیس کے پاس جاؤ، قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کیوں کر رہے؟“ پھر میں اچانک گرج کو

بولا۔ ”تم دونوں بھی اپنے ہاتھ اٹھاؤ اور دیوار کی طرف رخ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔“

میرے اشارے پر بلوچ نے بہت سہارت سے ان کی تلاشی لی اور ان کی جیبوں سے بھی ایک ایک وڑوا رک پستول

برآمد کر لیا، اس نے شفیق کی تلاشی بھی لے ڈالی، اس کی جیب سے تقریباً بیچاس ہزار روپے کے کرنسی نوٹ، ایک کھنگھار

ڈرائیو بگ لائسنس برآمد ہوا، بلوچ نے بڑھ کر شفیق کا رپوٹ اور بھی اٹھا لیا تھا۔

”پھر مجھے کیا کرنا ہے؟“ شفیق نے پوچھا۔

”تم سب سے پہلے تو متعلقہ تھانے میں اپنی بہن کے اغوا کے رپورٹ درج کراؤ۔“

”وہ تو میں کر چکا ہوں۔“ شفیق نے جلدی سے کہا۔

”تو پھر اب دیکھی پولیس اسٹیشن والے کوئی کارروائی کریں گے۔“ میں نے بے زار مائی سے کہا۔

”لیکن وہ پولیس اسٹیشن تو سیالکوٹ میں ہے، میں سیالکوٹ سے ان کا پوچھا کرتے ہو یہاں تک آیا ہوں۔“

”تمہارے آنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ میں نے کہا۔ ”کارروائی تو پولیس ہی کرے گی۔“

”آپ بھی تو پولیس کے افسر ہیں۔“ شفیق نے کہا۔

”آپ ہی کوئی کارروائی کیوں نہیں کرتے؟“

”میں صرف تمہارے کہنے پر ان معزز شہریوں پر اغوا کا الزام لگا دوں، اس کے لیے پولیس پارٹی وہاں سے آئے گی،

وہ پہلے یہاں کے متعلقہ پولیس اسٹیشن کو اطلاع دے گی پھر کوئی کارروائی ہوگی۔“

میری بات سن کر اس کے چہرے پر مایوسی کے سامنے گہرے ہو گئے۔

”اور تم بتاؤ کہ تمہارے پاس اس رپوٹ اور کا لائسنس ہے؟“

”لائسنس۔۔۔۔۔ تو جی ہے۔ لیکن۔۔۔۔۔“

”لیکن کیا؟“ میں نے سچ لکچے میں پوچھا۔

”لیکن میں اسے ساتھ نہیں لا یا۔“ میں نے کہا۔

”تم جانئے ہو کہ تم نے قانون کی دفعات کی خلاف ورزی کی ہے، ان ہی دفعات کے تحت تم کو جیل تک جیل کی ہوا کھا سکتے ہو، جیلا بات کہ تم بغیر لائسنس کا اسٹول لے گوم رہے ہو، دوسری بات یہ کہ اگر تمہارے پاس لائسنس ہے بھی نہ ہی تم رہو اور ساتھ لے کر نہیں گوم سکتے، اس کے لیے ڈسٹرکٹ ججز سٹ کا خصوصی اجازت نامہ ہوتا ہے۔“ پھر میں اس کے دونوں ساتھیوں سے مخاطب ہوا: ”تم لوگوں کے پاس ان پمپوں کے لائسنس ہیں؟“

”نہیں جی!“ ان میں سے ایک بولا۔ ”ان کی آواز تو سے متناہی تھی۔“

”گو جانم وہ دونوں بھی جیل کی ہوا کھا سکتے ہو، آج کل ملک میں جس قسم کے حالات ہیں تم جانئے ہی ہو۔ تم پہ نو بہت آسانی سے دہشت گردی کا مقدمہ بھی بن سکتا ہے۔“

میری بات سن کر شیفین کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا، اس سے زیادہ غیر حالت اس کے ساتھیوں کی تھی، وہ دونوں بار بار خشک ہونٹوں پر زبان بھیر رہے تھے، اور میری طرف رحم طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

آخراً مجھے مسکائی آواز والے نے کہا: ”صاحب جی! ہم لوگ یہ تصور ہیں، ہمیں نو بھائی نشین کراچی گھمانے لایا تھا۔“

”اس بغیر تو نولی اسٹول سے سمیت؟“ میں نے تلخ لہجے میں پوچھا، پھر میں بلوچ سے مخاطب ہوا: ”گرفزار کر لو انہیں اور پولیس اسٹیشن لے چلو۔“

”سرا یہ لوگ اتنی دور سے یہاں آئے ہیں، یہاں نو کوئی ان کی ممانت کرنے والا بھی نہیں ملے گا۔“

”پھر کیا کیا جائے؟“ میں نے پُر خیال انداز میں کہا۔

”سرا! آپ نے کسی بھی قسم کے ساتھ زبانی نہیں کی، ان لوگوں کا تصور ضرور ہے، لیکن ہم انہیں ایک موقع ضرور دیں۔“

”اچھا۔“ میں نے پُر خیال انداز میں کہا۔ ”اگر تم کہتے ہو تو میں ان کے ساتھ رعایت کرو دیتا ہوں، پھر میں شیفین سے مخاطب ہوا: ”چلو ہمارے یہاں سے۔“

”کیا ہم لوگ جاؤں؟“ شیفین نے بے چینی سے پوچھا۔

”ہاں ہمارے جاؤ۔“ بلوچ نے کہا۔

”اس سے پہلے کہ صاحب کار اور بدل جائے، تم لوگ یہاں سے نکل جاؤ اور آئندہ بھی قانون ہاتھ میں لینے کی کوشش مت کرنا۔“

وہ تینوں وہاں سے ایسے بھاگے کہ ایک لمحے کی تاخیر بھی ہوگئی تو میں اپنا راز بدل دوں گا۔“

”آپ کا بہت بہت شکریہ سر!“ کمال نے کہا۔

”اگر اس وقت آپ یہاں نہ ہوتے تو ہم دونوں کی لاشیں پڑتی ہوتیں۔“

”خطرہ ابھی نکلتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”وہ شیفین اس قسم کا انسان نہیں لگتا کراچی آسانی سے ہمارا بچھا جھوڑ دے گا۔“

”پھر..... پھر..... مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ کمال نے پوچھا۔

”تم ابھی اور اتنی وقت میرے ساتھ چلو، بعد میں کچھ سوچیں گے۔“

”میں چیک آؤٹ کر کے آتا ہوں۔“ کمال نے کہا، پھر وہ سارے سے مخاطب ہوا: ”تم جس تک اپنا سامان سمیت لو۔“

”چیک آؤٹ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے کہا: ”تم نے ہول میں ایڈوائس رقم جمع کر لی ہوگی؟“

”ہاں، میں نے ایک دن کا کرایہ واپس دیا ہے۔“

”بس تو پھر یہ بتائی کی کوئی بات نہیں ہے۔“ میں نے کہا: ”تم دونوں میرے سامنے کے ساتھ باہر نکل جاؤ، میں منہارا سوٹ کس لے کر آتا ہوں۔“

”وہ خبر! ان لوگوں کو ہم لے جاؤ۔“ بلوچ نے کہا۔

”میں بعد میں ان کا سامان لے کر آ جاؤں گا، مجھے یہاں سے نکلنے میں آسانی رہے گی، تیار ابھی ایک دو



آدھی اور ہوتی ہے۔“

مجھے خیال آیا کہ جب ہم ہوٹل میں داخل ہوئے تھے تو کسی نے بھی ہماری تلاشی لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ دونوں فائبر اسٹارز ہوٹل میں نوٹیفیر چیکنگ کے آج کل کوئی اندر داخل ہی نہیں ہو سکتا۔

”تم ٹھیک ہے، میں ان دونوں کے لئے کرکٹلر رہا ہوں، تم سامان لے کر آؤ، ہاں ایسا سامان مت بھول جانا۔“

اس وقت ساڑھے نو بجتے تھے، میں نے صرف اپنے اور کمال کے کپڑے ایک سوٹ کس جس کو دے دیے تھے بلکہ اس نے نہ جانے کس وقت واٹس روہم میں جا کر اپنا لباس بھی تبدیل کر لیا تھا۔

”چلو! تم لوگ میرے ساتھ آؤ۔“ میں نے ان دونوں سے کہا۔

”ذرا احتیاط سے ولند! بلوچ نے کہا۔“ وہ آدھی شفیق ابھی ہوٹل کے باہر ہی موجود ہوگا، اس کا ریوا اور تو ہم نے چھین ہی لیا لیکن اس کی گاڑی میں تو تھمیا ہو سکتا ہے۔“

میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور ہاشم کا نمبر ڈائل کیا، اس نے بیٹی ہی ہتھنی پر کال ریسیو کر لی اور بولا۔ ”آپ کہاں ہیں؟ کسی دوسری معیبت میں تو نہیں پھنس گئے؟“

”تم گاڑی گیت پر لاؤ، ہم لوگ نیچے آ رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔

پھر ہم لوگ لٹ سے جانے کی بجائے زینے سے نیچے اڑے اور اٹھیمان سے چلتے ہوئے ہوٹل سے باہر آ گئے۔ ہاشم اور تیمور گیت کے بالکل نزدیک لینڈ کر ڈور میں موجود تھے، مجھے دیکھتے ہی تیمور ڈرائیونگ سیٹ سے اتر اور غصی نشست کا دو دروازہ کھول دیا، میں نے پہلے ساڑھے نو بجنے کا اشارہ کیا، پھر کمال کے بیٹھے کے بعد ہی خود بھی بیٹھا گیا۔

”بلوچ کہاں ہے؟“ تیمور نے پوچھا۔

”بلوچ دو دوسانے سے آ رہا ہے۔“ ہاشم نے ہوٹل کے مین گیت کی طرف اشارہ کیا، اس کے ایک سامنے میں سوٹ کس اور دوسرے میں وہی عجیبے کا ٹائف تھا، تیمور نے ہنر و باکری کی کھول دی، بلوچ نے سامان پیچھے رکھا، پھر ہاشم کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا گیا۔

ان کے بیٹھے ہی تیمور نے جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

تیمور ہاشم میں سے کسی نے کمال اور ساہو کے بارے میں نہیں پوچھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر میں ضروری سمجھوں گا تو نوری طور پر انہیں کچھ بتا دوں گا اور نہ گھبرائے گا۔

”تیمور! میں نے اسے مخاطب کیا۔“ دھیان رکھنا کہ ہمارا مقصد نہ کیا جائے۔“

”میں آپ کے کہنے سے پہلے ہی محتاط ہوں۔“ تیمور نے کہا۔ ”کوئی گاڑی مسئلہ ہمارا چھوڑ کر رہی ہے۔“

”یہ ارجمند یا اس کے ساتھ ہی تو نہیں ہیں؟“ میں نے کہا، پھر پرخیاں انداز میں بولا۔ ”شفیق او اس کے ساتھ ہی ہو سکتے ہیں۔“

”رہو! ان وقت سننا ہے۔“ تیمور نے کہا۔ ”انہیں راج وینا مشکل ہوگا۔“

”پھر تم نہیں کیا اپنے پیچھے لگا کر اپنے گھر تک لے جاتا چاہئے ہوا؟“ میں نے سچے لہجے میں کہا۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ ان سے یہیں کہیں منت لیں۔“ تیمور نے کہا اور اچانک گاڑی کی رفتار خطرناک حد تک بڑھا دی، ایک سو ڈکھونے ہی اس نے گاڑی کو سڑک کے کنارے روکا اور اس کی لائٹس آف کر کے اسے کچے تیل اتار دیا۔

پھر وہ اوو ہاشم پھرتی سے باہر آ گئے، بلوچ بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ گاڑی بھی تیز رفتاری سے آئی اور اسی رفتار سے سیدھی گزرتی۔ تیمور اور دوسرے لوگ جلدی سے گاڑی میں بیٹھے، تیمور نے گاڑی کو فیژن لبار اور اسی خوفناک رفتار سے گاڑی ڈرائیونگ کرنے لگا۔ اس کی ہیڈ لائٹس اور بیک لائٹس بھی آف تھیں۔

”ذرا سنبھل کر تیمور! میں نے کہا۔“ ہم لوگوں کو نہ مہلاست دہا نہیں بیٹھا ہے۔“

”آپ غرمت کریں بھی یا میں گاڑی کو ہمیشہ قابو میں رکھتا ہوں۔“

”رڈ ڈوران ہو تو اس بہ طے دلے لگاؤ گا گاڑیوں والے اس خوش کنی میں رہتے ہیں کہ ان کے علاوہ اس وقت سڑک پر کوئی نہیں ہے، اچانک کسی کراٹنگ پر کسی راک ڈائونٹ، خوف ناک تصادم بھی ہو جاتا ہے۔“

”اوسے بھیا! آپ نونفلو میں ڈر رہے ہیں لیجئے ہم گھر پہنچ گئے، اگلی گلی میں ہمارا بنگلا ہے۔“

میں نے باہر بھاگا لیکن اندر صبر سے کے باوجود میں سمجھ گیا کرتے درنگ نہیں کہہ رہا ہے۔

اگلے دو منٹ کے بعد ہم گھر کے گیت پر تھے۔

”اوسے بھیا! جتنی سے آؤ اوسے جس ٹیکل رہی تھی۔“

مجھے دیکھتے ہی وہ پھٹ پڑی۔ ”عمران صاحب! آپ کو تو کسی کا خیال رہنا ہی نہیں ہے۔ کیا آپ ایک کال نہیں کر سکتے تھے کہ میں۔۔۔“

میں نے سائز اور کمال کی طرف اشارہ کیا تو وہ برہنہ ہو لیتے بولتے رک گئی۔

”ہمارے بھیمان ہیں۔“ میں نے نادیہ سے کہا۔ ”انہیں ذرا کر سے تک بھگوا دو اور انہیں کسی بھی قسم کی تکلیف نہیں ہونا چاہیے۔“ پھر میں نے نادیہ کا تعارف کر دیا۔ ”بی نادیہ ہیں اور یہ سا بیوہ اور کمال!“

نادیہ نے یہی طور پر سائز سے ہاتھ ملایا، نہ جانے کیا سمجھ رہی تھی اور سائز کو بہت عجیب سی نظروں سے گھور رہی تھی۔

بادیج ان لوگوں کا سوت کس کے کراٹا ہونے سے نادیہ سے کہا۔ ”ان کا سامان بھی کرتے میں بھگوا دیتا۔“

”آئیے۔“ نادیہ نے سائز اور کمال سے کہا۔ ”میں آپ کو کراٹا دکھا دوں۔“

اس کے جانے کے بعد ہم لوگ ذرا ٹیک رہم میں جا بیٹھے، اس بیٹاگ دوز میں بھوک بھی چمک گئی تھی اور اب یوں بھی ایک وز بڑھ گھنے بعد صبح ہونے والی تھی۔

نادیہ واہیں آئی تو میں نے کہا۔ ”تم پہلے ہمارے اجتن سے ناشتہ کا بندہ دست کرد، پھر اپنے ہاتھ کی ایک ایک گرام گرم کافیا پیاؤ بنا۔“

”کھاؤ، ناشتہ سب تیار ہے۔“ نادیہ نے سرو لکھ میں کہا۔ ”لیکن یہ پتھر کیا ہے؟ یہ ابگ کسی بھی طرف سے جراثیم پینے تو نہیں لگتے، تو ابگ اب تک جراثیم پینے افراد کو کچر کچر کر لایا کرتے تھے، اب کیا انگوٹھا دے تانہ ان کا ہندہ بھی شروع کر دیا ہے؟“

اس کے بدلے کئے لیجئے ہمبر سے ساتھ ساتھ ہاشم اور تیمور کو بھی نمی آگئی۔

”تم تو دانت نہ ہی ڈالو تو اچھا ہے۔“ نادیہ نے تیمور سے کہا۔ ”درد۔۔۔“

”درد کیا؟“ میں نے ہنس کر پوچھا۔

پھر اسے شروع سے لے کر آخیک سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔

بلوچ تو ساتھ تھا لیکن تیمور، ہاشم اور نادیہ کے لیے یہ نئی خبر تھی۔

”ان دونوں کو ساتھ کیوں لے آئے؟“ ہاشم نے کہا۔ تم تو پریشانیاں ڈھونڈتے ہو۔“

”ہاشم! تمہیں نے سنجیدگی سے کہا، اگر میں ان دونوں کو ساتھ نہ لاتا تو یہ آج نہیں تو کھل مارے جاتے، وہ بے ابھی تک

میں نے بھی نہیں سوچا ہے کہ مجھے ان کے لیے کیا کرتا ہے۔“

”کرنا کیا ہے؟“ تیمور نے کہا۔ ”کلی کوئی تاشی باؤ میں اور ان دونوں کا نکاح پر حوا میں۔“

”بات اتنی آسان نہیں ہے تیمور!“ میں نے کہا۔ ”سائز ایک بڑے خاندان کی لڑکی ہے، اس کے گھر والے چین

سے نہیں بیٹھیں گے، اس کا صرف ایک حل ہے کہ ان دونوں کی کوٹ میرج کر، ادنی جانے۔“

”واہ، کیا زبردست حل ہے۔“ تیمور نے کہا۔ ”کامران بھائی زندہ باور، کامران بھائی۔۔۔“

میں نے مات گھود کر دیکھا تو وہ خاموش ہو گیا۔

ہو کچھ کے بغیر، ہاں تہ آنکھ کر چلی گئی، میں بھی اٹھ گیا کہ ذرا لاک نظر سائرہ اور کمال کو دیکھوں، میں جانتا تھا کہ تاریخ نے انہیں کس کمرے میں ٹھہرایا ہوگا۔

دو دو دنوں اور ابھی تک جاگ رہے تھے اور آدھے میں بائیں کمرے تھے۔  
 اچانک سائرہ کی آواز آئی۔ "کمال! مجھے نو یہاں بھی کچھ گڑبگڑی ہے، مجھے یقین ہے کہ اس شخص کا پوئیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔" کمال نے کہا۔ "پوئیس والے ہونٹوں کے کمروں میں بناؤ نہیں لینے۔"  
 "مجھے ایک اور خدشہ بھی ہے۔" سائرہ نے کہا۔ "یہ لوگ اگر نہیں بھائی تھیں کے حوالے کر دیں اور ان سے بھاری رقم کا مطالبہ کریں تو وہ بھی کر دے گا، چاہے اسے اپنی زمین کا کچھ حصہ بھی کہیں نہ پہنچا ہے۔"  
 "تم کسی بائیں کمرے ہو؟" کمال نے کہا۔

"وہ ہمارا دشمن ہے، بھاری جان بھائی ہے ان نے، تم نہ دیکھا نہیں کہ ان لوگوں نے بھائی تھیں کی جب سے تھکنے والی رقم انہیں واپس کر دی تھی۔" میرا اندازہ ہے کہ وہ دزد ہے، پونے دو لاکھ روپے تو انہوں نے لے گئے؟"  
 میں نے دروازے پر دستک دی تو تھیں خاموش ہو گیا، میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور بولا۔ "اب لوگوں کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو ہانچ کر کہہ دیجئے گا، کورڈر میں تارا لاک ملازم سوجو ہے، وہ آپ کی ایک آواز پر یہاں آ جائے گا۔"  
 "آپ نے ابھی تک اپنا نام بھی نہیں بتایا؟" کمال نے کہا۔

"اس کا نام کس نام سے ہے؟" میں نے کہا۔

"میرا نام کاسران ہے۔"

"کاسران صاحب آپ کی جگہ نہ بہت غصے والی ہیں، وہ....."

"وہ مہری بیگم نہیں ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "آپ ماہ کی بات کر رہی ہیں؟"

"جی ہاں، وہ آپ کی بیگم نہیں ہیں؟" سائرہ نے جبرست سے پوچھا۔

"کوئی بھی کس تو نہیں ہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "آئندہ سناؤ ہو جائیں۔"

"میں بذرا کے اسٹائل ہی سے کچھ کئی تھی کہ....."

"اچھا اب فضول بائیں مت کرو۔" کمال نے اسے ٹوک دیا۔

"آپ لوگ بالکل پریشان نہ ہوں، ہم آپ کے دوست ہیں، دشمن نہیں۔ اب آپ لوگ اطمینان سے سو جائیں۔"

یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر آ گیا۔

وہی وقت مجھے ناویہ نظر آئی اور بولی ہم آشنا لاک کر یہاں بیٹھنا ان لوگوں سے چھپیں لگا رہے ہو؟"

"چھپیں تو نہیں لگا رہا تھا، ان کے خدشات و ورکر رہا تھا، میں نے ہنس کر کہا۔ "ان کا خیال ہے کہ ہم بھاری رقم کے

دشمن سائرہ اور کمال کو سائرہ کے بھائیوں کے حوالے کر دیں گے، پھر وہ لوگ ان کے کمرے کے کہیں باہر آئیں گے،

تھینک دین گے، آ کر غرٹ بھی تو کوئی چیز ہے۔" مہر سے مجھے میں نظر تھا۔

میں اس کے ساتھ مجھے ہر ایک روم میں آیا، نمودر، ہاشم اور بلوچ مہر سے ہی انتظار میں بیٹھے تھے، مہر اول نے چاہا اور باہر

کہ پہلے ایک شادو لے لوں لیکن ان لوگوں کے خیال سے میں ڈانٹا گیا، پہلے پر مہر تھا۔

خوب بھر پور ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد ہم لوگ پھر ڈانٹ کر ہم میں ڈانٹنے کا فیصلہ کیا، وہیں منگولیا تھی۔

کالی پیسے ہونے میں نے بلوچ سے کہا۔ "اب زرہہ، ٹھہرائی کو کھولو جس کے لیے ہم نے اسے پہنچا ہے۔"

بلوچ نے نیک کا وہ غائب ڈانٹ کر ہم کو فریش برائٹ راجوہ دار جن اور اس کے ساتھیوں سے چھین کر لایا تھا۔

اس میں مختلف قسم کی فالس تھیں، کچھ کئی ڈیز تھیں، کچھ کاغذات تھے اور باقی ہائی پار کا ایک ٹرا سمیٹر بھی تھا، زرہہ

دیکھ کر میں چونک اٹھا، وہاں وقت بھی آن تھا اور Blink کر رہا تھا، میں نے اس پر لگا ہوا لاک فین دبا یا تو کمرے میں

ایک کرسٹ آواز کو سمجھے گی۔" بیلو، جی ٹھنری۔ جی ٹھنری۔ جی سیون از کالنگ۔ پھر کچھ دیر بعد ایک اور کرسٹ آواز آئی۔ "بیلو جی ٹھنری۔ جی ٹھنری۔ بیلو۔ جی سیون از کالنگ!"

"جی سیون از کالنگ ٹنگ۔ اورورا"

کرسٹ آواز والا امریکن لہجے میں بول رہا تھا۔ "جی ٹھنری! کہا چونٹن ہے؟ اورورا"

"چونٹن ٹنگ نہیں ہے ہاس!" جی ٹھنری نے کہا۔

"وہ دونوں ٹرامز اوئے ٹنگ ٹنگ لگ گئے اورورا"

"ان پلنٹ سمجھو، اور پھر کسی وقت ہاتھ آ جا میں گے۔ اور جن کے پاس جو ٹکٹیں تھیں، اور نہ کھنڈن ہیں نا؟ اورورا"

"نوسرا" جی ٹھنری نے کہا۔ "اور جن کے پاس اب صرف ایک ٹائل رہ گئی ہے جسے وہ اپنے ساتھ بھاوت لے جاتا

چاہتا ہے، اورورا"

"تو اس سے کچھ دیر نہ کرے اور کل Available ٹلائٹ سے رہتی روانہ ہو جائے، اور ورائینڈ اول!"

میں نے بھی اٹھائے، آواز آئی کہ وہ باہر چلا گیا، مجھے خیال آ یا کہ ان ٹرامز میں لوکیشن ہائینز بھی ہو سکتا ہے، اگر ایسا ہوا تو وہ ہم تک پہنچنے کی نیا دی کر دے ہوں گے، میں نے اپنے اس خدشے کا اظہار نمود کیا۔

وہ بھی چونک اٹھا، بولا۔ "بھیا! تعظیم الیکٹرانک کا کارہ ہے، میں اسے ابھی بلواتا ہوں، اگر اس میں لوکیشن ہائینز ہوں تو

وہ اسے ابھی ناکارہ کر دے گا۔" اس نے جب تے بل ٹون نکالا اور ڈیٹریج کر کے بولا۔

"تعظیم انفرانٹ ڈرائنگ روم میں پہنچو۔"

ایک منٹ سے بھی کم عرصے میں تعظیم وہاں موجود تھا۔ ان نے ٹرامز کا جائزہ لیا، پھر اپنی جیب سے اسکرڈز راتھرو

نکال کر ان کا پچھلا منہ کھول لیا، اور بولا۔

"سرا، اس میں لوکیشن فائنڈر موجود ہے، میں اسے ابھی نکال لیتا ہوں۔"

"اس کے نکالنے سے ڈسٹنس مل نہیں ہوگا، تعظیم!" میں نے کہا۔ "وہ لوگ جو ہماری تلاش میں آئی تھیں ہوں گے۔"

"میں اسے لے کر ابھی بائی دے گی طرف جاؤں گا اور گراہی تے باہر جانے والے کسی بھی ٹرک کے نیچے چپکا دوں

گا، وہ لوگ بھی گزرا جائیں گے کہ ہم لوگ کراچی تے کیتن باہر جاوے تے باہر

"ڈیٹریج ملے گی۔" میں نے کہا، اس نے ہنسی کر سکیٹ کا، وہ کھڑا اور لوکیشن فائنڈر نکال لیا، وہ جھومتی سی ایک چپ

تھی جیسے بل ٹون کا سمبوری کارڈ ہوتا ہے۔ لوکیشن فائنڈر لے کر تعظیم اسی وقت نکل گیا۔

"نمودانم بھی اس کے ساتھ جاؤ، ایسا نہ ہو کہ لوگ اس سے... میں آ رہے ہوں اور تعظیم سے ٹکراؤ ہو جائے۔"

"ہاں، میں بھی یہی کہنے والا تھا۔" ہاشم نے کہا۔ "ہاں، جانے، تو نے لینڈ کر ڈو لے جانا، پھر نہیں اپنے ساتھ

انسانی اسلحہ رکھنے کی ضرورت چٹ نہیں آئے گی۔"

پتال ہاشم کے لینڈ کر ڈوڑ چلا پھرتا، اسلحہ خانہ تھا، ان میں ہر قسم کا اسلحہ موجود تھا لیکن سب کچھ خفیہ خانوں میں تھا۔

نمودانم بھی تیزی سے باہر نکل گیا، پھر مجھے لینڈ کر ڈوڑ اسٹارٹ ہونے اور اسٹی گنٹ مٹنے کی آواز آئی، میرے دل سے

بے ساختہ دعا نکلی کہ یا اللہ! نمودانم کو محفوظ رکھنا، مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں اور ہاشم خود بھی ان لوگوں کے ساتھ

کہاں نہ پٹے گئے؟

"کس سوچ میں تم ہو؟" ہاشم نے پوچھا۔ "کوئی پریشانی ہے؟"

"سب سے ڈیڑی پریشانی تو یہ ہے کہ ان لوگوں نے ہمارا ٹھکانا تلاش نہ کر لیا ہو، دوسری پریشانی مجھے تیمور اور تعظیم کی

طرف سے ہے، لوکیشن فائنڈر موجودگی میں ان لوگوں کا ٹھکانا ڈرائنگ روم کے سامنیوں سے ہو سکتا ہے۔"

"میں تو سوچ رہا تھا کہ میں بھی ساتھ ہی چلا جاؤں۔" ہاشم نے کہا۔ "باہر چل کر جمع ہوؤں، لیکن زیادہ لوگوں کی

موجودگی کی وجہ سے ہوشم ہٹنے کی بجائے بگاڑ بھی سکتا ہے، اللہ نے چاہا تو وہ دونوں خبر بہت واہیں آئیں گے۔"



”ابھی بھی دیر نہیں ہوا ہے اور“ بلوچ نے کہا۔ ”وہ لوگ بائی کے کسی طرف گیا ہے؟ ہم بھی ان کے پیچھے نکلتا ہوں۔“

”اب رہنے دو بلوچ! ہمیں نے کہا۔“ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ تیس دنوں میں اس طرح کی گرفتاریوں سے گاڑی روز آتا ہے؟ وہ تو اب تک یہاں سے نہ جانے کہاں پہنچا ہوگا۔“

”اب ذرا ان فائلوں کو بھی دیکھ لیں۔“ میں نے کہا اور ایک فائل اٹھائی، اس نے ٹاپ بیکریت لکھا ہوا تھا اور فائل پر حکومت پاکستان کا تختہ جس میں گرام رقم تھا، میں نے اسے کھولنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ اسے سیل کر دیا گیا ہے، اب سیل توڑنے بغیر اس کا پڑھنا ناممکن تھا۔

میں نے سیل کا جائزہ لیا، اسے ابھی تک جھپٹا نہیں گیا تھا، سیل پر محتاطہ دفتر کے دستخط تھے، مجھے خوشی ہوئی کہ دشمنوں کو اس فائل کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا، ہاں، اگر میں کچھ دیر چھو جاتی تو یہ فائلیں بھی یہاں سے نکل چکی ہوتیں، تم فائلیں مزید ابھی تھیں جن پر سیل موجود تھی، وہ فائلوں پر سرے سے سیل لگا تھا یا نہیں یا ممکن ہے اسے چرانے والوں نے سیل توڑ دیا، ہوا اور اسے سرے سے فائل سے نکال دیا ہو۔ اس فائل کے مندرجات پڑھتے ہوئے میرا ذرا دل خون تیز ہو گیا۔ اس فائل میں ان لوگوں کی فہرست تھی جو پاکستان میں دہشت گردی کے ارادے سے آگئے تھے یا آنے والے تھے، دوسری فائل میں ایک بدنام زمانہ بین الاقوامی ایجنسی کے لوگوں کے نام تھے، وہ اس وقت پاکستان میں موجود تھے اور نسل و نسلت کر رہی تھی کوئی منصوبہ بنا رہے تھے۔ وہ مائیا پیسے کے عوض دنیا کا ہر قانون اور غیر قانونی کام کرنے کو تیار ہو جاتی تھی، یہ ظاہر ہو لوگ ایسے طور پر کام کرتے تھے لیکن اسے دو تین غیر ملکی طاقتوں کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ ایجنسی کا مقصد وزارت خارجہ کے افسران کے تیار ہونے اور تقریروں کے بارے میں تھے۔ ہم لوگ ان فائلوں کو دیکھنے میں اتنے خوش تھے کہ میں تیس دنوں بعد بھی کامیابی کا احساس نہ ہوا۔

شیم نے ہنستے ہوئے بتایا کہ میں نے دو چپ (Chip) ایک ایسے ٹرک کے ساتھ دیکھا ہے جو پشاور جا رہا تھا، اب وہ لوگ یا تو اس ٹرک کوڑے میں ہی جا لیں گے، یا پھر اس کے پیچھے پیچھے پشاور پہنچ جائیں گے۔“ (ختم شد)



## اقبال بانو کے جادوگر قلم سے نکلا وہ

شاہکار جولازوال ٹھہرا۔  
 دو شہزادہ ڈائجسٹ میں مسلسل 20 ماہ شائع  
 ہونے والا یہ انمول ناول اقبال بانو کی پہچان بنا۔  
 ”شیشہ گر“ وہ ناول، جس کا ہر ماہ انتظار  
 کیا جاتا تھا۔ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔  
 کتاب ملنے کا پتا:  
 القریش پبلی کیشنز، سرکل روڈ آرڈو بازار لاہور۔



مجموعہ

تعمیر گاہیں

ان میں رانی کی داستانوں کے اس خاکرے سے  
میراثہ جڑوں کے نشاۃ الثانیات سے اس نیکو کھنڈر

## تمہیں رانی کی یاد دلاتی ہے

نور محمد

ایک نوجوان کی داستان جس کے لیے محبت ایک امتحان تھی.....

میں نے اپنے دل میں یہ عہد کر لیا تھا کہ اب کچھ بھی ہو جائے، میری زندگی کا مقصد صرف رانی کا حصول ہے۔ ایک طویل جدوجہد کے بعد بہر حال اسے میری حالت پر رحم آ گیا اور ان کی سرور میری قسم ہوئی اور پھر میری باقاعدہ محبت کا آغاز ہوا۔ میں نے اسے ٹوٹ کر چاہا اور اس کی طرف سے بھی مجھے ایسے ہی جذبات جواب میں ملے۔ ہماری محبت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مضبوط اور گہری ہوتی چلی گئی۔ وعدے وعدہ ہوئے، تمہیں کھانا کھیں، ساتھ سرنے اور جینے کے عہد و پیمانے ہوئے، ہجر زمانہ کب یہ سب کچھ اپنی آسانی سے ہونے دینا ہے۔ بہت جلد پورے کاچ اور اطراف میں رانی اور میری محبت کے چرچے عام ہو گئے۔ آخر کار یہ کہ ہر بات کی انتہا ہوتی ہے۔ جب یہ نام بائیس رانی کے گھر والوں کو معلوم ہوئیں تو انہوں نے اس کا کاچ جانا بند کر دیا اور اس کے لیے رہنے کی تلاش شروع کر دی، تاکہ ان کی مزید بدنامی نہ ہو۔

یہ صورتحال میرے لیے انتہائی تکلیف دہ تھی، مگر محبت اور بھجورنی ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

میں کا اصل نام نورفت تھا، مگر گھر اور اس کے خاندان کے سبھی لوگ اسے رانی کے نام سے پکارتے تھے۔ حقیقت میں وہ بھی میری رانی، اس کا لانا، اٹھانا، بیچنا بلکہ اس کا ہر کام بالکل رانیوں جیسا ہی تھا۔ رانی کہا گئی۔ وہ میری زندگی، میری جان، میر دنا، بلکہ سب ہی کچھ تھی۔ وہ اپنی جلدی مجھ سے جدا ہو جانے لگی، میں نے نو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ آج اسے مجھ سے جدا ہوئے پورے چار سال ہو چکے ہیں، مگر مجھے اب احساس ہوتا ہے جیسے وہ اپنی کل ہی کی بات ہو۔

میری رانی سے پہلی ملاقات کاچ کے گہٹ پر ہوئی تھی، جبکہ وہ میرے کاچ میں داخلے کے لیے آئی تھی۔ پہلی ہی نظر میں، میں نے اسے اپنے لیے منتخب کر لیا۔ کسی بھی انجام سے بے خبر ہو کر۔ شروع شروع میں، میں نے اس سے بات کرنے کی بہت کوشش کی، لیکن میری تمام کوششوں کے باوجود اس نے مجھ پر کوئی توجہ نہ دی، مگر میں نے بھی ہمسہ نہ باری اور برابر اس کے قریب آنے کی کوشش میں لگا رہا۔ کئی بار تو اس نے لائی تھی سے مجھے شبہ بھی کی اور وہ کبھی بھی ری کہ اگر میں اپنی حرکتوں سے باز نہ آتا تو وہ میری شکایت پر پہل صاحب سے کروے گی۔ بہر حال میں

رائی مل جائے۔ رائی سے ملاقات نہ ہونے کے سبب میری حالت ابتر ہو رہی تھی۔ نہ کھانے کا دوش، نہ پینے کا، میری کیفیت نیم پاگلوں کی سی ہو گئی تھی۔ کیوں کہ میری زندگی، میری جان جو مجھ سے دور تھی اور نہ جانے کس حالت میں تھی، مجھے معلوم نہ تھا۔ ہم دونوں ہی حالات اور وقت کے بے رحم

میرا تعلق ایک کاروباری خاندان سے ہے۔ میرے والد مجھے ایک کاروباری فرد کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں خود بھی یہی چاہتا تھا، مگر رائی نے میری زندگی میں اپنی چادری تھی۔ اس لیے میں یہ سب کچھ بھولی چکا تھا۔ اب تو میں صرف یہ چاہتا تھا کہ کچھ بھی ہو، بس کسی صورت مجھے



میں مزید دیر ہوگئی اور رانی کا رشتہ کہیں دوسری جگہ ہو گیا تو پھر کیا ہوگا۔ یہ سوچ کر میں نے رانی کے حالات معلوم کرنے کی کوششیں اور تیز کر دیں۔ جلد ہی مجھے یہ اطلاع ملی کہ اس کا رشتہ کہیں نہیں ہوا ہے اور ابھی اس کے لیے رشتے کی تلاش جارہی ہے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے بعد میں نے فوراً ہی اپنی والدہ سے بات کی کہ آپ جلد ہی کریں، کیسے اس معاملے میں دیر نہ ہو جائے۔ قسمت نے مجھے یہ آخری سوچ دیا ہے۔ کچھ دنوں بعد میری بار بار خوشخبرہ اور کوششوں سے والدہ میرے والد کو منانے اور تامل کرنے میں کامیاب ہو گئیں اور وہ اس رشتے کے لیے تیار ہو گئے۔

خدا خدا کر کے دو دن بھی آ گیا، جب میری والدہ، والد اور میری خالہ میرا رشتہ لے کر رانی کے گھر پہنچے، تھوڑی سی سیل و جھت کے بعد رانی کے والد اور والدہ اس رشتے کے لیے تیار ہو گئے۔ حقیقت میں جب مجھے میری والدہ نے بتایا کہ انہوں نے تمہارا رشتہ قبول کر لیا ہے تو کچھ لمحوں کے لیے میں تو بے خود سا ہو گیا اور مجھے یقین ہی نہ آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ میں خود بھی حیران تھا کہ کیا واقعی رانی مجھے اتنی جلد نال جانے کی، بہر حال یہ میری زندگی کا ایک بہترین لمحہ تھا اور میں اپنے آپ کو اس ہفت دن کا خوش قسمت انسان سمجھ رہا تھا۔

در اصل بات بھی کچھ ایسی ہی تھی کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی شے کی طلب کرے کہ جس کا حاصل کرنا بہت مشکل، بلکہ ناممکن ہو اور پھر وہ شے اس کو تھوڑی سی حد و جہد تک، وہ وہ اور ذرا سی کوششوں سے حاصل ہو جائے تو اس کی حالت کیا ہوگی؟ بہر حال میرا رشتہ طے ہو گیا اور کچھ عرصے بعد میری شادی رخصت یعنی رانی سے ہو گئی اور وہ دہن بن کر میرے گھر آ گئی۔

رانی کا ملنا تھا کہ میری زندگی میں جیسے بہار آ گئی اور مجھے ساری دنیا کی دولت مل گئی ہے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جب قسمت مہربان ہو تو کیا گل کھلاتی ہے۔ رانی کہا کرتی تھی کہ مجھے قسمت انہم کا خزانہ مل گیا۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانا، کوئی انتہا نہ رہی۔

باہنوں کی طرح ستائے جا رہے تھے۔ ہمارا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ جب مجھے بعض ترہی زرائع سے اس بات کی تصدیق ہوئی کہ رانی کے والدین اس کے رشتے کے بارے میں بہت متعجب ہیں اور ان کی کوشش ہے کہ جلد از جلد ان کی شادی ہو جائے تو یہ سن کر اور جان کر میری تو حالت ہی غیر ہو گئی، مگر مجبوراً رہے بس انسان کر ہی کیا سکتا ہے، پھر بھی میں نے ہمت نہ ہاری اور اپنے آپ کو سنبھالتا ہی رہا۔

میرے والد نے جب میری یہ حالت دیکھی تو انہوں نے مجھے بلایا اور مجھے زمانے کی اوجھڑی سمجھانے لگے اور کہا: "میاں صاحب زادے اپنی حالت ٹھیک کرو، شاید آئیں میرے بارے میں پوری معلومات حاصل ہو سکتی تھی۔ وہ بولے۔" ختم کر دو یہ جتنو لیں اور یہ ذرا ما، زندگی اس طرح نہیں گزرتی۔ زندگی ایک سچ حقیقت ہے۔ خواہیں کے سہارے اور محض جذبات سے اسے گزارنا آسان نہیں ہے۔ صرف ایک لڑکی کی خاطر زندگی اور اپنا مستقبل داؤ پر لگا دینا کہاں کی ٹھنڈی اور دانائی ہے۔ اگر تم اس پلکے سے نہ دیکھو تو سمجھ لو میں تمہیں اپنی تمام جائیداد سے عاق کر دوں گا، پھر تم چانو اور تمہارا کام۔ مجھے مزید تمہارا بوجھ برداشت نہیں، تم اس بات کو خوب اچھی طرح سوچ لو۔" میں خاموشی سے ان کی تمام باتیں سنتا رہا اور پھر ساری رونا اپنی والدہ سے جا کر بیان کر دیا۔ میری والدہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ ان سے میری حالت پر شدیدہ نہ تھی۔ میں نے ان سے کہا: "میں سب کچھ کروں گا، مگر میری ایک شرط ہے کہ میری شادی میری پسند یعنی رانی سے کر دو۔"

انہوں نے پہلے تو مجھے خوب ڈانٹا اور سمجھانے کی کوشش کی، مگر میری خد کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور بولی: "میں اس معاملے میں مزید تمہارے والد سے بات کر دوں گی۔" یہ بات سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اب مجھے یہ فکر کھانے جارہی تھی کہ اگر اس مسئلے



طرح سے دل جوئی کی، مگر نہہاری یاد نہہارے ساتھ گزرے ہوئے لمحات اور وہ دہنت میں کیسے بھول سکتا ہوں، جو نہہاری آغوش، نہہارے چہرے اور نہہاری محبت میں گزار چکا ہوں۔ رر وقت، دو شاعر ماضی ہر دہنت مہرئی نظروں کے سامنے کسی فلم کے باؤگار سین کی طرح رہتا ہے۔

میں ہر دم تمہیں اپنے خیالوں میں محسوس کرتا ہوں کہ شاید تم گھر کے کسی حصے سے آ جاؤ گے اور مجھ کو یاد دلاؤ گی، مگر یہ سب محض ایک وہم اور صرف ایک خیال ہے اور ان کے سوا کچھ نہیں۔ تم جو مہرئی زندگی تھیں، ہر دہنت، ہر گزرتی میرے اُس پاس موجود رہتی ہو۔ رانی میں تمہیں کبھی اپنے آپ سے جدا نہ کر سکیں گا۔ یہی بادیں، میری زندگی کا سرمایہ اور مستقبل ہیں۔ میرے چہرے کا سہارا ہیں۔ اب مجھے کسی سے کچھ نہیں لینا، مجھے جو کچھ ملنا تھا مل چکا۔ آج میں دنیا سے ہٹ کر اپنی ایک الگ دنیا بسائے بیٹھا ہوں۔ رانی تمہاری یاد، تمہارا تصور کسی دہنت مجھے بننا چھوڑتے ہی نہیں، میرے ارد گرد تمہاری یادیں کا جھوم ہر دہنت موجود رہتا ہے۔ میں اکہلا نہیں ہوں۔ میرے والدین، میرے دوست سب مجھ سے کہنے ہیں کہ نکا، اس یادوں کے چکر سے اور اپنی زندگی کو ناکام نہ کرو۔ کیسے گزرے گی یہ لمبی زندگی؟ مگر میرا ان سب کو ایک ہی جواب ہوتا ہے اور وہ ہے کہ میں نے کسی کے ساتھ عہد کیا ہے اور میں اپنا عہد کسی طرح اور کسی حال تو نہیں سکتا۔

مجھے اندازہ نہ تھا کہ قسمت میرا اتنا بڑا امتحان لے گی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میرا سب کچھ اتنی جلدی ختم ہو جائے گا، مگر رانت نے میرے ساتھ بہت زیادہ امان کیا ہے۔ اس بات کو شاید کوئی نہ سمجھ سکے۔ میں اس سچ کی مانند ہوں جو سحر ہونے سے بہت پہلے ہی بجھ گیا ہے۔ رانی میں تمہیں ساری زندگی بھول نہ سکوں گا، یہ میرا ایک بار پھر تم سے عہد دانا ہے کہ مہرئی زندگی صرف تمہاری یادیں گزرے گی، صرف تمہاری یاد میں۔



میرے احباب، دوست، عزیز واقارب سب کے سب حیران تھے کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟

میں نے اور رانی نے اپنی زندگی کا آغاز بڑے خوب صورت انداز میں کیا۔ دو ایک بہترین ساگھی اور میرے والدین کے لیے ایک بہترین بہو ثابت ہوئی۔ مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ رانت گزرتا رہا۔ میں اور رانی دہنت کا مذاق اڑاتے دنیا دنیا سے بے خبر ایک دوسرے کی محبت میں گم اپنا آپ کو بھولتے تھے۔ مجھے دنیا کی ہر شے رانی کی شکل میں مل چکی تھی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی۔ وقت رے پاؤں گزرتا رہا۔ گزرتا رہا اور پھر مہرئی بد قسمتی کا آغاز اس وقت سے ہوا کہ جب میرے ہاں بچے کی پیدائش کا مرحلہ آیا تو ڈاکٹر نے کہا کہ پیدائش میں کچھ پیچیدگی آسکتی ہے، مگر فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔

ڈاکٹروں نے مجھے بہت نصیحتیں دہانی کرانی تھی اور پھر میں اور رانی خود بھی اس دالے سے مطمئن بننے، پھر جب رانی تم نے ایک بیٹے کو جنم دیا، چوں کہ کیس کچھ پیچیدہ تھا، لہذا تمہارا آپریشن ہوا، پھر دو دن آپریشن اچانک تمہیں دل کا شدید دورہ پڑا، جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوا اور میں تم سے ان نازک نبوڑ پر مل بھی نہ سکا، تم سے بات بھی نہ کر سکا، اتنی مہلت ہی نہ ملی، بلکہ تم نے اتنا موقع ہی نہ دیا۔ میں جو رات دن تمہارے فریب، نہہارے پاس، سامنے کی طرح موجود رہتا تھا، آخری دہنت نہہارے پاس نہ بننا۔ تم مجھے دنیا میں نہہارا کیا چھوڑ کر بہت دور چل گئیں۔ مہرئی محبت و چاہت کی شام قسمت سے بہت پہلے مجھ سے دور ہو گئی۔

مہرئی دنیا میں تارک ہو گئی۔ میں جو اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین شخص سمجھتا تھا، اچانک بد قسمتی اور بد نصیبی کے تاریک گڑھوں میں جا گرا تھا جہاں ہر طرف تاریکی تھی، گھب اندھیرا تھا اور میرا گزرا ہوا ماضی تھا۔ اب میری زندگی بے مقصد اور بے معنی تھی۔ رانی نہہارے بعد مجھے تیرے جاننے والوں نے بہت محبت اور بہت چہارہ یاد اور مہرئی ہر

## دوسری مرد کہانی

### انسانیت کی اہمیت

#### غدر اور دوس

پیسے کے لیے لوگوں کا خون بہانے والے ایک مرد کی داستان خوب

حالت تو سمجھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ بیمار تو دہیلے ہی تھیں، اور بس گھر میں کھانے کے لالے بڑے تھے۔ مجاہد کی بیروزگاری کو انہوں نے اپنے ذہن پر کچھ زیادہ ہی غاری کر لیا تھا۔

”بیویوں کا کچھ انتظام ہوا، بچوں کی فیس جمع کرانی ہے، گھر میں راشن کی چیزیں الگ ختم ہو رہی ہیں۔“  
”صائم نے سوالیہ نظروں سے مجاہد حسین کو دیکھنے ہوئے کیا۔

”صائم تم جا کر آرام کرو، بیویوں کا بھی انتظام ہو جائے گا۔“ صائم نے کمرے سے باہر نکلنے ہی دو گرتی سے قبل گھر کو پھرتے گا۔

بڑے اچھے دن تھے جو گزر گئے، اب شاید وہ دن لوٹ کر آئیں۔ درمیانے درجے کی مناسب زندگی گزر رہی تھی، اہلے پوائے ہفتوں میں برتنوں کی دکان کھولی تھی جسے جو ان ہونے کے بعد مجاہد چھوڑا تھا۔ وہ جو کچھ کما، خرچ کم کرتا، دکان میں زیادہ لگا تا۔ مجاہد نے گویا درد سے آنکھیں بند کر لیں، دکان کا خیال آتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، کئی مشکل سے اس نے اپنی دکان برائی تھی مگر یہ سیاست دان کیا جائیں۔ اپنی سیاست

کمرے سے ماں کی آفتی ہوئی کھانسی کی آواز سے مجاہد حسین کے اٹھنے ہوئے قدم رک گئے۔ اس نے سر اٹھا کر ماں کے کمرے کی طرف دیکھا۔  
”سین ذرا ادھر آئے گا۔ ماں کی دوا کھل سے ختم ہو چکی تھی، میں نے اب کو بنا ہوا تھا۔ دیکھیں ماں کی کھانسی رکنے کا نام نہیں لے رہی ہے۔“

”صائم! میرے پاس پیسے کہاں ہیں؟ جر میں ماں کی دوا لے کر آتا۔ میں تمہاری طرح صابر و دشا کر نہیں، غربت اور مفلسی کی آتش میرے کانٹوں پر، اب تکلیف دینے لگی ہے، جو ان بننے کے ہوتے ہوئے ماں دوا کے لیے زنت سے یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔“ دوسرے دل میں سوچ کر رد گیا۔ کہنے کا حوصلہ اس میں کہاں تھا۔

”صائم میں ماں کے پاس ہوں تم نیم گرم پانی بوتل میں ڈال کر لے آؤ اور ماں کے سینے کی اس سے یہ نکالی کر دو۔ ہو سکتا ہے اس سے کچھ فائدہ ہو جائے۔“  
صائم نے چار پائی برس اپنے وجود کو سمیٹا اور باورچی خانے کی طرف ٹپل دیا۔ مجاہد یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو وہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔  
یہ روز کی کہانی تھی یاداری، دکھ، مجبوری ماں کی

جہاد کو محسوس ہو رہا تھا یہ آگ اس کے جسم میں لگائی  
گئی ہو۔ اس نے اس وقت یہ نہ دیکھا کہ وہ تنہا  
ان لڑکوں سے کیسے بنے گا جو طرح طرح کے نعرے  
لگا رہے تھے اور دکان میں چلا کر، شیشے توڑ کر خوش  
ہو رہے تھے۔ جہاد ان لڑکوں سے بچ رہا۔ طاقت  
کے نشے میں چور ان لڑکوں نے اسے روٹی کی طرح  
دھنک کر رکھ دیا۔ ہوش آیا تو وہ اسپتال میں پولیس  
کے سوال و جواب کی زد میں تھا۔  
گزر رہے تھے اس کے جسم کے زخموں پر

چکانے کے لیے ان کا کام آئے دن نئے نئے  
تھاڑے کرنا ہے۔ ان کے احتجاج اور آئے دن کی  
ہزتاؤں نے عوام کا جینا دو بھر کر دیا تھا۔ جس کا دل  
چاہتا کاروبار زندگی بند کر دیتا۔  
بڑے بڑے اور خوب صورت مکانوں میں  
ہزتاں والے دن بہترین کھانے پکانے جاتے۔ دنیا  
کے سامنے ایک دوسرے کے مخالف۔ ایک دوسرے  
سے دوستانہ ماحول میں ملاتا تھا کرتے ہیں اور یہ  
بھول جاتے ہیں کہ ملک کی اکثریت کے گھروں میں



شہر اور گاؤں نہ بچ سکا۔ نوکری کی تلاش میں وہ ان  
سڑکوں پر مارا مارا پھرنے لگا۔ جہاں بھاری ڈگریوں کا  
پروجہ اٹھانے لوگ سڑکوں کی خاک چھانتے ہیں اور  
چڑاؤں کی نوکری کرنے پر مجبور ہیں پھر بھلا جہاد جیسے  
انٹریاں کو ملازمت کہاں لائی۔ لوگوں کی نظریں جہاد جیسوں  
کی طرف ہوتی دکان پر بھی تھیں کہ وہ کسی طرح اسے ادا  
پونے فروخت کر دے اور بلا آخر اسے یہ قدم بھی اٹھانا  
پڑا۔ کیوں کہ دکان کی نئے سرے سے خریدیں اور آرائش

شاید کھانے کے لیے بچو نہ ہوگا۔ کئی چار وقت پر  
مناسب علاج نہ ہونے کے باعث زندگی کی بازی  
بارگئے ہوں گے۔

جہاد حسین کا قصور یہ تھا کہ اس سے ہزتاں  
والے دن دکان کھولنے کا جرم سرزد ہو گیا تھا۔ وہ شہر  
ابھی پوری طرح کھول بھی نہ پایا تھا کہ شہر پسندوں  
نے پائیس کی ایک تیلی اور پیڑوں کی ایک بوتلی سے  
اس کی دکان میں آگ کے شیشے بجز کا دیے تھے۔

ہوئی زندگی گزار رہی ہے۔ پیسے نہ ہونے کی وجہ سے جس کا علاج بھی ٹھیک طرح سے نہیں ہو پا رہا تھا۔ میں کیا کروں؟ عجبائے سر میز کیا۔

”چلو کہیں چل کر بیٹھے ہیں۔“ وہ دونوں ساحل سمندر کے نزدیک بنی ہوئی چٹان پر بیٹھ گئے۔

”اب تاؤ تم کیوں خود کشی کرنا چاہتے ہو؟ اگر مرنا ہی تمہارا مقصد ٹھہرا تو ایسی موت مٹھے لگاؤ جس سے تمہارے بعد تمہارے گھر والوں کو ناکہ نہ پہنچے۔“

”جتنی شخص کے پیڑھے پر سناک سکرناہٹ اور بھری۔“  
”بھلا میری موت سے تمہاروں کو کیا ناکہ پہنچ سکتا ہے۔ لہذا مزید مصیبتوں میں گرفتار ہو جائیں گے۔“

”پہلے تم اپنی سزاؤں وہ کیا وجوہات ہیں جن کی وجہ سے تم حرام موت مرنے کے لیے تیار ہو۔“

اس شخص کے الفاظ میں جانے کیسی ہمدردی چھپی ہوئی تھی۔ عجبائے حسین نے اس کے سامنے اپنی زندگی کی پوری کہانی کہہ ڈالی، دل کا غبار کسی کے سامنے تو نکالنا ہی تھا۔

”اودا تمہارے ساتھ بہت برا ہوا مگر کیا کیا باپ نے ہمارے ملک میں تم جیسے کنی لوگ بھرے پڑے ہیں، کوئی ان کا پرسان حال نہیں ہے۔ ایسے لوگ اپنا گھر چلانے کے لیے کسی بھی قسم کی نوکری کے لیے تیار ہیں، مگر کیا کیا باپ نے یہ روزگاریں بڑھ گئی ہے۔ اگر تم روزگار کے حصول کے لیے کچھ بھی کرنے کے لیے تیار ہو تو مجھ سے رابطہ کرنا۔ یہ لوہیر اپنا اور دونوں نمبر۔“

”آپ مجھے کام بتائیں میں کرنے کے لیے تیار ہوں۔“ عجبائے سند سے بے اختیار نکلا۔

”ابھی تم اچھی طرح سے سوچو اس کام میں تمہاری ماں جانے کا پورا بائیس ہے، مگر بدلے میں تمہارے گھر والوں کو مستقبل دم گارنٹی کے ساتھ ملے گی، ٹھیک ہے۔“ اس سے پہلے عجبائے کچھ مزید پوچھتا، وہ شخص اٹھ کر چلا گیا۔ عجبائے ہاتھ میں اس کے ویسے ہوئے کارڈ کو اٹ پالت کرنے لگا۔

رات گئے تک وہ سمندر کی شور مچاتی لہروں کو دیکھتا رہا۔ لیکن اس کے دل کی آواز اس کا راستہ روک لیتی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ گھر والے کتنا پریشان

کے لیے بھی بھاری سرباپہ درکار تھا، جو عجبائے حسین کے بس سے باہر تھا۔ گھر کا خرچ چلانے کے لیے بھی پیسوں کی ضرورت تھی اور پہلے ہی علاج پر کافی رقم خرچ ہو گئی تھی۔ سوچتے، سوچتے اس نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ زندہ نہیں رہے گا، موت ہی اس کے مسائل کا آخری حل تھی۔ اسے اس بات کا احساس تھا وہ جو کچھ کرنے جا رہا ہے وہ ٹھیک نہیں، مگر اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔

اگلے دن اودا سمندر کے کنارے پہنچ گیا۔ وہ کئی دنوں کے سمندر میں بڑھا اتار آگے اسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ اب ذہب ہی ہائے گا، مگر ذہب کا خوف اسے دوبارہ چھپے جا سنے پر مجبور کر دیتا۔

”کیا بات ہے بھائی؟ کیا مرنے کا یہ گرام بنا کر آئے ہو۔“ اسے اپنے پیچھے آواز سنائی دی، ساتھ ہی کسی نے مضبوط ہاتھوں سے اس کے کندھوں کو پکڑ لیا۔ عجبائے حسین نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس کے پیچھے درمیانی عمر کا لمبے قد اور بھرے جسم کا حامل شخص کھڑا دکھائی دیا۔

”کیا پریشانی ہے تمہیں تاؤ؟ ہو سکتا ہے میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں، اسے خاموش رکھ کر دہرا دہرا۔“

”آپ میری کس کس پریشانی کو حل کریں گے۔ میں تو اپنی زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی الفاظ اس کی زبان سے نکلی گئے، یہ بانٹتے ہوئے بھی کہ وہ شخص ایسی ہے۔

”تم کیا سمجھتے ہو موت کو گلے لگانے سے تمہارے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ تم جن لوگوں کو اپنے پیچھے چھوڑ کر جاؤ گے انہیں تمہاری زندگی سے زیادہ دولت کی ضرورت ہے۔ اگر زندگی کا سودا کرنا ہے تو انسان اپنے پیچھے اتنا چھوڑ جائے کہ وہ لوگ جن کا وہ سہارا ہے محتاج نہ ہوں، اس دنیا میں انسانی جان سب سے سستی چیز ہے کیا سمجھے؟“

”جتنی شخص کی اس بات پر عجبائے کی نظروں کے سامنے اپنے تین منقسم بچوں کا چہرہ ٹھوم گیا۔ وہ انہیں اور اپنی بیوی کو کس کے سہارے چھوڑ کر جا رہا تھا، اس دنیا میں جو افسانوں کا نہیں درندوں کا جنگل ہے، بیمار ماں جو سستی



کل ہر حال میں اس انہی شخص سے جس کا نام نذرا احمد کا ڈپرورج تھا، اس سے ضرور ملاقات کرے گا۔  
 ”مجھے سو فیصد یقین تھا تم ضرور آؤ گے۔“ نذرا احمد نے اٹھے دن اسے اپنے سامنے سو جودیا کر کہا۔

”کہا کروں میرا دن وقت تو اب ہی مجھے امید کی کرن دکھائی دے رہی تھی۔“ مجھ پر تو ہر روز اندھ بوجھ لگتا تھا دنوں میں ساتھ دینے والے دوست، احباب نے آنکھیں پھیر لی ہیں۔ برے دنوں میں کون سا ساتھ دیتا ہے؟“

”وہ کچھ مجاہد یہاں کوئی کسی کا دوست نہیں۔ بہ جو میں تم سے سب سے منہ پٹ کر رہا ہوں، ان میں میری غرض کبھی ہوتی ہے۔ مجھے تم سے کام ہے جو دن بکچھ اور کچھ دو کے اصول پر چل رہی ہے۔“ نذرا احمد نے صاف لفظوں میں کہا۔

”اب مجھے کام بتا کر۔“

”وہ تو میں بتاؤں گا مگر یاد رکھو۔ بات بنانے کے بعد شاید تم اپنے قدموں داہیں نہ جا سکو۔ تمہاری زندگی کی گارنٹی میں نہیں دوں گا۔ اگر تمہیں میری دنی بونی آخر منظور ہوگی تب میں تمہیں اپنے ساتھ دہشتہ دوسرے لوگوں سے ملانا دوں گا۔ کام بڑوں لوگوں کا نہیں ہے۔“

”کہہ کر نذرا احمد اسے کام کے مفصلین بتانے لگا۔“

”نہیں میں یہ کام نہیں کر سکتا، یہ کہاں کی انسانیت ہے، میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔“

”نہ چاہو کام ڈھونڈ لو، رہنا اپنے گھر والوں کو ملاوک احوال دیکھنے رہو اور اگر نہیں دیکھ سکتے تو زہر دے کر اپنے ساتھ نہیں بھی ختم کر دو، ہم اگر تمہاری دنی بونی آخر سے تمہارے بچے نہیں تو کریں گے۔ تم یہاں پر بیٹھ کر اچھی طرح سمجھو، سوچو اور عمل چاہو جس نے کہی ہے۔ تک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ قسمت نے تمہیں آزار کس سے ات دیا چار کیا تھا۔ نذرا احمد کی بات اپنی جگہ درست تھی۔ جب شریں بندوں کی وجہ سے وہاں حال ہی پہنچا ہے تو اسے کسی سے ہمدردی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن انسانیت بھی تو کوئی چیز ہے۔ دل اور دماغ کی شخصیت جارحی۔ خیر و شر کی اس جنگ میں پلا خورشطان غالب آ گیا۔“

”ساتھ میرے ملک سے باہر جانے کا انتظام ہو گیا ہے اب ساری پریشانیوں دور ہو جا جس کی، اس ملک میں

ہوں گے۔ ساتھ ہار بار و روز سے کے پتھر ڈکاری ہوگی اور روز سے بڑا ہوا پرودا تھا کر باہر کی جانب دیکھ رہی ہوگی۔ اہل کی بوجھ لگتا ہے اس کی راد تک رہی ہوں گی اور بچے اس کے منتظر ہوں گے۔ بچوں کا خیال آنے ہی اس کی آنکھوں میں اداسی اترتی۔ جب وہ گھر میں داخل ہوتا تھا، بچوں کو قہقی آس ہوتی تھی کہ وہ پھل یا سٹافنی لے کر آیا ہوگا مگر ایک دو سب سے اس کے پاس اکاؤنٹ میں موجود رقم بھی ختم ہو گئی تھی۔ بچے جب اسے خالی ہاتھ دیکھتے تو ان کی آنکھوں میں ماہی کی جھلک کو دیکھتی طرح حسوس کر سکتا تھا، پھر دوسرے، دوسرے قدموں سے وہ گھر کی طرف چل دیا۔

”آج آپ صبح سے کہاں غائب تھے؟“

ساتھ نے دل ردنی لڑے میں سجا کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا، چپ چاپ کھانا کھانے لگا۔

”نو کوئی کی کہیں بات ہوئی، اب تو اس گھر میں مفلسی نے ڈرے ڈال لیے ہیں، آخر میں کب تک مہر کا واس تھا ہے بیٹھی رہوں۔ میں بھی تنگ آ گئی ہوں۔“

”تمہارا کہا خیال ہے میں کوشش نہیں کر رہا۔ مجھ سے زیادہ کس کو اس گھر کی پریشانی کا احساس ہوگا، جاؤ یہاں سے میں پہلے ہی بہت تنگ ہوا ہوں، گھر میں

تھکنے ہی دہی تھکے پے سوالوں کی گھبراہٹ ہو جاتی ہے۔ وہ جہاں یا نذرا احمد چپ چاپ ڈرے اٹھا کر چلی گئی اور

نابہ حسین اس کے سراپے میں اس کا کھو با وجود تلاش کرنے لگا۔ جس کے سرخی ماہل رخساروں کی رنگت

چہلی بڑ چلی تھی اور بڑیاں اچھر کر خدا کی کمی کا شکر کر رہی تھیں۔ وہ ساری دنیا کی تعین جس کے قدموں

میں ڈالنے کے وعدے پر ساتھ کولا بانہا، وہ ساتھ تو کہیں کھنگلی تھی، مجاہد حسین دل میں خدا سے شکوہ کرنے

لگا۔ مہرے رب زبیری رحمت کہاں ہے۔ میں کمزور

تا تو اس انسان آزار کس سے گھبرا گیا ہوں۔ زندگی جیسی نعمت مجھے اب بوجھ حسوس ہوتی ہے، مجھے معاف

کرو۔ دل ہی دل میں اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ

دن کے گیارہویں بجے تھے اس وقت صائمہ کا مہوں سے فارغ ہو کر انہیں اخبار پڑھ کر سنانی تھی۔ گزشتہ روز ہونے والے دھماکے کی تفصیلات اخبار میں موجود تھیں۔ دھماکے میں ٹلوٹ ہونے کے شہر میں کئی لوگوں کو جراثیم میں لپا گیا تھا جن سے تحقیقات جاری تھیں۔

”پانسٹیں اہل ملک کا کیا بڑے۔ آئے دن خود کش دھماکوں سے کتنی قیمتی جانیں ضائع ہوتی رہتی ہیں۔ ذرا بل بھی تو صائمہ گنگو اور صوری چموز کر دو اور دھمکنے چلی گئی۔ دروازہ کھولتے ہی پولیس کی وردی میں ملبوس افراد اس کو تفریبا دھمکنے بولے اندر داخل ہو گئے۔

”کون ہیں آپ لوگ، کیا کر رہے ہیں یہ“ دھمکنے ہوئے بولی۔

”یہ مجاہد کا ہی گھر ہے؟“ آنے والوں نے استفسار کیا۔

”کیا ہاں، مگر مجاہد گھر نہیں۔“

”ہاں نہیں پتا ہے مجاہد جہاد پر گیا ہوا۔“ ان میں سے ایک نے صائمہ کو جواب دیا۔

”ٹاشی لو پورے گھر کی۔“ ایک پولیس اہلکار نے جو نائبان کا افسر تھا، نے بانی ساتھ آنے والوں کو حکم دیا۔

”سر یہ رقم براہ ہوئی ہے۔ ایک اہلکار نے لفاظ اپنے افسر کی طرف براہتے ہوئے کہا۔

”ان کا گند کے پرزوں کے بدلے تم لوگ مصحوم لوگوں کی جانوں سے کھیلے ہو اور اسے جہاد کا نام دیتے ہو، تمہیں بھی تو اسے شوہر کے کالے کر تو توں کو ظلم ہوگا نا اور یہ بات تم ابھی طرح جانتی ہوگی کہ کھل کیے جانے والے دھماکے میں مجاہد بھی ٹلوٹ تھا۔ گرفتار کرو سب کو۔“

صائمہ جھین جھین آنکھوں سے یہ سب سن رہی تھی، اس کو اپنے سارے وجود سارے گھرتے بارود اور انسانانی خون کی پونجوں سے بھری تھی۔ ”نہیں نہیں، میرا مجاہد ایسا نہیں تھا، وہ تو برائے دکھ پر بھی تڑپ اٹھتا تھا۔ اس نے تو کبھی کسی چیز کو بھی ایذا پہنچانے کا نہیں سوچا تھا۔ یہ

سارے حالات ہم سب کے کم سب کے جیوا کر رہے ہیں ہم سب مجرم ہیں، جن کی وجہ سے مجاہد اپنے آپ سے ہار گیا۔ حالات سے ہار گیا، انسانیت سے ہار گیا۔“

ہم غریب عزت سے گرا کر انہیں کر سکتے۔“ مجاہد حسین صائمہ کو سامنے بٹھا کر سمجھا رہا تھا۔ جو اس کے آئی دور چلے جانے کی خبر سے کافی پریشان نظر آ رہی تھی۔

”نہیں اپنے بچوں کو چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے یوں ترستا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ میری ہڈی ماں و دادوں کے انتظار میں تھیں رہتی ہے اور تم؟ میں جانتا ہوں کہ اٹھے کپڑے زلیو عورت کی مزدوری ہوتے ہیں جو میں تمہیں مہیا نہیں کر پارہا، میں نہیں جانتا یہ محرمہاں مجھے تمہاری محبت سے محروم کر دیں، میں تو تمہاری محبت اپنے ساتھ قبر میں بھی لے جانا چاہتا ہوں۔“ آخری جملہ مجاہد نے قدر سے اٹکتے ہوئے کہا۔

صائمہ ایک دم تڑپ کر مجاہد حسین سے پست گئی۔ ”اللہ نہ کرے مجاہد ایسا بائیس نہ کریں۔“

”موت اور زندگی کا کس کو پتا ہے۔ بس تم اور بیٹے میری مغفرت کی دعا ضرور کرو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے صائمہ کے گال چھینے۔

مجاہد حسین کو گھٹنے ہوئے 15 دن ہو گئے تھے۔ گھر والے اس کی کمی کو بہت محسوس کر رہے تھے مگر اچھے دنوں کی اس میں جدائی کا یہ زہر بہر حال چنا تھا۔

اس روز وہ سب فی دی کی آگے بیٹھے اپنا پسندیدہ پروگرام دیکھ رہے تھے۔ مجاہد حسین نے پہلے ہی انڈیا اس کی رقم کیسج دی تھی۔ رقم دیکھ کر صائمہ بہت جبرائلی تھی جو کہ اگر دیکھا جائے تو کئی بیٹیوں کی نواہ کے برابر تھی۔ یہ رقم اس کو ایک شخص دے کر گیا تھا، جو صورت شکل سے علامت غیر کا لگ رہا تھا۔ رقم صائمہ کے حوالے کرتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ دوسری قسط بھی جلد مل جائے گی۔ اچانک فی دی پر بریکنگ نیز چلنا شروع ہو گئی، خود کش حملہ آور نے جلوس میں دھماکا کر دیا۔ کئی انسانانی جانیں ضائع ہونے کا

خوشہ اور پھرا ہستہ آہستہ تفصیلات آنا شروع ہو گئیں، دھماکے میں کئی لوگ ہلاک ہو گئے تھے، جبکہ زخمیوں کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

”ہائے، ہائے کیا زمانہ آ گیا ہے، مسلمان ہی مسلمان کی جان لے رہا ہے۔ یہ گناہ لوگوں کا کل ہو رہا ہے، یہ تو قیامت کی نشانی ہے۔“ اماں لینے لینے خبر کو سنتے ہوئے پولیس۔

”ہائے، ہائے کیا زمانہ آ گیا ہے، مسلمان ہی مسلمان کی جان لے رہا ہے۔ یہ گناہ لوگوں کا کل ہو رہا ہے، یہ تو قیامت کی نشانی ہے۔“ اماں لینے لینے خبر کو سنتے ہوئے پولیس۔

”ہائے، ہائے کیا زمانہ آ گیا ہے، مسلمان ہی مسلمان کی جان لے رہا ہے۔ یہ گناہ لوگوں کا کل ہو رہا ہے، یہ تو قیامت کی نشانی ہے۔“ اماں لینے لینے خبر کو سنتے ہوئے پولیس۔

”ہائے، ہائے کیا زمانہ آ گیا ہے، مسلمان ہی مسلمان کی جان لے رہا ہے۔ یہ گناہ لوگوں کا کل ہو رہا ہے، یہ تو قیامت کی نشانی ہے۔“ اماں لینے لینے خبر کو سنتے ہوئے پولیس۔

”ہائے، ہائے کیا زمانہ آ گیا ہے، مسلمان ہی مسلمان کی جان لے رہا ہے۔ یہ گناہ لوگوں کا کل ہو رہا ہے، یہ تو قیامت کی نشانی ہے۔“ اماں لینے لینے خبر کو سنتے ہوئے پولیس۔

”ہائے، ہائے کیا زمانہ آ گیا ہے، مسلمان ہی مسلمان کی جان لے رہا ہے۔ یہ گناہ لوگوں کا کل ہو رہا ہے، یہ تو قیامت کی نشانی ہے۔“ اماں لینے لینے خبر کو سنتے ہوئے پولیس۔

”ہائے، ہائے کیا زمانہ آ گیا ہے، مسلمان ہی مسلمان کی جان لے رہا ہے۔ یہ گناہ لوگوں کا کل ہو رہا ہے، یہ تو قیامت کی نشانی ہے۔“ اماں لینے لینے خبر کو سنتے ہوئے پولیس۔

”ہائے، ہائے کیا زمانہ آ گیا ہے، مسلمان ہی مسلمان کی جان لے رہا ہے۔ یہ گناہ لوگوں کا کل ہو رہا ہے، یہ تو قیامت کی نشانی ہے۔“ اماں لینے لینے خبر کو سنتے ہوئے پولیس۔

## تیسری مرد کہانی

قلمی اوراد

اوریب مسیح چمن



قلمی روزنی کے نام پر پتلا دھونے والے ایک مجرم کی کہانی

www.paksociety.com

یہ بات ہے ہرے اسکول کے زمانے کی قلمی روزنی کے شوق کی، ان دنوں اخبار کے صفحات کراشل اور کاروباری اشتہارات سے لبریز نہیں ہوا کرتے تھے۔ ہر اخبار کا ٹائٹل اور ایڈیٹر ٹیکہ پاکستان، صحافت اور کرب سے گزرا تھا۔ حقیقت میں بڑے بڑے نام تھے اور بڑے بڑے شخص تو مہن کے لوگ بنا کرتے

نہایت برا تجربہ ہوا اور اصل گرو سے واقعات اور حالات ہی زندگی کی حسین یادیں ہوا کرتے ہیں۔ ہم ان کو یاد کر کے ایک انجمنی خوشی، آوازی محسوس کرتے ہیں۔ میں کیا آپ کسی بھلا کون ہے جسے اپنے بچپن کی ذمہ داری اسکول و کالج کی حسین یادوں سے چار نہ ہوگا، یہ بھی وہ اصل میری اس ذمہ داری کے دور کی کہانی ہے۔



تھے۔ اتوار کے روز اخبارات میں بچوں کا صفحہ آتا تھا۔ اخبارات میں اپنے جیب خرچ سے جب تک لیکچر باجوب تک اب جانی نہ لپٹا ایک اسٹال میں کیا تھا اور پھر جب ہمارا چانک اسٹال ہو گیا پھر تو لوکارے تھے۔ پاکستان کے تمام اخبارات کے بچوں کے صفحات اور رسالے ہم خوب ہی بھر کر پڑھتے تھے۔ میں نے اپنی ذہنی پایا تھا، چنانچہ قدرت نے مجھے کہا یہاں تک تھے اور نظمیں لکھنے کا بھی ان دنوں تھا۔ ایک مرتبہ میں نے اپنا تعارف لکھی دوہتی میں دو ہوا۔ دو ہفتہ پانچ ماہ کے انتظار کے بعد اخبار میں ہمارا تعارف اور تصویر کیا آئی جناب سارے رشتے داروں میں اور کلمے میں محوم ہوئی، یہ ہی نہیں ان دنوں ملک جہاں جہاں تارے رشتے دار تھے وہاں سے بھی ایسا اور ای کے ہم خطوط آ رہے تھے۔ ان دنوں خط اور ٹیلی گرام ہی ملتے تھے۔ یہ وہاں شریکان قرآن کی چیز ہیں۔

ان دنوں نے کہا۔ ”بیٹا تو اختر عباس کو خط لکھ دے کہ وہ آ جائے، میں اسے اپنا بڑا بیٹا بنا لوں گی۔“ چنانچہ میں نے اختر عباس کو خط لکھ دیا کہ بھائی تم گھر نہ کرو میری امی نے اجازت دے دی ہے اور اب تم جب چاہو ہمارے پاس آ جاؤ۔ مجھے ہی اختر عباس کو میرا خط پڑھا، اس نے فوراً جواب لکھ مارا کہ دو بڑا خوش ہوا ہے، اللہ آپ کی امی کی عمر دوا کرے میں سے آپ کی امی کو انشاء اللہ ہمیشہ امی کی طرح عزت و وقار دوں گا۔ تم کو چھوٹا بھائی تصور کر کے سنبھالنے سے براہ کرم بیارو دو۔ آخر ایک دن صبح کی گاڑی کی آمد سے وہ ہمارے گھر آ گیا۔

ان دنوں باہمی کے شوہر جن کو میں اور سب بچے بھائی صاحب کہتے ہیں، ان کا جوتے بنانے کا چھوٹا سا کارخانہ تھا، مجھے انہوں نے کارخانہ کی دیکھ بھال کا کام سپرد کیا۔ ہوا تھا۔ مجھے ایوکا اسٹال بھی اسکول سے آنے کے بعد شام تک سنبھالنا ہوتا تھا۔ اور بھائی صاحب کا کارخانہ بھی تھا۔ اختر عباس کے آنے پر مجھے خوشی ہوئی، میرا خیال تھا کہ میں اسے یا تو بچہ جان کے یک اسٹال پر سنبھالوں گا یا پھر بھائی صاحب سے ملوا کر اسے کارخانہ کی دیکھ بھال پر مقرر کر دوں گا۔ لہذا اسے بھائی صاحب نے اپنے پاس لکھوا دیا، 18 برس کا نو عمر لڑکا تھا اور میری عمر پندرہ برس کے قریب تھی۔ والد نے اور میں نے اسے آگے تعلیم کا مشورہ دیا، مگر وہ شاید بڑھنے پر آمادہ نہیں تھا، میں نے کہا کہ باپ کو پوسٹ دیا گیا تھا۔ اب دو کارخانے میں دن بھر کیا ہیں، بالوں وغیرہ پر مہنتا رہتا تھا اور اس دوران کارخانہ کا کوئی کام ہوتا۔ بازار سے سامان وغیرہ لا کر دے دیا کرتا۔ اب وہ ہمارے گھر کا ایک فرد بن گیا تھا۔ ہمارے ساتھ آہٹا اٹھتا بیٹھتا اور ہمارے ساتھ ہی کھاتا پیتا۔ اس وقت وہ واقعی بھولا بھالا اور کم گوڑا کا

تھے۔ اتوار کے روز اخبارات میں بچوں کا صفحہ آتا تھا۔ اخبارات میں اپنے جیب خرچ سے جب تک لیکچر باجوب تک اب جانی نہ لپٹا ایک اسٹال میں کیا تھا اور پھر جب ہمارا چانک اسٹال ہو گیا پھر تو لوکارے تھے۔ پاکستان کے تمام اخبارات کے بچوں کے صفحات اور رسالے ہم خوب ہی بھر کر پڑھتے تھے۔ میں نے اپنی ذہنی پایا تھا، چنانچہ قدرت نے مجھے کہا یہاں تک تھے اور نظمیں لکھنے کا بھی ان دنوں تھا۔ ایک مرتبہ میں نے اپنا تعارف لکھی دوہتی میں دو ہوا۔ دو ہفتہ پانچ ماہ کے انتظار کے بعد اخبار میں ہمارا تعارف اور تصویر کیا آئی جناب سارے رشتے داروں میں اور کلمے میں محوم ہوئی، یہ ہی نہیں ان دنوں ملک جہاں جہاں تارے رشتے دار تھے وہاں سے بھی ایسا اور ای کے ہم خطوط آ رہے تھے۔ ان دنوں خط اور ٹیلی گرام ہی ملتے تھے۔ یہ وہاں شریکان قرآن کی چیز ہیں۔

لو جناب اخبار تعارف کیا آیا تھے کہ ایک کی روزانہ میں پانچ پانچ خطوط لکھ دینے کی ذہنی لگائی، پھر جب اور اخباروں، رسالوں میں ہمارا تعارف میں تصویر آئے تو روز پانچ لوگ آئے گی۔ چھوٹی موٹی کہانیاں، نظمیں، ہادی پینا شروع ہوئی تھیں، مسالاج ہم نے کس سے کس کی اس لکھنے والوں کی تحریر پڑھ کر ہی ان سے فن حاصل کرتے رہے۔ اور جنوں دوست بن گئے تھے۔ بلکہ دلش، مجھے بجا رہیں لکھتے ہوئے ان بھی میرا لہذا جاتا ہے۔ دو ہوا چارہ (ایسٹ پاکستان) میں شریکان پاکستان کیلئے تھا، کسی ساگر پاکستان میں ہوا تھا، کئی خان کی حکومت چل رہی تھی اور ہر چیز آسان اور سستی تھی۔ یہ ہی آج کی طرح بدست گردی کا زمانہ تھا اور نہ بہت فخری اور فخری و عاقبت کرنی کا۔

تو جناب ان کی دوستوں میں ایک دوست بہ خوب کے ایک علاقہ سے بھی بن گیا تھا۔ جس کا نام اختر عباس تھا۔ اختر عباس سے میری جب تک دوستی ہوئی شروع ہوئی تو اس نے آہستہ آہستہ ہر خط میں مجھے اپنے گھر کی حالات پتائیں حقیقت تھے یا دو فرضی لکھتا تھا، عمر میں مجھ سے تین چار سال بڑا تھا، لگھنوا شروع کر دیے۔ مجھے اس نے بتایا کہ اس کی ماں کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا ہے۔ اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی تھی اور اب میرے ساتھ میرے چھوٹے بھائیوں اور میرے باپ اور سوتیلی ماں کا سلوک ظالمانہ ہے جو میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ میں کیا کروں بھائی میری مدد کرو اور مجھے اپنے پاس حیدرآباد لیا لو۔ میں تمہارے ساتھ بڑا بھائی بن کر رہوں

چشمہ لگا ہے، مجھے سلام کر کے نمبرارے تا اس سے جس میں معلوم کر رہے ہیں، میں نے جا کر دیکھا، کچھ پوجو نہیں ہیں، میں نے پچھانا، مگر پھر بھی جانی پہچانی شکل معلوم ہو رہی تھی، مگر وہ مجھے پہچان گیا تھا، اس نے بڑھ کر مجھے گلے لگائے ہوئے کہا۔

”میں ہوں اب کا بڑا بھائی اختر عباس۔“  
 ”ار۔۔۔ میں خودی سے آشنا چیل گیا۔“

”ارے ارے تو ذرا کافی لیے چیز سے جوان بن گئے ہو ار۔۔۔ میں ہانسی نہیں پچھان رہا ہوں۔“ گھر میں امی سے ار ر مگر بھائی نہیں سے اور ادا ہونے بھی ادا ہونے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، امی نے بھی دعا میں دیا، اس نے بتایا کہ اس کے ادا آج بھی اس اس کو غیر سمجھتے ہیں، سوئیٹاں میں نے آتے رہتے نہیں دیا، بھائی ار ادا رہتے واروں میں رہتا رہا، مگر رننے واروں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ ادا نے کہا۔  
 ”بیانم فکر نہ کرو اب تم گہرے جوان ہو، رکان بند ہے۔ اس تم جا کر کہو اور تم بھی، ار سے بیٹے کی طرح سے ہو۔“

سیرت بھی ڈسے رار ہاں بڑھتی تھی، ظاہر ہے اخبار و سائلے سچ لینے جا تا تھا، رکان سچا تھا۔ گھر کا سووا سلف لانا، لگتا بڑھتا، وقت ہی نہیں ملتا تھا، ادا ر خر جانے کو۔

اختر عباس اب کہیں بائیس سال کا خوب صورت جوان بن گیا تھا، پہلے کی نسبت نیر طرار بھی ہو گیا تھا، آنکھوں میں جذباتی پن چھلکے لگا تھا، اکثر گھر میں ادا رکن پر ڈانٹتی لکھتا رہتا تھا، وہ بے بسی و ہمارے گھر کا ایک فرزند بن گیا تھا اور میری ہی وجہ سے وہ سب کہ پسند تھا، مگر۔۔۔ میں نے محسوس کیا کہ اختر مجھ سے بہت حق بانٹتا چھپاتا ہے۔ اب وہ پہلے کی طرح مجھ سے بے تکلف ہو کر بانٹتا نہیں کرتا ہے۔ میں نے سوچا، سنا دیا ہے یہ احسان ہو گیا ہے کہ ر مجھ سے عمر میں بڑا ہے، مگر میں پونے تے بڑے دوستوں کے ساتھ بھی جی مذاں بلکہ کلر کرتا تھا۔ یہ نیر جی مجھے تنبیہ کر رہی تھی، دوسرے ایک ادا بات میں نے محسوس کی کہ وہ پہلے جی مجھے پرصبا تھا، مجھ کو کتا تھا، مجھ سے انجوائے کرتا تھا، مگر اب وہ خط مجھ سے چھپ کر بڑھ رہا تھا، بلکہ ڈانٹتی لکھ دیا تھا، ادا میں اچانک آجاتا تو وہ گھبرا کر فوراً بند کر دیتا تھا۔ مجھے ظاہر ہے محسوس تو ہوگا کہ میں تو اس سے کوئی بات نہیں چھپاتا ہوں، ادا پھر کیوں مجھ سے یہ خطوط اور

تھا۔ میں بھی تو غمناک۔۔۔ میں نے اس پر بیچہ ہی نہیں دی کہ اس کا ماضی کیا ہے؟ اور اصل سنیوڈا کا سے نقل پاکستان کے لوگوں میں آتے ہیں، بڑی سنجیدگی اور اعتماد تھا۔ آج کی طرح سے نفسا نفسی، عصبیت گردنی اور ہوش زود ماحول نہیں تھا۔

چند ماہ کے بعد میٹرک کے امتحان کے بعد مجھے میرے تازہ ادا بھائی اپنے ساتھ کراچی لے گئے۔ ان کی سلاوی حال ہی میں ہوئی تھی، کراچی کورنگی نمبر 6 میں ان کا کوارٹر تھا۔ گھر میں صرف ان کی بڑی بھائی، یعنی میری سانی ماں تھی۔ وہ عمر سرد اور کانی بڑی تھی۔ بھائی ملازمت پر جاتے تو گھر میں بھائی اکتلی ہوتی تھی۔ وہ مجھے ادا کی سے کہہ کر لے گئے کہ کچھ دنوں کے بعد آجائے گا، مگر وہاں جا کر مجھے کراچی میں رہنا اچھا اور میں نے رہیں کے ادا بھائی کورنگی کے کالج میں داخلہ لے لیا، ادا اختر عباس جو ساہی میری بیوی سے ہی آتا تھا، میرے کراچی آنے سے ادا اس ہو گیا اور بعد میں پنا چلا کہ اور وہاں اپنے گھر چلا گیا ہے۔  
 ”چلو، اچھا ہوا، اپنے گھر اپنوں میں چلا گیا۔“ امی نے بھی میری ڈھارس بندھائی۔

کراچی میں، میں روٹن سال رہا، بھائی کے ہاں بنا پیدا ہو چکا تھا، بڑی دھوم دھام ہوئی ار حرائی میری جدائی سے روٹنے لگی تھی، ادا کراچی آئے تھے۔

میں خط و کتابت کرتا تھا، مگر ان کی بے فروری اور ادا سے میں خود بھی بڑا بار، عرصے بے پروانہ رو سکا اور کالج سے تعلقیت لے کر واپس حیدرآباد گھرا گیا۔

ادا کو میری ضرورت پہلے سے زیادہ تھی، وہ سنا دیا بہار رہنے لگے تھے۔ یک اسٹال باؤ بندر بنا تھا، ادا پھر کی بھائی ادا چاہتا تھا، مگر نقصان بھی ہو رہا تھا۔ اس وقت پھلو صاحب کی حکومت چل رہی تھی۔ میری عمر بھی ادا تھا، سال ہوئی تھی، اختر عباس کے جانے کے بعد ساہی ای کے پاس ایک ہی خط ادا تھا، جس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ گھر نہیں رہنے رادوں کے ہاں مہم ہے۔ پنا جلد پہنچوں گا، مگر ہاں کو کوئی خط نہیں آتا۔

کراچی میں بھی میرے کانی دوست بنا گئے تھے، وہ عمری لارہائی کی تھی، امی نے کئی بار تذکر کیا تو میں نے نوید نہیں کی، ایک دن دروازہ پر دستک ہوئی، امی تھیں ساہی زاکا آ گیا ہے جب وہ کچھ نوواں ایک لہا زانو جوان کھرا تھا۔ امی نے مجھے بتا کر کوئی نو جوان لڑکا ہے، آنکھوں پر سیاہ



کمزے کیا، میں محنت جو کرتا ہوں اس کے بھی یہ گمنے چنے پیسے بھی دیتے ہیں، مگر میری سنجیدگی سے..... ورنہ..... میں ان کے در پر کیوں رہنے پر مجبور ہوتا۔  
میرے ذہن پر ہتھوڑے برسنے لگے۔ "ہیں، غیروں کے در پر، یہ کیا لگتا رہا ہے، غیروں کا در تارا مگر؟ ہم غیر اس کو کھینچتے تو نہ گھر کے فرد کی طرح یہ کس طرح تارے درمیان رہتا اور اس طرح اس کے کپڑوں اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتا جاتا ہے۔"  
دوسرا سٹو پیٹا تو۔ درج تھا۔

"آج میں پھر آؤں ہوں، میرے سامنے سے خوب صورت حسینائیں نازک ادا سے گزر رہی ہیں، رچی چاہتا ہے براہ کرم ان کو چوم لوں یا انہوں میں لے لوں، مگر کیا کروں؟ تم..... تم مجھے سے پتھر گئی ہو۔ رات دن سلگ رہا ہوں تمہارے بغیر رات بھر نیند نہیں آتی۔ کاش یہ کچھ نہ ہوتا جو ہو گیا۔"  
"کاش..... نقلی نہ ہوتی ہوتی۔"  
"مگر..... تم..... تم سے تو جدائی کی طویل دیوار حائل ہو گئی ہے۔"

اس سے آگے پڑھنے کی مہربانی نہ ہوئی۔  
پہ سوچتا ہے..... اس نے وہ ناخن کیا، اور پھر، پھر..... یہ لڑکی وغیرہ کا کیا پتھر ہے؟ اور کبھی دیوار کھڑی ہے، ہو سکتا ہے۔ موسم نے کسی لڑکی کو اپنے جگر میں چھانسی لیا ہوگا..... اب یہ کلاتے داتے تو کچھ ہیں نہیں، شاید لڑکی والوں نے منہ کر دیا ہوگا یا نئے بننے پر پابندی لگا دی ہوگی؟  
میرے ذہن میں اس طرح کے سوال دو جواب آ رہے تھے۔  
"مگر..... مگر..... پھر..... یہ تارے پاس ہی کیوں آ کر رہنے لگا ہے؟"

خدا جانے کیا راز ہے؟ یہ پہلے بھی ہمارے باپ رو کر گیا تھا، اس وقت تو یہ ایسا نہ تھا، بہت کم گوارا ہونے لگا تھا نارت و اطوار..... رکھتا تھا۔ ہمارے ذہن میں تو اس کا وہی کردار وحشی نظر تھا، اگر میں نے یہ سب باتیں ہی کو بتا دیں تو ان کو بہت دکھ ہوگا اور بلاوجہ تپش پیدا ہو جائے گی، وہی الحال خاموشی سے آنے والے مزید انکشافات کا انتظار کرنا چاہیے یہ سوچ کر میں نے نگہ میں کسی سے تکرار وغیرہ کیا اور نہ ہی اختر عباس کو محسوس ہونے دیا کہ

ذاتی پیمانہ ہے؟ ضرور کوئی خاص بات ہو رہی ہے۔  
میرزا گریس کراچی اور پاکستان کے دوسرے شہروں کے اخبارات اور رسائل میں، بچوں کے صفحات پر جگہ گری تھیں اور ادیبوں، شاعروں کے بلاگز، ملک کے طویل عرض میں کئی روایتیں اضافہ ہو رہی تھیں، کبھی میں سوچتا کہ اختر بھی تو میرا ہی دوست ہے، پہلے تو خوب ڈلس کرتا تھا۔ اب یہ میری طرف سے کچھ لاپرواہ معلوم ہوتا ہے۔

تارے گھر میں..... وہ گھر کے فرد کی طرح سے رو رہا تھا، لیکن روزانہ پوسٹ میں کے انتظار میں اس کے راستے میں ہی جا کر کھڑا رہتا، میں کہتا۔ "ارے میاں کیوں، بہت ضائع کرتے ہو؟"

"میری ڈاک آئے گی تو تمہاری بھی آ جائے گی۔" لیکن دوبار نہ آیا، میں نے بھی زیادہ توجہ نہیں دینی۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ پوسٹ میں جا چاہا نہ مجھے راستے میں ہی پکڑ لیا اور مجھے میرا سارے خطوط بھڑا دیے، میں جب گھر آیا تو حسب عادت پہلے خطوط پڑھنے کے لیے بیٹھ گیا، پانچ ایک ایسی ساٹھ میرے ہاتھ میں آ گیا۔  
وہ خط اختر عباس کا تھا۔

میں نے یہ سوچ کر کہ کسی کا خط پڑھنا اچھی بات نہیں، اس کا خط است دے دو یا۔ دوسرے دن مجھے ڈاک کے دوسرے ساٹھی نے پوچھا کہ..... "تمہارے گھر میں جو لڑکا رہتا ہے، وہ کون ہے؟"

میں نے کہا۔ "ہمارا عزیز ہے، کیا بات ہے؟"  
کہنے لگا۔ "آج دو صبح ہیڈ آفس آ گیا تھا اور صبح کر رہا تھا کہ اس کے خط ہرگز آپ کے ہاتھوں میں نہ دوں۔ ذاتی خط ہوتا ہے اور تمہارا نام لے کر کہا کہ تم اس کی ڈاک پڑھ لیتے ہو۔"

مجھے بہت حیرت ہوئی اور ذہن میں عجیب سا جھکا محسوس ہونے لگا۔

"یہ کیا بات کی ہے۔" ایک دن اختر عباس اپنی ذاتی ڈاک پر محمول گیا میں نے سوچا وہ محسوس تو سنی کہ یہ ذاتی خط مجھ سے کیوں چھپا تا ہے۔ چہ کیا ہے؟"  
چند دنوں آنے کے بعد پہلے صفحہ پر لکھا تھا۔

"تسلیت مجھے کہاں لے آئی ہے؟ دوسروں کے ٹکڑوں پر زندگی گزارنے پر مجبور ہوں اور دوسروں کے

تہا ہر دے خود غرض خیالات کا مجھ پر انکشاف ہو گیا ہے۔  
 دوسرے دن جب ڈاکیا مجھے ڈاک دے آئے تو  
 میں نے آت کہا۔ ”چاچا جی یہ جو ہوا دے گھر لڑکا رہتا  
 ہے اس کی ڈاک میری معرفت آئی ہے، آئندہ آپ  
 اسے کوئی ڈاک وغیرہ نہیں دیں گے۔ سادہ ڈاک آپ  
 میرے ہاتھوں میں دے دیں گے اور اگر میں موجود نہیں ہوں  
 تو آپ گھر میں انی یا بوب کو ڈاک دینے کے کسی اور کو نہیں۔“  
 چاچا پوسٹ میں عرصہ نہیں سالوں سے جا رہی ڈاک  
 لا رہے تھے۔

دو تین دن گزرے ہوں گے کہ ایک خط اختر عباس  
 کا میری ڈاک سے برآمد ہوا۔ یہ خط بہادر نگر سے اس کے  
 ایک دوست نے لکھا تھا۔ میں نے تحقیق کے انداز سے  
 اسے کھول کر پڑھا شروع کیا تھا، سلام کے بعد اختر  
 عباس کے دوست نے لکھا تھا۔

”جب سے تم اپنے گھر سے فرار ہوئے ہو،  
 تمہارے گھر والوں کی شامت آگئی ہے، پولیس واپس واپس  
 دن انہیں تنگ کر رہی ہے۔“

”تم نے بہت بے ذوقی کی ہے، بغیر شادی کے تم  
 بچے کے باپ بن گئے ہو، لڑکا گاڈاں بھر میں بدنام ہوگئی  
 ہے۔ تمہاری بیوی سے پولیس جیسے کسی تنگ کرنی ہے، کیوں  
 کہ انہیں پتا چل گیا ہے کہ تم میرے دوست تھے۔ لڑکی  
 کے بھائی بندوں کے گھر نہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں  
 اور تمہارے والد کو تمہاری بیوی سے تھیل ہو سکتی ہے، کیوں  
 کہ تم پر اقدار اہل کا بھی مقدمہ درج ہو گیا ہے۔“

خط پڑھ کر میں لرز کر رہ گیا۔ ”آف خدا یا، جی  
 دوستی کا یہ مسئلہ دبا ہے اور پھر یہ شخص جرائم کر کے  
 ہوا دے یاں پناہ لیے ہوئے ہے؟ کل کہاں پولیس کو خبر  
 ہوگئی، بالکل نے ہوا داؤد نہیں دے دیا تو..... ہمارا کیا  
 بے کا گھر میں میری کیا عزت رہ جائے گی، میں نے  
 ایک خط اختر کے دوست کو لکھا کہ تمہارا خط پڑھنے کے بعد  
 میں تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔“

دیگر باتوں کے ساتھ میں نے اسے لکھا کہ اب  
 اختر کے والد صاحب کو تمہارا پناہ دے دو اور دائیں کیوں فوراً  
 انہیں دو دنوں کا جتنا تنگ اور ڈرا ہوا رہا ہے۔  
 یہی تم عمر کی آج سے مجھ سے ظلمی ہوگئی۔ اختر کا

باپ پولیس کے بہادر پٹارے گھر آ گیا اور بجائے  
 احسان ماننے اور ہمارا شکر یہ ادا کرنے کے ہم پر اٹلے  
 سیدھے الزامات لگانے لگا۔

”اس کو تم نے کیوں گھر میں رکھا، اس کے پاس  
 اسے ہزاروں روپے سنے، ماٹا اور تیرا تھا، وہم نے ہتھیار لیا ہے اور  
 سیدھی طرح تم دو چہرے زید اور اس کو رو۔“  
 بجلی کر رہا میں ڈال والا معاملاً ہو گیا تھا۔

سادے گھر والے ہم خود دو گئے تھے۔ اختر کا باپ  
 نہایت ہی عبادت و بی معلوم بود با تھا، میں گھر والوں کے  
 آگے مجرم سا بن گیا تھا، میری اس ادا ان دوستی کا نتیجہ ہے۔  
 آفت آئی تھی۔ کاش میں اس کو اپنے ساتھ گھر نہیں نہ رکھتا۔  
 جب تک اس کے گھر والوں سے منہ لیتا۔

میرے رشتے دار، محلے والے، دوست وغیرہ  
 میری اس مصیبت کے آگے آگے، محلے کے بڑے  
 بڑے لوگوں نے میرا اور میرے گھر کا دفاع کیا۔ دو  
 خطوط لکھنے کے لیے میں اختر عباس اپنے گھر والوں کی  
 برائیاں لکھتا تھا، مجھ کو خط کام آ گیا۔ جو اختر عباس کے  
 دوست نے لکھا تھا اور میرے ہاتھ لگ گیا تھا، جس میں  
 اس کا دوست کھلبلی لکھا اس کے جرائم کی گواہی لکھی گیا تھا  
 سب تفصیل درج تھی۔ اختر عباس کے باپ کی جب ایک  
 چلی تو اپنے بیٹے سے کھسر پھسر کرنے لگا۔

محلے والوں اور بڑوں نے میں منورہ دیا کہ ابھی  
 ان وقت اس کو کھر سے لگا لو نہیں انہں کے خلاف فراڈ کا  
 کیس کرنے ہیں، اختر عباس نے حالات کا اندازہ کر لیا  
 تھا۔ پولیس نے اسے گرفتار کر لیا اور اپنے ساتھ لے گئی۔  
 اختر عباس کتنا خود غرض اور احسان فرسوش لگا کہ  
 اس نے ہماری سادگی، اعتماد اور دوستی کو اتنا بڑا جھوک دیا  
 تھا۔ اس نے تو جاتے وقت نہ سلام کیا اور نہ ہاتھ ملایا۔  
 خدا کا شکر ہے کہ ایک جرائم زدہ شخص سے نجات ملی اور  
 بڑوں کی مدد اور عقل کام کر گئی۔ ورنہ نہ جانے کس کس  
 مصیبت اور حالات سے پورا گھر متاثر اور دوچار ہو جاتا۔  
 اختر عباس نے دوستی کے اعتبار کو جو خاک دیا تھا۔

ایک عمر تک مجھے دوستی سے چڑھائی تھی۔ خدا  
 ایسی دوستی سے بچائے۔

☆.....☆

شعبہ سالانہ تحریریں

پروا اشد

روایتی کے مینار



بیچل میتلو

شہریک مسین دادہوں میں ختم لینے والی ایک نابینا کی محبت بھری داستان



تو جوانوں کو نعرہ آزادی سے باز رکھنے کے لیے ان پر طرح طرح کے تشدد کے طریقے آزمائے گئے۔ انہیں بھوکا پیاسا رکھا گیا اور سینہ دہاوا دہاوا سے برا نہیں مارا۔ پانی میں ان کی لاشیں بہا دی گئیں، خوراک بھوکے ہونے پر انہیں اچھالنا، ترشوں سے ہنسی خوانی، گولہ چھینا اور سخت سروا میں ضربوں کو برسہ برسہ دن ٹھہرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ یہ سب کرنے ہوئے انہیں بہت مزا آتا اور بھاری سہانی خوراک و نفا کا طاقتور شخص تصور کرنے ہوئے نینے کشمیر ایل کی بے بسی دے کسی کا ذہان اڑانے تھے۔ یہ سب کچھ روہ شراب کے نشے میں کرنے۔ سب سے کم شراب کرشنا پتیا تھا، کیوں کہ پتیا نہیں کہیں اسے شراب بالکل اچھی نہیں لگتی تھی اور اسے جبر سے وہ کم ہی پتیا تھا۔ یہ شیطانی تھیل کھیلنے ہونے انہیں نین سال ہو چکے تھے۔ گھر سے بھی خط اور چٹھیاں آتی تھیں کہ ماں بہار ہے، تجھے بہت یاد کرنی ہے۔ گھر کی یاد کے ساتھ ہی کرشنا بکین، بھائی، باپ، (بے سے) یعنی ماں بہت یاد آنے لگے اور اس کے ذہن میں کشمیر کی ماں آنے لگیں جو روہ روہ انہیں سے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی جان و عزت کی بچک ماٹھیں اور وہ انہیں کشمیر کی انہوں سے جھبہ جھبہ کراد رہا ہے

کوشش سنگھ اور کبریا بہت اچھے دوست تھے۔ انٹر کرنے کے بعد کبریا مڑ پڑ تعلیم کے لیے وئی چلا گیا اور کرشن سنگھ فوج میں بھرتی ہو گیا، کیوں کہ اس کا تعلق کسان گھرانے سے تھا اور سب سے بڑا ہونے کے ناتے باپ کے بعد گھر کی ساری ذمہ داری ان کی تھی۔ باپ کے پاس ٹھوڑی سی زمین اور کچھ بکرے تھے، انہیں اپنا کا گزارا تھا۔ کٹر باپ کہتا۔  
 ”کرشنا جلدی سے بڑھ لکھ کر نو سرکاری نوکریاں لگ جانو کچھ اپنے بھی چٹھے رہا آؤں۔“ اسی لیے انٹر کے بعد جیسے ہی فوج میں بھرتی شروع ہوئی تو وہ ان میں بھرتی ہو گیا۔ یہ اس کی بھرتی تھی، ورنہ وہ نوادر زیادہ بڑھ کر سول سروس کرنا چاہتا تھا اور ایک بڑا سرکاری افسر بننا اس کا خواب تھا۔  
 فوج کی نوکری میں آئے تیسرا سال تھا اور اب اسے کشمیر کے مشن پر بھیجا گیا تھا۔ یہاں آ کر وہ بہت تڑپائی کا شکار ہو گیا تھا۔ دنیا کا کون سا ایسا ظلم تھا جو یہاں نہیں دیکھا تھا، بلکہ ظلم کے معنی تو اسے ہی لگتا تھا کہ سمجھ میں آئے تھے۔ یہاں ظلم اور بربریت کی انتہا تھی۔ کشمیریوں کے گاؤں کے گاؤں خنڈ خنڈ کر دیا، معصوم لڑکیوں کی عزتیں لوٹا، کشمیری

جاؤں اور ماں کی گود میں سر رکھ دوں، لیکن کسی بے بسی  
 دلا چاہی تھی۔ کرشنا آنسو بہ رہے تھے اور یہ احساس  
 اسے مارے ذال رہا تھا کہ انہوں نے کیسے کیسے ظلم  
 کمزور سمجھتے تھے، یوں پر زحائے ہیں، تب ہم اپنے گھر  
 والوں کو بھول گئے تھے۔ اب کرشنا صرف ماں کی  
 بیماری کا سن کر تڑپ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر دوسرے دوست  
 اس کا مذاق اُڑاتے اور اسے بزدل کہتے، مگر وہ اپنے  
 ضمیر کے آگے بے بس ہوتا جا رہا تھا۔  
 ماں ہمیشہ اسے نصیحت کرتی تھی کہ بخر کے دادوں

اور خوب تھمتے لگاتے اور انہیں زیادہ سے زیادہ اڑتیں  
 دیتے۔ ان کی جینیں سن کر کئی ماؤں کو انہوں نے مرتے  
 دیکھا۔ ان کا دل چھٹ جاتا ہوگا اور وہ اپنی رانگلوں  
 کے منہ ان سمیتے اور جھوک و پیاس سے زخموں سے  
 نڈھال جوانوں اور ان کی ماؤں کی لاشوں پر کھول  
 دیتے تھے اور ان کے گھروں اور گاؤں کے گاؤں کو  
 آگ لگا دیتے تھے اور پھر ہنستے ہوئے نعرے لگاتے  
 ہوئے واپس جھاؤلی کی طرف لوٹ آتے تھے یا پھر  
 کسی اور گاؤں کی طرف نکل جاتے تھے۔



نہ دکھائیں، وہ چونک چوک جاتا۔ دل دکھانا اس نے  
 تو بھارتی فوجیوں کے ساتھ مل کر خوب اچھی طرح سے  
 سیکھ لیا تھا۔ اس نے ان سمیتے لوگوں پر وہ قسم ڈھائے  
 تھے کہ جس کی مثال ملنا مشکل تھی اگر ماں کو ذرا بھی پتا  
 چلے تو وہ تو صدمے سے ہی مر جائے شاید، یا پھر اسے  
 پتین ہو جائے کہ کرشن سنگھ اس کا بیٹا نہیں ہو سکتا۔ ہر ہر  
 طرح سے انہوں نے آزادی کی آواز کو دبانے کی  
 کوشش کی، مگر یہ اتنی ہی زور بکرتی تھی۔ اب کرشن نے

بھارتی فوج کی ظلم و بربریت اور فوجی ٹروپوں کی  
 آوازوں سے اک گونج کر طرف پھیل جاتی اور وہ صبح  
 کے نقشے میں پھور ہوتے۔ یہ سب دیکھ کر تو شیطان بھی  
 کہیں منہ چھپا کر رہتا ہوگا۔ یہ احساس اسے اب ہور با  
 تھا، جب چھینوں میں ماں کی بیماری کی خبر آ رہی تھی اور  
 کرشنا مجھے چھینی نہیں مل رہی تھی۔ گھر والوں کی یاد نے  
 اس کی میری راتوں کی نیندیں اُڑا دی تھیں اور دن کو  
 بھی قرار نہ تھا۔ اس کا قومی چاہتا تھا کہ اُڑ کر گھر پہنچ

جو بھی انسان پیدا ہوتا ہے وہ آزار پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے گھر میں، شہر میں، ملک میں آزار، اپنی مرضی سے دہنا چاہتا ہے، یہ اس کا پیدا ہونے کا حق ہے۔ یہ اس سے چھیننا اور وہ بھی طاقت کے زور پر..... اس کا دل آہستہ آہستہ کشمیریوں کے حق میں ہوتا جا رہا تھا۔ جو بھی یہ حق چاہتا ہے، اُسے بھارتی اپنی طاقت سے دبا دیتے ہیں۔ جیسے کہ سکھوں کے گولڈن تمبل پر حملہ کر کے دبا دیا، مگر یہ مسلمان تو ہر قسم کا ظلم سینے کے بعد بھی سینہ پر ہیں۔ گاؤں کے گاؤں اجڑ گئے، خود بھی

بھارتیوں کے ساتھ جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ زیادہ تر چوکی پر ہی رہتا۔ اس کے سر میں درد رہنے لگا تھا۔ اچانک ہی اس کی دعائیں ونگ لائیں اور اسے دل دن کی چھٹی ٹل گئی، ساتھ ترتی بھی، اُسے سپاہی سے لاس ناک بنا دیا گیا تھا، لیکن وہ ترتی سے زیادہ چھٹی ملنے پر خوش تھا۔ جب گھر آیا تو اُسے احساس ہوا کہ وہ دوندوں کے چنگل سے نکل کر جنت میں آ گیا ہے۔ ہاں تو اُسے دیکھتے ہی کھل اٹھی اور چند دنوں میں ہی بھلی چٹکی ہو گئی۔

”اُسے نیک بخت اب تو وا بھی نہیں ملے وہی“ پاپو بھی خوشی سے کہنے۔  
 ”میری دو وا تو میرا کر شاہے، اُسے دیکھ کر تو میں خوشی سے ٹھیک ہو گئی ہوں۔“

واہے گرد کی مہربانی اور اللہ تو کی کرپا سے ماں اُسے دعائیں دیتی۔ دن دن تو ایسے گزر گئے جیسے دو دن ہوں۔ جب وہ واہاں آنے لگا تو بہت آواں اور بے قرار تھا، مگر سب اُسے دعاؤں میں دھخت کر رہے تھے۔ ماں، بہنیں چھپ کے اُنسو لے کر پوچھتی تھیں اور منہ بند کر لے اُسے دھخت کر رہی تھیں اور اسے جلدی آنے اور چھٹی ملنے کی دعائیں دے رہی تھیں، خیر وہ پھر انسان نما دوندوں میں آ گیا، لیکن اب اُس نے بس چھاؤنی میں چار سپاہیوں کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی تھی۔

”یہ مسئلہ بھی نا..... بہت سخت جاں..... اوو پکے ہیں۔ ہا وہی نہیں مانتے۔ بس آراوی۔ آراوی کے ہی لفظ بولے جاتے ہیں، مرتے مرتے بھی“  
 بھارتی سپاہی اکثر آپس میں اس طرح کے تبصرے کرتے۔

”ہاں یار بڑے جگرے والے ہیں۔“ وہ بھی نکلا لگا تا۔ ”اُسے کیا کریں گے۔“

”ہماری بڑی طاقت ہے..... سکھوں کی تحریک ٹھہری ہا وہے آگے؟“ گوپال بہت تعصب پسند ہندو تھا، کوئی سونچ نہیں جانے دیتا کرشن کو ہریت کرنے کا۔ دنوں میں جیسے ایک سرد جنگ جاری تھی اور وہ سوچتا پھر گوپال کے روہنے اوو جملوں نے اس کی سوچوں کا زخ سوزا شردہ کر دیا تھا۔ وہ سوچتا وا تھی

بھارتیوں کی وجہ سے ہجرت کر کے کہاں سے کہاں جا چکے ہیں، مگر جذبہ تحریک میں کمی نہیں آئی۔ آفرین بے اُن پر..... وہ انہی سوچوں میں گھرا تھا کہ حکم ملا کہ آج تم بھی چلو گے، کیوں کہ نفرتی کم ہے..... یہ نئے صوبے وار کا حکم تھا اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ بھی ساتھ ہوا، کیوں کہ یہی تو اس کی روزی دہلی تھی۔ بہانہ گشت کا تھا مگر ارادہ کشمیریوں کے گھروں پر حملہ تھا۔ دو تین فوجی چھپوں پر فوجی ہتھیار لے کر ہشتے ستاتے نعرے لگاتے سوار ہو کر روانہ ہوئے۔ وہ سب سے آخری گاڑی میں تھا جو وہر کرنے کی جگہ سے کافی پیچھے تھی۔ نامعلوم کیوں اس کے دل کی طرح جیپ کی رفتار بھی سست بہت تھی۔ یہ ایک تباہ حال جاپا گاڑیوں تھا۔ سب عمارتیں ٹوٹی پھوٹی، نہ کوئی دیوار سلامت، نہ چھت، کرشن نے سپاہیوں سے کہا کہ تم لوگ ہمیں گاڑی روکو اور گشت لگاؤ۔ سب سپاہی اتر پڑے، کیوں کہ بھی بھی ایسی ہی نماؤں میں چھپا ہوا کوئی کشمیری مجاہد یا پھر کوئی بد قسمت جو رت ہاتھ لگ جاتی تھی اور پھر سپاہیوں کی عیب ہو جاتی تھی، لیکن آج کرشاؤل سے دعا ناک دبا تھا کہ کوئی ہاتھ نہ لگے اور وہ وہ خالی لوٹ جائیں۔

وہ ایک چٹان سے ٹیک لگائے دل میں یہ دنا مانگ رہا تھا اور سپاہی اوھر اوھر گھومتے ہوئے کافی آگے تک نکل گئے تھے۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ جیسے کوئی گھڑ کا سا ہوا۔ اُن سے سوچا شاید کوئی مجاہد اس پر پستول تانے کھڑا ہوگا۔ اس کا دل جیسے کھلی میں آ گیا۔ پیشانی کی دو تین تھکیں۔  
 کیوں کہ کشمیری مجاہد بھی تو ان کے خون کے



معالے میں کسی برہمروسا نہیں کہا جاسکتا، دماغ نے اسے سختی سے سرزنش کی اور بچاؤ (یعنی کھوسنی باقی ہوئے تو) پھر زور دار بھی جاسکتا ہے۔

اس وقت وہ پیر پڑھ رہی تھی۔ درشام کا انتظار کرنے لگا۔ کسی کی زبونی دن کی بھی نوکسی کی رات کی گھر ان کے لیے ٹائم کی کوئی نیند نہیں تھی، جو فوجی جس فوجی کے ساتھ چاہتا، جلا جاتا۔ کچھ ساہی گشت یہ گئے ہونے سے اور کچھ ٹائم کی بازی لگانے بیٹھے تھے۔ وہ سب کا جائزہ لینے لگا۔ عسکر تھا کہ گوپال ابن دنوں پہلیا کی بیچ سے اسپتال میں داخل تھا، ورنہ اسے کرشن کی بڑی نورگی رہتی تھی پھر وہ بہانہ بنا کر چھاؤنی سے نکل کر اس طرح کو روانہ ہوا جہاں اس نے اس لڑکی کو رکھا تھا۔ راستے سے اس نے کچھ ٹکٹ بھی لے لیے تھے، نامعلوم بچاری، وہ لڑکی کہاں کیوں تھی؟ اس کے گھر والے کہاں تھے؟ یا پھر وہ سب مارے گئے تھے؟ یا دو بچاؤوں کی ساہی تھی؟ انہی سوچوں میں گھرے ہوئے اس نے گاڑی ایک طرف رشتوں کے جھنڈ میں اس طرح کھڑی کی کہ دوڑتے وہ کسی کو نظر نہ آئے اور وہ اب گرو کا نام لے کر دو راوی میں آ کر گیا اور پھر بغور ملاحظے کا جائزہ لینے لگا۔ وہ گاڑی مسلسل طور پر بہانہ حالی کا ٹکڑا تھا اور اس اونچی نیچی اداری میں ٹکٹا تھا کہ کوئی گھر یا بندر سلامت نہ تھا۔ فوجیوں کے خوف سے بہت سے لوگ نقل مکانی کر چکے تھے۔ ورنہ اس سرکنڈوں والے نکلنے کے پاس آ کر رکا اور پھر آس پاس کا خوب اچھی طرح سے جائزہ لینے کے بعد اس نے اس گھاس چھوس کے نکلنے کو بنا ہا، مگر در کانی بھاری تھا۔ اس نے خوب زور لگا باور آ کر خوردا ناسرک گیا کہ وہ اس میں کود گیا۔

وہ ہاتھی ایک تہ خانہ نما کر رہا تھا، جو کہ پتھر جلی زمین کو تراش کر بنا گیا تھا اور اس گھاس نما دروازے کے وزنی ہونے کا راز اس کا ایک ٹکڑی کے کھونٹے سے بندھا ہوا ہوا بھی تھا اور اس کے زور لگانے سے وہ رسی، جو کہ اودھ جلی تھی، ٹوٹ چکی تھی اور ایک کونے میں ایک مہ جیس کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ آنکھوں میں خوف ہی خوف تھا، ڈر کے مارے چہرہ زور دار آنکھیں چھٹی ہوئی تھیں۔ بوڑھوں پر خشکی کی تہ جی ہوتی تھی۔

پاس سے نئے اور تھلے کرنے سے وہ بھی باز نہیں آتے تھے۔ اس نے جلدی سے پیچھے مڑ کر دیکھا، لیکن وہاں تو کوئی نہ تھا۔ اس نے ٹھنڈی سانس عسکر کی خارج کی اور جس طرف کھڑا ہوا تھا، اس طرف احتیاط سے بڑھنے لگا۔ اس نے سوچا کہ دو چپکے سے نکل جائے گا۔ جس طرف سے آواز آتی تھی، وہ آگ ٹوٹی ہوئی کوٹھری تھی، بس ایک دیوار پر چھت جزی ہوئی تھی، باقی تین دیواریں دروازے، کھڑکیاں جل کر گر چکی تھیں۔ چھت نے زمین پر گر کر نصف چھت کی شکل اختیار کر لی تھی اور باقی جگہ بن گئی تھی کہ ایک دو آوی آسانی سے چھپ کر بیٹھ سکیں۔ مارے جنس کے اس نے وہاں بھانکا تو ایک دم جیسے بجلی سی چمک گئی ہو۔ گلابی در چنا اور وہ سبھی ہوئی آنکھیں اور خود آسانی چہرے کی جھلک اسے نظر آئی اور بس، اب سوانے علی ہوئی گھاس اور اودھ جلی سرکنڈوں کے وہاں کچھ نہ تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے تو یہ سب ایک وہم سا لگا، لیکن بغور دیکھنے اور جائزہ لینے کے بعد وہ سمجھ گیا کہ یہ ایک گھر کا کمرہ یا ہوگا اور نیچے ایک نہ خانہ یا اسٹور تھا کہ اس کو سکتا ہے۔ وہ ٹھنڈک سا گیا۔ اس نے اوجھر دیکھا، نوکری شاید آس پاس نہیں تھی۔ وہ آگے بڑھ کر بچے کی طرف بیٹھ گیا اور اسے لہجے میں کہ کوئی دوسرا نہ سن سکے، منہ کا زرخ اس طرف کر کے بولا۔

”نم جو کوئی بھی ہو..... یہاں سے مت نکلنا، کیوں کہ بھاری فوجی کتوں کی طرح کشمیر ہوں کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔“ اور پھر در تیزی سے اٹھ کر بیٹھے آگے اور مسکون کا سانس لیا کہ ابھی تک فوجی وہاں نہ ہوئے تھے۔ وہ بھی اس جگہ سے ہٹ کر چھپ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور جب تھوڑی دیر میں سب ساہی آگے تو پھر وہ چھاؤنی کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں وہ سوچ رہا تھا کہ شاید وہاں گھر کے لوگ چھپے ہوں گے یا پھر بچاؤ..... یا صرف..... ورنہ لڑکی..... اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری..... کیسی بے بسی کا عالم تھا! ان مخصوص کشمیر ہوں کے لیے..... چھاؤنی آنے کے بعد بھی وہ یہی سوچنے لگا کہ اسے اس لڑکی کی مدد ضرور کرنی چاہیے۔ وہ اگلا جائے یا نہیں..... نہیں اس

بھائی کا انتظار کر رہے تھے کہ اسے بتا کر کہیں جائیں گی کہ اچانک بھارتوں نے ان پر حملہ کر دیا، تب جا چینی نے اسے یہاں چھپا دیا اور خود جا چکا بولانے لگی کہ اسے میں سپاہیوں نے جا چینی کو پکڑ لیا اور گھر کو آگ لگا دی۔ ان دھکی درندوں نے جا چکا کو شہید کر دیا۔ یہ دیکھ کر جا چینی نے بھی خود کو چھڑا کر آگ میں چھلانگ لگا دی۔ فوجی درندے قہقہے لگا رہے تھے۔ یہ سب وہ ایک درزن سے دیکھتے ہوئے بے ہوش ہو چکی تھی۔ جب وہ ہوش میں آئی تو اسے نمنڈا اور بارش کی آواز محسوس ہوئی۔ اس نے درزن سے باہر جھانکا تو واقعی بارش برس رہی تھی اور آگ بجھ گئی تھی، شاید خدا کو نور بانو کو زندہ رکھنا تھا۔ تین چار دن تو اس نے گھڑے سے پانی پیا اور سوکھی روٹی کے ٹکڑوں پر گزارا کیا تھا، جو کہ وہ اپنے بھائی کے لیے بکا کر رکھی تھی کہ وہ جب بھی آتا جلدی میں ہوتا تھا۔ اگر وہ نہ آتا تو دوسرے وقت دو کھا لینے تھے اور اس کے لیے پھر تازہ پکا کر رکھتے تھے۔ برہمہ عبت کا ایک خوب صورت طریقہ تھا۔ واقعی بھائی، بہن، ماں باپ ایک نعمت ہوتے ہیں۔ اس کی باتیں سن کر کرشن کو اپنا گھریا یاد آ لگا تھا اس نے ایک نمنڈی آؤ دھری۔

آج ابھی دو نور بانو کے پاس جانے کا سوچ رہا تھا کہ درسا پانی نے اسے پوچھا۔  
 ”یاریے نور زان کہاں جاتا ہے۔“ یہ سن کر کرشن اندر فری اندر جیسے اڑو سا گیا، لیکن پھر خود پر کاڑ پاتے ہوئے بولا۔  
 ”یار چینی کی درخواست دہنی ہے، اس لیے کچھ یاد آ جاتا تو وہ یہ دے کے لیے چلا جاتا ہوں، تم بھی چلو گے کیا۔“  
 ”نہیں نہیں یار۔ دیکھو کون سی چینی مل رہی ہے۔“  
 وہ ہنس کر جاتے ہوئے بولا۔ ”اب جو بھی کرتا ہے، خوب سوچ سمجھ کر کرتا ہے۔ کرشن خود سے مخاطب ہوا۔  
 ”گھٹا ہے دشمن ہوشیار ہو رہا ہے اور اب مجھے بھی چوکنار بننا ہوگا۔“  
 اب کرشن دن رات نور بانو کی سوچتا رہتا تھا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کی ہمدردی اب محبت میں تبدیل ہو چکی تھی۔  
 دوگی ہی اتنی چاڑی، معصوم، کم سن۔ اسے چاہنا

کشمیر کا حسن تو بہت سنا تھا، لیکن ایسا سہا سن اس نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا، کشمیر میں زیادہ عرصہ رہنے کی وجہ سے اسے کچھ کچھ کشمیری زبان آ چکی تھی۔ اس لیے اس نے اس سے کہا۔

”گھبراؤ مت میں نہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ تم مجھ پر بھروسہ کر سکتی ہے۔“ وہ اپنی جگہ سے ہلانگ نہیں تھا، بلکہ وہیں گھڑے رہ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ لڑکی نے جب محسوس کیا کہ وہ اس کے قریب بھی نہیں آ رہا تو اس کے چہرے کا خوف کچھ کم ہونے لگا۔  
 تناؤ اور رول کی بھڑکن تھوڑی معیبل پر آنے لگی، لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولی اور نہ اپنی جگہ سے ہلی۔ کرشن اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ اس نے وہ خریدے ہوئے مسکت اور پانی کی بوتل زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ تمہارے لیے ہیں اور یہ بہت محفوظ جگہ ہے، لہذا ختم یہاں سے ہانگن مت ڈگنا، میں بھی تمہارا ہمدرد ہوں۔ کرشن کر دیا گا کہ تمہارے کچھ کام آسکوں، اب چلتا ہوں۔“

وہ دسے ہی مسبت کھڑی متوشن لگا ہوں سے اسے جاتا دیکھتی رہی، بولی کچھ نہیں۔ وہ است حیران د پریشان چھوڑ کر باہر آ گیا اور چھاؤنی میں پہنچ گیا۔ کسی نے بھی نوٹ نہیں کیا تھا کہ وہ آج پونت سے غائب ہے۔ کرشن نے اطمینان کی سانس لی اب وہ روزانہ مہیپ مہیپ کر دیاں جانے لگا سوز سائیکل پر، کیوں کہ جیب چار پانچ سپاہیوں کے لیے تھی اور بائیک پر سائیکل خریداری کے لیے شہر پاس تنگ جاتے تھے۔ اس لیے کسی کارحصان اس طرف نہیں گیا تھا، لیکن پھر بھی اسے ایک ڈوسا لگا رہنا تھا کہ نہیں کسی کو شک نہ ہو جائے، اس لیے وہ کم سے کم وقت نور بانو، ماں اس کا نام نور بانو ہی تھا۔ گویا کرتا تھا۔ اب وہ کچھ کچھ اس سے باتوں ہی ہو چکی تھی۔ اس نے اسے بتایا کہ وہ وہ بھائی بہن تھے۔ بھائی (بائی) یعنی مجاہد بن گیا تھا اور ماں باپ بیٹین میں مر چکے تھے، چاچا چاچا نے ان کو پالا تھا۔ ان کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ یہ کوئی بوا گاڈن نہ تھا، بس ہندو ہیں گھر تھے، جن میں سے وہ تین کے مواسب نقل مکانی کر چکے تھے۔ وہ لوگ

اُس سے بات کرتے ہوئے اپنا سروں کا وڈ دکھایا تو فوجی سپاہی اسے دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا۔ جیب پھر آگے کی طرف چل پڑی، ہر طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور کہیں کہیں نیچے اور کہیں اوپر پہاڑوں پر درختوں کی ادت میں روشنیاں نظر آ جاتی تھیں، ورنہ سناٹا ہی سناٹا تھا۔ اِدبے اوچے پہاڑ تار کی کاپریب لہاؤہ اوڑھے کھڑے تھے۔ کرشن چھوٹی چھوٹی سڑکوں سے ہو کر آ رہا تھا تاکہ چیکنگ سے بچا جاسکے۔ یہ راستے اس نے دن کی روشنی میں خوب اچھی طرح سے دیکھ لیے تھے۔ ایک پہاڑی کے نیچے چکی سڑک پر کچھ دیر چلنے کے بعد اس نے گاڑی روک دی اور نور بانو کو ایک پوٹی سیٹ کی پچھلی طرف سے نکالی کر دیتے ہوئے کہا۔

”یہ کپڑے ہیں جن کو اوو اِن کپڑوں کو پوٹی میں باندھ لو، جلدی کرو اب ہم بس میں سوار ہونے والے ہیں۔“ نور بانو سے یہ کہتے ہوئے وہ خود دوسری طرف چل گیا۔ نور بانو نے جیب اوو پہاڑی کی ادت میں جلدی سے کپڑے بدلے اور ساتھ ہی کچھ ٹکی زیور بھی تھے، وہ بھی چاکن لیے۔ وہ دل میں خوف بھانے ادھر ادھر بھی دیکھے جا رہی تھی۔ وہ اتنی خوف زدہ تھی کہ اس کا خوف سے دل لرز رہا تھا، جلدی جلدی کپڑے بدلنے کے بعد جیب کو ہاتھ مارا تاکہ کرشن آ جائے۔ کرشن کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ اب وہ مکمل طور پر ایک کچھ عورت کے دو ب میں تھی۔

”اندھیرے کے باوجود تم نے کپڑے، گھینے ٹھیک سے چکن لیے ہیں اور اب تم بہت بھاری لگ رہی ہو۔“ اس نے نور بانو کو گاڑی کی بیڈلائٹ کی روشنی میں دیکھتے ہوئے اس کے حسن کی تعریف کی۔ نور بانو مارے شرم کے سرخ ہو گئی تھی اور سرخی اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہی تھی، لیکن اب ایک بڑی مشکل گھڑی آن پڑی تھی، جیب کو تھکانے لگانے کی۔ اس لیے وہ جلدی جلدی ہلنے سے پیدل ہی ایک طرف چلنے لگا۔

”دیکھو نور بانو، گھبراؤ مت، میں جو بھی کہوں تم جیب رہنا اور اپنا چہرہ دھانکے دیکھنا لگے ہو کھسٹ کی طرح۔“ وہ اُسے سمجھا رہا تھا اور وہ تو ویسے ہی چپ تھی،

تو چاہنا، نور بانو کا کرشن کو ملنا ہی اس کی خوش قسمتی تھی۔ یہ سوچ کر وہ زرب لب مسکرا دیا اور آکھوں میں اس کا معصوم چہرہ گھوم گیا۔ اب اصل کام جلد از جلد اسے یہاں سے نکالنا تھا اور ایسی جگہ پہنچانا تھا جہاں وہ محفوظ بالکل ہو۔ اُس نے کافی سوچ بچار کے بعد آخر ایک منصوبہ بنالیا اور نور بانو سے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ تیار رہے۔ وہ کسی وقت بھی وہاں سے نکل سکتے ہیں اور پھر یہاں سے نکل کر آرام سے اس کے بھائی کو بھی تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ کب تک یہاں رو سکے گی؟ اگر کسی روز کسی بھاری فوجی کے ہاتھ لگ گئی تو؟ اس سے آگے نور بانو سوچ کر کانپ جاتی۔ اللہ کے بھروسے پر اُس نے کرشن کی بات ماننے میں ہی بہتری تھی۔ اُس نے کرشن کی بات مان لی اور کرشن نے اپنے بچپن کے دوست علی اکبر کا پتا اپنے پرانے کانڈوں، خنطوں میں سے ڈھونڈ کر اُسے ایک خط لکھا، اب کچھ احوال نور بانو کا بھی لکھ دیا اور خط پوسٹ کرنے کے بعد اب وہ بہت بے چینی سے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ بارہ دن گزر جانے کے بعد آخر خط کا جواب آ گیا۔ اکبر علی نے اُسے خوش آمدید کہا تھا۔ اُس نے وہ خط پڑھنے کے بعد جلا دیا اور خود جانے کی تیاری کرنے لگا۔

ٹھیک دو دن کے بعد وہ فوجی جیب میں نور بانو کے ہمراہ تیزی کے ساتھ شہر کی طرف گامزن تھا۔ نور بانو بھی فوجی وردی میں داخلہ تھا جس میں لپٹے بیٹھی ہوئی تھی۔

نور بانو سوچ رہی تھی کہ اب قسمت اس کے ساتھ نہ معلوم کیا کرنے والی ہے۔ اب تک تو قسمت نے اس کے ساتھ جو کیا تھا وہ بڑا ہی ہوا تھا۔ اُس کا پورا خاندان ختم ہو چکا تھا۔ بھائی نہ معلوم کہاں تھا، بس کرشن پر ہی اتھاروا کر سکتی تھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، شاید کہ سچ ہی ہو۔ ”اے خدا تو ہی میرا بد و گار رہنا۔ آمین۔“ اُس نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔ گاڑی کو ایک جھٹکا لگا اور دو ڈک گئی۔ نور بانو کا دل ایک دم جیسے مٹھی میں آگسا تھا۔

اللہ خیر ہوگی فوجی تھا۔ جس نے گاڑی کو روک لی تھی، وہ کچھ لائیں بھی، عمل رہی تھیں۔ کرشن نے

اندر عورتوں کے ساتھ تھی۔ اُس نے ہاتھ منہ دھویا،  
 ناشنا کیا اور پھر اسے ایک کمرے میں آرام کرنے کے  
 لیے کہا گیا۔ دو جیسے ہی نرم سبز برسوں نے زینب نے اُسے  
 اپنی آغوش میں لے لیا اور اسے کسی نے جگا بھی نہیں۔  
 جب وہ اٹھی تو رات کا کھانا لگا جا رہا تھا۔ سب عورتوں  
 نے گھر اور مردوں نے بیٹھک میں کھانا کھایا، پھر کرشن  
 نے کپلو باک کو زور بانو سے بات کرنا چاہنا ہے۔ کھانے  
 کے بعد وہ بیٹھک میں گئی، وہاں صرف کرشن تھا۔ کرشن  
 نے اُسے سنے کپڑے اور کچھ چیزیں دینے ہوئے کہا  
 کہ یہ بھارت ہے ہے۔ وہ بڑی حیران ہوئی، اس نے  
 کہا۔ "اب آپ بالکل فکر مند نہ ہوں میں کہیں نہیں  
 جا رہا اور میں نے ایک ماہ کی پھنسی لے لی ہے۔ اب جو  
 کچھ ہوگا، اس کے بعد دیکھا جائے گا۔" نور بانو نے  
 اطمینان کا سانس لیا۔ کرشن اُسے ہی دیکھ رہا تھا، نور بانو  
 کے چہرے پر مسکراہٹ بہت چمکی لگ رہی تھی۔ وہ  
 نظروں سے اٹھنے والی نظر میں اس کے صدفے دار ہاتھ  
 تھا۔ اس کا پلکوں کو اٹھانا پھر جھکا نا۔ کہا خوب ادا تھی۔  
 "اب میں جاؤں" نور بانو بولی۔

"ہاں۔" اُس نے گردن ایک سرشاری کی  
 کیفیت میں ہلائی۔ دوسری صبح جب نور بانو نے نیا کر  
 سنے کپڑے سینے پر علی اکبر کی بہن شربانے اُسے مناسی  
 نظروں سے دیکھنے ہوئے کہا۔  
 "بہت چمکی لگ رہی ہو، چشم بدور ہمارے  
 لیے دیکھنے والے بہت خوب صورت ہیں۔"

اپنی تعریف سن کر نور بانو کے کان لال ہو گئے۔ علی  
 اکبر کے گھر میں اس کی چھوٹی بہن، جو کہ اُس کی ہم عمر  
 تھی اور ایک ماں، ایک بھائی، ان کے دو چھوٹے بچے  
 تھے۔ بھائی کی دکان تھی، جس پر علی اکبر کا بھائی قاسم علی  
 اور والد دونوں دن مہر ہونے تھے اور رات گئے آتے  
 تھے۔ بڑے ست حمن والا چار کمروں اور ایک بیٹھک  
 سمیت بکا گھر تھا۔ یہ درمیانے درجے کی ایک خوشحال  
 تھیلی تھی، علی اکبر کی سہیل سروس تھی۔ نور بانو علی اکبر کی  
 ماں کو ماں کہتی تھی اور وہ بھی اسے اپنی بیٹی کی طرح ہی  
 چاہتی تھیں۔ سب گھر والوں نے اُسے گھر جیسا پارو دیا  
 ہوا تھا، پھر تین چار دن بعد ملتان منگانی کا ڈپا لے ہوئے

اس نے نو خود کو اسے خدا کے حوالے کر دیا تھا۔ اب  
 تک اس کی جان کے ساتھ عزت بھی سلامت تھی،  
 جس کے لیے وہ خدا کا دل ہی دل میں شکر ادا کر رہی  
 تھی۔ چلتے چلتے اب وہ بڑی چکی سڑک پر آگئے تھے۔  
 "دعا کر کہ جلدی نہیں لیں اس ل جائے۔" کرشن نے  
 اُس سے کہا اور چلتے چلتے ہی اُس نے کپڑے بدلنے  
 شروع کر دیے۔ اندھیرے کی وجہ سے کچھ بھی صاف  
 نظر نہیں آ رہا تھا۔ کرشن نے اُسے ایک دم زکے کو کہا  
 اور خود ایک پیڑ کی اٹھ میں بیٹھ گیا، چند منٹ بعد وہ  
 فوجی کے بجائے ایک سکھ مرد کی صورت میں غنا۔ ہاتھ  
 میں ایک لٹھ اور دوسرے ہاتھ سے اُس نے اس کی پوٹی  
 اور اپنے کپڑوں کو آگ لگا کر سڑک سے نیچے کھیت  
 میں اٹھ سیٹ ڈھکیں ڈالیں اور اس کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے  
 سڑک کی دوسری جانب ہو کر بھاگنے لگا۔

نور بانو اس صورت حال میں بالکل بدحواس  
 ہو رہی تھی۔ اس کا ہاتھ تھی سے اس کے ہاتھ میں رہا ہوا  
 تھا۔ پہلا موقع تھا کہ ایک غیر مرد نے اس کا ہاتھ اس  
 طرح پکڑا تھا، لیکن یہ اس کی جھوٹی تھی۔ کرشن جلد از  
 جلد اس جگہ سے دور نکل جاتا چاہتا تھا اور پھر دس منٹ  
 بھاگنے کے بعد وہ ڈک گیا۔ کرشن کو نو زبانہ فریق نہیں  
 پڑا تھا، لیکن نور بانو بری طرح باپ رہی تھی۔ اس کا  
 سینہ دھوکھی کی طرح جل رہا تھا۔ کرشن نے اُسے پائی دیا  
 جو کہ بول میں وہ ساتھ لائے تھے۔ دو گھنٹ پائی پی کر  
 آہستہ آہستہ چند منٹ میں وہ مارشل ہو گئی اور اب وہ  
 پھر چلنے لگے تھے اور چلتے چلتے ایک بڑے روڈ پر پہنچ گیا  
 گئے اور جیسے ہی وہ روڈ پر چڑھے ایک بس نیا کھڑی  
 تھی۔ وہ اس میں سوار ہو گئے۔

رات پھر کے سبز کے بعد وہ لوگ ممبئی پہنچ گئے۔  
 یہاں بہت مہمانی تھی۔ وہ حیران حیران ہی تھی۔ نور  
 بانو تو ممبئی اپنے گاؤں سے باہر ہی نہ تھی۔ کرشن نے  
 اُسے بتایا کہ ممبئی شہر ہے اور پھر وہ ایک تھکی میں سوار  
 ہو کر اکبر علی کے گھر پہنچے۔ علی اکبر اور اس کے گھر والوں  
 نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ نور بانو کو بھی کچھ منہ ملی ہوئی  
 تھی۔ عورتوں اور بچوں کے درمیان آ کر۔ اکبر علی اور  
 کرشن تو سردانے میں رکھے ہوئے تھے، جب کہ وہ

فہمست میں عزت بھری زندگی آئی، ورنہ جب وہ دیگر لڑکیوں کے بارے میں سوچتی تو اس کی بہت جواب دے جاتی۔ وہ سیدہ شکرہ اور کرنی کہ فہمست نے اس پر اپنی خاص مہربانی کی ہے اور اسے سادوں مشکلات سے نکال انا محبت کرنے والا شوہر رہا ہے۔ عبد اللہ میں اس کی جان بھی، کیوں کہ وہ بھارت کا ایک بھگتوز انجینی تھا، اس لیے اسے بمبئی میں بھی بڑا خطرہ تھا۔ اس لیے بابا صاحب (علی اکبر کے والد) کے صلاح مشورے سے وہ اپنی بیٹی شناخت کے ساتھ بحیثیت مسلمان آزاد کشمیر کے ایک گاؤں میں، جہاں بابا صاحب کے کچھ جاننے والے تھے، ان کے ساتھ کھلے میں رہنے لگا۔

یہاں نور بانو کو اپنے جیسے لے پنے بہت سے خاندان ملے، یوں وہ جیسے اپنوں کے درمیان تھی، عبد اللہ نے اپنے کام کے ساتھ اس کے بھائی کی بھی تلاش شروع کر دی تھی۔ اندر ہی اندر وہ مجاہدوں سے مل گیا تھا۔ نر جنگ کے دوران اس نے کشمیری نوجوانوں کا جذبہ آزادی رکھا کہ وہ سب شمع آزادی کے پروانے جانا چاہتے تھے۔ جب سب مل کر نگرہ تکبیر پڑھنے تو دل چھوٹنے بیچ کی طرح ہلکے ہلکے جانا اور ان کے دلوں میں شوق شہادت اور بھی بڑھ جاتا۔ جب دل میں تکی لگن اور نوب ہو تو منزل بھی ٹرپ محسوس ہوتی ہے۔ مجاہدین کا جذبہ شہادت دیکھ کر عبد اللہ کا دل بھی شوق شہادت سے بھر بھر جاتا۔ جذبہ آزادی اور پھر بھارتی فوجوں کے ظلم و ستم نے ان کے جوش و ولولہ کو اور بھی تیز کر دیا تھا اور وہ سب وطن کی آزادی کے جان نثار بردانے بن چکے تھے۔ بہت سے مشن ان کے ساتھ مل کر عبد اللہ نے بھی انجام دیے تھے اور بر مشن کی تکمیل کے بعد اسے ایک عجیب قسم کی خوش محسوس ہوتی تھی۔ چار سال ہو چکے تھے اسے کشمیر میں۔ اس کے ابو نور بانو کے اب دو بیٹے تھے ان کے وطن کی رونق تھے، جب وہ گھر جاتا تو وہ دڈر کر اس سے پلٹ جاتے نور بانو نے تو اب بھائی کا آسرا تک چھوڑ دیا تھا۔ پہلے وہ عبد اللہ سے اکثر پوچھتی تھی، لیکن اب اس نے یہ سچ بھی چھوڑ دی تھی، کیوں کہ عبد اللہ کی خاموشی اسے سب کچھ بتا دیتی تھی۔

اس کے پاس آئیں اور کہا۔

”مبارک ہو نور بانو، کرن اب کرن سنگھ نہیں رہا، بلکہ عبد اللہ ہو گیا ہے۔“ لومضانی کھاؤ۔“

”کسا مطلب۔“ وہ دیکھتے ہوئے بولی۔

”بیٹی اس نے اسلام قبول کر لیا ہے اور یہ سب تمہاری بدولت ہوا ہے۔“ تکب کام۔“

”اجھا۔“ اس نے مضانی لیتے ہوئے کہا اس کے دل میں خوشی اور چہرے پر حیرانگی تھی اور محسوس ہی مسکراہٹ کے ساتھ وہ مضانی کھانے لگی۔

”عبد اللہ سے مل کر اسے مبارک باد نہیں دو گی۔“

نر بانے اسے ٹوکا۔

”ماں باں بیٹی تم اسے ضرور مبارک باؤ۔۔۔ وہ بہت خوش ہو گا۔“ اور اس نے سر میں مسکراہٹ کے ساتھ۔۔۔ ”ہاں“ میں گردن ہلاتی اور پھر مغرب کی نماز کے بعد وہ بیٹھک میں عبد اللہ کے رہبر بھی اور مہلکا پھولوں کا ہار اس کے گلے میں ڈالنے ہوئے وہ بھجک بڑی دلگلی لگائیں انہاں سامنے تھیں، اس لیے انہوں نے اس کی بہت بندھائی۔ عبد اللہ تو اس بہت افزائی پر کھلا جا رہا تھا۔

نور بانو کے عشق میں تو اسے خدا سے لگاؤ ہوا تھا اور

اس نے نور بانو کے لیے اپنا آب پانی ہر چیز قربان کر دی تھی۔ انہاں انہیں نیا چھوڑ کر بیٹھک سے چلی گئیں۔

نب عبد اللہ نے آٹھ کر اس کے ہاتھ تمام لے اور نور بانو نے جب جبار آکھیں انہاں تو اس کی آنکھوں میں

بھی محبت کے سب رنگ تھے اور پھر چندوں کے بعد عبد اللہ اور نور بانو کا نکاح تھا۔ اسے ماہوں بٹھا با گیا،

ہر ہندن لگتی تھی، نکلے والوں کے ساتھ مل کر گیت گانے گئے، بالکل اپنی بیٹی کی طرح اور نور بانو کو انہاں نے جینر کے ساتھ دیا۔

کے ساتھ دیا۔

نور بانو اس روز اپنے گھر والوں کو یاد کر کے خوب روئی اور اسی محلے کے ایک گھر میں جو کہ کرائے پر لیا گیا

تھا، وہ رخصت ہو کر وہاں آ گئی۔ عبد اللہ نے اسے بہت ہنار اور بڑی محبت دی۔ نور بانو سوچ دیتی تھی کہ

اس سے تو تقدیر نے سب کچھ چھین لیا، لیکن عبد اللہ نے تو اس کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ دیا۔ اس کی



”بہنا..... وہ سب ہمیں خوشی خوشی واداع کر اور وطن کی آزادی کی دعا کیا کر۔ کشمیر کی خواہش و سچے کس عذاب سے گزر رہے ہیں مجھے تو معلوم ہے نا..... دعا کر، اگر میں شہید ہو جاؤں تب خدا تجھے اور تیرے بچوں کو آزادی کے دن دکھائے۔ آمین۔“

سب نے مل کر کہا اور نور بانو نے تڑپ کر بھائی کو گلے سے لگایا۔

”خدا کرے بھائی جان آپ بھی آزادی کی صبح دیکھیں، آمین۔“ پھر سب نے کہا اور دیکھی آنکھوں سے ان کو رخصت کیا۔ عبدالرحمن نے بچوں کو پارکیا اور عبداللہ کے ہاتھ چومتے کہا۔

”میں تمہارا بہت احسان مند ہوں کہ تم نے میری نور کو عزت دی، گھر دیا، پناہ دیا۔“ عبداللہ نے اُسے گلے سے لگایا اور پھر دونوں نماز برداشت ہوئے۔ نور انہیں اس وقت تک دیکھتی رہی، جب تک وہ آنکھوں سے اوچھل نہ ہو گئے۔

گاؤں میں سب مل جل کر رہتے تھے۔ ان کا چھوٹا موٹا کاروبار تھا، کچھ موٹی وغیرہ پال رکھتے تھے، جن سے دل والی چل رہی تھی، ایک دن نور بانو برتن دھو کر نوکری میں ڈال کر اندر باورچی خانے میں رکھنے جا رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

”خدا خیر کرے“ آج صبح سے دل کی دعاؤں میں شدت آگئی تھی۔ عجیب اُرداسی بل پر چھا رہی تھی، نور بانو نے کمر دروازے کی طرف دیکھا اور کمر پر نوکری دھرے دھرے ہی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ ایک مجاہد نے آگے بڑھ کر سلام کرتے ہوئے کہا۔

”محترمہ۔ آپ کے شوہر اور بھائی دونوں نے جام شہادت نوش کر لیا ہے..... وہ وطن کے عظیم سپوت تھے، انہوں نے وطن کی آزادی کے لیے اپنی جان نثار کر دی ہے۔“ یہ سنتے ہی نور بانو کے برتن چھوٹ کر بکھر چکے تھے اور وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ روشن راہوں کے مسافر اپنی منزل پر پہنچ کر زندہ جاوید ہو چکے تھے۔

☆.....☆

اور دن عید سے کم نہیں ہوتا تھا جس روز عبداللہ گھر پر ہوتا اور نور بانو اور بچوں کو وہ گھمانے پھرانے کے لیے لے جاتا اور جب وہ کسی گاڑی پر جاتا تو نور بانو خدا سے اس کی اور اپنے کم شدہ بھائی کی سلامتی کی دعائیں مانگتی تھی اور ساتھ ہی اپنے سببگ کی جدائی کی لمبی راتیں بے چینی سے گزارتی تھی۔ انہی بے چین راتوں اور دنوں میں ایک خوش قسمت دن بھی آ گیا، جب عبداللہ نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے اُسے آواز دی، تو وہ تو خوشی سے لپک کر کمرے سے باہر نکلی تو عبداللہ نے ایک طرف ہوتے ہوئے خوشی سے کہا۔

”دیکھو..... نور کون آیا ہے۔“ ساواہلی کی گرہ بھی اُس کے چہرے کو نہ چھپا سکی تھی، جس پر کھسی واڑھی موچھوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔

”بھائی جان.....“ نور کے سبب کپاتے ہوئے نور سے ایک دم نکلا اور وہ دوڑ کر اپنے بھائی سے لپٹ گئی۔ دونوں خوشی سے روتے ہوئے ایک دوسرے کو چوم رہے تھے۔ عجیب رقت آمیز منظر تھا، پھر چاروں اس کا بھائی اور عبداللہ گھر میں رہے۔ اس نے اپنے او عبداللہ کے حالات اُسے بتائے اور جی جان سے بھائی کی خدمت کی۔ بھائی بہت وہاں رہا تھا..... چھ ماہ سے وہ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ و شمنوں کی قید میں تھا۔ یہ تو اچانک مجاہدین کے ہنٹلے میں آئیں بھارتیوں کے ہنٹلے سے نجات مل گیا۔ وہ دو وہی کیسپ میں رہے، وہیں عبداللہ و شمنوں کی خدمت کرتے ہوئے اس سے ملا۔ نور بانو سے مشابہت کے سبب اسے پہچان گیا اور جب اس کے گاؤں اور پھر نور بانو کا نام لیا تب عبدالرحمن نے اُسے کچھ حالات بتائے اور پھر عبداللہ نے اُسے اپنے مصلحتن بتایا، پھر وہ نور بانو سے ملنے آیا کہ بہن کی محبت نے اس کے دل میں ایک تڑپ پیدا کر دی تھی۔ کن میں اس بات کی خوشی تھی کہ بہن زندہ سلامت ہے اور گھر جاوالی بھی۔

نور بانو کا دل ابھی بھائی کی محبت سے بھرا بھی نہ تھا کہ دونوں نے رخصت چاہی، تو اس کی آنکھوں سے آنسو بے اختیار بہنے لگے۔



ایس اتما ز احمد

ایک گورکن کی عبرت خیز کہانی جس نے اپنی محبوبہ کو.....



کھل اٹھا تھا۔ نبھاتے وقت وہ مولوی صاحب سے بھی بڑھ چڑھ کر سرگرمی دکھاتا، پھر اسے اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر قبر میں اتارتا اور بڑی احتیاط سے اٹھیں چتا، کئی ڈالتے وقت لوگوں کو اس سے زیادہ اجازت نہ ہوتی تھی کہ وہ مٹی کی مٹن مٹی بھری قبر کی طرف اُجالا لیں۔ اس کی بڑی بڑی انگلیاں نکلار نہ چا بکد سنی کے ساتھ مٹی سے کھیلتیں اور دیکھتے ہی دیکھتے قبر سانچے میں ڈھالی ہوئی معلوم ہوتے لگتی۔

وہ گورکن تھا اور ہوش سنبھالتے ہی اس نے قبر تانا سیکر لیا تھا۔ اسے قبر بنانے کا شوق تھا۔ خوب صورت اور دلکش قبریں، ایسی قبریں جنہیں دیکھ کر لوگوں کو مرنے کی آرزو ہو۔

بھی بکھار دہ نمونے میں تہہ لپی بھی کر دیا کرتا تھا، تاہم ایسا بہت کم ہوا تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک صرف دو بار ایسا ہوا تھا کہ ایک قبر ان کے باپ کی تھی اور دوسری اس بڑھبا کی جو صاحبہ کی ماں تھی۔ پوری دنیا میں اسے دو چیزوں سے شغف تھا، قبر اور صاحبہ سے۔

دو اپنی جھونپڑی میں اکثر چھوٹی چھوٹی قبریں بنایا کرتا تھا، جنہیں بار بار بنانے اور تاننے سے ہر طرف مٹی کھرنی رہتی تھی۔ لوگ اسے پاگل کہتے تھے اور اس کا

”اسے قبر بنانے کا شوق تھا۔ ایسی قبریں جنہیں دیکھ کر لوگوں کو مرنے کی آرزو ہو۔“  
مرد، خوب صورت ہونے کی شکل میں اس کا بی



کے کفر پر مستعد و جگہ چھوٹے چھوٹے گڑھے تھے اور سنی صحیحی ہوئی تھی۔

صائمہ جا رہی تھی، اس نے ہاتھیں نیچے لٹکائی ہوئی تھیں، ہنسیوں اب دو ہوئے ہوں بلکہ اسی تھی، اس نے ہاتھ کی پٹیلی پر ٹھونڈی تھی اور اس کی نظریں سجھی ہوئی تھیں۔ دو درانی طویل اور نمد و پیلوں کو پار پار جھپک رہی تھی۔ اس کی نکل ڈھنکی ہوئی تھی اور دو پانسرا سے ڈھلک گیا تھا۔

“صائمہ! شاید نے اسے شوکا دیا۔

صائمہ نے جواباً اپنی بیٹی سی، فرنگیسوں اور افساد پر۔ ان کی مسکراہٹ کا ٹکس ان کی آنکھوں سے بھی جھٹک رہا تھا۔ “ہم نے جو فریڈ کے گرد بھول گئے تھے، تاہم، کھل گئے ہیں۔ کیا ہم دیکھو گے؟”

“ہاں۔“ صائمہ نے نکل کو درست کرنے ہوئے کہا، “اگر تم کہو گے تو میں ضرور دیکھوں گی۔“

دو درانی جو بیڑی سے باہر نکل آئے۔ شاید اس فریڈ کے اسے کسی طرف لے آیا تھا جہاں انہوں نے بھول لگائے تھے اور جنہیں ہر روز وہاں دیا کرتے تھے۔

بھینچتی تھی خوشبو اب ان کے تھنوں میں محسوس ہونے لگی تھی۔ ذرا دیر کے لیے وہ خود سے ہو گئے تھے۔ کسی نے کہا۔ بات نہیں کی، آخر کار صائمہ نے سکوت کو توڑا۔

“سیراجی خوشی سے بھولوں ایسا ہو رہا ہے۔“ اس کا چہرہ تھمرا رہا تھا اور آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔

“تم کو کچھ لگتا۔“ شاید نے کہا۔ ان کی آواز بھاری ہوئی تھی اور وہ اس وقت: ہنسی، جذباتی ہو رہا تھا۔ میں اسے بارگ سے زیادہ خوب صورت بنا دوں گا۔ لوگ یہاں دفن ہونا قابل کفر تصور کریں گے۔ ان کے ہونٹ کھینکائے گئے تھے۔

“کیا میں ایک بھول توڑوں۔“ صائمہ نے پوچھا۔

“نہیں نہیں۔“ اس کا ایک اور گھبراہٹ گیا۔ اس نے عجیب طریقے سے ہاتھ کو جھٹکا۔ اس کی آنکھوں سے نہ معلوم خوف جھانکنے لگا تھا اور ان کا رنگ بھی بدل گیا تھا۔

“تم ایسا نہ کر دو گی۔“ وہ ایک لمبے کے لیے رک گیا، تاہم اس نے جملہ مکمل کرنے میں دیر نہیں کی۔

خاتون اڑانے سے، تاہم اس نے کبھی بھی کسی کی پرہائیس کی تھی۔ وہ ہرے سے بے نیاز اپنے کام میں مشغول رہتا تھا۔ اس پورن کائنات میں اگر اسے کسی کی پرہائیس تو وہ صائمہ کی بھی جو کبھی بھی اس پر نہیں نکلی تھی۔ اگرچہ آغاز میں اسے یہ فریڈ کا سلسلہ بڑا ہولناک لگا تھا اور وہ اس فریڈ جیٹائی اور بیڑی بڑی سیاہ آنکھوں والے آدمی کی طرف حیران نظروں سے گئی رہتی تھی جو فریڈ کے بارے میں کمال سرت اور دلچسپی سے باتیں کرتا تھا، آخر کار اس کا خوف بھی آہستہ آہستہ دور ہو گیا تھا اور وہ اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگی تھی۔

انہیں آدھس میں ملتے پانچ سال ہو گئے تھے اور اس پانچ سال کے عرصے میں ایک رات بھی ایسی نہیں آئی تھی، جب صائمہ ان کی جھونپڑی میں نہ آتی ہو۔

وہ آج بھی ہمیشہ کی طرح اسے جھونپڑی سے باہر ہی آ ملا تھا اور اس سے لپٹ گیا تھا۔ بل بھر کے توفیق کے بعد ان نے کچھ شروع کیا۔

“جب میں تختہ سے چر ہو جا ہوں تو سرت اندر نہیں دیکھنے کی خواہش کتنی مند ہو جاتی ہے۔“ اس نے صائمہ کی آنکھوں میں جھانکا۔

“کیا تم جانتی ہو؟“ وہ اس کے رخساروں پر جھپک گیا۔ صائمہ چادر کی نکل میں ذرا کسمپاسی۔ اس نے شاید کی نیز تیز سانسوں کو چہرے پر محسوس کیا۔ پھر اس نے سر گھٹی کی۔

“میں آؤنگی ہوں، پھر تم ایسا کہیں سوچنے ہو۔“

ان کے لیے میں دکھ کی چائنی تھی۔ شاید نے اسے اپنے سینے کے ساتھ چٹانے رکھا اور اس کے باؤں کی خوشبو اپنے چہرہ پر بھرتا رہا۔ ذرا دیر کے بعد وہ جھونپڑی میں چلے گئے، رنگ آلود لائین کی جھبی جھبی رزنی میں ہر شے رحنڈا ہائی ہوئی تھی، جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی جھبی دکھانے کے ساتھ جوڑا ہوا تھا اور جھونپڑی کے دائیں کونے میں پوسٹر دسار رنگ بڑا تھا، جس کے رنگ کی جائز رنگ نے لے لی تھی۔ ان کے ساتھ ہی جا رہی تھی

چمکی ہوئی تھی، دو پار پر دو گلیں ٹھکی ہوئی تھیں۔ ایک پر فیس اور دوسری پر لائین دکھائی دے گی۔ دو پار کا وہ حصہ جہاں لائین تھی ہوئی تھی، کالا ہو چکا تھا، جھونپڑی

میانہ جواب تک بت کی طرح ساکت و جامد تھی، ات دیکھتی رہی۔ وہ بکا ایک ایسے آب گوواں خصوصی کرنے لگی تھی۔ اس نے جمبو نڈی کی طرف دیکھا۔ اپنا بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں سے دہان آنکھوں سے جن کی چمک ایک ہی لمحے میں کم ہو گئی تھی اور جن میں آواہی اور برائی والی بات کی سیاہی کی طرح آپ ہی آپ لذتی چلی آ رہی تھی، پھر دو تھکے تھکے قدموں سے گاڑن جانے والی چمڈ نڈی پر چلنے لگی۔

شاید جلد ہی وہ اچیں آ گیا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ قبر کے سربانے اس نے کمال اور کھرا رکھ دیا۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ اس نے سوچا۔ یہ جو خواہش تھی اسے کام میں کمال حاصل کرنے کی جس کے لیے میں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی، آخر اس سب کا کیا بنا؟ کچھ بھی نہیں۔ اس نے تاسف کے ساتھ سر ہلایا اور بڑے ہی دکھ کے ساتھ سوچا۔ میں نے محض اپنا وقت برباد کیا ہے۔ اس نے کھریا اٹھالیا اور ہولے ہولے ٹٹی اکھاڑنے لگا تو کیا میں اسے خیر آ یا دکہ دوں؟ اس نے سوچا۔

”نہیں نہیں“ اس کا دل تڑپنے لگا، یہ نہ ہو سکے گا اور کبھی ایسا ہو گیا تو اس کے لیے بہت بڑے طوفان کی ضرورت ہوگی۔ تاہم ماکامی کا گرنہ بک احساس اسے ذن رہا تھا۔ آخری مہارتوں کا چاند مشرقی افق سے ہولے ہولے خیم لے رہا تھا۔ دوسرے تھا تو اس میں روشنی نام کو بھی نہ تھی۔

شاید بڑا ڈاؤ اور بڑا سرد لگ رہا تھا، اس نے شام تک قبر کو صاف کر دیا تھا۔ تیر کو بند کرنے والی ایشیں ٹوٹ چکی تھیں۔ دو ایک دم سرت سے کھل اٹھا تو اس میں میرا گناہ چھبھی ہے۔ زرا اور کے لیے اس خوشی سے جو اسے خلاف توقع ہی تھی وہ بات پھر پھول گئے۔ کافی دن وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ آخر جب اس کی طبیعت اعتدال پر آئی تو اس نے فوراً ہی قبر کو مٹی سے برابر کروا دیا پھر اس نے کھرپے کی پشت سے تھپکیاں دے کر قبر کے کونے نکالے۔ اب اس کا روپ کھرا آیا ہے۔ دو بڑا بڑا، پھر اس نے اٹھ کھٹے کے ساتھ پیٹ پونچھا اور اوزار اٹھا کر جمبو نڈی میں آ گیا۔ مسکراہٹ سے اس کے بہت چھلے

”تم نہیں جانتیں یہ سب“ اس نے قبرستان کا احاطہ کیا۔

”یہ سب کچھ مجھے کس قدر عزیز ہے۔“ پھر وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے پھولوں پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

”پھول تو دیکھنے کے لیے ہوتے ہیں“ اس نے

کہنا شروع کیا۔ اس کا لہجہ بالکل کسی خوف زدہ بچے کی طرح تھا، تاہم اس کا رنگ جو زرا اور پہلے زرد ہو گیا تھا۔

اب معمول برآ چکا تھا۔ وہ زرا اور تک بیٹھا رہا۔ اس کی طبیعت آہستہ آہستہ اعتدال پر آ رہی تھی۔ آخر کار وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے صائیکہ کا بازو سے پکڑ لیا۔ وہ جمبو نڈی کا

طرف بڑھنے لگا۔ وہ چپ چاپ چل وے تھے اور ان کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ ایک اچھی وہ رک گیا۔ اس کی نظرس آواہی جانب والی قبر پر رک گئی تھیں۔

حاضر نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کیا یہ؟“

اس نے فوراً جواب نہیں دیا۔ زرا اور کے لیے وہ ہونٹ کا تار رہا۔

”یہ قبر چھٹی تھی ہے۔“ اس نے ایک برائی قبر کی طرف اشارہ کیا۔

”تو اس نذر کھیرانے کی کیا بات ہے؟“

اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا اور آنکھیں اٹنے لگیں۔ ”کھیرانے کی بات نہیں“ اس نے دہرایا۔

تمہا وے لیے اس میں کھیرانے کی کوئی بات نہیں۔ وہ بیٹھ گیا۔ ایک بنالی ہوئی قبر کا بیٹھ جانا کیا معنی رکھتا ہے، اسے

صرف میں ہی سمجھ سکتا ہوں۔ اس نے ہونٹ دانتوں میں دبایا۔ اس کے چہرے پر کرب کی بہت ہی تیز لہر دوڑ گئی۔

”اس کا مطلب ہے۔“ وہ رک گیا۔ اس نے وحشت کے ساتھ اوتر اور حرو دیکھا۔ ”میں اتاڑی ہوں۔“

اس نے بڑی ہی تکلیف کے ساتھ یہ جملہ ادا کیا۔ اس کی آواز کھرا گئی تھی اور اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھایا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے قبر کو ٹٹولا۔ پھر

وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر سختی ہی آ گئی تھی۔ جس سے اس کی درست کردوں گا۔ کل سے پہلے ملاقات کی کوئی صورت نہیں ہو سکی، ان دنوں نے جواب کا انتظار نہیں کیا

اور لیے لیے ڈگ بھرتا ہوا جمبو نڈی کی طرف چلا گیا۔

اور واپس آ گیا۔ جموں بڑی کے وسط میں کھانا رکھا اور کھا ہوا تھا جو کرنی اس کی غیر موجودگی میں رکھ گیا تھا۔ اس نے کہا کھا کر برتن کرنے میں رکھ دے اور دروازہ بند کر لیا۔ اور اپنے اس شاہکار کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔ کافی ریر کے بعد وہ جب اس سوچ کے سمندر سے نکلا تو رات بھگ چکی تھی اور ٹپکی ٹپکی ہوا چل رہی تھی۔ اس نے قبرستان کے درختوں کو سانس لیتے ہوئے محسوس کیا۔ اس نے اٹھ کر بائی بنا، پھر جموں پتڑی سے باہر نکل آیا۔ ان نے ستاروں کی مدد سے جان لیا تھا کہ صاف کھویر ہوئی ہے۔

”راہ کھینسا ناراض نہ ہوگی ہو۔“ ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا۔ ”آخر مجھے اس طرح الوداع کہنے کا کیا حق تھا؟“

وہ قبروں کے درمیان سے ہو کر گزرنے والی پگڈنڈی پر گھاؤں کی طرف چلنے لگا، تاہم ان نے قبرستان کی حد عبور نہیں کی، اس کے دل میں طرح طرح کے سو سے برا ٹھانے لگے تھے اور دل جو ابھی ابھی مسرت کے نئے گہرا تھا اب بٹکے بٹکے اضطراب سے درچار ہونے لگا تھا۔ یعنی اور انتظار کی شدید کوفت کو اس نے پہلی بار محسوس کیا اور وہ اس پگڈنڈی پر پرہیز چکر لگا ہوا۔ جب کافی ریر گزرنی نو ستاروں کی چمکی رہی روشنی میں ایک سایہ ابھرا جو نکل میں لپٹا لپٹا! جموں بڑی کی طرف بڑھنے لگا۔

آج اس نے صاف کو کافی فاصلے پر ہی چاہا تھا، وہ زرا ریر تک چپ چاپ کھڑے رہے، آخر شاہ نے ہاتھ تمام لیا اور وہ دھیرے دھیرے چلنے لگے۔ ابھی تک شاہ نے لائین نہیں مہلائی تھی۔

”کس قدر اندھیرا ہے۔“ صاف نے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

”جب تم نہیں آتی ہو تو یہاں کی ہر شے اجالے کی کرن تک کو ترس جاتی ہے، میرا دل ڈر رہے لگتا ہے اور کوئی بھی شے مجھے اٹھنی نہیں لگتی۔“

شاہ نے لائین جلا دی اور کہنے میں دھیمی دھیمی روشنی پھیل گئی، صاف ابھی تک کھڑی تھی۔ اس کی پگڈنڈی جھکی ہوئی تھی۔

”یہاں میرے پاس آنا۔“ شاہ نے چار پائی پر

ہوئے تھے۔ اس نے ہرزہوں کو دھوکہ دہریوں کا تیل لگا با، اس کا مزاج بڑا خوش گوار ہو گیا تھا اور تم کی گھنٹا اس سے جوتا رہی اس نے اپنی روح پر چھائی ہوئی محسوس کی تھی، مسرت کے نور میں دم توڑ گئی تھی۔ وہ چار پائی پر روزانہ ہو گیا۔ اس کا جسم رکھ رہا تھا، تاہم وہ خود کو بڑا ہی ہلکا محسوس کرنے لگا تھا۔

اگلے دن کافی ریر تک سوتا رہا، جب در اٹھا تو سورج کافی بلندی پر پہنچ چکا تھا۔ اس روز وہ ستاروں فہروں کے درمیان سے گھاس کھو رہا۔ شام کے وقت وہ نہا کر جموں بڑی میں آ گیا اور چار پائی پر لیٹ گیا۔ وہ اپنے نئے زبان کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔

ان دنوں وہ ایک نئی قبر بنانے کی فکر میں تھا۔ کافی رازوں سے اس کے ذہن میں ایک راز چھپا ہوا بھر رہا تھا، بلکہ اب تو کافی حد تک مکمل ہو گیا تھا، اس نے ایک بار صاف سے رگوں بھی کیا تھا اور در اس وقت بڑا جذباتی ہو رہا تھا۔

”تم ریکھ لینا کسی قبر ساری دنیا میں نہیں ملے گی۔ میں اسے اپنے خون سے ستیوں گا۔“ اس نے دونوں ہاتھ کمر پر باندھ لیے تھے اور جموں بڑی میں ٹپکنے لگا تھا، اس کی آنکھوں میں مجبوری چمک آئی تھی۔

”تو دفن آ گیا ہے کہ اسے شروع کر دیا جائے۔“ اس نے چار پائی پر لیٹنے لے کر صاف کو اب ان کھویر کر، جسے ہر روز میں تصور کی آگھ سے رکھتا ہوں، میرے ہاتھوں زمین کے اس ٹکڑے پر چشم لینا ہوگا، جو مدت سے اس کا منظر ہے میں اسے کل ہی شروع کر دوں گا، مجھے اپنا آپ پھینتا ہوا محسوس ہونے لگے۔ وہ اٹھ کر جموں بڑی سے باہر نکل آیا۔ اس کے رخسار ختمانے لگے تھے اور ہاں میں اسے کل ہی شروع کر دوں گا۔ اس نے بلند آواز سے کہا۔

پھر وہ چلا ہوا اس جگہ تک گیا جہاں اس شاہکار کے لیے عرصے سے پڑی ہوئی تھی، یہ جگہ بقول اس کے پورے قبرستان میں جنت کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہاں چھوٹے سے قلعے کو لیے اور کھلے درختوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا اور زمین پر گھانٹا آگ آئی تھی جو پڑی کرکٹ لگتی تھی۔ اس نے نرم نرم گھاس پر باندھ پھیرا جس پر اس کے موٹی پڑے ہوئے تھے، اس پر قبر کے نشانات لگائے



بانٹھ سے جگہ بتائی۔ ساتھ اس کے فریب آ کر بیٹھ گئی۔

”کیا تم ناراض ہو گئی ہو؟“

اس نے پلٹیں اٹھائیں اور شاہد کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”میں تم سے ناراض نہیں ہو سکتی۔“ اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔ وہ مسکرائی اور اس نے پچھلا ہونٹ واغٹوں میں ڈالیا۔ شاہد نے اپنی طرف کھینچا، وہ اس کی چھاتی پر ڈھسے ہی گئی، دیکھی ہوئی چڑبائی طرح چست ہو گئی۔

”جب تم روبرو سے آتی ہو تو میری روج پھڑپھڑانے لگتی ہے۔ میرا جی کسی کام میں نہیں لگتا۔ ہر نئے مجھے نئی بات کا احساس دلاتی ہے۔“ اس نے ساتھ کے بالوں کو چوما۔ ”میرا بھی تو جی نہیں لگتا۔“ وہ اُداس ہو گئی اور اس کا رنگ پھیکا ہو گیا تھا، اس کی آواز وہی تکرار لگتی تھی۔ ”سارا دن دل جھجا جھجا سا رہتا ہے اور ہر چیز کو اس طرح کھوٹی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہوں جیسے کچھ کھو گیا ہے۔“ اس کی طویل اور شیدہ پلٹیں جھک گئیں۔ اس نے اپنا پچھلا ہونٹ واغٹوں میں ڈالیا۔ اس کی ٹھنڈی پر نئے نئے گڑھے پر گئے تھے اور اپنی آنکھوں کو اس نے بڑے ہی کرب کے ساتھ بند کر لیا تھا۔

”میں نہیں جانتی میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔“ وہ اس کی گود میں گر گئی اور سسکتی گئی۔

”تم رونا نہ کرو۔“ اس نے ساتھ کا چہرہ جو آگ کی طرح دیک رہا تھا ہاتھوں میں اٹھالیا۔ ”تمہارے آنسو مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتے۔“ شاہد نے اس کی آنکھوں دھساروں اور رزرتے ہوئے ہونٹوں کو چوایا، پھر اس نے ساتھ کی آنکھوں میں جھانکا جو سرخ ہوئی تھیں اور پونے معمول سے بھاری تھے، شاہد وہ رات بھر نہیں سوئی تھی۔ باہر ہوا تیز ہو گئی اور درختوں کے پتے بری طرح کھڑکھڑانے لگے تھے۔ وہ کافی دیر تک اتنی طرح بیٹھے رہے، جب کافی وقت گزر گیا تو وہ پھول دیکھنے قبروں کی طرف چلے گئے۔

آنکھ دن کی مسلسل جدوجہد کے بعد اس نے قبر کھل کر لی تھی۔ اس کا جسم مثل یوگیا تھا اور مضبوط ہاتھوں میں جھالے پر گئے تھے، اس کا بے پناہ سرت سے دوچار ہوا تھا۔

اس نے قبر پر اس طریقے سے پھول لگائے تھے کہ

قبر پھولوں سے گندمی ہوئی معلوم ہوئی تھی، اس نے پھولوں کے پودے اوپر سے نیچے کی طرف لگائے تھے اور ان کا درمیان فاصلہ نصف انچ سے زیادہ نہیں تھا۔

اس طرح پھولوں کے ذخیل نظر نہیں آتے تھے اور پھول پھول چڑھ گئے تھے، ہوں لگنا تھا جیسے پھولوں کی چادر بچھا دی گئی ہو۔ یہ سلسلہ ابھی ایک طرف ہی ہوا تھا، کیوں کہ نیچے کی طرف سے قبر کھلی تھی، تاہم اس نے زمین پر پھول لگا دیے تھے تاکہ ضرورت کے وقت پھول تیار ہو چکے ہوں۔ اس کے علاوہ ذرا ذرات فاصلے پر انار اور بادام کے درخت لگا دیے گئے تھے، جنہوں نے قبر کا چاروں طرف سے احاطہ کر لیا تھا۔

درخت کافی بڑے تھے اور وہ انہیں شہر سے خرید کر لایا تھا۔ ان چیزوں کو خریدنے کے لیے اس نے کپڑوں کا اکلوتا اور نیا جوڑا بیع ٹریک کے فروخت کر دیا تھا۔ وہ بے حد خوش تھا، ایسی خوشی اور اسی اطمینان اس نے زندگی میں پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا، اس کے ہونٹوں سے ایک بچھائی شہر غیر احتیاطی طور پر پھوٹ پڑا، پھر اپنے جسم کو بے متنی انداز میں حرکت دینی، اس کا جی چاہا کہ وہ تازے لیکن اپنی اس خواہش کو عملی جامہ پہنا نہیں سکا۔ اس نے جھونپڑی اور ڈیرنگ کی پتھر لگا ڈالے۔ وہ ساتھ کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اسے اپنا شاہکار دکھانا چاہتا تھا جس کے لیے وہ عرصے سے تڑپ رہا تھا، آخر جب اسے ساتھ دکھائی دی تو اس نے ودر ہی سے پکار کر کہا۔

”میں نے وہ قبر کھل کر لی ہے۔“ اس نے مزہ بھرتکتلو کے بغیر ہی ان کا رخ فبرکی جانب پھیر دیا۔ ساتھ اس کے پیچھے چلے گئی تھی۔ اس نے خلاف معمول صرف دو پناہی اوڑھ رکھا تھا، اس کی کمر پٹی اور شیدہ تھی۔ جس سے چلنے وقت ان کے دونوں حصے الگ الگ چلنے ہوئے تھیں، پورے تھے۔

ساتھ اسے دیکھ کر اپنی ستور ہو گئی تھی۔ بادام اور امیر کے درختوں پر گلیاں کھل رہی تھیں۔ پھولوں کی چھتینی بھی خوشبو نفا میں پھیل رہی تھی۔ وہ چپ چاپ کھڑی تھی اور آس پاس کی ہر شے کو گور کر رکھے جا رہی تھی۔ شاہد بڑا جذبہ پالی ہو رہا تھا، اس کا سانس تیزی سے

اس نے فیصلہ کر لیا اور نئی قبر کھودنے میں مصروف ہو گیا۔ اس آؤدی کو نئی قبر میں دفن کیا گیا۔ تمام شاہد کے دل میں کھدو دہنے لگی۔ قبر کے مکمل ہونے کا جشن منظراب میں بدل گیا تھا۔

مجھے اس میسار کا مرو بھی نہ مل سکتا گا۔ وہ اب اکبر سوچنے لگا تھا اور بے چینی جس جس ذمہ کی آسپرز ہوتی ہے، اس نکلے کی طرح کر بدنے لگی تھی۔ روز بروز کسی اس کے چہرے سے برص نشت ہوتی جا وہی مٹی میں کی آنکھوں کی چمک بجھتی تھی اور چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ مٹی اچانک ہی ایک ہی سکراتا ہوا چہرہ دفن میں اٹھتا، خوب صورت اور دلکش چہرہ جو واقعی اس کے مبارک پر اترتا تھا اور جس کے ایک بال میں بھی مٹی ان کے کسی خانی کو چھوس نہیں کیا تھا۔ ”نہیں نہیں۔“ وہ اپنا پوچھتا سرب جھٹکتا، اس کے جہزے پہنچ جانے اور آنکھیں حلقوں سے باہر اٹھنے لگتیں۔ مٹی میں نذر کبید ہوتا جاوا ہوں۔ وہ سوچتا اور اس ذنبال سے چھینا چیزانے کے لیے وہ بانوں کی طرح قبروں میں بھاگتے لگا، جو اس کے ذہن میں اپنے واپس آتے گا زبے لگا تھا۔

مجھی ابھی اسے یہ وہم بھی سنانے لگا تھا کہ وہ اسی طرح سوچتے سوچتے قبر میں جاے گا اور لوگ اس جگہ پر کسی بھی ایسے آؤدی کو وہاں کے جس کی اہمیت اس کے نزدیک ذرا بھی نہ ہوگی۔

کافی دن وہ اپنی مٹی میں گھل رہا۔ وفات کے ساتھ ساتھ اس کی سخت مٹی گرتی جا رہی تھی۔

”زندگی کی ہر خوشی تو پوری نہیں ہو سکتی اور اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ زندگی کا ساتھ ہی چھوڑ دیا جائے۔“ اب وہ زندگی سے مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ مٹی اپنے غم کو ان کے فیصلہ کر لیا، ساتھ ساتھ اس کی محبت کے سامنے مٹی بھلا دوں گا اور ان قبر کو گل ہی ہمیشہ کے لیے بند کر دوں گا جو مجھ سے ہر شے جیسے چارہ ہی ہے۔ وہ دیکھنے پر ڈھیلے لگا۔ اس نے جانے کی طرف دیکھا جو کمان کی طرح بنا ہوا تھا۔ اس نے ہوا میں دوغٹن لیے لیے سانس لیے اور سوچا جات مٹی حسین ہے۔ وہ گھٹانے لگا، وہ مٹی وہی مٹی مگر غمگین آواز میں، جو صاف سر جھانپتی ہوئی لگتی تھی، پھر اس نے بل بھر کے لیے سنی بجاہلی اور

جل و پانہا۔ وہ کافی دیر تک قبر کی غریف میں نظر رکھتا رہا، آخر کار وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔  
”میں رات نہیں گزارتا جا ہوں مگر تمہیں نہیں خبر ہے۔“  
اس نے جواب کا انتظار نہیں کیا اور چھوہڑتی کی طرف بھاگ گیا۔

صاف کھڑی مٹی اور سدا بہا و بھولوں کی خوشبو سے لطف اندوز ہو رہی تھی، ذرا سی ویر کے بعد شاہد بھی اُٹھ گیا۔ اس نے جا رہی مٹی اور مٹی مٹی۔ اس نے قبر سے ہٹ کر بھولوں کی کناروں کے بالکل ساتھ چار پائی بچھاؤنی۔ وہ وہاں چار پائی پر بیٹھ گئے۔

”یہ ابھی محل نہیں ہے، بہر حال جلد ہو ہی جائے گی۔“ اس کا نفس ابھی تک غیر متوازن تھا۔ وہ صاف کہنے لگا کہ یہ ہی لبت گیا۔ مٹی ٹھک گیا ہوں۔ اس نے اپنے جسم کو ہبلا چھوڑ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

صاف قبر کی غریف میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے اور کہے کہے۔ اس کی آنکھیں اشرفانی انداز میں گردش کر رہی تھیں۔ وہ اپنا ہونٹ کاٹنے لگی تھی اور اس کی انگٹیاں بھی ایک دوسری میں الجھ کر تھیں۔ ایک ایک گاؤں سے چیتے اور چلانے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ رات کے ساتھ کو عورتوں کے مین پھیٹھوڑ رہے تھے اور دفن خانہ کی شو سے لرز اٹھی تھی۔

”مجھے جانے وہ ہمارا بڑی فوت ہو گیا ہے۔“ وہ زب کر اٹھی اور گھنڈی پر پگنت بھاگنے لگی۔

”خو کیا یہ مکمل ہو گئی؟“ اس نے اپنے شاہد کے بارے میں سوچا۔ آج ہی رات اس پر خرن پھول لگا دے جائیں گے۔ وہ دفن خانہ میں کے ڈھیلے پارک کرنے لگے۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ ہائی میں بائی لانا۔ آخر میں اس نے قبر تک نالی پھینچی جو نکلے سے پانی لاتی تھی۔ کام ختم کر کے سامان اس نے چھوہڑتی میں دھک دیا۔

”تو کیا ان قبر میں جسے میں نے اپنے خون سے سنبھا ہے ایک بڑھا آرام فرمائے گا۔ اسے کچھ کراہیت ہی ہوگی۔ نہیں نہیں، اس نے فوراً ہی زور دے کر دی۔ میں اس کی پگنت میں تاخیر برداشت کروں گا، لیکن اس میں کوئی انتہائی خوب صورت بدل نہیں ہوگا۔“

تاہم جلد ہی اس نے خود پر قابو لیا اور صائمہ کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے صائمہ کی پتلی عمر پر ہاتھ پھیرا، اس کی گوری گوری لمبی انگلیوں کو ہاتھوں میں لے کر دیا، اس کے گلاب جیسے ہونٹوں کو چوما، پھر اس نے صائمہ کو اپنے ساتھ چنایا۔

ایسا لگتا تھا جیسے وہ صائمہ کو اپنے سینے میں پیوست کر لینا چاہتا ہو، پھر وہ چار پائی پر لیٹ گیا اور اسے کندھے سے پکڑ کر کھینچا۔ صائمہ نے اپنے رخسار اس کے سینے میں پیوست کر دیے۔ اس نے صائمہ کی سانس کو اپنے سینے پر پھیلنے محسوس کیا۔ اس نے صائمہ کے بھرے بھرے گالوں کو گدگدا، پھر اس کی گردن پر ہونٹ رکھ دیے۔ اس کی سانس تیز ہوئی تھی، اس نے اپنے اندر ایک عجیب سی آگ کو پھیلنے ہوئے محسوس کیا۔

پھر ایک دم وہ تڑپ کر کھڑا ہو گیا، اس کے حلق سے بڑی ہی عجیب و غریب آواز نکلی جو کراہے کی جلتی تھی، صائمہ اسے پانکھوں کی طرح سمجھنے لگی تھی۔

”کیا ہوا؟“

اس نے جواب نہیں دیا، وہ دوڑاڑے تک گیا اور اپنے بالوں کو کھینچ کر نوجوان پھر ایسا کی وہ پلٹ آیا اور صائمہ کے ساتھ دوبارہ لیٹ گیا۔ وہ پانکھوں کی طرح اسے چومنے لگا تھا، اس کے ہاتھ صائمہ کو جبکہ جگہ سے اٹھا کر ہونٹوں کے قریب لارہے تھے۔

صائمہ پر بدبوئی بھی چھا گئی تھی، اس نے اپنا جسم ذہیلا چھوڑ دیا تھا، وہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس پر مکمل خور ہو گئی کی حالت طاری ہو چکی تھی، شاید نڈھال سا بورہا تھا اور اس کا پورا جسم کاپٹنے لگا تھا، تاہم اس نے اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے صائمہ کے گالے اور ہتھیلیوں سے پھر اس کی کانچی سیکھائی انگلیاں گردن کی طرف سرک گئیں۔

اگلے دن لوگوں نے دیکھا، قبرستان میں نئی قبر مکمل ہو چکی تھی۔ گورکن کا کہیں نشان تک نہیں تھا، تاہم اس کے اوزار قبر کے سرہانے نوٹے ہوئے پڑے تھے۔

☆.....☆

تال کے لیے سر کو ہلایا۔ ایسا کی اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک تنگ کر رہا ہے، حالانکہ ان چیزوں کے لیے اس کے دل میں رتی بھر جگہ نہیں تھی۔

اجابک وہ صائمہ سے ٹکرا گیا جو چاروں کے ہٹل میں سنی سناٹا کھڑی تھی، وہ چروں کی طرح ٹھٹھک گیا۔ اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ صائمہ نے اپنی بڑی سیاہ آنکھوں سے شاہد کو دیکھا، پھر نظریں جھکا لیں۔ وہ پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کرینے لگی تھی۔

”تم آگئی ہو۔“ شاہد نے بھیجی بھیجی آواز میں پوچھا۔ اس کا رنگ آڑا ہوا تھا اور آج پہلی بار وہ نظریں ملانے سے گریز کر رہا تھا۔ ”ہاں۔“

وہ جموہڑی میں طے کئے۔ شاہد نے لائین جلانے کے لیے اتارنی تو اس کی فحشی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بدل گئی۔ اس نے بغیر چھٹی کے ہی لائین جلانی اور کالج کے نکلے باہر پھینک دیے، پھر وہ اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ وہ اپنا ہنرم چار پارہا تھا، صائمہ کا چہرہ قدر سے رہا اور زرد ہو گیا تھا۔ شاہد ابھی تک خاموش تھا اور یہ بالکل ہی خلاف معمول تھا۔

”کیا میں اب تم کو اچھی نہیں لگتی؟“ صائمہ نے پوچھا۔ وہ سر جھانکی ہوئی اور پڑوس دی لگ رہی تھی۔

”میں اب صرف تمہارے سہارے سے جی رہا ہوں!“ اس کی آواز بھاری تھی اور اس کے چہرے پر تھکن کے گہرے تاثرات تھے، جلی بھر کے توقف کے بعد اس نے کہا۔

”مجھے عجیب عجیب خیال آتے ہیں، کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے آنے والے لمحے میں بہرے جسم کی وجوہاں اذ جا میں گی، میں تم سے کہتا چاہتا تھا کہ اب.....! مجھے خواہی وقت پر بھی نہیں رہا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ دو چیزوں کے درمیان آ کر میں پس جاؤں گا۔“ اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھایا۔

”یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم لیٹ جاؤ جہیں آرام کی ضرورت ہے۔“

وہ لیٹ گیا، کوئی سیاہی اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ وہ تڑپ کر کھڑا ہو گیا، اس کے جڑے پھینچ گئے،

## قسمت کی دستک

ریحانہ نسیم

ایک ایسے بڑے دل جوڑے کی کہانی جس نے خوابی قسمت پر تالا لگایا

فرحانہ صفائی کرتی رہی اور بوز بوزی رہی کہ ہر  
مہینے دو مہینے کے بعد آپا صفراں رشتہ کروانے کے  
بیانے لوگوں کو لالی تیرا اور کھانی کر چٹنی جاتی  
تیرا۔ آج تک نہ منگنی کروائی نہ ہی شادی۔ وہ زور  
تے بولی۔

"انہی آپا صفراں کہاں پیدا ہوتی تھیں؟ ہمارے محلے  
میں کیسے آئیں؟ آپ کی ان سے دوستی کیسے ہوئی؟"

صفیہ بولیں۔ "اے لو، مجھے کیا پتا کہاں پیدا ہوئیں؟  
کون سا رہ میری ام عمر ہیں، کم از کم دس سال بڑی ہوں  
گی مجھ سے۔" انہوں نے فوراً اپنی عمر واضح کر دی۔

"انہی مجھ سے اس گھر کی صفائی نہیں ہوتی۔ لالی  
اینوں کا کھن ہے۔ شکے والی جھاڑو استعمال کرتی پڑتی  
ہے۔ جتنا فرش ہو تو وہ منٹ میں جھاڑو پونچھا ہو جاتا  
ہے۔ یہ کھن تو یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ قسم  
ہی نہیں ہوتا، دھوپ گرمی الٹک۔ آپ ہاں لگا لیں  
صفائی کے لیے۔"

فرحانہ نے تک آ کر کہا۔

"اے ہاں یہ گھر تو مجھے بھی شروع ہی سے تاپند  
ہے۔ اتنا بڑا ہے اور رہنے والے صرف ڈھائی لوگ۔  
آگے برآمدہ، پیچھے کوٹھریاں۔ تمہارے دادا کو بھی انڈیا

"ارے فرحانہ بیٹی صفائی ذرا اچھی طرح کر لیا۔  
کل آپا صفراں کسی کو لا میں گی تمہارے رشتے کے لیے۔"  
صفیہ جھگمگے کہا۔

"انہی آپا صفراں کو پورے محلے میں صرف ایک  
میں ہی جوان لڑکی نظر آئی ہوں کیا؟ اور بھی تو میری کسی  
سہیلیاں ہیں۔ فوزیہ، رعنا، اسرنی۔ یہ ان کے گھر کیوں  
نہیں جاتیں۔" فرحانہ نے غصے میں کہا۔

"اری بے شرم، ناشکرئی کہیں کی۔ ایک تو وہ ہمارا  
خیال کرتی ہیں اور تیرے داماد ہی نہیں ملتے۔ چل  
دیواریں بھی جھاڑو لے، کہیں کوئی کھڑکی کا جالاندگا ہو،  
ورنہ وہ سوچیں گے کہ لڑکی چھوڑے۔" صفیہ آرزو سے  
کہا اور پچی خانے میں چلا گئیں۔

فرحانہ کے ذہن میں کل آنے والے لوگ ابھی سے  
آگئے اور اس نے دیوار پر جھاڑو ایسے زور زور سے ماری  
کہ جیسے وہ لوگ دیوار پر چنگے ہوئے ہوں اور جھاڑو سے  
بچ کر جائیں گے۔

بویکھ کر صفیہ بی بی ہیں سے جنٹیں۔

"کم بخت تو تو دے جھاڑو۔ چاروں بھی نہیں چلتی  
ہے، مہینے کی رو آ جاتی ہیں۔" انہوں نے مہینے کا خرچا پاتا  
شروع کر دیا۔







کو دیکھے ہی بند رکھا۔ اسٹور وہ کمرہ تھا، جو گھر کے مشرئی کوٹنے میں بنا ہوا تھا۔ یہ دوسرے کمروں کے مقابلے میں ذرا چھوٹا تھا۔ اس کمرے میں سے اکثر پیشتر عجیب سی آواز آ کر رہتی تھی، جیسے زمین کے اندر کوئی سخت چیز تکرار ہی ہو۔ شروع میں یہ سب لوگ بہت خوف زدہ ہوئے کہ ہندوؤں کا مکان تھا۔ اس کمرے میں صورتیں رکھی ہوئی تھیں۔ فرحانہ کے دادا حامد صاحب نے جب یہ مکان خرید لیا تھا تو اسے پاک صاف کر کے قرآن خوانی کروائی تھی اور پورے گھر میں نیارنگ دروٹن کر دیا تھا۔ اگر تباہ جلائی گئی تھیں۔ وہ ہر جمعرات جمعہ کو خاص طور پر اگر بتیاں پورے گھر میں لگاتے تھے وہ خود بھی حافظ قرآن تھے اور پورے گھر میں نبل نبل کر قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ ان کی بیگم بھی نمازی پابندی کرتی تھیں، مگر جب وہ آواز آتی تو ذرا ہی ضرورت تھیں۔

”کھنت ہندوؤں نے فردے چلائے ہوں گے، ان ہی کی بددروٹیں بیچتی ہوں گی۔“ ڈوھلا کر کہتیں۔

عزیز اور طوبی ان کے دو ہی بیٹے تھے۔ طوبی کی شادی کے بعد گھر اور خالی خالی ہو گیا تھا اس لیے نورانی عزیز کے لیے وہیں ڈوھلائی شروع کر دی گئی۔ صفیہ ان کو پسند آئی اور دروٹن بن کر اس گل میں آگئی۔ شروع شروع میں نو صفیہ کو اس آواز کا پتا نہیں چلا، پھر بچوں کی آمد شروع ہو گئی۔ طوبی کے کوئی دلاڑ نہیں تھی۔ وہ اکثر ماہوں ہو جاتی کہ میری شادی کو دو سال ہو گئے ہیں اور بھائی کی نوا بھی ہوتی ہے اور بھائی کے خوش خبری ہے، مگر اللہ کے آگے کسی کی جلتی ہے۔ رفیقہ بیگم ہر نماز میں اپنی بیٹی کے لیے دعا کرتی تھی کہ اللہ اس کی گود بھی بھر دے۔ صفیہ بیگم کے نئے ارپہ بچے ہوئے۔ فرحانہ پھر راجہ اور پھر عثمان۔

طوبی کا علاج شروع کر رہا گیا۔ اس کے شوہر دانش کا بھی چیک اپ ہوا، مگر اللہ نے ان کی دعاؤں کو مارا بیگان نہیں جانے دیا اور جب عثمان تین سال کا تھا تو طوبی کے گھر رہنا پیدا ہوئی۔ بڑی خوشیاں منائی گئیں، پھر ننھوڑے ننھوڑے دھتے تھے اور ادا جان بھی ہو گئے۔ پوس طوبی کا گھر بھی بچوں کے شوہر و نسل میں زوب گیا۔ حامد صاحب

سے آ کر یہی گھر کا شمار ہے کو؟ کوئی دوسرا کچھ لیتے۔ لوگوں نے نوا انڈیا سے آ کر خوب ہاتھ پاؤں چلائے تھے۔ خوب بنوڑا، ہنہار سے دراواہی ایک شریف آدمی تھے جو یہ محل لے کر بیٹھ گئے۔ ”انہوں نے اپنی ساس کو آتا دیکھ کر باقی کا جملہ بند سنا ہی روک لیا۔

رفیقہ بیگم نے اپنی بہو کے منہ سے اپنے شوہر کی تعریف سنی تو بڑا خوش ہو گیا۔ در ذرا اونچا سستی تھیں۔ عزیز ان کو بیٹا اور صفیہ کا شوہر تھا عزیز صاحب ایک شریف انسان تھے۔ گورنمنٹ ادارے کے ملازم تھے۔

سادہ طبیعت کے مالک۔ باز یادہ کی منشا نہ ہوں۔ انڈیا سے آ کر ان کے والد نے کلیم کے ذریعے یہ مکان حاصل کیا تھا۔ یہ ہندوؤں کا مکان تھا اور ان ہی کے طرز رہائش کے مطابق بنا ہوا تھا۔ اس کے چاروں طرف برآمدہ تھا۔ چیمبے کی طرف کمرے، کھلا صحن اور ایک طرف زینہ۔ یہ لال اینٹوں کا بنا ہوا ایک مضبوط مکان تھا۔ ان کے گھر میں کھلی افزادہنی کھتے تھے، وہ بنیان، فرحانہ بڑی 23 سال کی اور چھوٹی رابعہ 20 سال کی۔ آخر میں عثمان تھا 15 سال کا۔ یہ گھر ان کی ضرورت سے کہیں بڑا تھا، مگر صفیہ بیگم کو اس گھر سے خدا دارا سٹے کا پیر تھا۔ ایک تو ان کو اپنے مہاں کی سہمی سادہ طبیعت ناپسند تھی، بس جو کما آس جس ہی خوش ہیں آگے کی فکر نہیں ہے کہ لڑکیوں کی شادی کرنی ہے، بیٹے کو پڑھانا ہے۔ کسی ایسے علاقے میں ذرا چھوٹا مگر خوب صورت سا مکان دیکھ لیں اور جو پیسے بھی ہیں اس سے کوئی چھوٹی موٹی دکان کر لیں نو چار پیسے کی آمدنی ہونے لگی۔

چار بیٹے آفس سے آ کر میں نادر نہیں گئے، انسان ذرا آگے توڑا ہے، بس لکیر کے فٹربے ہوئے ہیں۔

عزیز صاحب کو ان کی شرافت کی وجہ سے پورے محلے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس وجہ سے آپا منفران جو بگلت آبا تھیں، آئے دن ان کے گھر لڑکیوں کے لیے رشتے لاتی رہتی تھیں۔ صفیہ ان کے لائے ہوئے مہاڑوں کی خوب آہ بگلت کرتیں۔ فرحانہ نے پورے گھر کی صفائی کی اور اسٹور

برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھی نہیں۔ انہوں نے جو زور و شور سے صفائی ہوتے دیکھی تو سمجھ گھس گھس کہ کوئی مہمان آ رہا ہے۔ فوراً بلبس۔

”ارے کیا مہربی طوٹی آ رہی ہے۔“ وہ لطف آ باو میں رہتی تھی وہ کہہ کر خود خیر آباد میں تھے۔ ایک ہی نو بجی تھی اس لیے جاہ صاحب نے اسے قرب میں ہی ایسا بجا بھا۔ کہ ایک ہی بھائی ہے۔ دونوں کو ملنے ملانے میں آسانی رہے۔ عزیز بھی اپنی چھوٹی بہن کا بہت خیال رکھتے تھے فرحانہ بولی۔

”نہیں واہی۔ چھوٹی نہیں ا رہی ہیں کوئی اور آ رہا ہے۔“  
 ”ارے کیا نور بیٹا آ رہا ہے۔“ نور ان کا بھانجا تھا۔  
 دو دو گ جا مشور میں رہتے تھے۔ فرحانہ نے ان کے کان کے قرب آ کر زور سے بتایا کہ نور بھائی نہیں بلکہ کوئی اور مہمان آ رہے ہیں۔ جب اب ان کو سمجھ میں آیا۔

شام کو عزیز آئیں سے آئے تو ضعیف نے ان کو آ پا صفرائ کے بارے میں بتایا۔ انہوں نے چاہنے پینے ہوئے پوچھا۔

”کون لوگ ہیں لڑکا کیا کرتا ہے۔“ غلام کھنٹی سے

کچھ بتایا آپا نے ان کے بارے میں کچھ

وہ بولیں۔ ”لوکا آ نور سے ہیں سب معلوم ہو جائے گا۔“

عزیز کا غضب آنے لگا کہ وہ پروندہ کوئی نہ کوئی اپنی

سیدھی پہلی اٹھا کر لے آئی ہیں۔ کبھی خاندان برابر ہی

کا نہیں، کبھی لڑکا جاہل ہے اور ان کی جگہ کو اپنی عقل

نہیں ہے کہ ضروری باتیں نو پہلے معلوم کر لیں۔ پھر سمجھ

میں آنے تو بلاؤ۔ وہ اپنی جگہ کی اس بات سے چڑنے

تھے۔ رشنے کے نام پر کوئی بھی کھا ہی کر چلا جاتا ہے،

اب بھی پہلی کی طرح کچھ معلوم نہیں کہ کون لوگ ہیں۔

کار و بار سے باور کرتی ہے۔ غلام کہا ہے؟ وہ پتال رکھ

کر غصے میں بڑبڑانے ہوئے پاہر چلے گئے۔ ان کی

سایں چپ چاپ بیٹھی و کچھ رہی تھیں۔ سمجھ میں نہ آ رہا

آبا نہیں، بس نینے کو غصے میں باہر جاتا دیکھ کر یہ سمجھ گھس

کہ بہو سے لڑائی ہوئی ہے۔ وہ بھوکے پوٹے لگے۔

”ارے ضعیف کہیں لڑائی سے بہرے پہنچے۔“ صبح کا

گھا شام کو آتا ہے تو کہا۔ ذرا گھر میں آرام کرنے

دیا کر، اب پھر باہر چلا گیا۔“

کا انتقال اچانک ہی ہوا تھا۔ پورے گھر میں کبرام بچ گیا

نہا، لیکن بھرا ہند آہن سب معمول پرتا نے گئے۔

عزیز صاحب حسب معمول آئیں جانے لگے۔

بچے اسکول چلے جانے تو گھر میں سنانا ہوا جاتا، انا بڑا گھر

جب اس سنانے میں جب اس کرے سے آواز آتی تو

ضعیف بیگم کے پسینے چھوٹ جاتے، سانس کو تو آواز اب کم

سنانا رہتی تھی۔ ان کی فوت ساعت عمر کے ساتھ ساتھ

کمزور ہو گئی، مگر ضعیف بیگم بہت ڈرتی تھیں۔ شروع

شروع میں انہوں نے عزیز صاحب پر بہت زور ڈالا کہ

وہ یہ مکان تبدیل کر لیں مگر وہ بولے۔

”ارے صرف آواز ہی تو آتی ہے، کوئی جن

بھوت تو آج تک نظر آبا نہیں ہے اور ویسے بھی اس

آواز نے آج تک کسی کو کسی قسم کا کوئی نقصان بھی نہیں

پہنچایا ہے، پھر بلا وجہ کان کیوں کھینچ دیں، ویسے بھی ابا

جان حافظہ فرآن تھے۔ اگر کوئی خطرے کی بات ہوتی

تو وہ خود اس کو چھوڑ دیتے۔ جہاں نماز اور قرآن پڑھا

جائے رہاں کوئی بد روح نہیں آسکتی۔ نہ ہار کی تسلی

کے لیے میں اس میں فالو کا سامان بھر کر تالا ڈال دینا

ہوں۔ تا اس طرف کوئی آنے اور نہ جانے۔ بیکار

کے وہم میں مت پڑو۔

یہ کہہ کر انہوں نے اس کرے میں فالو سامان بھر

کر تالا ڈال دیا، گویا انہوں نے ضعیف کا منہ بند کر دیا، مگر

جب وہ آواز آتی تو ضعیف بیگم کا منہ کھل جاتا اور عزیز

صاحب کا بند ہو جاتا۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ بچے

بڑے ہونے لگے آواز گامے لگا ہے آتی رہی، اس کے

بچھا۔ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ یہ کیا چکر ہے۔ آواز

کبھی ہے۔ اس تاریخ سے جو تالا ڈالا گیا تو پھر کھولا ہی

نہیں گیا۔ اب تو بچے بھی اس آواز کے عادی ہو گئے

تھے، مگر کبھی ایک لمحے گودہ ڈرنے ضرور تھے۔ ویسے بھی

کبھی سینے دو سینے میں پڑا آواز آتی تھی۔ آج بھی فرحانہ

نے پورے گھر کی صفائی کی مگر اس کرے کی طرف نہیں

گئی۔ راہبہ باور ہی خانے میں ماں کا ہاتھ بٹار ہی گئی۔

عثمان بھڑک کا امتحان دے کر فارغ ہوا تھا۔ اب وہ

زباہ وقت اپنے دوستوں میں رہتا۔ وہ اپنے آپ کو

فریٹش کر رہا تھا۔ والد صاحب آئیں میں تھے در فہم

کیوں کہ دوسرے گھروں میں نو بھری کا سامان کھانے کو ملتا تھا۔ سب بناری کے بعد فرحانہ نے نہا رحو کو ران کا گلابی سوٹ پہنا۔ لمبے بالوں کی چوٹی بنائی اور کانوں میں سونے کی جھولی جھولی بالیاں پہن لیں۔ بغیر مہک اب کے ان کا گوارا رنگ خوب مکمل رہا تھا۔ رابعہ کو اس نے منع کر دیا تھا کہ تم مہانوں کے سامنے مت آنا، ورنہ لوگ بڑی کوچھوڑ کے جھولی کی بات کرنے لگتے ہیں۔ ان لیے ورا اندرونی کرے۔ میں ہی کتاب پڑھنے بیٹھتی۔ عثمان کو بھی گھر میں ہی رہنے کا آرڈر دیا کہ کوئی کام پڑ سکتا ہے، یا ان کے ساتھ کوئی مرد ہو تو ان کے ساتھ کون بیٹھے گا۔

پڑے چھ بیچے ان لوگوں نے دستک دی۔ آپا مہنوں سب سے آگے اپنا شکل کاک، برقع سنبھالے چلی آ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک اچھے کھاتے چنے گھر کی اذہب عمر خانوں اور دو لڑکیاں ساتھ میں تھیں۔ ایک بڑی خوشامی شدہ لگ رہی تھی اور ایک رابعہ کی عمر کی تھی۔ مرد کوئی نہیں تھا۔ عثمان کی ایک ٹینشن نو ختم ہو گئی تھی۔ وہ بڑا خوش ہوا کہ اس کی جان بچ گئی تھی۔ سب ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ سلام دعا کے بعد مدعا فرما ہوا کہ اذہب عمر خانوں قد سید ہیں، لڑکی کے اس اور یہ دونوں چھوٹی سببیں ہیں۔ بڑی رانی شادمانی شدہ ہے، اس کا نام رضوانہ تھا۔ اس کی صرف ایک بیٹی تھی۔ اور اب نام رضوانی کا، دو تین سال کی تھی۔ چھوٹی کا نام ندا تھا، اس کی منگنی ہو چکی تھی۔ اب بیٹی کو باجئے سے پہلے وہ بڑھلا چاہ رہی تھیں، گھر ایک دم سے خالی نہ ہو جائے۔ اس لیے بہو کے آنے سے روکنا ہو جانی۔ وہ بیٹیوں اسی لیے ساتھ آئی تھیں کہ ایک ہی وقت میں سب رکھ لیں لڑکی کو، ورنہ ہارنی باری آ کر دیکھنا بہت نڈا لگتا ہے۔ جو قبیلہ بھی ہو سب کا شترک ہو۔ سلام دعا کے بعد فرحانہ نے مہنہ سے ان کے گھر کی تعریف کی کہ آپ کا گھر نو بہت خوب صورت ہے۔ صاف ستھرا نکلا نکلا۔ صنفہ بیگم حیران رہ گئیں، کیوں کہ یہ پہلی خانوں تھیں، بیٹیوں نے ان کے اس گھر کی تعریف کی تھی، انہوں نے بھی ایک نظر اپنے گھر پر ڈالی۔ صاف ستھرا گھر ترے پہلے سے تھا ہوا، سادگی اور صفائی کا حسین امتزاج لگ رہا تھا۔

صنفہ کو بھی غصہ آ گیا، ورنہ زرد سے بولیں۔ "خود گئے ہیں میں نے نہیں بیگلا۔"

"ہائیں، کیا جلا با؟ کیا سامان جلا رہا۔" در حسب عادت غلط بولے تھیں۔

"ارے زرد دل لگا کر سامان نکال کر، جب تو ہی جلا دینا چاہتے گی نہ مہری بیچاں کیا بیٹھیں گی؟" صنفہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور چپ چاپ رہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں اور ان کی ساں ایک مہنہ تک بولتی رہیں۔ تو راجھا بہا کہ مغرب کی اذان ہو گئی اور عثمان نے ان کو اشارے سے بتایا کہ اذان پوری ہے۔ شب در حسب ہوئیں۔

دوسرے کمرے میں رابعہ فرحانہ کو چھین رہی تھی کہ "پانچ بج لاکے والے آ رہے ہیں۔ آپ کون سا سوٹ پہنیں گی؟" فرحانہ جل کر بولی۔

"کم خواب کا جو نیا سوٹ تیار ہے وہی پہنوں گی۔"

رابعہ اس کی اس بات پر خوب ہنسی۔

صبح جب عزیز صاحب آفس جانے لگے نہ صنفہ نے بار دلا با کہ زرا جلدی آ رہے۔ لڑکی کے والے 6 بجے آئیں گے۔ وہ بولے۔ "اے بھئی آج نو صرف عودوش ہی تو آئیں گی۔ مہرا بھلا کیا کام؟ تم رکھ بھال کر لہنا، لہنگہ بچھ ہونے نہیں بڑا کلا کیوں گا۔"

صنفہ کی سمجھ میں بات نہ آئی۔ دے بھی در عام گورڈوں کی طرح نیز طرا نہیں تھیں۔ اس لیے عزیز صاحب ان کو سمجھاتے رہتے تھے۔ اب صبح ہی سے وہ بوکھلائی پھر رہی تھیں۔ جلدی جلدی سب کر لیں۔ لڑکیاں آرام سے اپنا اپنا کام کر رہی تھیں۔ ان کو معلوم تھا کہ جب تک مہان نہیں آ جاتے تب تک ان کا یہی حال رہے گا۔ آج کوئی نئی بات تو سے نہیں، لہذا ماں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ رابعہ کو صاف ستھری کپڑے استری کر کے پہنائے گئے۔ ان کو بھی تو بیٹھنا تھا۔ صنفہ بیگم جیت مہانوں کے لیے گھر میں سب کچھ تیار کر رہی تھیں۔ بازار سے صرف پھل اور مٹھائی آئی تھی۔ کباب، کسٹرو رہی، جے، چھوٹے جو کچھ بھی ہو گھر کا بنا ہوا ہو۔ آپا مہنوں کو ان کی یہ عادت بہت پسند تھی۔ ان لیے ہر شے پہلے یہاں لائیں پھر کہیں اور

کی بیٹی کو اگر لڑکے والے پسند کر لیں، نو ذرا اس کو بھی آدمی شادنی سمجھ لینے ہیں۔ جاے اب ان کی بیٹی کنسی نکا خوب صورت سلتہ مند باڑھی لکھی ہو، مگر ماں باپ پر بوجھ ہی ہوتی ہے کہ کوئی کس پسند کرے۔ خواہ لڑکا اس سے کم شکل یا مزاج کا خلف باہر راغ ہی کیوں نا ہو۔ مگر ان کی بیٹی کو صرف پسند کر لیا جائے، بہ لوگ خوش ہو جاتے ہیں، لیکن بعد میں بیٹی جو کچھ بھگتی ہے، نو اسے اس کا نصیب کہہ کر چھوڑ دیا جاتا ہے اس کے حال پر، یہاں بھی یہی کچھ ہوا۔ ابھی نالڑکا دکھانے ان کا گھر بار دکھا۔ بس انہوں نے باں کہا اور یہاں اجھل کود شروع ہوئی کہ جیسے شادنی کی تاریخ رکھ دنی گئی ہو۔ دیسے بہ پبلار شہنشاہ جو عزیز صاحب کو سمجھ میں آ رہا تھا۔ رابع بہت خوش تھی، دو بار بار فرحانہ سے چھینے جا رہی تھی کہ اب تو آپ مسز ندیم بنا جا میں گئی۔ فرحانہ خوش ذہنی مگر سو رہے کے نوٹ پر بار ارض تھی کہ کم از کم 500 ڈر بتیں۔ ایک لان کا سوٹ نکا بن جاتا۔ اس میں نوٹس آکس کریم کھانکنے ہیں۔ داؤنی اس ڈر سے پروگرام میں خاصوش بھی رہیں۔ جب سب چلے گئے تو فرحانہ سے پوچھنے لگیں کہ انہوں نے تیرے ہاتھ میں کیا رکھا تھا؟ وہ بولی کہ سو رہے وہ کر گئی ہیں۔ داؤنی بولیں۔

”ہیں کیا؟ نو رہے۔ اے لوک کم از کم دس کا نوٹ تو رکھا ہوتا ہاتھ پر۔ نا بھی نا۔ ایسے غریب لوگوں میں نوٹس اپنی پوٹی کا رشتہ نہیں کریں گی۔“

داؤنی کی بات سن کر سب لوگ ہنسنے لگے کہ اماں نو نہیں سو پھر ان کو سوکات نوٹ دکھا با گیا نو ذرا خوش ہوئیں اور فرحانہ کو دعا دیسے لگیں۔

اب طے پا گیا کہ انوار کو ہم لوگ لڑکا رکھنے چلنے ہیں، مگر عزیز صاحب نے کہا کہ میرے گھر کی بیٹی شادنی ہے۔ صرف ہم ماں ہونی لڑکا دیکھ آ میں۔ بہ کچھ درست نہیں ہے۔ بہرنی صرف ایک بہن ہے طہنی اور شہارہ صرف ایک بھائی ہے طارنی، اب ان دونوں کو چھوڑ دیں نو بہ لوگ بولیں گے کہ کچھ نہیں، مگر دل میں ضرور نہ مانیں گے۔ اسیا کرنے ہیں۔ ان دونوں کو بلا لیں اور لڑکے کو بھی یہاں بٹوا لیں۔ سب لوگ ایک

پورے کرے میں سا در سات لہن، صونے ان پر داہن گور، بیک گور پر فرحانہ نے آمل چینگ سے پھول بنانے ہونے تھے۔ پورا گھر سفید رنگ میں خوب کھل رہا تھا۔ بڑا مین، چاروں طرف گٹے، پھول کٹے، مہک رہے تھے۔ نخت گونے میں رکھا تھا۔ تخت کو بھی داہن، صفیہ بیگم کو ایک دم سے سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دیں، کیوں کہ ان کو نو بہ گھر میں بڑا لگا تھا۔ مگنی بیارے دکھا تکی نہیں تھا۔ آج ان کے کنبے پر دیکھا نو ذرا ہی کھر نو بہت خوب صورت تھا۔ دو جھنپ کئی کئی اور ذرا ان کی ہاں میں ہاں ملانی اور بولیں۔ ”ہاں آپ نے جنت سے دکھاے۔ اس لیے آپ کو خوبیاں نظر آ رہی ہیں۔“ پھر اور ذرا دھڑکی بائیں ہونی رہیں۔ آپا مینوں نے اشارے سے کہا کہ فرحانہ کو نو بلاؤ، مطلب یہ تھا کہ کھانا پنا شروع کر داؤ۔ صفیہ اٹھ کر اندر گئیں اور فرحانہ کو آ داؤی۔ فرحانہ تاشنے کا سامان لاکر میز پر رکھنے لگی اور سب کو سلام کیا۔ جب پورا ہاشنا گوا دوہ جانے لگی، مگر ان خواتین نے اسے روک لیا اور اپنے درساں بٹھالیا۔ اب فرحانہ کا اندر پوشرع ہوا۔ اس نے بنا با کہ بی اے کر کے فارغ ہوں۔ امی کا ہاتھ پٹانی ہوں۔ ان سب کو فرحانہ ایک ہی نظر میں بھاگتی۔ انہوں نے اس کو اپنے ہاتھ سے مٹھالی کھلاؤی اور جانے دنت سو رہے ہاتھ پر رکھ گئیں، ان کے بنے کا نام ندیم تھا۔ ہم اے کر کے اب بیٹیک میں جا کر رہا تھا۔ مٹھالی بھی چھوٹی تھی اور ننھوار اچھی تھی۔ اب وہ با قاعدہ دشا لانے کا کہہ رہی تھیں کہ آپا مینوں کے ہاتھ پر جا بھجوا دوں گی۔ اس میں لڑکے کے مکمل کوائف تفصیل سے لکھ دیں گے۔ آپ لوگ رکھ لیجئے گا، مگر سمجھ میں آئے تو پھر آپ لوگ لڑکا دیکھنے آ جائیں۔ بہ کہہ کر دو ٹوٹی خوش چلی گئیں۔ آپا مینوں کی نو با بھی کھلی جا رہی تھیں۔ ان کو دونوں طرف سے ہرا ہرا دکھ رہا تھا۔

عزیز صاحب کو تفصیل بتانی گئی، مگر میں ایک عجیب سی خوشی کی لہر دو گئی تھی۔ حالانکہ جب تک وہ لوگ وہ سے صفیہ بیگم اور فرحانہ ڈرتی رہیں، کہ وہ آ داؤ نہ آ جائے ورنہ سب بھاگ جائیں گے، مگر خدا کا شکر ہے کہ اس بی بی رہا۔ متوسط طبقے کی ایک خاصیت یہ ضرور ہے کہ ان

دغبرہ میں ایک بچی لیں گے اور ہم آنے جانے کی زحمت سے بھی بچا جائیں گے، ورنہ گزارنی کافی انتظام کرنا پڑے گا۔ صغیرہ بیگم ذرا ان کے پیچھے ہو رہی تھیں، کہوں کہ وہ دن تو خبر سے گزر گیا تھا۔ کوئی آواز وغیرہ نہیں آئی تھی، مگر اب اتنے لوگ جمع ہوئے اور کچھ ہو گیا تو کیا عزت رہ جائے گی۔ بات نو دو ٹھیک کر رہی تھیں، مگر عزیز صاحب نے سارا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا کہ ”اگر جو آواز انسان پر بنا ہوا ہے تو کچھ نہیں کہے گا۔ اب اگر ہم سب کو لڑکا پسند آ گیا تو ہم اور ڈوبی جا کر گھر وغیرہ دیکھ آنا۔“

صغیرہ بیگم راضی ہو گئیں۔ کھانے کا انتظام کیا گیا، کہوں کہ اتنے لوگوں میں ناشا اچھا نہیں لگتا۔ ندیم کے گھر فون کر دیا گیا کہ آپ لوگ ندیم کو یہاں لے آئیں۔ ہر لوگ بھی فوراً ہی تیار ہو گئے۔ جتنے کے مبارک دن ان کو بلا یا گیا۔ وہاں سے ندیم بیگم، ندا، ندیم، اس کا چھوٹا بھائی نسیم رضوانہ کے شوہر عرفان صاحب اور والدہ دقار صاحبہ، محل چھ لوگ آئے تھے۔ پروڈرٹنگ رہم میں بیٹھ گئے۔ طوبی رات کو ہی آگئی تھی۔ اس کے ٹیبل بیچے خوب رکھا چوڑائی پیارے تھے۔ طارق ماسوں اور انیس مائی صبح آگئے تھے۔ سب لوگ خوش تھے، عورتیں دوسرے کمرے میں تھیں۔ فرحانہ کو بالکل آخری کرنے والے کمرے میں بیٹھا یا گیا تھا۔ اس کے سامنے ہی اسنو رہتا جس میں سے آواز آتی تھی۔ فرحانہ کا ذرے کے مارے نہ حال ہو رہا تھا کہ وہ آواز نہ آجائے۔ بلکہ آسانی سوت میں گورا رنگ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ آج رابعہ نے زبردستی گلن کی ایک شیڈ کی لپ اسٹک لگا دی تھی اور کانوں میں سونے کے جھمکے ڈال دیے تھے، حالانکہ آج تو لڑکا دیکھنا تھا لڑکی نہیں، مگر بھر بھی نیار تو سب ہی تھے۔

کھانے کا سارا انتظام عثمان اور ان کے دوستوں کے ہاتھ میں تھا۔ صبح بہت بڑا تھا، اس لیے من مہر میں لکائی تھی تھیں۔ ذرا سے تو اوگ تھے، پہلے ان کو کھلا تھا، پھر گھر والے کھاتے، اندر مرد حضرات تھے۔ اب ندیم کا انٹرویو ہو رہا تھا۔ کہا مضامین تھے۔ چنک کے ناشنگ کیا ہیں، فارغ وقت میں کہا کرتے ہو وغیرہ

دغبرہ۔ در بڑی بد باری اور کچھ داری سے ہر بات کا جواب دے رہا تھا۔ لڑکا سب کو پسند آیا۔ سجدہ، باوقار لہا تھا اور رکھ رکھاؤ والا۔ غرض کہ کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ سب بہت خوش تھے۔ ورنہ خاندان کراچیک دوسرے میں کوئی بذاتی نہیں ملی۔ بہت اچھے ماحول میں ذرہ ہوا۔ کھانا کھا کر سب باتوں میں لگ گئے۔ کرنی چھت پر بیٹھے چلا گیا۔ کوئی گھر نہ کھینے گا۔ سب اپنے آپ میں گن تھے۔ عثمان برتن سمیت رہا تھا، دستوں کے ساتھ، تاکہ اگلی رات کے لیے تیار ہو جائے کھانا۔ ندیم بھی بیٹھے ہوئے برآمدے میں آگے کی طرف چل پڑا۔ جہاں وہی اسنو تھا اور ان کے سامنے والے کمرے میں فرحانہ بھی، سب اپنے آپ میں گن تھے۔ فیضیہ ہند ہو رہے تھے۔ اسے میں اچانک فرحانہ کو وہی منہوں کز گزراہت کی آواز آئی۔ فرحانہ کا دل تو جب سے ادھر ہی لگا ہوا تھا۔ ورنہ اسے اکیلی بیٹھی تھی، اب ذرا ہی آواز سے ہی ڈر گئی۔ آواز صرف اتنی تھی کہ فرحانہ نے سنی، باہر ویسے نو شور ہی ہو رہا تھا۔ سب مصروف بھی تھے، کسی کے کان اس آواز کی طرف نہیں تھے۔ فرحانہ اس آواز سے ڈر کر کمرے سے بھاگی اور باہر آنے ہی آئے والے سے کرا گئی۔ آنے والا کوئی اور نہیں بلکہ ندیم تھا۔ ندیم اپنے خیالوں میں گم تھا۔ وہ اس کا گمانی انہما کے لیے تیار نہیں تھا۔ در بھی گھبرا گیا اور آنے والے کو سنبھالنے لگا۔ پھولی ہوئی سانس، ذری ہوئی شکل، پریشان نظیں، سینے میں بیجا گداز بدلی۔ وہ ندیم کی باتوں میں گہری گہری سانس لے رہی تھی، اچانک وہوں کو ہوش آ گیا۔ ندیم نے ان کو دیکھا تو وہ فرحانہ تھی۔ ندیم کو ہوش آگئے۔ فرحانہ ایک جھٹکے سے اس سے الگ ہوئی، ندیم کی شکل رنجھی اور بھاگ کر بھڑائی کمرے میں گھس گئی جہاں سے آئی تھی اور اندر جا کر اس نے کتلی لگائی۔ ندیم وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ ایک سینکڑ میں سب کچھ ہو گیا اور کسی کو کچھ چاہی نہیں چلا کہ کس طرح ان دونوں نے ایک دوسرے سے اتنی فیصلی ملاقات کر لی۔ آسانی سوٹ میں لگالی چھوڑ، سینے میں پھیلائی بڑھلی بالوں کی لٹس، وہ تو کوئی آسانی خور لگ رہی تھی۔ فرحانہ کی منہ پر بندوانے



کرنے لگے۔ پندرہ دن کے بعد منگنی کا دن رکھا گیا تھا۔ چار دن کے بعد طوطی، صفیہ، بیگم، رابعہ، عثمان اور دانش ان کے گھر گئے۔ گھر بہت اچھا تھا۔ سب کو پسند آیا۔ ندیم کے لیے اوپر کا کمرہ دکھایا گیا تھا۔ رابعہ نے خوب گھوم پھر کر پورا گھر دیکھا۔ وہ اپنی باجی کی قسمت پر رشک کر رہی تھی، منگنی کا دن بھی ملگ جھکتے میں ہی آ گیا۔ ندیم کے گھر والوں نے ہال تک گر دیا تھا۔ کھانا بھی ان ہی کی طرف سے تھا۔

وقار صاحب عزیز صاحب کی ساؤگی اور شرافت کے واسطے میں جانتے تھے۔ لہذا یہ فیصلہ انہوں نے خوب سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ انہوں نے کہا: "پچاس لوگ آپ کی طرف سے ہوں گے اور پچاس ہی ہماری طرف سے ہوں گے۔" عزیز صاحب نے بہت زور دیا کہ ایش کر آدھا آدھا بانٹ لیں، مگر وقار صاحب نے منع کر دیا۔ کیوں کہ ایک کھانا تو وہ لوگ کر چکے تھے۔ اب ان کی باری تھی، مجبوراً عزیز صاحب کو اتنا پڑا۔ دو دن پہلے سے ہی انہوں نے فرحانہ کا ججزا جوئے، چوڑیاں، ہنڈی سب سامان بھجوا دیا تھا تاکہ اب وغیرہ کچھ لیں۔" ادھر سے بھی ججزا وغیرہ گیا۔

فرحانہ منگنی والے دن گولڈن سوٹ بھرے ہوئے دوپٹے میں میک اپ کے ساتھ بہت حسین و جمیل لگ رہی تھی، سب ہی تعریف کر رہے تھے۔ ندیم کو بھی آف وائٹ اور گولڈن گرٹا شلوار پہنایا گیا تھا۔ گلے میں گولڈن لمبا منظر دو بے حد اسٹارٹ اوڈ جاؤب نظر لگ رہا تھا۔ کیمروں کی لائٹ میں دونوں نے ایک دوسرے کو انگوٹھی پہنائی، حالاں کہ عزیز صاحب چاہتے تھے کہ عورتیں یہ سہم کر سں، مگر آج کل یہ ہی فیشن چل رہا ہے، لہذا ان کی کسی نے نہیں سنی، خوب تازہ کفن ہو رہا تھا۔ چمٹے بازی ہو رہی تھی۔ منٹھائیوں اور پھاوں کے نوکر کوں کا تالہ ہوا۔ لٹانے میں ہزار روپے ڈین کو سلامی کے ملے لڑکی والوں نے بھی بارہ سو روپے دے، کھانا بہت زبردست تھا۔ اچھا خاصا بڑا پروگرام ہو گیا۔ وقار صاحب نے خاموشی سے بیٹھا ہوا آدھا کھانا ڈین کی گاڑی میں رکھوا دیا تھا۔ عزیز صاحب بولے۔

بڑی مشکوں سے ندیم کو دکھائی تھی۔ اب اصل میں تو وہ نصور سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ وہ ابھی تک اسی سحر میں جکڑا کھڑا تھا۔ عثمان کسی کام سے ادھر سے گزرا تو اس نے ندیم کو اسٹور کے قریب کھڑے دیکھا۔ وہ حیرانی سے بولا کہ "ارے ندیم بھائی آپ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں۔" ندیم نے اپنے آپ کو منہ بول کر کہا۔

"ارے کچھ نہیں، دیکھو ہاتھاکہ اس طرف کہا ہے۔"

عثمان بولا: "ادھر بھی گھرے ہی ہیں، آئیں باہر بیٹھ کر گولڈ ٹرک بیٹیں۔" دو ندیم کے سخن میں لے گیا۔ اندر گھرے میں فرحانہ کا خوف کے مارے نہ حال تھا، وہ سوچ رہی تھی کہ ندیم اتنی ایسی ویسی لڑکی نہ سمجھے کہ مجھے آتا دیکھ کر جان بوجھ کر گھر آگئی۔ وہ بہت خوف زدہ تھی کہ کہیں کسی نے رکھ نہ لیا ہو۔ وہ بہت پریشان ہو رہی تھی۔ ان دونوں نے فون بھی خراب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایسا ہوگا۔ اب سب جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ندانے کہا میں تو بھائی سے ملے بغیر نہیں جاؤں گی۔ مجھے تو ان کی تصویریں بھی ملنی ہیں۔ ندیم بیگم نے بھی کہا کہ ہاں بھئی اپنا بیوٹے تو مل لوں۔ وہ لوگ رابعہ کے ساتھ فرحانہ سے ملے چل پڑیں۔ فرحانہ نے دروازہ کھولا۔ سب بیڈ پر بیٹھ گئے۔ سائیں نے اپنی بیوی کی بلا میں لیں، ندانے بہت ہی تصویریں بھیجیں۔ فرحانہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ ندیم بیگم نے پرس میں سے 500 کا نوٹ نکال کر فرحانہ کو دیا اور بولیں۔

"بیٹا اس دن میرے پاس صرف سو کا ہی نوٹ تھا، مجھے بھی نوٹ لگ رہا تھا مگر مجبوری تھی" فرحانہ نے گھبرا کر ان کی طرف دیکھا۔

وہ بولیں: "اب انشاء اللہ منگنی میں ڈھیر سا سا مان لائیں گے۔" فرحانہ جینٹ گئی کہ اس دن کے خیالات انہوں نے پڑھ تو نہیں کہے، بھوڑی در بیٹھ کر دو لوگ ہنسی خوشی چلے گئے۔ عثمان نے کھانا لگا پھر سب گھر والوں نے مل کر کھانا کھایا اور بانٹیں کرتے رہے۔ طارق، ماموں اور اوشینا مائی تو اپنی گاڑی میں آئے تھے، لہذا آرام سے چلے گئے۔ طوطی پیسہ کو سب نے روک لیا تھا۔ سب بچے چل کر اوچھ بازی

ہے۔ رابعہ حیران تھی کہ مثنوی کے بعد باج کو کیا ہو گیا ہے۔ بہانے بہانے سے اس کو نئے والے کرے میں جا کر لیٹ جاتی ہیں۔ اُدھر نہیم بھی کم صبر رہنے لگا تھا۔ جہاں جا تا فرحانہ آ کر اس کے سینے سے لگ جاتی۔ وہ اس کی زلفوں میں چہرہ چھپائے باتیں کرتا رہتا۔ کوئی آتا تو چونک جاتا۔ ڈر جاتا کہ کسی نے دکھ نہ لیا ہو۔ نہا نے بھی یہ بات ٹوٹ کی، نہ ایم بھائی پہلے جیسے ہنس کھ نکس رہے، بلکہ کافی سنجیدہ ہو گئے ہیں۔ ماں نے کہا کہ بھئی اب وہ شادی کر رہا ہے، اگر سنجیدہ ہو رہا ہے تو کیا ہوا۔ دن اسی طرح گزرنے لگے، دونوں طرف شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

عزیز صاحب نے دو تینا کنبھیوں میں مکان کے لیے پول دیا تھا۔ نام شام کا رہا گیا تھا، تا کہ ان کی موجودگی میں ہی پارٹیاں آئیں، لوگ آ کر دیکھتے اور قیمت لگانے لگے۔ رقیہ بیگم کو معلوم ہوا کہ مکان بیچا جا رہا ہے تو وہ بہت رنجیدہ ہوئیں۔ ان کی پوری زندگی اسی مکان میں گزری تھی۔ ان کے دونوں بچے عزیز اور طوٹی کا بچپن اس مکان میں کھیلنے کودنے جوانی میں تبدیل ہوا تھا۔ طوٹی اس گھر سے رخصت ہو کر چلا گھر سدھاری تھی۔ صفیہ بیگم بھی یہی کہ اس گھر میں داخل ہوئی تھیں۔ عزیز کے بچوں نے اس گھر میں آنکھ کھولی تھی، ان کے شوہر کا جنازہ اس گھر سے نکالا تھا وہ اتنی جلدی اس حادثے کو قبول کرنے کو تیار نہ تھیں۔ ان کی آنکھوں سے جھڑی لگ گئی تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا جنازہ بھی اسی گھر سے نکلے۔ افسردہ تو عزیز بھی بہت تھے کہ یہ مکان ان کے والد کی واحد نشانی تھا۔ ان کا بس چلتا تو وہ کسی قیمت پر بھی یہ مکان نہیں بیچنا چاہتے تھے۔ مگر انسان جو بیکہ کھاتا ہے اپنی اولاد کے لیے کھاتا ہے۔ اس لیے ان کے باپ نے اپنی اولاد کے لیے یہ مکان بنایا تھا۔ اب عزیز اپنی اولاد کے لیے اس مکان کو فروخت کر رہے تھے۔ اگر کوئی خوش تھا تو وہ بھی صفیہ بیگم۔ ان کی اس مکان اور اس شخص آواز سے جان چھوٹنے والی تھی۔ اس رات بھی عزیز صحن میں پڑے پلنگ پر لیٹے اور آسمان پر چمکتے ستاروں کو دیکھ رہے تھے، مگر ان کا ذہن نہیں اور تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ

”بھئی اب آپ زیادتی کر رہے ہیں۔“ مگر انہوں نے کہا کہ میری بیوی نے کھانا ٹھک سے کھایا نہیں ہے۔ اب گھر جا کر آرام سے کھائے گی، آپ کیا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ عزیز صاحب خاموش ہو گئی۔ یوں کسی خوشی یا کام بھی انجام کو پہنچا۔

شادی چھ سینے کے بعد رکھی گئی تھی۔ تیاری کے لیے کم از کم اتنا وقت تو چاہی ہی تھا۔ صفیہ بیگم نے ٹھنڈی کا کام یہ کیا کہ اپنی طرف کے آئے ہونے سب بھائیوں کو منگانی کے ڈبے وہیں ہال میں ہی دے دیے، اس طرح سب گلے ہاتھوں نہٹ گئے، دو دن اگلے دن عثمان کو بھانگنا پڑا منگالی ہانسنے کے لیے، جو دو چار لوگ وہ گلے تھے ان کو الیت جا کر دینا پڑا۔

اصل مسئلہ تو اب شروع ہوا تھا، ارشہ آنے سے مثنوی ہونے تک تو بکا پھلکا خرچہ تھا، لیکن اب شادی کوئی گڈے گڑیا کا کھیل تو ہے نہیں، اس کے لیے اچھی خاصی رقم چاہیے تھی۔ اب وہ اس کے لیے ٹھکر منہ رہنے لگے کہ پیسوں کا انتظام کہاں سے کریں۔ ان کے پاس مع پونجی کوئی خاص تھی نہیں۔ اگر آفس سے لاون بھی لیتے تو کتنا ملتا۔ اب ان کو صفیہ کی بات سمجھ میں آنے لگی تھی کہ یہ مکان فروخت کر کے قدرے چھوٹا مکان لے لیتے ہیں اور باقی کے پیسوں سے کوئی دکان وغیرہ کر لیں، کیوں کہ ان کے مکان کا رتی کا ٹی بڑا تھا، جب کہ اس رقبے کا آدھا مکان بھی ان کی گلی کے لیے کافی تھا۔ فرحانہ کے بعد رابعہ بھی رخصت ہو جائے گی، وہ گھٹیا مکان تو اس کے لیے پورا گھر ہوگا۔ اب وہ دن رات اسی چکر میں رہنے لگے۔ ادھر مثنوی کے بعد فرحانہ کی تو دنیا ہی بدل گئی۔ وہ اپنے خیالوں کی نئی دنیا میں کھن رہتی اور اکثر بے دھیانی میں اپنی اسی سے پوچھتی۔

”اب تو کافی دنوں سے اس کمرے سے کوئی آواز نہیں آئی۔“ وہ پوچھیں۔

”ارے کیا پاگل ہو گئی ہے کہ آواز سننے کی بات کر رہی ہے۔“ اب ان کو کیا معلوم کہ وہ اس آواز سے کس دنیا میں کھو جاتی ہے۔ کس کی ہانپوں میں گم ہو جاتی ہے۔ خیالوں میں نہیم کے سینے سے گلی تھی باتیں کرتی ہے۔ وہ اونچانے میں اس آواز کی منتظر رہتی

اگر میرے پاس اپنی رقم ہوتی کہ میں اپنی بیٹی کو ساوی اور عزت سے رخصت کرو تا تو میں بھی یہ مکان مانجتا۔ یہ سوچ کر اور اپنی بے بسی پر ان کی آنکھوں میں بھی تارے جھلملانے لگے اور آنکھوں کے کنارے سے پلے ہو گئے تھے کہ اچانک دبی گزر گھاسٹ کی آواز اس رات کے منانے میں کافی زور سے آئی۔ اس اچانک اور تیز آواز سے وہ خود بھی ایک لمحے کو خوف زدہ ہو گئے اور ایک لمحے پہلے کی مکان کی محبت اس آواز کے ساتھ رخصت ہو گئی اور انہوں نے جلد از جلد اس مکان کو فر دخت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ گھر کے باقی افراد نے بھی وائٹ کے منانے کو چیر لیا اس آواز کو سنا۔ عثمان اور راجہ تو خوف زدہ ہو گئے، مگر فرحان تو اس آواز کے ساتھ ہی غم کی بانہوں میں پینچ جاتی تھی، سو وہ مطمئن تھی۔ آج یہ آواز منیدہ بیگم کو بھی تاگوا نہیں گزری، کیوں کہ اب تو یہ سب کچھ چند دنوں کا کھیل رہ گیا تھا۔ عزیز صاحب چون کہ نظر نا ٹریف اور نیک تھے، لہذا ان کو یہ لگتی تھی کہ جو لوگ مکان دیکھنے آ رہے ہیں ان کو اس آواز کے بارے میں کیا بنا با جانا، بتاؤں کہ نا بتاؤں۔ وہ کسی کو وجہ کہ نہیں دینا چاہتے تھے۔ تا جانتے یہ آواز بے کیا۔ انہوں نے خود تو بھی جاننے کی کوشش کی نہیں۔ اب سننے آئے ہالوں کیا بتاؤں؟ اس سے سووے پر کیا اثر پڑے گا؟ انہوں نے اپنی بیگم سے اس سلسلے میں مشورہ کیا۔ وہ بولیں۔

”اوے بھولے سے بھی اس آواز کا ذکر مت کیجیے گا۔ لوگ خریدنا تو ڈر تریب سے گزرتا چھوڑوں گے۔“ عزیز صاحب سر ہلکا کر دو گئے۔

عثمان کو اپنے بچپن کے وہ سنوں کو چھوڑنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے والد سے کہا کہ جب ہم نیا مکان خرید ہی رہے ہیں تو کیا معلوم مقام پر جانا ضروری ہے۔ ہم اسی علاقے میں خرید لیتے ہیں۔ پرانے لوگوں سے تعلق بھی وہ ہے گا۔ اپنا گھر بھی نظروں کے سامنے رہے گا۔ آنے جانے اسے دیکھتے بھی رہیں گے۔ سب کو یہ بات پسند آئی، کیوں کہ خود ان کے افس کا بھی مسئلہ تھا، ابھی تو اس منٹ کی ڈراما ہو رہا۔ اب نہ جانے کہاں جا پڑا۔ اس لیے عثمان کی بات پر

عمل کیا گیا۔ اب اپنا مکان فر دخت کرنے کے ساتھ ساتھ نیا مکان خریدنے کی بھی بات کی گئی، تاکہ یہ کچے اور امی رقم سے نیا خریدا جائے۔ چنانچہ یہ ڈیوٹی عثمان کی لگی کہ وہ دن میں مکان دیکھے۔ شام کو اپنا مکان لوگوں کو دکھانے، مصروفیت کا بیڑا بڑھ گئی تھی، گج ہے پتا ہے ندیم کے گھر والے بھی چکر لگائے، ان کو بھی معلوم تھا کہ مکان کیوں بیچا جا رہا ہے، وفاق صاحب نے تو کہا بھی کہ ”بھائی صاحب رہتے رہتے، ہا، وہ گھر اللہ کا دبا سب کچھ ہے۔ آپ پریشان مت ہوں، بس سادگی سے دیکھیں کروں۔“ مگر عزیز صاحب کو معلوم تھا کہ اس ساوٹی میں بھی کتنی بناوٹ ہے۔ ماں باپ کا کس پیلے تو اچھی لخت چکر کو اپنی جان بھی وے دیں، لہذا انہوں نے مسکرا کر بات نال دی۔

عثمان کی محنت رنگ لائی اور وہ گلہاں چھوڑ کر ایک خوب صورت سا ایک سو بیس گز کا ڈیل اسٹورنی مکان عثمان کو پسند آ گیا، بس رنگ و فرنی کر دانا تھا۔ وہ سب کو دکھانے کے لیے گیا۔ رفیق بیگم نہیں گئیں، منیدہ کو وہ مکان بے حد پسند آیا، جیسا وہ چاہتی تھیں بالکل دیا ہی تھا۔ فرحانہ اور وادعہ کو بھی اچھا لگا۔ عزیز صاحب بھی راضی ہو گئی۔ نوگن کی رقم وے کر بات کر لی گئی۔ اب اپنے مکان کی قیمت لگتی تو اس سے ادائیگی کی جانی۔ اب اپنے والے بھی خوب بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ ان کو تو ڈیل کے جانے جا رہا تھا، قسمت کی بات کہ اگلے ہفتے ہی ایک باوٹی کولڈ پڑ صاحب کا مکان پسند آ گیا۔ قیمت بھی عزیز صاحب کی مرضی کی تھی۔ وہ ڈوڈرا راضی ہو گئے۔ ایک مہینے کا تاخیر ان سے لیا گیا تاکہ اپنے گھر کی مرمت اور رنگ و روغن کروا سکیں۔ عثمان نے جلد از جلد مکان تیار کر دیا۔ مسجد کے بچوں کو جا کر قرآن خوانی کروائی اور اگلے ہی دن سامان پانہنا شروع کر دیا گیا۔ وقت بیگم اٹھنے بیٹھے آتسو بہا رہی تھیں۔

”دیکھنا تم لوگ بچھتاؤ گے۔ ایسا مکان کہیں لے گا نہیں، میری ماں تو اب بھی ذک جاوے۔“ مگر سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ ان کی بڑ بڑوں سنا ان کو دیکھ کر ان کا بنا بھی رنجیدہ ہو جاتا۔ وہ بھی اس مکان کو بیچنے کے حق میں نہیں تھے، کوئی چیز تھی جو ان کو ابنا

کے قدم روک رہی تھی۔ اس مکان کو منوں مت سمجھو۔ یہ آواز خوشی کی نہیں ہے۔ اسے سمجھو۔ یہ جہیں بہت پیچھے وہے گی، ذرا زک جاؤ، وہ ذک تمہیں اور مزہ کر پیچھے اپنے مکان کو دیکھنے لگیں۔ نہ جانے یہ کیا ہو رہا تھا۔ انہوں نے بھی ترائی ساہگ رات اسی گھر میں منائی تھی۔ ان کی بھی کئی حسین یادیں اس مکان سے وابستہ تھیں، وہ آٹسوں کی آنکھوں سے نکل کر گالوں پر پھسل پڑے۔ انہوں نے اپنے آپ پر قابو پایا اور تیز تیز چلے گئیں۔

عزیز صاحب اس بند کمرے کے سامنے کھڑے تھے۔ جہاں سے وہ آواز آتی تھی، ان کی آنکھوں میں آنسو جھللا رہے تھے۔ سارا سامان بندھا ہوا رکھا تھا۔ پر رات گھر خالی سائیں سائیں کر رہا تھا۔ عثمان زک لینے گیا ہوا تھا۔ انہوں نے اس بند کمرے کا تالا کھولا اور وہاں رکھا ہوا سامان باہر نکالے گئے۔ سارا سامان کام کا تھا، مگر بیگم کو خاموش کرنے کے لیے انہوں نے فالتو کہہ کر اندر رکھ دیا تھا۔ باہر زک آ گیا تھا عثمان ایک مزدور بھی لے آیا تھا، تاکہ آسانی رہے۔ اب سارا سامان زک پر رکھا جا رہا تھا، وہ حسرت بھری نگاہوں سے اپنے پیارے مکان کو دیکھ رہے تھے۔ وہ اس وقت بہت جذباتی ہو رہے تھے۔ ہر بار سننے سے کمرے میں جا کر دیکھ رہے تھے۔ عثمان کن آنکھوں سے اپنے باپ کی حرکتیں دیکھ رہا تھا۔ رنجیدہ تو وہ بھی بہت تھا، مگر خود پر قابو رکھا ہوا تھا۔ گھوم پھر کر عثمان سامان دیکھ رہا تھا کہ کچھ رو ناجائے۔ اب عزیز صاحب پھر اس کمرے میں آگئے جہاں سے وہ آواز آئی تھی۔ ان کو اچانک اس کمرے میں اپنے والد صاحب کھڑے ہونے نظر آئے۔ جو بہت افسردہ ہیں اور ان کی بھی آنکھوں میں آنسو جھللا رہے ہیں۔ جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ عزیز بیٹا، اس مکان کو فروخت مت کرو۔ یہ تمہارے لیے بہت اچھا ہے۔ آگے چل کر تم کو اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوگا۔ عزیز صاحب کے بھی آنسو بہ رہے تھے، مگر جو ہوتا تھا وہ ہو چکا تھا، عثمان کی آواز پر وہ چوہے کے اور خود پر کمرشل قابو پایا۔ وہ تالا لگانے کو کہہ رہا تھا، سارا سامان زک

کرنے سے روک رہی تھی اور ان کے قدم جکڑ رہی تھی، مگر وہ کچھ سمجھ نہیں پارے تھے، لیکن اولاد کے مسئلوں کے آگے یہ جذباتی باتیں کہاں ٹھہرتی ہیں۔ مکان کا سوا ہو گیا۔ آج ان کا اپنا خریدہ ہوا مکان پورا تیار تھا۔ سامان عورتوں نے بانہہ لیا تھا۔ عثمان نے کہا میں میٹرک لے آتا ہوں۔ عورتوں کو چاہی وہی کہ آپ لوگ جائیں وہ وی تو لگائیں ہیں۔ جھاڑو لگا کر سامان آ رہا ہے۔ عزیز صاحب کو فون کر، باکد رات کو آ کر چالی لے لیں، وے منٹ بھی ہو جائے گی، آج رات ان کو سننے گھر میں گزرائی گئی۔ عورتیں پیدل ہی گھر کی طرف روانہ ہو گئیں۔ کیوں کہ قریب ہی تو تھا۔ رقیہ بیگم باقاعدہ رہتے ہوئے جا رہی تھیں، جیسے کسی نے ان کو زبردستی گھر سے نکال دیا ہو۔ دونوں لڑکیاں بھی اس صورت حال سے کافی افسردہ تھیں۔ آخر کو وہ ان کا اپنا گھر تھا۔ ایک زمانہ گزارا تھا سب نے وہاں۔ اب اتنی جلدی تھوڑی سب کچھ سیٹ ہو جا گیا۔ سب کے دل اُداس تھے۔ رقیہ بیگم مستقل پڑھاری تھیں۔

”وہ کتنا تم لوگ میری بات نہیں مان رہے ہو۔ اس گھر میں کتنی ہی ہے، وہ نہیں یاد رہی ہے۔ مت جاؤ یہاں سے بہت پیچھا ڈالو گے۔“ وہ اپنے آپ سے بولی ہوئی جا رہی تھی۔

”چار بیویوں کے لیے تم نے بھرنی دولت کو لات پارہی ہے۔ اپنی باپ کی بنائی ہوئی جائیداد بیچ کر تم لوگ کبھی خوش نہیں رہو گے۔“

ان کے قدم نہیں اٹھ رہے تھے۔ وہ مرے مرے قدموں سے چل رہی تھیں، ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ واپس اپنے گھر میں چلی جائیں، جہاں ان کے مرحوم شوہر کی روح ان سے ملنے آتی تھی۔ آنسو بہانے ہوئی وہ اس گھر سے دور ہوتی جا رہی تھیں۔

منیہ بیگم بھی ذہنی طور پر الجھی ہوئی تھیں۔ دل تڑپتے ہوئے خوش تھا، مگر وہ اس سلسلے میں گڑبگڑ رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ مت جاؤ، لیکن وہ اپنی ذہنی کیفیت کو سمجھ نہیں پارہی تھیں۔ اگر وہ خوش تھیں تو ان کو وہ خوش محسوس کیوں نہیں ہو رہی تھی۔ ان کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ وہ چل نہیں پارہی تھیں۔ زمین جیسے ان

پر رکھ دیا گیا تھا۔ معزز صاحب بھی آچکے تھے۔

چھوٹ گئے۔ لوگ جمع ہونے لگے۔ کسی نے کہا مولوی کو بلاؤ، جن بھوت کا معاملہ ہے۔ کسی نے کہا پولیس کو بلاؤ، آواز ایک ہی نغمہ آئی، مگر مزدور فریب جانے پر تیار نہیں تھے۔ رش بڑھتا جا رہا تھا کسی نے بتایا کہ یہاں پہلے ہندوؤں کا شمشان گھاٹ تھا۔ مروے جلائے جاتے تھے ان کی رومیں شہر کر رہی ہیں۔ کوئی بولا۔

”ارے یہاں جنی رہنے ہیں اور وہ تاراش ہور ہے ہیں۔“ فرض جتنے منہ آتی باتیں۔ اچانک کسی کی نظر عثمان پر پڑ گئی۔ وہ بولا۔

”ارے یہ بھی پہلے تو یہ لوگ یہاں رہتے تھے۔ اب عثمان کو اپنی حاققت کا احساس ہوا کہ آواز سنتے ہی وہ وہاں سے بھاگا کیوں نہیں۔ وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ اب سب کی توجہ عثمان کی طرف ہو گئی۔“

”تم لوگوں نے کیا دھوکے سے یہ مکان بچا ہے، اس کمرے میں جنوں کا اثر تھا کیا، جو وہ آوازیں نکال رہے ہیں۔“ ہر طرف سے سوالوں کی بارش ہورہی تھی۔ عثمان کا رنگ فنی ہورہا تھا۔ ایک بڑے میاں کو اس پر ترس آ گیا۔ وہ بولے۔

”ارے یہ بھی صبر کرو، کیوں بچے کو پریشان کر رہے ہو۔ میں ان لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں، بہت شریف لوگ ہیں، یہ کسی کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ کیوں بیٹا، جب تم لوگ یہاں رہتے تھے تو کیا بھی یہ آواز آتی تھی؟“ انہوں نے چار سے عثمان سے پوچھا۔ اتنے عرصے میں عثمان سنبھل چکا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگرچہ بولے گا تو پورے بچھوم سے پٹائی ہوگی، وہ صاف مگر گیا اور بولا۔

عزیز صاحب نے اپنے گھر پر ایک آخری اور الوداعی نظر ڈالی اور تالا لگا دیا۔ چابی دیتے وقت ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ معزز صاحب بھی ان کی جذباتی کیفیت کو سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے عزیز صاحب کو گلے لگا کر کھینکی دی، پھر انہوں نے ہاتھ ملائے اور گلے آہستگی میں ملنے کے لیے رقت مقرر کیا، تاکہ ہائی لیمن دین بھی ہو جائے۔ عزیز صاحب ڈرامیٹر کے ساتھ بیٹھے اور عثمان مزدور کے ساتھ سامان پر چڑھ گیا۔ ایک منٹ کا تو راستہ تھا، فرحانہ اور رابعہ نے پورا گھر صاف ستھرا کر دیا تھا اور سوجھی لیا تھا کہ کیا چیز کہاں رکھوائی ہے۔ عثمان کے دوست بھی آگئے تھے۔ لڑکیوں کی بداباوت پر پورا سامان میٹ کر دیا گیا۔ سارنی کا تھڈی کارروائی کے بعد یہ مکان عزیز صاحب اور رر مکان معزز صاحب کے نام زائسفر ہو گیا۔ معزز صاحب کی تنظیم نے جب یہ مکان دیکھا تو اس میں کچھ تبدیلی کروانے کے لیے کہا۔ خاص طور پر وہ حصہ جس میں وہ کمرہ تھا جہاں سے آواز آتی تھی۔ معزز صاحب کو بھلا کیا اعتراض ہوتا، چنانچہ انہوں نے ٹھیکے دار سے بات کی اور وہ حصہ نوٹنا شروع ہو گیا۔ عثمان کو پتلا چلا کہ مکان نوٹ رہا ہے تو وہ دیکھنے آ گیا۔ جہاں وہ پیدا ہوا تھا اسے نوٹنا لگتا رہا۔ مزدور روز رات تھوڑا تھوڑا کر کے توڑ رہے تھے۔ وہ مزدور تھے جو رات دن لگے رہتے۔ کسی رقت عزیز صاحب بھی اوھر کا پتھر لگا لیتے اور مکان کو نوٹنا دیکھتے اور اسروٹی سے چلے جاتے۔ آج چھوٹا تھا اور آج ان کمرے کو نوٹنا تھا جہاں سے آواز آتی تھی۔ عثمان جمعہ چارہ کے نکلا تو نہ جانے کیوں اس طرف آ نکلا۔ دیکھا تو مزدور اس کمرے کو توڑ رہے تھے۔ چھت اور دیواریں نوٹ چکی تھیں، اب فرش کی باری تھی۔ عثمان دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ نہ جانے اب کیا ہو۔ مزدور نے فرش توڑنا شروع کیا جب وہ کمرے کے درمیان میں پہنچے تو ایک نینر گزراہٹ کی آواز سنائی دی۔ مزدور کو دل پھینک کر بھاگے۔ آواز اتنی زوردار تھی کہ اس پاس گزرنے والے راگبیروں نے بھی سنی۔ سب آوازیں کر ڈر گئے۔ عثمان کے توبہ پسنے



بابا۔ درتو تو لوگ لوٹا ماری شروع کر دیے۔ پورنی دہک باہر نکالی گئی۔ خانے سے بڑے افسران کو بلایا گیا۔ پورے خانے میں چلچلی مچ گئی۔ عثمان کو نہ تو کوئی آواز سمجھ میں آ رہی تھی نہ کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ لوگ بھی اسے دھکتے سے آگے کر دیئے بھی سمجھے۔ کون کہا پوچھ رہا تھا اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ ہونے ہونے یہ خبر عثمان کے گھر بھی پہنچ گئی۔

جمعہ کے دن عزیز صاحب جلدی جا با کر رہے تھے۔ وہ بھی دہک کا سن کر بھاگے بھاگے وہاں پہنچے، دہک کو پیرنے ہونے دو اندر گئے۔ پولیس نے دہک سے دہک کی بات کہہ کر بندھی کی ہوئی تھی اور دہک اسے بیٹھے میں لے لی تھی، عزیز صاحب کو اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ مکان ان کے لیے انا لکلی ثابت ہوگا۔ دو ڈار پوٹ پتی بن گئے تھے۔ ان کی نوٹسلسن پہنچ کر کھانا نہیں تب بھی کم نہ ہوتا، وہ دو سوئے گئے کہ عزیز صاحب تو داخلی ضرورت سے زیادہ ہی شریف آدمی ہیں کہ سالوں اس خزانے کے ساتھ رہے، حفاظت کرتے رہے مگر ہاتھ نہیں لگا، عثمان نے اپنے والد کو دیکھا تو ان کے فریب آ گیا۔ دوڑوں باپ بنا ایک دوسرے کو ایسی حرمت سے دیکھ رہے تھے کہ برسوں بعد جیسے آج ہی ملے ہوں، عزیز صاحب اور ان کا بیٹا حاد اچھلنے پھرنے سے بچنے کا ایک ان کی نظر عزیز صاحب پر پڑی۔ وہ دوڑنے ہونے آئے اور ان کے گلے لگ گئے اور بولے۔

”داعی آپ بہت شریف آدمی ہیں، آپ نے یہ مکان نہیں دیا بلکہ ہمیں ایک نئی زندگی دی ہے۔“

عزیز صاحب بالکل مسمم کھڑے رہے۔ پولیس افسران نے کاغذی کارروائی کی اور گورنمنٹ کے سارے ٹیکسز نکالے اپنا اور اپنی پورنی ٹیم کا حصہ لیا اور غلام ضرورنی کارروائی کے بعد دہک، عزیز صاحب کے حوالے کر دی۔ ان کو اپنی آنکھوں اور قسمت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے عزیز صاحب کو بھی آفر کی کہ یہ مکان خود بہر حال آپ ہی کا تھا۔ سالوں سے یہ خزانہ آپ کے پاس رہا۔ آپ بھی اس کے حصے دار ہیں مگر عزیز صاحب افسردگی سے بولنے لگے، ”میں مہری سزا ہی ہے کہ میں ان دولت سے ڈور رہوں، کہوں کہ میں نے آپ کو دھوکے

حیران ہونے کہ دکھائی دیکھنے کے لیے انا ش کیوں ہے۔ انہوں نے کھودنا شروع کیا، اچانک ان کی کدواں کسی سخت برتن سے ٹکرائی۔ وہ حیران ہو گئے۔ دہک بڑھتا جا رہا تھا۔ کھودنے کھودنے ایک دیگ زمین میں دلی ہوئی نظر آئی۔ اس عرصے میں پولیس بھی آچکی تھی۔ سب دیکھ رہے تھے۔ عزیز صاحب الگ پوچھنا سنے کہ یہ کس جگہ میں پھنس گئے۔ دہک کو باہر نکالا گیا، اس کے اوپر کی مٹی کی صفائی ہوئی، عثمان سانس روک کے آنکھیں پھاڑے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ کزور دل حضرات دندم پیچھے ہٹ گئے، مولوی صاحب کو آگے بلا گیا۔ انہوں نے پڑھ کر دم کہا، کوئی کہہ رہا تھا دھکن نکھولو، کوئی منع کر رہا تھا کہ اس میں جین فید ہیں۔ مزہ دوروں نے اللہ کا نام لے کر دیگ کا ڈھکن کھولا۔ عزیز صاحب اور ان کا بیٹا سادہ بھی پریشان کھڑے تھے۔ ان کو عزیز صاحب کی شرافت پر کوئی ٹیک نہیں تھا، مگر ایک بڑی حقیقت سامنے منہ کھولے کھڑی تھی۔ جیسے ہی ڈھکن کھولا گیا۔ سب ایک جگہ ہار کر پیچھے ہٹ گئے۔ سب کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ سب سے نہ حال عثمان کا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بے ہوش ہو کر گرے والا ہے۔ پورنی دہک سونے کی اشرفیوں سے بھری ہوئی تھی۔ سورج کی درختی میں ان کی طرف دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ پانے زمانے میں ہندو ماہو کا اپنی دولت اور جمع پونجی زمین میں دبا کر چھپا کر رکھ کر رہے تھے۔ ہندو مسلم فسادات کے وقت اس مکان کے ہندو مالک کو بھی اٹھانا کم نہیں ملا ہوگا کہ دو جاتے ہوئے اپنی دولت نکال کر لے جاتا۔ وہ اسے اسی حالت میں چھوڑ کر جان بچا کر بھاگا ہوگا کہ جان ہے تو بچان ہے۔ بعد میں آکر لے جاؤں گا مگر شاید اسے اپنی مہلت نہیں ملی ہوگی کہ وہ دو پارہ پاکستان آتا۔ پاکستان آکر یہ مکان حاد صاحب کو لکھنم کے ذریعے مل گیا۔ انہوں نے جیسا ہے اور جیسا ہے کی بنیاد پر رہنا شروع کر دیا۔ نہ تو ڈرا نہ پھوڑا۔ بس اپنی نواز اور نران میں مگن رہتے۔ یہ دولت ان کے اور ان کے خاندان کے لیے نہیں تھی۔ اسی لیے سالوں رہنے کے باوجود وہ ان کو نہ ملی۔ لوگوں میں ایک جگہ دیکھا جگہ گئی تھی۔ پولیس نے حالات پر قابو

عزیز صاحب نے غضبناک نگاہوں سے ان کو دیکھا اور سالوں کا بھرا ہوا غبار نکال دیا۔ دو بیچ کر بولے۔  
 "بندو کو اپنی کواں" بیٹیوں بیچے بھاگ کر آگئے۔  
 آج پہلی بار انہوں نے اپنے والد کی بے آواز سی صیغہ کے توہینے چھوٹ گئے، وہ بولے جا رہے تھے۔

بیسویں سال تک وہ بیٹا کو اس گھر میں آتی نہیں تھیں اس گھر سے نفرت تھی۔ تم نے بیٹا اس کو بیچنے کی بات کی۔ اٹنے سال یہ مکان رہا تو صرف میری وجہ سے۔ اب بھی اگر فرحانہ کی شادی کے لیے رقم کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں بھی یہ مکان بنا بیچتا، بھگت فروخت کرتے دانت بھی تم نے بیچھے بیچا کہ اس آواز کے بارے میں معزز صاحب کو بتاؤں۔ میں نہاؤں ساتھ جرم میں برابر کا شریک رہا۔ دو دولت اور قسمت کی اور بی بی بی بی بی سے ہمارے دروازے پر دستک دے رہی تھی، مگر کسی کو وہ آواز سنائی نہ دی۔ صرف ایک خوفناک گڑ گڑاہٹ سنائی دینی رہی، ہم اس سے آنکھ چراتے رہے۔ اس سے نفرت کرنے رہے، خوف زدہ ہوتے رہے، ابھی آگے بڑھ کر جاننے کی کوشش نہیں کی کہ یہ آواز ہے کیا۔ یہی فرحانہ کو ٹھونک بھاگ نہیں دیا۔ چپک گرنے کی کوشش آواز سے۔ تم نے صیغہ بیگم اس آگ کو اور بھی بھڑکا دیا۔ دروازہ بند کر دے کالا ڈالو ابا۔ میں بھی دی کرتا رہا جو تم کہتی رہیں۔ تم نے اپنی قسمت برتال ڈال لیا تھا۔ اب کس دولت کی بات کر رہی ہو۔ میرا بیٹا اس پر کوئی حق نہیں ہے، ہم نے دھوکے بازی کی ہے۔ اب اس کی یہ بی بی سزا ہے کہ ہم اس سے دور رہیں اور تم بھول جاؤ کہ وہاں سے کوئی فرحانہ ملا ہے جو ہماری قسمت میں تھا، وہ ہمیں مل گیا ہے، چار سو گڑ کے مکان سے کلکل 120 گڑ کے مکان میں آگئے ہیں۔ یہ نہا رہی ہی نہیں کرو، دروازہ بھی، جس پر میں نے آنکھ بند کر کے گم کیا ہے وہ سونے کی ویگ ہماری قسمت میں نہیں تھی، قسمت کی دیوٹی ہمیں پکار پکاؤ کے چلی گئی۔ ہم نے ان کی آواز پر کان نہیں دیا۔ اب چھپتا ہے کہا ہوتے جب چیزیں چپ نہیں کہتے۔"  
 صیغہ بیگم اپنی قسمت پر آنسو بہاتی رہیں اور قسمت کی دیوٹی معزز صاحب پر مہربان ہوئی۔

☆.....☆

میں دکھا تھا۔ بے آواز جو آج سب نے سنی ہے، یہ برسوں پرانی ہے۔ میرے والد کے زمانے سے آ رہی ہے جب میں چھوٹا سا تھا، مگر میرے والد اللہ والے تھے، انہوں نے کبھی اس پر توجہ نہیں دی۔ میں نے بھی اپنے والد کی طرح اس پر توجہ نہیں دی۔ میری بیوی کو اس آواز سے بہت خوف آتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس مکان کو فروخت کرنے کی بات کرتی تھی، اب جب کہ مجھے جی کی شادی کے لیے رقم کی ضرورت تھی تو میں نے یہ مکان فروخت کر دیا اور اب کو اس آواز سے لاعلم رکھا۔ ضرورتی نہیں تھا کہ یہ سونے کی ویگ ہی ہوتی۔ ہو سکتا تھا کہ کوئی آسب ہوتا، جن ہوتا، جو آ ب کو اور آ ب کی جی کو کوئی نقصان پہنچاتا۔ میں نے آپ کو دھوکے میں رکھ کر یہ مکان آپ کو فروخت کیا ہے۔ اب یہ آ ب کی قسمت ہے کہ یہ آسب کے بجائے دولت ہے اس میں میرا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ میری سزا ہے۔ دولت ہمیشہ قسمت سے ملتی ہے۔ ہم برسوں اس دولت کے ساتھ رہے۔ اگر ہمارے لیے ہوتی تو اتنے عرصے میں کسی نہ کسی بجائے سے ہم کو مل جاتی، مگر ہم اس سے محروم رہے۔ اب میں اس کا حصہ دار نہیں بن سکتا۔ میرا صبر مجھے ملامت کرتا رہے گا۔ ہم نے تو اس آواز کو نہیں سمجھا کہ اس سے اپنی جان بچرائی تھی، اب یہ آ ب کا نصیب ہے، آ ب کو سارک ہو، میرا اس سے کوئی نقص نہیں۔ یہ کبہ گردہ اشرافی کے ساتھ واپس چل جائے۔

معزز صاحب اور دیگر محلے والے حیرانی سے اس عجیب و غریب شخص کو دیکھ دے تھے جس نے اپنے کبے کی سزا اپنے لیے خود ہی تجویز کر لی تھی۔ عثمان بھی اپنے والد کے ساتھ چلا گیا۔ عزیز صاحب گھر جا کر پٹنگ پر زور سے ت گئے۔ ان کو اس مکان میں آخری نجات میں اپنے والد صاحب کا اس گھرے میں نظر آنا اور مکان فروخت نہ کرنے کی اکتھا باؤ تھی۔ ان کی آنکھیں اپنی سے نکلیا پر ایک بار پھر سناں ہو گئیں۔ صیغہ تک بھی بے چارے تھی کہ اس آواز والے گھرے سے فرحانہ ملا ہے۔ وہ شوہر کو دیکھ کر خوشی خوشی ان کے قریب آئیں اور بولیں۔

اس میں ہن خا، تو دولت تو ہمارا ہی ہوئی تھی۔"

کار جہاں دراز ہے

انسان کی منزل

سگسٹریز اور



بچی کے ہاتھوں میں کتاب کی لذت خیز داستان، نو بہ تک سگسٹری سے



بنا اچانک لاپتہ ہو گیا۔ لاپتہ بھی وہاں کہ تمام کوششیں کر لیتے تھے کہ باوجود اس کا کہیں سراغ نہیں ملا۔ چنانچہ اسے زمین کھا گئی با آسمان نکل گیا۔ ثانیہ نے دل پر بھر رکھ کر اپنا پورا دھیان بانی بچوں پر لگا دیا۔ دونوں بچے پڑھنے کے لیے اسکول جانے سنے، وقت نے بھر پادشہی چارے، رانیہ دوسرے میں پہنچ گئی اور اس کا چھوٹا بھائی آنسوؤں کا اس میں۔ چنانچہ رانیہ نے ہم بھول کر نئی آمدوں کے سہارے جی رہی تھی کہ بھی اس پر بد نصیبی کی برہنہ گری۔ ثانیہ کا دوسرا بھائی سڑک کے ایک حادثے کا شکار ہو گیا اور موٹے رسی اس کی موت ہو گئی۔ شوہر کے بعد دونوں بچے بھی چلے گئے تھے۔ اب بچی تھی اس کی واحد اولاد رانیہ۔ اب ثانیہ اپنا سارا دھیان رانیہ پر لٹاتی، لیکن دل میں ڈری سی رہتی کہ کہیں یہ بھی میرا ساتھ نہ چھوڑ جائے۔ رواج پر عملی آنسوؤں کی ٹہنی سے دہنی ہوتی انجان اور بے نام آرزوؤں کی موجودگی رات کو گری ہوئی، اس کی مانند یہ جو نظر نہیں آتی، لیکن آسمان کے بچے پر تھے جھگ جاتی ہے۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ رانیہ نے انٹرن پاس کر لیا اور عمر کے بھی انٹار وسٹائل مکمل کر لیے۔ جوان بچی اس کے سینے پر بھاری بوجھ کی مانند ہوتی ہے۔ اسی لیے

**ثانیہ** آبائی طور سے حد حال کی رہنے والی تھی، اس کے والد کا نام مدثر علی تھا۔ نگر بائیس سال قبل ثانیہ کی شادی گھرو کی میں رہنے والے شہرزبان سے ہوئی تھی، بعد میں شہرزبان بھلور میں کئی مسبت آ رہا ہو گیا تھا۔ وقت کا پہرہ گھوٹا اور ثانیہ میں بچوں کی ماں بن گئی۔ وہ بچے ہونے کے بعد بھی رانیہ نے آنکھ کھولی۔ رانیہ جب بہت چھوٹی تھی تب ایک دن شہرزبان اچانک بیمار پڑ گیا۔ ثانیہ سے جتنا ممکن ہو سکا اس نے شوہر کا علاج کرایا۔ یہ الگ بات ہے کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، آخر کار ایک دن شہرزبان اسے کہنے کو روٹا بلکتا چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔ سوگ کے دن بہت گئے تو گھر والوں نے ثانیہ کو دوسری شادی کے لیے راضی کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، مگر اس کی زبان پر ہمیشہ انکار رہا۔ اس کا ایک ہی جواب تھا۔ دوسری شادی کرنے پر بیوی تو میں تھی رہو گی، مگر بچے سوئیٹے ہو جائیں گے، ثانیہ ہی راضی نہیں تھی تو کوئی کیا کرتا، ثانیہ محنت مشقت کر کے اپنی زندگی گزر بسر کرنے لگی۔ بس! اس کا بھی ایک عنصر ہی تھا جو بہن اور اس کے بچوں کا حال لینے پھار آ رہا تھا اور جتنا ممکن ہو پانچ ثانیہ کی مانی مدد بھی کر دیتا تھا۔ دن جیسے تھے، بیت رہے تھے کہ ایک دن ثانیہ کا بڑا

ملا۔ عصر علی کو حیرت ہوئی کہ تانیہ کا فون ان سالوں سے کبھی بند نہیں ہوا تھا، نواب کیوں بند ہے؟ اسے تو فون بند کرنا بھی نہیں آتا۔ تانیہ کہیں گئی ہوتی تھی تو تانیہ کال انشید کرتی تھی۔ عصر علی نے بے سوچ کر خود کو مطمئن کر دیا کہ ہو سکتا ہے ماں بنی کہیں گئی ہوتی ہوں۔ اس کے بعد عصر علی پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

تین چار دن بعد اسے فرصت ملی تو پھر سے بہن کا نمبر ڈائل کیا۔ اس بار بھی اسے وہی پیغام سننے کو ملا۔ اس کے بعد عصر علی روزانہ تانیہ کا نمبر ڈائل کرتا رہا، مگر اس سے بات نہ ہو سکی، ہر بار فون بند ملا۔ اسی طرح جب تقریباً 20 دن بیت گئے اور تانیہ سے رابطہ نہیں ہو پایا، تب عصر علی کا ہاتھ اٹھکا، ضرور کوئی گڑبڑ ہے، بھلو جا کر رہتا

دوسری ماؤں کی طرح تانیہ بھی اس بوجھ کو جلد ہی اتار دینا چاہتی تھی۔ اس کے بارے میں روکٹی بارانیے بھائی عصر علی سے بھی ذکر کر چکی تھی۔ عصر علی کی بھی وہی خواہش تھی کہ تانیہ کے ہاتھوں میں جلد ہندی گئے اور وہ کسی اچھے خاندان کی بیوی بن جائے۔ ہر دوسرے نمبر سے دن سو یاں فون کے ذریعے بہن کی خبریت پوچھتا رہتا تھا، عصر علی کی تانیہ سے آخری بار 24 اکتوبر کو بات ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ کام میں ایسا مصروف ہوا کہ بہن کو فون کر کے خبر نہ لینے کا اسے وقت ہی نہیں ملا۔ عصر علی کو امید تھی کہ بہن فون کرے گی، لیکن تانیہ نے کبھی اسے بار نہیں کیا۔ تقریباً 8 دن بعد عصر علی نے بھانجی کی خبریت جاننے کے لیے فون کیا تو جواب میں فون بند ہونے کا ریکارڈ پیغام سننے کو



کرنا چاہیے کہ کیا بات ہے؟

نہیں ہے، اسے رانا دہانے کا سیدھا مطلب رانیہ کی زندگی برباد کرنا ہوگا۔ جب تک میں زندہ ہوں رانیہ کو یہ سن مانی نہیں کرنے دوں گی۔ صبری موت کے بعد چاہے وہ کچھ بھی کرے۔ عضر علی جانا تھا کہ رانیہ ضدی عورت تھی۔ اگر اس نے شان لیا تھا کہ وہ رانیہ کی شادی خاور کھارو سے نہیں کرے گی، تو نہیں کرے گی۔ وہ فوت جانے والی عورت تھی، جھکنے والی نہیں، رانیہ کی شادی کرنے کے لیے وہ کسی اچھے گھر اور زرکی تلاش بھی کر رہی تھی، ایسی حالت میں وہ رانیہ کی شادی آنا نانا خاور کھارو سے کیسے کر سکتی تھی، ثانیہ نے بھی کی شادی بھی کر دی اور علی پر بھی چلائی۔ یہ بات عضر علی ختم نہیں کر پاؤا تھا، خیالات کے ہمنور سے نکل کر عضر علی نے رانیہ سے سوال کیا۔

کہہ دوں گی۔ ”رانیہ نے نظر جھکا کر آہستہ سے جواب دیا۔“ اما میری شادی ہوگئی ہے۔“

”کب؟“

”اسی مہینے کی پانچ تاریخ کو۔“

”نیا بانی شادی ہوگئی اور مجھے خبر تک نہیں کی گئی۔“

”اما سب کچھ اتنی جلد ہی ہوا کہ کسی کو بتانے یا

بلانے کا بھی وقت نہیں ملا۔“

”اور بہن تمی کہاں ہے۔“ عضر علی نے چاروں

طرف دیکھ کر پوچھا۔

”یہ سننا پوچھنا نہیں۔“

”کیا؟“

”کانی کوشش کرنے کے باوجود عضر علی

رانیہ کے بیان پر یقین نہیں کر پا رہا تھا۔ دل میں ایک ہی

بات اُتر گزری تھی کہ بہن نے اسے بتانے بغیر رانیہ کی

شادی کر دی اور خود بیخ پر چلا گئی، یہ ممکن نہیں لگتا، ضرور

کہیں کوئی گزرتا ہے۔

”رانیہ تیری شادی کس سے ہو رہی ہے؟“

رانیہ نے سر جھکا کر دھیرے سے جواب دیا۔ ”خاور

کھارو سے۔“

”وہی جو دہر پر رہتا ہے اور صہیب کا چھوڑا

ہے۔“ رانیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پلک جھکنے ہی عضر علی کا دل ہاشمی میں دھرتک چلا

گیا۔ ثانیہ نے اسے بتایا تھا کہ رانیہ نے خاور کھارو کو دل

میں بسا لیا ہے۔ بدنامی کی لنگر کے بغیر وہ اس کے ساتھ

گھومتی پھرتی ہے۔ رکھنے والوں نے بتایا ہے کہ وہ نیا بانی

میں بھی اس سے ملتی ہے۔ پوچھنے پر کہتی ہے خاور کھارو میرا

پیارے اور میں اس سے شادی کروں گی۔ عضر علی کو باؤ یا

کہ ثانیہ نے اس سے ایک نہیں متعدد بار کہا تھا، ایک تو

خاور کھارو دارہ اور کھنور ہے۔ دو در باری برادری کا بھی

ہیکے میں کہا کر دینی ہو؟“

رانیہ نے سوچا سمجھا جواب دیا۔ ”انہاں گھر کی

رکھوالی کے لیے مجھے یہاں چھوڑ گئی ہیں، جب تک وہ بیخ

سے نہیں لوٹیں، میں یہیں رہوں گی، ان کے آنے کے

بعد دہر پر پوچھنی چاہوں گی۔“

”اور تیرا گھر والا کہاں ہے؟“

”وہ کام پر گئے ہیں، شام کو لوٹیں گے۔“

”اما تم تنہو میں نا سٹا بنا کر لاتی ہوں۔“

”رانیہ! آن صبرے پاس دفت نہیں ہے۔“ عضر

علی نے اسے بلا۔ ”میں انہم لوگوں کی خبر بہت لینے کے

لیے پانچ منٹ کے لیے آتا تھا۔ بہن آ جا میں تو زن

کر لہنا، ملنے آؤں گا۔ تیرا بے لے خود بھی لاتا ہے۔“

اپنی بات کہہ کر عضر علی گھڑے سے نکل گیا۔

☆.....☆

اس کے دل میں شک کے باؤل محوم دے تھے، وہ

سیدھا بھلا پوچھا، یہاں اس کے کچھ واقف کار تھے۔ ان سے

ملا اور رانیہ کے بارے میں بات چیت کی تو ان سب نے بھی

رانیہ کے بیان پر اسے شک کا اظہار کیا۔ دو سب بھی چاہنے کے

تعلق پر جانے کی بات پر یقین نہیں کر رہے تھے۔ ان لیے

عضر علی کے مذمذم نظروں کی جانب مٹھان ہو گئے۔

☆.....☆

اشکوزن نارا اپنے کرے میں موجود تھے۔ عضر علی



ایسے ایسے سوالوں کی بارش کی کہ وہ دہانے نکلے اور رونے رونے ہی اپنے جسم کا اقرار کر لیا۔

23 سالہ خاور کھاوہ دوزر پور کے باشندے صہب کا بیٹا تھا۔ اوسط پڑھائی کرنے کے بعد وہ آوارگی کرنے لگا۔

اس باپ کی چھ اولادوں میں خاور سب سے چھوٹا تھا، اس لیے سب سے ڈرا تھا۔ خاور کے دو بڑے بھائیوں علی،

وسیم اور دو بہنوں کے بہا ہو چکے تھے۔ شادی شدہ بھائیوں کے علاوہ کنوا اور بھائی نسیم بھی کام دھندے سے لگا ہوا تھا،

جبکہ خاور کی زندگی عیش سے گزر رہی تھی، باپ نے اسے بانگ ولار بھی ملی، اس پر سواد ہو کر وہ سن مری سے گھومتا

رہتا تھا۔ خاور کھاوہ کی رشتے داری پھیل رہی تھی، جہاں وہ اکثر آجاتا وہنا تھا۔ اس کے رشتے دار کا گھر ٹانبہ کے

مکان کے صحن نکل میں تھا، وہاں آنے جانے کے دوران ایک سال پہلے خاور کھاوہ نے وادی کو بکھا اور اس کے حسن

پر نفا ہو گیا۔ اس نے رانبہ پر ڈور سے زوالے نوہ اس پر رنجھ گئی، کچھ دنوں تک ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے اور

آنکھوں ہی آنکھوں میں بات کرتے رہے۔ اس کے بعد ایک دن رانبہ کو ایلا پا کر خاور کھاوہ اس کے گھر میں گھس آیا

اور محبت کا اظہار صاف صاف کر دیا، بس اس کے بعد ہی دونوں کی لوانسنوری شروع ہو گئی۔

عشق کا جنون آگے بڑھا تو دونوں کے دل ہی نہیں جسم بھی ایک ہو گئے۔ ٹانبہ کو اس بات کا علم ہوا تو دیکھنے میں آ گئی۔ عزت کے علاوہ اس کو ٹھیکیا وکیا کے پانچ کچھ

ٹھیس مضا اور تاروں میں عزت کو تھام کرنے پر تہی ہوئی تھی، اس نے بیٹی سے جواب طلب کیا تو رانبہ نے صاف

صاف بنا دیا۔

”اماں! میں خاور کھاوہ کو چاہتی ہوں اور ہم دونوں جلد شادی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“

ٹانبہ نے رانبہ کو سمجھا یا کہ خاور کھاوہ اس کے لافنی نہیں ہے، نہ وہ زباوہ پر حا کھا ہے اور نہ ہی کوئی کام

دھندا کرتا ہے۔ بھلو سے دوزر پور تک ساری آوارگیوں اس کے بیٹی تاج درج ہیں، خاور کھاوہ کے ساتھ وہ خوش

تھیں وہ کسکی، لیکن رانبہ نے ماں کی بانوں پر کان نہیں دھرے۔ وہ پہلے کی طرح خاور کھاوہ سے ملنی اور خرابوں

میں دنگ بھرتی رہی۔

نے انہیں رانبہ اور خاور کھاوہ کی پریم کہانی سے آگاہ

کر کے ٹھیک ظاہر کیا، بین ان دونوں کی شادی کے حق میں نہیں تھی۔ اب، بین اپنا ہے اور رانبہ خاور کھاوہ کی

بیوی بنی ہوئی ہے، مجھے شک ہے کہ رانبہ اور خاور کھاوہ

نے ٹانبہ کو کہیں قید کر رکھا ہے اور دونوں اپنا من مانی

کر رہے ہیں۔ پولیس کی ٹوٹی کے ساتھ عنصر علی ٹانبہ کے

گھر گئے تو رانبہ گھر میں ہی تھی اور اتفاق سے خاور کھاوہ

بھی وہاں موجود تھا۔ عنصر علی کے کہنے پر پولیس نے رانبہ کو

بھی حراست میں لے لیا۔ رانبہ اور خاور کھاوہ کو ساتھ لے کر

پولیس ٹیم تھانہ بھلو روٹ آئی۔

”جبری ماں کہاں ہے؟“ مسن ٹاؤ نے وادی کو

سامنے کھڑا کر کے پوچھا۔ رانبہ بڑی طرح گھبرائی ہوئی

تھی، بھر پھی خود پر قابو پانے ہوئے بولی۔

”وہ تبلیغی جماعت کے ساتھ تبلیغ کرنے کے لیے

راولپنڈی گئی ہوئی ہیں۔“

”ہوں!“ مسن ٹاؤ نے بظاہر اجماعاً ”24 اکتوبر کو

تبلیغ کے لیے راہ لپنڈی گئی اور اب تک واپس نہیں آئی، نو

آٹا ٹاٹا میں 5 نومبر کو اس نے تیرنی شادی خاور کھاوہ سے

کیسے کر دی؟“

اس بات کا رانبہ اور خاور کھاوہ کے پاس کوئی

اطمینان بخش جواب نہیں تھا، کچھ دیر منٹیں جھانکنے کے بعد

خاور کھاوہ نے بگڑی ہوئی بات کو سننے کی کوشش کی۔

”سرا ہم دونوں بچار کرتے تھے، لیکن ٹانبہ چاہتی

تھاری شادی کے خلاف تھیں۔ اسی لیے ہم نے ان کی خبر

موجودگی کا فائدہ اٹھا کر 5 نومبر کو شادی کر لی۔ ہمارا خیال

تھا ٹانبہ چاہتی تبلیغ سے لوٹیں گی تو ہمیں ہماری شادی ختم

کرنا ہی ہوتی۔ اس لیے اسے اب تک نہیں لوٹیں۔“

”پولیس کو تو بے وقوف سمجھتا ہے کہ جو نوکے کا ہم

اس کا بھین کر لیں گے۔“ مسن ٹاؤ نے دھاڑنے دھاڑنے

ہوا میں تیرا چلا دیا۔

”صاف صاف کیوں نہیں کہتا کہ تم دونوں نے ٹانبہ

کو مار کر اس کی لاش کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔“ اندھیرے

میں چلا گیا نیر بالکل صبح نشا نے پر لگا۔ رانبہ اور خاور کھاوہ

کے چہرے پر ہوا کہاں اُنزے نگیں اور ان کی چشمانی سپتے

سے بھگ گئی۔ مسن ٹاؤ نے انہیں سنبھالنے کا موقع دے بغیر

کھار اور واحد پہلے سے موجود تھے۔ وہ تانبہ کو پاؤں میں اُلجھا کر کھودی گئی قبر کے پاس لے گئے، وہ تک تانبہ پر نیند کی گولہوں نے از کرنا شروع کر دیا تھا، اس سے نہ تو ٹھیک رہے کھڑا ہوا جا رہا تھا اور نہ ہی وہ بات کرنے کی حالت میں تھی۔ تانبہ کی اس حالت کا فائدہ اٹھا کر رائیہ نے اسے دیوبند لیا، واحد نے اس کے پاؤں پکڑ لیے اور خاں کھار نے تانبہ کے دوپٹے سے اس کا گھاگھونٹا شروع کر دیا، تانبہ سانس رکھنے سے بے ہوش ہو گئی، لیکن وہ مرئی نہیں۔ اس لیے واحد اور خاں کھار نے بانک کے بیچ واڑے سے اس کا گھاگھونٹ دیا۔ تانبہ مرئی تو تا کھوں نے اس کی لاش گڑھے میں ڈال کر اس پر نمک کی بوری ڈالت دینی اور پھر گڑھے کو کھنی سے پانے کے بعد وہ اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

اس کے بعد 5 نومبر کو بمبئی گورنٹ کی اجازت سے رائیہ اور خاں کھار نے سٹاؤ کی کر لی تھی۔ ملازموں کے بیان کے بعد انہی کی نشان دہی پر پولیس کی پوری ٹیم نے گڑھا کھود کر تانبہ کی لاش نکھلائی، جس کے باقیات ہی رو گئے تھے، باقی سب کچھ سڑھل کر مٹی میں مل چکا تھا، اس کے علاوہ ملازموں کے پاس سے متھڑا لاکھو ہاں ٹون، ٹونا ہوا سم کارڈ اور سوئے کی ایک اٹھنچی بھی برآمد کر لی گئی اور واحد کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ پولیس نے تانبہ کے بھائی ناصر علی کی تحریر کی بنیاد پر مقدمہ نمٹل 302 کے تحت ایف ڈی آر درج کر کے رائیہ و خاں کھار کو عدالت میں پیش کر کے جیل بھیج دیا، مادہ نمٹل 302 کے تحت عدالت میں پیش کرنے اور تانبہ کی جیل لاہور بھیج دیا گیا تھا۔

جس جی کو پالنے کے لیے تانبہ نے زندگی بھر تک نفیس اغناس، عود ہونے پر صرف اس لیے کہ بچوں کو سونپے ہیں کا احساس نہ ہو۔ شوہر کے بعد دونوں بیٹوں کے چلے جانے سے تانبہ جو صرف اس لیے جی رہی تھی کہ اس کی بیٹی کا مستقبل روشن ہو سکے، اسی بیٹی نے اپنی ہوس کی کھمبیل کے لیے ماں کی قبر کھود ڈالی۔ عام آدمی اس لحاظ سے اچھا ہوتا ہے کہ اس کی موت پر بلا سے آدمی کی موت کی طرح کوئی بہت بڑا غلطا پیدا نہیں ہوتا، بلکہ زیادہ سے زیادہ ایک چار پائی، ایک کرے، ایک چھوٹی سی جگہ خالی ہوتی ہے جسے بڑی آسانی سے بڑھا جا سکتا ہے۔

☆.....☆

تانبہ نے جب دیکھا کہ پریم دیوالی بیٹی پر نصیموں کا اثر نہیں ہو رہا ہے تو اس نے بیٹی پر پابندی عائد کر دی۔ جب اس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو تانبہ رائیہ پر ہاتھ اٹھانے لگی اور یہ بھی بول دیا کہ جان بوجھ کر میں تجھے بہیم میں نہیں دیکھ سکتی۔ مجھے زبردستی کے بارے میں اس کے بعد کچھ عرض کرنا رہنا، پھر میں تجھے دیکھنے بارے میں تو کہنے نہیں آؤں گی۔

رائیہ نے یہ باتیں جب خاں کھار کو بتائیں تو وہ اسے سٹاؤ کی آسان راہ سوجھائی، وہ مسکرا کر بولا۔

”تانبہ چاچی! اپنی عمر جی بچھیں، ویسے بھی انہیں دکھ کے سوا ملا کیا ہے۔ اب مزید بیٹی کر دو کیا کر سکی، انہیں سربہ جانا چاہیے۔ ویسے بھی جب تک وہ زندہ ہیں۔ ہماری سٹاؤ کی نہیں ہو سکتی، اب فیصلہ شمارے ہاتھ میں ہے کہ ماں کا انتخاب کرتی ہو یا میرا!“

رائیہ پر عائشہ کا ایسا رنگ چڑھا ہوا تھا کہ اس نے ماں کی بجائے خاں کھار کا انتخاب کر لیا۔ ان کے بعد ان دونوں نے مل کر تانبہ کو گل کرنے کا منصوبہ بنایا، نفیس جیسا سنگین جرم کر کے لاش ٹھکانے لگا پانا کیلئے خاں کھار کے بس کی بات نہیں تھی، اس لیے اس نے اپنے دوست واحد کو ساڑھس میں شریک کر لیا۔ واحد پھلوں میں ہی رہنا تھا اور اس کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔ مل کر تانبہ آسان تھا، لیکن لاش ٹھکانے لگانا زار مشکل تھا، اس لیے خاں کھار اور واحد نے لاش ٹھکانے لگانے کی تیاری پہلے کی۔ 24 اکتوبر کی صبح ہی ان دونوں نے چلو روڈ پر واقع ایک خشک نالے میں لاش ڈھانسنے کے لیے فریڈنا کڑھا کر دوایا۔

جب غیر تیار ہوئی تو خاں کھار اور واحد ایک بوری تک خرید لائے، اس کے بعد خاں کھار نے رائیہ کو ڈون کیا کہ اپنی ماں کو سمزوں والا لے آؤ، وہ ہاں سے آگے کا کام ہم سنبھال لیں گے۔ منصوبے کے مطابق رائیہ نے چائے پلائی اور اس میں نیند کی گولیاں گھول دیں۔ رائیہ نے وہ لٹی چائے ماں کو پلائی۔ اس کے بعد بوٹی۔

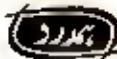
”اماں! تم ٹھیک کہنی تھیں خاں کھار میرے لاکن نہیں ہے، میں نے غلط فہمیاں تو زرنے کے لیے اسے سمزوں والا بلا دیا ہے، تم بھی ساتھ چلو، تو بے بس ہو گا۔“

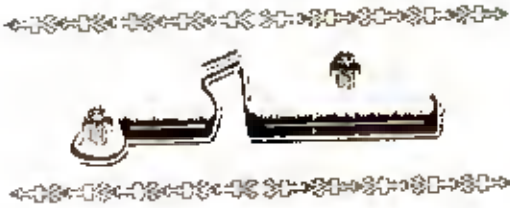
تانبہ کے دل کی بات تھی، وہ خوش خوشی رائیہ کے ساتھ اس مقام پر چلی گئی۔ سمزوں والا کے سمنان مقام پر خاں

خوبصورتی جو صرف  
ظاہری ہی نہیں  
بلکہ اندرونی ہے

اکثر اہم فریب دہندہ اور تڑپاؤ کو دور کرنے اور صحت مند زندگی گزارنے کے لیے  
ہر روز صبح اور شام کو دو گولہ لیں۔ جلد کے لیے بہترین اور سب سے  
زیادہ فائدہ مند گولہ ہے۔  
X آئس کریم X مٹھکے X سبزیوں کا  
ایجنڈا کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی

Safi Kafi Hai





انجائز احقر نواب

زندگی صرف وہی تو نہیں جو ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ زندگی تو وہ بھی ہے جسے ہم صرف سوچتے ہیں۔ سلسلہ "تاکسن" آپ کو یقیناً ایک نئی دنیا یعنی زندگی میں قدم رکھنے پر مجبور کر رہے گا۔ ہزاروں سال کی تہنابیر پر چھلانا زندگی کا یازدہک۔ تاکسن کے دو بھائی آپ کو ضرور نصیر کر رہے گا۔

قسط نمبر: 9

گزشتہ افسانہ کا خلاصہ

جوگی مہاراج کے پردادا لوگوں کے گروہ نے مرنے سے تپسوں تک کا ہر ذرا ان کا ہنسا اور تپا تھا کہ ان لوگوں کے سر پہ چاند کی نقابیں ہیں اور انھوں میں سنہری روٹھی، انھوں کی سنہری روٹھی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بادشاہ مہاب ہیں مگر جو سال تک زندگی نہ پڑے صرف انسان کے دو بھائی آپ جائیں گے، بلکہ ہر جانداد کا روپ دھار سکیں گے۔ زمین کی تہوں میں بھی نہ جانے ان کی ہوسز میں ہوں گے مردانہ دقت جس کے بیٹے میں ہوں گے باہی کے حکم کے نام ہوں گے، لیکن میں کے لئے ضروری ہے مردانہ میں لوگوں کی رات ہنگامہ دو ہوتا ہے حضور ایک مرد اور ایک عورت کی فریبانی ہی چاہئے۔ جان جو انھوں میں ڈال کر ان کے پرکھوں میں ان لوگوں کو تازہ دم سے بلاؤ، انھوں کو بھائی کا چہل قدمی جوگی مہاراج کے حصے میں آ چکا تھا۔

دو رات بھی لوگوں کی رات بھی وہ ان لوگوں کی عمر کے سو سال تک ہونے جا رہے تھے، بڑی مہاراج نے یہ کہانی میں سال سے ساتھ دینے والے بیٹے صاحب کو ستائی اس کی تپت میں کھوت آئے گا۔ گرو مہاراج ہر خوشی میں ہنسنے سے ناگ ستر کا چاب کر رہے تھے اور صاحب کو نہیں بھڑپتے نظر دیاں سے کہہ کر زہر مسکرا رہا تھا، چاب کھل کر کے جوگی مہاراج نے اپنی کمال کھلی کیا، روزوں تک دور تاگن انسانی خوان میں اٹھان کر رہے تھے اور سر ہڈیاں نکال کر خون جات رہے تھے، جوگی مہاراج بیٹھے یہ منظر خود سے دیکھ رہے تھے، یہی دور کو تھا جس کا صاحب کو اڑنا تھا، اس نے ہلک جھپٹنے میں ہنجر کا وار مہاراج کی گروں پر کیا اور گرو مہاراج ہنجرانی انھوں سے اپنے پہلے روکے رکھے، صاحب لوگوں کو کھانے کا کہہ کر جب گرو سے اسے توڑا، وہی چکر ایک خوب صورت نوجوان مرد اور سزا تھا، وہ سالہ لڑکی موجود تھی، صاحب نہیں کہتا ہے کہ تم میرے غلام ہو، دو دن کے نام اور میں اور کھٹنا جو ہر کر رہا ہے، جب اور جن اور کھٹنا سے جانتے ہیں کہ انہیں معلوم ہے کہ صاحب لوگوں کا گرو مہاراج نہیں بلکہ ایک چھلہ ہے، جب صاحب کے خون سے نشیں ہو گیا کاہہ بڑھاپا پائیاں جھا کر تیر کا رخ کر رہا ہے۔

لوگ اسے دیکھتے ہیں اور اس پر ہنس ڈال کر ناگ لگا کر مار ڈالتے ہیں، یہ منظر دیکھ کر کھٹنا غصے میں آ جاتی ہے اور کہتی ہے، "اور جن کے تاگوں انہیں میرے ہانگ کی ہتھکڑی کر کے بلا دیا ہے کیا ہم تاگوں کی طاقت اور انتقام سے راضی نہیں، کھٹنا مہاراجی زندگی میں ہر کھول دے گی، میں اس کاوش کی اہانت سے اہانت، جہادوں کی ہمت موت وانگوں لیکن موت بھی تم سے روٹھ جائے گی، ایک ایک کو تیرا شاہکار اور اس کی ہیراؤں کی اور مہاراج سے لیے قیامت میں کر ڈالوں گی!"







گھنٹلا گاؤں کے لوگوں سے جان بچا کر بھاگتی ہے اور جنگل میں موجود ریاست تپان کے مہاراجہ رام ناتھ کے قافلے تک جا پہنچتی ہے۔ مہاراجہ رام ناتھ اس کی خوب صورتی دیکھ کر دمک رو جاتے ہیں اور اسے اپنی کینئر بنانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ مہاراجہ رام ناتھ مہاراجہ رام ناتھ کو کہتی ہیں کہ گھنٹلا گاؤں میں اور انسانی روپ میں اس شخص سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے اور اس کے لیے وہ چاہیں تو شاہی پنڈت گرو ذرائع سے تعہد لین کر سکتے ہیں۔ مہاراجہ اس سے کہتے ہیں کہ اگر گھنٹلا گاؤں میں تو اس کو آگ میں جلا دیا جائے گا اور اگر ایسا نہیں ہوتا ہے تو اسے آگ میں بھینک دیا جائے گا۔ ایک دن گھنٹلا گاؤں کے باشندے بچکے۔ مہاراجہ رام ناتھ اسے لباس میں جیسا کر لایا جانے والا آئینہ اجا تک گھنٹلا کے سامنے کرتی ہے جس میں ایک بڑی ہی ناگن لوگوں کو نظر آتی ہے۔ یہ سارا راجہ مہاراجہ گھنٹلا کے بھائے راجہ رام ناتھ کو گھر لے لیتا ہے۔

سامری گھنٹلا، بیکرام اور پرہیہ تپان کی حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کر چکے تھے۔ کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہ ہو سکتا تھا۔ ہر طرف ظلم کی راج تھی۔ گھنٹلا چاہے کہ ذریعے کا لی مائاتی مہمان شتی کے حصول میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ گھنٹلا اب صرف آسمان نہ تھی بلکہ چاروں طرف ہی جلی تھی۔

گھنٹلا سزا گھنٹلا اور گھنٹلا کے پالوں والے فوجوں کو دیکھ کر بہت روجاتی ہے۔ وہ گھنٹلا کو بتاتا ہے کہ وہ جنات کے بارشاہ گھنٹلا ان کا بیٹا ہے اور تپان کوئی جاوڑو نہیں ہوگا۔

گھنٹلا شکران کو دوست بنانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ وہ بھی اس کا ساتھ دینے پر راضی ہو جاتا ہے۔ سامری گرو ذرائع کو منزل چاہے۔ ہاڑ کھنے میں کام ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے گرو شاہ کی روح سے مدد طلب کرتا ہے۔ سامری جاوڑو کی ماکھت شکران سے ہوتی ہے۔ گھنٹلا شکران اور سامری تپان گرو ذرائع کے منزل کے پاس جا پہنچتے ہیں لیکن گرو ذرائع اپنا چاہے کھنی کرتے ہیں کامیاب ہو جاتا ہے۔

گھنٹلا کی سامری گھنٹلا میں اسٹیل ہوتی تھی اب وہ بالکل ایک عام ہی گزروا ہے۔ بس لڑکی تھی۔ گرو ذرائع گھنٹلا سے کہتا ہے کہ چنگار سے ہلو کو تھوڑے شہیرا مانگنے کے لیے چنگار سے براہ راست میرا ہاتھ مانے۔

ادھر یہ جیران تھی کہ کوئی دن گھر نہ گھنٹلا اور پتہ آئی اور نہ سامری یا شکران۔ پر یہ کہتا تھا کہ گرو ذرائع گھنٹلا کو قلام بتاتا چاہا رہا ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ گھنٹلا کا قلام سن جاتا ہے کہ حق میں بہتر ہے تاکہ وہ حکومت پر قبضہ کر کے ملک میں جانے سے قبل اپنا تک شکران آتا ہے اور اسے قلام سے قلم لے کر گرو ذرائع تیرے چاہے۔ کامیاب ہو کر گھنٹلا کے جسم و جان اور اس کی تمام خلقوں پر قابض ہو گیا ہے اور سامری بھی اس کے پاس قید ہو گیا ہے۔ وہ میں گرو ذرائع ہو جاتی ہے۔ سامری کو ہوش آتا ہے تو سامنے گرو ذرائع اور قلم ناتھ موجود تھے۔ جب وہ اپنے دو ہاتھ لٹکا کر اپنی سہانا کے لیے پکارا ہے، گرو ذرائع ہنتر جاتا ہے اور نکل آگ کے شٹل سامری اور گھنٹلا کو گھر لیتے ہیں۔ گھنٹلا گرو ذرائع کو بھی اس آگ میں گھنٹلا سے اور ان کے جسم جلا شروع ہو جاتے ہیں۔ جب گھنٹلا کی آگ کھلتی ہے تو وہ ایک دربان اور شہر چنگار ہو جاتی ہے۔ اس کا جسم ہر طرف جلا ہوا تھا اور ذروں میں بھیب پر چلتی تھی، اسی حالت میں گھنٹلا زہنی سستی آہادی تک پہنچتی ہے جہاں اس پر کتے حمل کر رہے ہیں اور وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ جب اس کو ہوش آتا ہے تو وہ ایک گھر میں موجود ہوتی ہے ایک نوجوان لڑکا لڑکی اور ادھیر عورت اور مرد موجود تھے۔ علاقہ اچھی خوراک اور مکمل آرام سے اس کے زخم ٹھہرنے شروع ہو چکے تھے۔ لڑکی سندری گھنٹلا کی دوست تھی۔ گھنٹلا کو سمجھتی ہے کہ سندری کا بھائی گھنٹلا کے گھر چکے ہے۔ روز باہر نکل جاتا ہے۔ گھنٹلا کو خود میں خون کی محسوس ہوتی ہے اور وہ چنگار کو یاد کرتی ہے۔ وہ اس وقت حیرت زدہ رہ جاتی ہے جب چنگار کو اپنے سامنے کھڑا سمجھتی ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ اس کو گھنٹلا ہونی چاہتی تھی۔

گھنٹلا گھنٹلا ہونی چاہتی تھی۔ گھنٹلا کو اس کا جسم ہر طرف جلا ہوا تھا اور ذروں میں بھیب پر چلتی تھی، اسی حالت میں گھنٹلا زہنی سستی آہادی تک پہنچتی ہے جہاں اس پر کتے حمل کر رہے ہیں اور وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ جب اس کو ہوش آتا ہے تو وہ ایک گھر میں موجود ہوتی ہے ایک نوجوان لڑکا لڑکی اور ادھیر عورت اور مرد موجود تھے۔ علاقہ اچھی خوراک اور مکمل آرام سے اس کے زخم ٹھہرنے شروع ہو چکے تھے۔ لڑکی سندری گھنٹلا کی دوست تھی۔ گھنٹلا کو سمجھتی ہے کہ سندری کا بھائی گھنٹلا کے گھر چکے ہے۔ روز باہر نکل جاتا ہے۔ گھنٹلا کو خود میں خون کی محسوس ہوتی ہے اور وہ چنگار کو یاد کرتی ہے۔ وہ اس وقت حیرت زدہ رہ جاتی ہے جب چنگار کو اپنے سامنے کھڑا سمجھتی ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ اس کو گھنٹلا ہونی چاہتی تھی۔

خون بی ایسا تھا۔ گاؤں کے لوگ اس بات سے بہت خوف زدہ ہوتے ہیں۔ دلدارو نامی شخص جس کو ساہوکاروں کو غارتی نے اپنے نام میں کیا ہوا تھا، کو غارتی والا اور سے کہتا ہے کہ تپان سے ذریعے ایک نیا سیرے جیسے شے آئے گا جس سے تمام کام پلے پھر میں کروے گا۔ پھر ذریعے کو غارتی کا چیلنا بن کر پیش کرتا ہے۔ یہ شکران اور ذرائع کی مدد سے حکومت کر رہی تھی اور ذرائع کو خوش رکھتی تھی۔ جب ایک روز شکران گھنٹلا کی تلاش میں آیا، اور پھر وہیں نہیں آتا اور پھر ایک روز وہ پھر کام کو بھی قید خانے میں ڈال دیتا ہے جہاں بھوک پیاس سے اور باہر رگڑ کر بیکرام بھی ہے یہی کی موت مارا جاتا ہے۔

گھنٹلا کو چنگار سے تپان کے سندری کے بھائی گھنٹلا کو ایک چھوٹی خوب صورت لڑکی میں اپنے جال میں قید کر لیتا ہے۔ اور روزانہ حضور و حضور کر کے اس کا خون پیتی ہے۔ چنگار گھنٹلا کو اس جگہ لے جاتا ہے جہاں گھنٹلا کو ہوشی کی حالت میں قرار دیا، لڑکی اس کا خون

ہیں تو ان پر چمکی ہوئی تھی۔ جب وہاں جا چکے تھے تو ضرور ہوتی ہے اور کابل و پراہنیا کو چاہے بڑھ کر اس جڑیل کو آگ لگا کر ہلاک کر دیں۔  
ہے۔ ممکن ہو تو اسے آج بے نوا سے سب تباہ کر کے واپس جانے کا کہتی ہے۔

سچے کر وہ دلدادہ اور اس کے چہل قدمیوں تک کو اپنے بس میں کرنا چاہتی ہیں اور اس کے لیے وہ جی تو پیاسی مصروف تھے۔  
کوٹھاری دلدادہ کو ساتھ لے کر قیرستان پہنچا ہے اور کوہاں سے ایک قبر کی ٹہلی بنا رہا ہے۔ قبر سے جو اس سال موت کی لاش نکلتی ہے۔  
دلدادہ اس کے بال کاٹ کر اپنے پاس محفوظ کر لیتا ہے۔ وہاں سے کوٹھاری اسے ایک مکان کے سامنے لگا کر ڈالتا ہے اور دلدادہ سے کہتا  
ہے کہ اس مکان میں میاں بیوی اور ان کی ایک چھ ماہ کی بیٹی ہے، بڑے سے کوہاں پر اس میں ابھی قتل کرنا ہوا ہے جبکہ لڑکی کو تو ہی لائے  
گا میرا ہاتھ لگا تاغ ہے۔ اس کے بعد دلدادہ دلدادہ کو دیکھتا ہے اور اسے ایک اور چیز عرض کرنا ہے۔ کوٹھاری اس پر حملہ کر رہا ہے  
اور اسے گرا دینے سے دبوچنا لیتا ہے۔ سوچتے تے تا کہ وہ اٹھا کر دلدادہ مکان میں گھس جاتا ہے۔ جہاں ایک کمرے میں نوجوان اور شہزادہ  
موجود تھے اور وہاں اس کی آواز سے نیند سے بیدار ہوئی تھی۔ دلدادہ کو دیکھ کر خوف زدہ ہو کر بھاگنے لگتی ہے۔

دلدادہ اس لڑکی کو بے ہوش کر کے باہر کوٹھاری کے پاس لے آتا ہے، کوٹھاری اسے اپنے پیچھے آئے کا اشارہ کرتا ہے، اور دلدادہ  
کے ساتھ اپنی لگتی کے ذریعے ایک غبر اور پیمانے ملائے میں پھینک دیتا ہے۔ اور اس اور شہزادہ کو ایک چٹا پر لگا کر اس کے ہاتھ پاؤں  
باندھ دیتا ہے۔ لڑکی ہوش میں آ کر رونے لگتی ہے۔ دلدادہ کو ان پر ترس آ جاتا ہے اور وہ کوٹھاری پر حملہ کر دیتا ہے۔ کوٹھاری  
شعے میں آ کر اسے ہاتھ پاؤں پلانے کی طاقت سے محروم کر دیتا ہے اور پھر اپنے جینز سنز میں مشغول ہو جاتا ہے۔ تب ایک ٹیلا شطہ  
آساں سے زمین کی طرف آتا ہے۔ جس کے ساتھ وہاں سا تھا وہ وہاں جو کہ شہزادہ من تھا، آہستہ آہستہ جگمگ میں داخل ہو جاتا  
ہے۔ کوٹھاری دیکھ کر لڑکی کو لاش کا منہ بند کر دیتا ہے اور خوشی میں ناچنا شروع کر دیتا ہے اور دلدادہ سے کہتا ہے کہ کوٹھاری آج بہت  
بڑی فتحی میں آیا ہے، ایک جن اس کے ہوش آ گیا ہے جو اس کے سامنے کام کرتے گا۔

کوٹھاری اس سامنے ٹھل کے بعد ماہین سمیت کراٹھنے کی تیاری کر رہا ہوتا ہے کہ وہاں بری داس کے سپاہی آتے کہ ہمارے لیے  
ہیں۔ وہاں بری داس میاں ہونے کے باوجود ایک دم دلدادہ کا لیا کا خیال رکھنے والا کھرا تھا۔ اس نے جاہلوں کو اور جاہلوں کے



شکاف سخت قانون بنا ہوا تھا جس کی وجہ سے پورنی ماہر معاشی میں جا دوڑنے کرنے والا نہیں تھا۔ کوٹھاری کی باہر جرم میں گرفتار ہو چکا لیکن وہ ہر بار فرار ہو جاتا۔ اس بار اسے گرفتار کر کے اپنی دکان کے سامنے جیل کھا جاتا ہے اور سزا کے طور پر اس کے ہونٹ سی رہے گئے۔ بری دکان کو کوٹھاری کے منسلک سے برآمد ہونے والا سامان دکھا یا جا، انٹرا جس میں ایک شیشے کی بوتل بھی تھی جس میں دھواں بھر ہوا تھا۔ وہ اس بوتل کو کھولنے کا حکم دیتا ہے اور چند ہی لمحوں میں میدان میں خشک ان جن مو جوڑا جوتوں میں بندھا ہوا نام لوگ اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ خشک ان کوٹھاری کو آواز دے دیتا ہے اور اسے پورنی دوپاسٹ کو ڈنگ لگووے کا حکم دیتا ہے۔ اور اس خشک ان کے منفق سے چٹا ہے کہ خشک ان کو کیسے دی جانی کا پتا چلا، کیسے اسے ختم کر دیا۔ خشک ان کے ہاتھ کو گاؤں سے باہر بری کے درختوں کے پاس لٹنے کے لیے کہتی ہے۔ خشک ان کوٹھاری کی پاس ہے اب کہتی ہے لیکن خشک ان کے گھر والوں کے احسانات کی وجہ سے وہ خشک ان کا خون چٹا مناسب نہیں سمجھتی۔ اور اسے کہتے ہیں کہ وہ ایک گھر میں ایک گھر میں داخل ہو جاتی ہے اور ایک گھر کے خون سے اپنی پائیاں بھاتی ہے۔ ان خون والوں سے گاؤں میں کراہ مچ جاتا ہے۔ چٹا ہونے میں نپٹلے کیا جاتا ہے کہ گاؤں میں لٹنے والوں کو ملنا نہ دے کہہ رہا ہے، اور لوگ گاؤں کے کھانے کے چٹا خشک ان کو کھانے سے لٹنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

**(اب آپ آگے ملاحظہ کیجئے)**

”لیکن خشک ان ہرنی زانی مہمان ہے۔“ سو دارو اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔  
 ”خنے ڈوبوں کو نکالا جا رہا ہے وہ کسی نہ کسی کے مہمان ہی ہے۔“ ایک بوڑھا شخص بولا۔  
 ”لیکن یہ عورت ذات ہے اور مظلوم بھی۔ اس کا کوئی آگ چھپا نہیں بہا نائے ہوگا۔“ سو دارو باگاؤں والوں کا رویہ دیکھ کر نرم انداز میں بولا۔

”تم اس گاؤں کے کھیا ہو سو دارو با۔“ بوڑھا شخص جو منیر آدمی معلوم پڑا، مفاہمت لیتے میں بولا۔ ”نہن خون ہو چکے ہیں کیا یہ اتنا نہیں؟“  
 ”لیکن خشک ان ہرنی زانی ہے۔“

”بہ کوئی بات نہ ہوئی۔“ ایک خنے اور گول سردالا بندہ جس کے سر کے دو میان چوٹی تھی مخاطب ہوا۔ ”دوسروں کے فیصلے تو ہم بوڑھے سے راضی کرتے ہوئے گھر کی بات آئی تو تمہارے انصاف کا چٹا نہ نکل گیا ہے اگر تم اپنی بات متوانا ہی چاہتے ہو تو اس چھوڑی کے اپنے چھوڑے خشک ان کے ساتھ بھجے کر دارو۔“  
 ”ہاں۔۔۔ یہ بات البتہ دل کو گھنی ہے۔“ بوڑھے شخص نے دوبارہ گفتگو میں حصہ لیا۔



خشک ان گھرنی سوچ میں گم تھی۔ اس گاؤں میں رہنے کا حکم ناگ رہا تھا، جبکہ گاؤں والے اسے گاؤں سے نکالنے کے دوپے تھے! با پھر خشک ان سے اسے پھیرے لینے پڑتے ہیں جبکہ انسانی خون چٹا اس کی فطرت اور ضرورت تھی۔ یہ دارو اس نوردہ مسئلہ کوئی رہے گی! پھر اب کیا کیا جائے اس وقت وہ صحن میں پھٹی ایک چار پائی پر کھٹی تھی۔  
 ”پتھار۔۔۔ اس نے آہ زدی۔“

”جی مالکن۔۔۔“ پتھار فوراً اسے سامنے کھرا نظر آ یا۔  
 ”نوی کچھ بتا۔۔۔ کوئی مشورہ دے کہ اب میں کیا کروں، گاؤں چھوڑ دوں یا خشک ان سے پھیرے لے لوں۔۔۔؟“

”بیاہ کرنے یا نہ کرنے سے تجھے کوئی فرق نہیں پڑتا مالکن۔۔۔ پتھار کی خبر سے لے کر کوئی شہیت نہیں، بھرتی ہی ہے کہ خشک ان سے پھیرے لے لو اور حالات کا جائزہ لو۔“ یوں جھپٹ پٹ ہی گاؤں کے بندے اکٹھے کر کے پنڈت جی کو بلا کر شادی کی دوسرا ادا کر دئی تھی۔ اسی رات خشک ان کو لوڈ لکھن رو دیا کہ وہ اب میں آئے سامنے آگئے! خشک ان کو اپنے نصب ایسے کھٹنے کی نفعاً امید نہ تھی۔ وہ خشک ان کے آگے بچھا بچھا جاتا۔ اب وہ کام بھی کرنے لگا تھا اور والدین کا مطیع و فری بان برادر بھی ہو چکا تھا۔ لیکن خشک ان جو روانی مہارانی کے سزے لے چکی تھی، وہ خشک ان کے ساتھ کچھ کھٹا کو بر کیف نہ بنا سکتی تھی لیکن اس ماحول میں خود کو سمجھ سکتی اس کا سن بیاہل رہنے لگا۔ اسے بے چینی محسوس ہونے لگی اور پھر ایک دن اپنا تک

ایک ایسا واقعہ وقوع پذیر ہوا جس نے شکستہ کی گھبری ہوئی زندگی میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ ممکن جو اس کا بچی تھا ایک دن اس کو کسی انتہائی ذہیرے سانپ نے ڈس لیا۔ لوگ اس کی چار پائی کا دھوس پر اٹھائے جب گھر گھر پتو کھرام برپا ہو گیا! سندری اور اس کی ماں یہ سمجھ کر کہ وہ چکا ہے اپنا منہ سر پٹینے لگیں۔ ان کے تین کن کر شکستہ جتنی ٹھیک کرتی کمر سے سے باہر آئی تو ممکن میں خاصا رش ہو رہا تھا، ٹھوڑی دیر کے بعد اسے اہل صورتحال کا علم ہوا تو وہ دل ہی دل میں گھبرائی، کیوں کہ اسے دیکھتے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ ممکن کو سخت ذہیرے سانپ نے ڈسا ہے اور اگر فوراً طور پر کچھ نہ کیا گیا تو وہ مر جائے گا۔ لیکن شکستہ عجیب حالات میں آپہنسی کر رہی تھی اور فوراً طور پر ممکن کی جان بچانے کے لئے سانپ کو داپس بلائی ہے تو اس کے ناممکن ہونے کا راز فاش ہو جاتا ہے اور اگر خاموش تراشائی کا کردار ادا کرتی ہے تو بھی ممکن کی موت کی صورت میں اسے ممکن کی چٹائیں بٹھا کر تکی کر دیا جائے گا۔ دونوں صورتوں میں اس کی جان پر نکتی ہے اور اسے آگ میں جلا جاسکتا ہے۔ جوں جوں اس کی سوچ گھبری ہوئی جا رہی تھی اس کے ماتھے پر ایک پسینہ اور ہاتھ ایک پسینہ جا رہا تھا۔ اسی شکستہ میں خاصی دیر ہو گئی۔ ممکن کی چار پائی ممکن میں رکھی گئی تھی۔ یہ لکھ اس کا جسم نپلا پڑا جا رہا تھا، اس کی حالت بگڑ رہی تھی۔

اسی اثناء میں کسی کی زبانی ممکن کے باپ موراد باکو پتا چلا کہ گاؤں سے باہر سرائے رام چند میں ایک سپیرا گھبرا ہوا ہے فوراً بندھے دوڑائے گئے کہ اس سپیرے کو بلا لیں۔ شکستہ فوراً فکری کہ ہو نہ ہو یہ وہی سپیرا ہو گا جو کھڑا باؤنڈ کے کندرات میں اس سے نکل گیا تھا۔ دو خطرے جو اس نے سوچے تھے یہ ڈان سے بھی مختلف اور خطرناک بات ہو گئی اور چور دی ہوا جس کلاست خدشا تھا کہ روٹا یا اپنے چیلے کے ساتھ آ پانچا۔ آئے ہی اس نے ممکن کا ہنور معائنہ کیا۔

”کتنا سے بہت چکا ہے بی بی؟“ دو چار پائی کے پان کھڑی ان کی ماں سے مخاطب ہوا۔  
 ”مباراج کچھ کیجئے۔“ ممکن کی ماں ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی کہ سامنے کھڑی ہو گئی!  
 ”خاصی دیر ہو چکی ہے میرے اکلوتے بچے کو بچا لیجئے۔“

”مائی تم لوگوں سے بہت دیر کرنی کرنا تمہوں دوسرے بہت مشکل ہے۔ یہ کہتے ہوئے کہ روٹا بانے اپنے جھولا زمین پر رکھا اور تین ہونٹوں سے لگا لی اس کا چپلا بھی اس کی تقلید کر رہا تھا۔ اچانک کر ڈٹ باہری طرح چونک پڑا اور دراجھا بائیں دیکھنے لگا۔

”گیا بات ہے مباراج“ موراد بایاے کہ روٹا یا سے پوچھا کیوں کہ وہی تھی اور ممکن کا جسم آہستہ آہستہ نپلا پڑ رہا تھا۔  
 ”شش..... شش.....“ کہ روٹا یا سر سرائی ہوئی آواز میں بولا۔ تم لوگوں میں سے دو ممکن میں کھڑے تمام لوگوں کو بھر پور نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ کوئی ایک آدمی شش ناگ ہے اور با پھر تم میں سے کسی کے کپڑوں میں شش ناگ چھپا ہوا ہے مجھے بہت قریب سے اس کی بو آ رہی ہے۔

کہ روٹا یا کی بات سنتے ہی لوگوں میں کھلکی جگ مچی۔ سانپ کا خوف سانپ سے زیادہ ہوتا ہے لوگ بکھرنے لگے کہ مبارا ساتھ والا کھس ہی سانپ نہ ہو اور پھر اپنے اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے گھروں کو بھاگ نکلے توڑن ہی دیر میں موراد اور اس کی بیوی کے علاوہ صرف سندری اور شکستہ رہ گئے۔ کہ روٹا یا آہستہ آہستہ سب کے چہروں کو ہنور دیکھنے لگا، بلا کر شکستہ کے دستے چہرے پر اس کی نگاہ کر گھبر گئی۔ بڑی تباہی کیا لگتی ہے؟

یہ سب ہے ہماری۔ یعنی ہے اس بے یقینی کا، موراد یا ممکن کے نیم مردہ جسم کی طرف دیکھ کر حسرت سے بولا۔  
 ”ہوں.....“ موراد بایا ہوں کو کہا کرتے ہوئے شکستہ کے قریب آیا۔ اب شکستہ کو یقین آ گیا کہ بھانڈا پھوٹ گیا ہے۔ چلو جو ہو گا دیکھا جائے گا۔  
 ”بچی سانپ ہے.....“ موراد یا کہہ رہے نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا تو سب لوگ اچھیل پڑے..... ہیں۔  
 سندری ڈر کر اپنی ماں کے پیچھے ہو گئی اور باجیرت سے شکستہ کو دیکھنے لگا۔

”تو... تو ہی وہ موذی سانپ ہے جس نے اس اوجڑان کو ڈسا۔“ گردنڈیا غیر محسوس انداز میں شکستہ کی طرف بڑھا۔ اس کا چپلا اس کی آڑ میں ہو گیا۔

”ہاں.....“ شکستہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ میں سانپ تو ضرور ہوں، لیکن اسے ڈسا میں نے نہیں۔

”اے گھوٹلی... ختی نو... ختی پتی پرستی ہو جانی ہے اور تو اسے ہی کھا گئی! سات گھر تو ڈاکن بھی چھوڑ دیتی ہے۔“ گردنڈیا درشت لہجے میں بولا۔

دو باتیں یاد رکھ سیرے۔ شکستہ کے اندر کی ملکہ بہن اٹھانے لگی! میں نے سگن کو نہیں ڈسا اور نہ ہی تو مجھے ڈس سکتا ہے۔ جہاں دستہ تاب نہیں تو بچھڑانے کے لیے بھی وقت نہ ملے گا۔

میرا نام کر دیا ہے۔ سانپ کے بل پر ناک رکھ کر سانس کھینچوں تو سانپ باہر آ جائے، میرے ہاتھوں میں آ کر زہرے سے زہر ملا سانپ بھی رسی بن جاتا ہے اور زہر کر دینا یا کیلئے امرت ہے بھی نا بچھ۔

ن شکستہ بل کے اندر سے نہ تیرے ہاتھ ڈانے کی اور نہ تجھے زہر سے اردہ گی۔ بہتر یہی ہے کہ پہلے سگن کو کھجک کر دیا جائے تو اتنا بڑا سپیراجوگی ہے تو پہلے اس کی جیون ڈور بجا! با پھر پیچھے ہٹ جا میں بھالی ہوں۔

دشوں کی تہیا کے بعد ہاتھ آبا یہ موقع اب نہ ضائع کروں گا سگن چھوڑ پورا گاڑا میں جاتے۔ گردنڈیا نے بین مینوں سے نکالی اور سرعت سے اس کی خوب صورت لمے بکھیرنے لگا۔ اس کی بین کی آواز کچھ ایسی سحر انگیز تھی کہ ایک بار شکستہ اچھوٹنے لگا پھر اس نے سر کو زور سے جھکا کر بولی۔

”بھنگار...“

”جی ہاں...“ آواز ابھری۔

”اس ننگے کو ختم کر دو۔“

”جیسا تمرا حکم ہاں...“

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے گردنڈیا زور سے تپا پیسے اس کے جسم پر کسی تیز و حاد فوٹے ت اور کہا گیا ہو۔ ساتھ ہی اس کے پہلو سے خون کا فوارہ نکلا اور پھر گردنڈیا زور سے زور سے ناؤ بے خبروں کے وار شروع ہو گئے!!

اور دو دو تیرا وار بجائے اور گردنڈیا کے گھجوں میں جا۔ جگہ ت کنی چینی لاش سگن کی کھاٹ کے قریب پڑی تھی۔ اس دوران اس کے چیلنے نے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن شکستہ نے کچھ پڑھ کر انکی کا اشارہ کیا تو وہ اپنی جگہ گڑھیا اور باوجود کوشش کے اٹھ کر بھاگ نہ سکا جوں لگا پیسے اٹھیں وہ کبھی زنجیروں نے ات جگہ رکھا ہو۔ وہ دونوں کامستہ عمل ہو جانے کے بعد شکستہ چلی اور مندروی اس کی ماں اور سوراہا جو خوف اور حیرت کا جھمبہ بنے تھے، کی طرف دیکھ کر بولی جو پتھر دیکھو اسے بھولی جانا اور زور دیا اور بھاگنا نہیں ہے! سگن میرا بیتی ہے ان کی جان بھی میں بھادوں گی۔“

یہ کہہ کر شکستہ نے زور سے بھنگار ماری اور پیش نامن بن گئی اب وہ روح فرسا منترو کچھ کر مندروی تاب نہ لاسکی اور بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ نامن نے ہی شکستہ نے زور سے پھنگار ناسروں کو دیا اور درلوں کے ذریعے پیغام چھوڑنے لگی کہ میں سانپوں کی ملکہ ہوں جس کی سانپ نے میرے چنی کو ڈسا ہے وہ اپنے اور زہر ہوا جس چوٹی لے۔ اس کا پیغام من کر قرب و جوار کے کثیر انٹسل سانپوں میں پھیلنے لگی اور پھر تھوڑی ہی دیر میں ایک سیاہ کالا لساناگ بنتی لی تی تیزی سے واپار سے آترتا ہوا سگن میں اٹھیا اور اٹھنے ہی شکستہ بڑا انسانی روپ میں واپس آ چکی تھی، کئی قدموں میں اٹھنے لگا اور پھر سگن جس کھاٹ پر لیٹا تھا ان پر چڑھ کر ہنڈلی پر اپنے ڈسے ہوئے مقام پر بند کر دیا۔ تھوڑی دیر میں ساناہ ہر چوڑے کے بعد خود بھی ایک جانب لڑھک گیا اور پھر کھٹکے ہوئے انداز میں آہستہ آہستہ جلتا دوا چلا گیا!

شکستہ کو کہہ ہاتھ جمانے میں سارا منترو دیکھ دینی تھی۔ ناگ کے جانے کے بعد وہ سوراہا اور اپنی ساس کی طرف منسوب ہوئی اور بولی۔

”میرا ہم شکستہ ہے اور میں نیکڑوں سال کی عمر کی ہوں۔ سنا سانپ ہوں لیکن وہ بتی انسانی روپ میں بہوں۔ دم کر تا میری



فطرت نہیں، بچانے کیوں آپ لوگوں پر مجھے زس آ گیا تھا۔ شاید ان لیے کہ آپ نے میری جان بچائی تھی۔ گاڑوں میں بیٹنے  
 نقل ہوئے وہ بھی میں نے کے کہ خون اب درود بھی انسانی خون چنا میری سرشت میں شامل ہے۔ یہ میری خوراک ہے!“  
 سو راد اور اس کی بیوی بھی پھٹی پھٹی نگاہوں سے شدید شگفتگی کو دیکھ رہے تھے اسی اثناء میں گھن کو بوش آنا شروع  
 ہو گیا لیکن شگفتگی نے اس کے عمل بوش میں آنے کا اہتمام نہیں کیا۔

”چنگر.....“  
 ”جی ہاں.....“

”جلو اب اس گاڑوں میں ہمارا رہنا ممکن ہے!“  
 ”لیکن آگن آپ کو یہاں رکھنے کا حکم ہے۔“  
 ”لیکن اب یہاں ٹھہرنا ممکن ہو گیا ہے۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“  
 ”گردنڈا کے ان بیٹے کا کہا کرنا ہے آگن۔“  
 ”اس کو ساتھ لے چلو رائے میں اس کا خون میرے خون کی گرمی بڑھانے گا۔“  
 ”جو حکم سرکار۔“ چنگر رستنا بنا۔

☆.....☆

دلادور کی جب آنکھ کھلی تو اسے کچھ بھائی نرودے رہا تھا، البتہ تھوڑی ہی برہمیں آنکھ کے پردے پر مناظر ابھرنے لگے۔  
 کوشاری سامنے ہی تھا۔

”کیوں پتہ تھے عزت رائے نہیں آئی، کوشاری کے آگے تو ایسے ہی ہے جسے صحرا کے سامنے ریت کا ذرہ اور سمندر  
 کے مقابلہ نظر.....“ کوشاری سونے چاندنی سے مرصع تخت پر بیٹھا غرار اٹھا، جبکہ دلادور اس کے سامنے زمین پر پڑا تھا۔  
 اس کا سارا جسم پانی سے بھگا تھا اور خوب صورت کپڑوں میں ٹیوٹس ایک نازک سی اور شجرہ اس کے فریب کھڑی تھی۔ پاس  
 ہی گھڑا رکھا تھا، گاٹا لڑکی نے انی گھڑے کا پانی دلادور پر اتنا باغیا جس کی جیت ہے وہ بوش مند ہو گیا۔  
 ”آخری بار نیوی گستاخی پر تھے، معافی دے رہا ہوں! اس لیے کہ نے میرا وہ کام کہا جس کی جیت سے میرا جیون بچ  
 گیا، ورنہ اس شبیٹ جس نے میری موت کا مکمل سامان کر لیا تھا۔“ کوشاری پاس کھڑے راجہ ہرش داس کی طرف دیکھ کر  
 غرا پا چونک دھڑک بھاری کے عالم میں سر جھکانے لگا تھا۔

”آج میں اتنا خوشی مان ہو گیا ہوں کہ عام آدمی اور معمولی بڑ بھاری میرے آگے پانی بھرنے ہیں، اب میں اپنی  
 حکومت قائم کر رہا گا۔ انی لیے ان گل کو چلنے سے بچا۔ آج سے یہ گل میری ملکیتوں اور میرے کاموں کا مرکز ہو گا۔ یہ ہی  
 میرا دارالسلطنت ہے اور دلادور تم میرے نائب ہو اور یہ جن مبرا خاں کا نرندہ اور میرا سب سے مضبوط ہتھیار ہے۔“  
 ”آزاد جن زانوے۔“ کوشاری نے ہنسر ان کو حکم دیا، جو لوگ کے اندر جس کی شکل میں موجود تھا۔ کوشاری کا حکم سننے  
 ہی ایک زمانے دار اور اپنے پیدا ہوئی اور ہنسر ان کو سب سے باہر آ گیا۔ جس کو دیکھ کر کتیر سی، ہری داس اور دلادور برقی طرح  
 خوف زور ہو گئے! اب ہنسر ان کا سر کمرے کی چھت سے ٹگ رہا تھا! اس کی کر یہ شکل، یہ بھی نہ جانی تھی اس کے منہ سے  
 نیلے رنگ کا تھک باہر آ رہی تھا۔ اس کے منام بدن سے انتہائی گرم بھاپ نکل رہی تھی۔

”کجا حکم ہے میرے آقا.....“ ہنسر ان اب سے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا!  
 ”تمہارا نام کیا ہے؟“ کوشاری اپنے مکروہ جیرے پر خباث بھری مسکراہٹ سجا کر عنوت سے بولا۔  
 ”ہنسر ان میرے آقا۔“

”کس نسل سے تعلق رکھتے ہو اور کہاں رہتے ہو!“  
 ”میرا تعلق جنات کے قبیلہ آتھان سے ہے اور میرا اب ہنسر ان اپنے نیلے کا بادشاہ ہے۔“  
 ”یوں۔“ کوشاری پر سوچ لہجے میں بولا۔

”تو کس کا غلام ہے؟“

”کوٹھاری کا!“

”میرا حکم مانے گا؟“

”مانوں گا!“

”جو میں کہوں کرے گا؟“

”مکروں گا!“

”نیرابا پ ساتھیوں سمیت تجھے لینے آ جائے تو؟“

”اس سے توڑوں گا۔“

”شام!۔۔۔“ باور کچھ ہنسر ان آج سے تو میرے حکم کا غلام ہے، حکم عدویٰ کرے گا تو بھسم کر دوں گا اور دستو ہری راس نیری عیاشی کا دور لے گا، اب بیٹے جیون نوکتے کے، دوپ میں گناہے گا۔ یہ کہہ کر کوٹھاری نے کچھ پڑھنا شروع کیا۔ کافی درمیز برب بڑ بانے کے بعد اس نے دونوں ہاتھوں کی تمام انگلیاں ہری راس کی طرف کر کے جھٹکیں، نوٹاس کی انگلیوں کی پودوں سے سبار حواں نکلنے لگا جس نے ہری راس کو گھیر لیا۔ ٹھوڑی اور بعد حواں چھنا نھری راس غائب ہو چکا تھا اور اب اس کی جگہ ایک خار ش زد، کٹا کٹا تھا۔ کمزور اور سر بل کٹا جس کی ذم اس کی ٹانگوں میں صحنی بھی اب کرٹھا دی نے ہوا میں ہاتھ بلند کیا، نوٹاس کے ہاتھ میں ایک پتلی سی چھڑی آ گئی۔ کرٹھا دی نے چھڑی ہاتھ میں آتے ہی نکتے پر جو دراصل ہری راس تھا، شدت سے، ہوا میں شروع کر دی اور ہری راس نکتے کے دوپ میں جاؤں جاؤں کرنے لگا۔

ہری راس کا خوفناک حشر کہہ کر دلا دکان پ کر وہ گھا اور کتیر بی اپنے واپ کو بلنے د کچھ کرٹھا نھری راس نے اور وہ نے نگلیں نو کوٹھاری نے ہاتھ روک لیا اور چھڑی پھینک کر دونوں ہاتھ پھیلا کر کتیروں کی طرف بڑھا اور بولا۔ ”تم کتیروں روٹی ہو جان سن، تمہیں نو کوٹھاری سزا نہیں دے گا۔ نہ ہوا کوئی دوش نہیں۔ پہلے تم ہری راس کا سے سہا ما کرنی تھیں اور اب تمہیں کوٹھاری کا پھانسی مارا پڑے گا۔“

”اؤ۔۔۔۔۔ اؤ کتیر۔۔۔۔۔ بد نیر ذ اور آگے بڑھ کر اس نے دیکھتے ہیں کو ایک سا نھرا اٹھارے!“



گلگتلا ایک تیل چوڑی میں سوار آرام سے اپنی تھی۔ پینکا و گاڑی بان کے فرائض سنبھالے تھا، جبکہ کروٹہ پا کا چیلو گلگتلا کے سامنے سبھا ہوا، جتنا تک حسن کی سواری کو نکتے چار ہاتھ۔ شام کا وقت اور چتر بلا عا ن تھا، خٹک ہوا جل وہی تھی، جبکہ گلگتلا ٹھوڑی پھنسیوں رنگائے اسے مسکرائی لگا ہوں سے، یہ کچھ وہی تھی۔ کافی در ایسی عالم میں گزرنے کے بعد وہ حرکت میں آئی اور سر کی موٹی چیلے کے پاس پہنچی۔

”کیا نام ہے نیرا؟“

”بھئی۔۔۔۔۔ شرا۔“

”رہو کیوں ہو آؤ۔ تم جوان ہو میں حسین ہوں، دو م سہا ہے تو پھر یہ دوری کسی۔۔۔۔۔؟“

”بھئی۔۔۔۔۔ شرا بھلا کر وہ گیا، اس کا زہن شہنا کر رہ گیا!“

لیکن گلگتلا نے اسے مزید سوچنے کا موقع فراہم نہیں کیا اور اپنے نرم گداز، جو کے ساتھ اس کے اوپر گر گئی!

شرا اپنے پیسے ہو گیا!

گلگتلا کی پھر پورے عا ن اور شادابی بیچ و پھر کچھ کر شرا مز پ اٹھا۔ ان کے ہر دو خوفزدہ جذبات سلگنے لگے۔ سر سستی و سرشاری میں اضافہ ہوا، چلا گیا۔ جسوں کی اور پز ش ہر لھا آ سوگی کے قریب ہوئی چلا گیا ٹھوڑی ہی، وہ میں شرا بھی بند کے حے لے لگا، لیکن یہ مختصر زین خنداں کے جیون کی آخری بندھی کیوں کر اب اسے ابدی نیند سوا تھا، لیکن سونے سے پہلے اسے اذیت ناک موت کے ٹھلے سے بھی گزردھا تھا، ہو گلگتلا نے کچھ پڑھ کر ان پر پھونکا۔ اب شرا باز بدو حرکت نہ

کر سکتا تھا، لہذا کلنگستان نے بڑے سکون سے اس کی شدت گنول کر ہاتھوں سے پکڑی اور بھرتیزی سے ہاتھوں سے اسے اوجھڑے لگی۔ تکلیف کی شدت سے شرابی کی آنکھ کھل گئی، اس نے تیزی سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اندر اور دو تلوے تلنے سے بھی تھکا ہوا تھا۔ اور کلنگستان شرمگاہ کاٹنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ شراب کا جواں ابلتا گرم خون کھل کھل مگر نے لگا تو کلنگستان پر حیرانیت چھا گئی اور وہ لپ لپ شپ شپ کر کے خون زبان پر لینے لگی۔ شراب کلنگستان کا یہ روپ اور اپنی حالت دیکھ کر پورنی قوت سے جینے لگا، لیکن اس کی چیخوں کو چکار اور کلنگستان کے سوالوں و برانوں میں سننے والا کوئی نہ تھا۔ چکار کے انداز میں کوئی فرق نہ آیا اور وہ بدستور بیلوں کو ہانکنے میں مصروف رہا اور کلنگستان اپنی طمانیت سے خون پی رہی تھی۔ شراب اور سے نڈھال چیتھے چیتھے بے ہوش ہو گیا اور کلنگستان خون بننے کے بعد ہوش ہو گئی۔

تیل گاڑی چلتی رہی۔ رات گہری ہو گئی اور گہری اور گہری، جانے کون سا پہر تھا کہ کلنگستان کی آنکھ کھل گئی۔ تیل گاڑی رکی ہوئی تھی۔

چکار اس نے آواز دی۔ خاموشی..... مسلسل خاموشی.....

”چکار..... کلنگستان زور سے پکارنی، لیکن کوئی جواب نہ ملا۔“

کلنگستان بڑی حیران ہوئی اور حیرانی کے عالم میں اس نے سراخا کر دیکھا تو چکار نظر نہ آیا۔ اب اسے تشویش ہوئی! وہ تیل گاڑی سے اتر گئی۔ یہ ایک بے پرواہی تھا۔ وہی تھم کی چٹائیں جن پر چلنے ہوئے تیل گاڑی کھڑکی تھی۔ چار سو گرا اندھیرا تھا۔ آسان پرستارے روشن تھے! ہر طرف موت کی خاموشی طاری تھی کوئی عالم لڑکی ہوئی تو مارے خوف کے بے ہوش ہو جاتی لیکن یہ کلنگستان کی خوف جس سے ذرا تھا اہلہ و دو چوکی ہوئی اس کی حیرتیں جس سے خراب و رکڑنے لگی کہ کوئی خطرہ ضرور ہے ورنہ چکار اس طرح غائب نہ ہوتا۔

کلنگستان تیزی سے اوجھڑا اور دیکھنے لگی۔ ان دیکھے خطرے کا احساس بڑھتا چلا گیا پھر اپنی پشت پر کلنگستان کو کچھ جھک محسوس ہوئی اور عورت سے لٹی اور بھڑکنا بھڑکنا ہو گئی، دو دھیرا رنگ کی انتہائی تیز روشنی کا بولا تھا جس میں سے کہیں کہیں سر شاہ سبز آگ کے شعلے بھی نکل رہے تھے۔ یہ بہ لاکھنلا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک لمبے کلنگستان کارل اہمبل کر صلق میں آ گیا اس کے ہونٹ تلنے لگے، لیکن ہونٹوں کے تلنے ہی زراخ کی آواز آئی اور زور دار چانا کلنگستان کے گلانی گال کو سرخ کر گیا۔ گستاخ لڑکی..... یہ بھاری بھکم اور گرفت آواز شاید اسی ہولے کی تھی جس کا تھپتھرا تازہ دروار تھا کہ کلنگستان کو جہڑا ہلکا ہوا۔ ہوا۔ وہ شدت دار خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”ہم جانتے ہیں کہ تو کون ہے پر تو ہمیں چاہی کہ ہم کون ہیں۔ تو ہمارا نام لشکران ہے۔ ہم باپ ہیں لشکران کے۔“

لشکران ہماری اکلونی اولاد ہے۔ انسانی ہستیاں دیکھنے نکلا تھا۔ تیرے حسن کے چال میں گرفتار ہو گیا، تیری جدائی کے بعد وہ تمہیں ہی تلاش کر رہا تھا کہ ایک دن آج تک وہ لاپتا ہو گیا ہے! ہمارے تمن چکر ہے اس کا تمس غائب ہو گیا، ورنہ تمہیں ہر وقت اپنے تمن چکر میں اس کا تمس دیکھتے رہتے تھے! لیکن اب وہ لاپتا ہو گیا ہے! ایسے یقینا ہے کہ وہ کسی مصیبت کا شکار ہو گیا ہے!

اور اب ہم تمہیں حکم دینے ہیں کہ اسے تلاش کرو۔ وہ روئے زمین پر جہاں کہیں بھی ہے اس کو ڈھونڈ کر بسنی آستان جانے کا کہو اور اگر تم نے یہ کام نہ کیا تو یاد رکھنا ہم جنات ہیں تمہیں جلا کر خاکستر کر دیں گے!! بات کھل جوتے ہی لشکران کا تیل غائب ہو گیا اور پھر اندھیرا چھا گیا!

کلنگستان گہرا سانس لے کر دو بار دہیل گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔

اچھا تو یہ بیٹھی جس کی پہنچی اطلاع پا کر چکار بڑک گیا تھا۔

جنات کے آگے نہیں بے بس ہوں کلنگستان سوچنے لگی۔ لشکران کی تلاش کر رہی ہو گا وگرنہ زبان بجائی مشکل ہو جائے گی۔ چکار چنانچہ نہیں کہاں وفد ہو گیا ہے۔ کلنگستان اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے اٹھی اور بیٹوں کی رامیں سنبھال کر انہیں ہانکنے لگی۔ کافی دیر چلتے چلتے آ کر کھڑکی ہوئی تو اسے آوازوں کے آکر دکھائی دیے۔

یہ بڑی آبادی تھی چند سو گھر تھے جس کے شروع میں ایک بہت بڑا مندر تھا۔ مندر کے باہر وسیع میدان آدوں سے کھینچ بھرا تھا، یاد کوئی جشن یا میلہ تھا۔

شکستلا ایک درہان جگہ پر اتر کر انسانی دوپ میں آئی اور یہاں عورت کا روپ دھادے اور لباسا گھونٹ نکالے مندر کی طرف چل پڑی۔ کچھ لوگوں سے پوچھنے پر ات پتا چلا کہ یہ ایک چھوٹی سی رہاست تھا جہاں ہے۔ اس کے دلچسپ رانی گزشتہ دنوں ایک سوزی مرض کی شکار ہو کر درہانت ہو گئی اب دلچسپ کے لیے نئی رانی کا انتخاب ہوگا۔ اس مقصد کے لیے رہاست بھرت لوگ اپنی اپنی بیٹیوں کو لے کر آئے ہیں۔ ایک طرف نگے بیٹیوں میں ان کو بٹھایا جا رہا ہے۔ ان کے ساتھ آنے والے عزیز باہر میدان میں خوش بگبگوں میں مصروف تھے۔ اس بات میں ہوں بھی دلچسپ بڑا دلچسپ کی ایک رانی کے علاوہ ایک درہان جنگ داسوں کا انتخاب بھی ہونا تھا۔ رانی منتخب ہونے والی لڑکی کے روتا کو بطور انعام شہن گاڈاں شہنے سے اور لڑکی کا پتا باسر پرست ان بیٹیوں گاڈاں کا مالک اور بٹھا کر کہلانے کا حق دار بن جائے گا۔ اسی طرح جنگ داسوں کے درہان کو ایک ایک گاڈاں بطور دخلعت ملے گا اور ان کے دوپا بھی گاڈاں کے کلبا کے عہدے پر فائز ہوں گے اور ہر جنگ داسی کو جوئی، چاکر اور اسان ملتی تھیں، جبکہ رانی اس گل اور رہاست پر راج کرے گی۔ باغبات اور دھڑائی کی دوزخی، جیشن میں شریک ہر شخص کی خوشی کیوں کی بنی راج کو پسند آ جائے تاکہ ہارے نہ رہے ہو جائیں۔

شکستلا بھی جیسے چھپانے اس خیمے میں داخل ہوئی جہاں کلبا میں آنکھوں میں خوب سجائے نظارہ دکھانے کی سہولت پر بیٹھی تھیں۔ یہ ایک بہت بڑا مندر تھا اور خوب صورت خیمہ تھا۔ رنگ و بو کا ایک سلاب آبا ہوا تھا۔ خیمے کے اندر فرش پر قالین تھے تھے اور ہر کرسی اعلیٰ مرصع تھی اور ہر لڑکی کے آگے چھوٹی سی میز تھی جس پر مشروبات اور پھل رکھے تھے، جبکہ کھانا اور کنبہ بر کلباؤں کی خدمت گاڈاں کے لیے موجود تھیں۔ خیمے کے اندر گزرتی پھرتی بڑا اوقات غیر متعلقہ انعام کو خیمے کے دروازے سے ہی داخل ہوجا جاتا۔ شکستلا کو اسب دا بچھ کر اندر جانے سے نہ روکا گیا۔ درہانوں کرباں بھر چکی تھیں اور بہت سی اہلی خالی تھیں اور لڑکیوں کا ایک سلاب تھا جو خیمے میں گھسا جا رہا تھا۔ شکستلا نے جو اس وقت ایک عام دیہاتی لڑکی کے روپ میں تھی، خیمے کے درہان کو نے کا انتخاب کر کے ادھر ادھر لگا دوڑا، آہن بان کوئی آرمی نہ تھا، اور لڑکیوں اپنے خباہتوں میں کم تھیں، جبکہ کنبہ بر اور دھام کام کی بھاگ دوڑ میں تھے۔ کوئی شکستلا کی طرف منوج نہ تھا شکستلا پھل کر تانگن تھی اور پھر دوسری بھنگار کے ساتھ دو دو بارہ شکستلا کی لگن اب دو دیہاتی روپ میں نہ تھی بلکہ اس وقت خوب صورت دلہن بن چکی تھی اب اس نے دوبارہ گھونٹ نکالا اور درہان خرابا ملتی ہوئی سب سے آخری نظارہ کے ایک کو نے دانی کر سی پر بیٹھ گئی۔



کافی بر بعد راج کی سواری کی آمد کا اعلان ہوا۔ تقارے پر چوٹ پڑی، چوہا دانگاباٹ دہرانے لگے، ہر طرف پاپل بچ گئی۔ کوار باں پہلو بند لئے لگیں۔ راج کی سواری کہیں باہر ہی رک گئی، ٹھوڑی درہان کے بعد راج پور سے طمراق کے ساتھ خیمے میں داخل ہوا اور ایک طرف رکھے اپنے خوب صورت تخت پر براجمان ہو گیا اور ارد گرد کی مرصع کرسیوں پر دو پاری درجہ بدرجہ بیٹھے گلے لگیں دلچسپ کو کچھ کر شکستلا کے ارمانوں پر اس پڑائی کو راج کو کم از کم پسند کے پینے میں مضارہ دوڑا تاکہ سونا تھا کہ تو نہ باہر کو لگی ہوئی، سرخ زار رنگ سبازے کی مانند۔

شکستلا کی ضروری کارروائیوں کے بعد لڑکیوں کے درہان میں سے ایک ایک آدمی خیمے کے اندر بلا لیا گیا اب درہان اور لڑکیوں کی کھینچ کی گئی تو ایک لڑکی زباورنگی۔ اعلان ہوا کہ وہ کون سی لڑکی ہے جس کے ساتھ کوئی آدمی گھر کا نہیں آتا، نو شکستلا کھڑی ہوئی۔ وہ اس وقت سیاہ چادر میں سر سے پاؤں تک لپیٹ کر اور لباسا گھونٹ نکال رکھا تھا، جبکہ دیگر تمام لڑکیوں کی چادریں زرق برقی تھیں اور ان کے چہرے نما ہاں تھے، جبکہ شکستلا کی صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں بالی چہرے پر نقاب تھا۔

ادھر آؤ لڑکی، راجہ کرخت آواز میں اولا، نو شکستلا جھونے جھونے قدموں سے چلتی ہوئی راجہ کے صحن سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ راجہ بے کوشن نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔  
 ”جی شکستہ!“

”تمہارے ساتھ کوئی نہیں آیا؟“

”جی نہیں“

”کیوں؟“

”میں زمانے کی ٹھوکریں سہنے کے لیے اکیلی دنیا میں ہوں۔“

”کہاں رہتی ہو؟“

”جی کمز ماؤنڈ گاؤں سے آئی ہوں۔“

”کس کے ساتھ.....؟“

اپنے بھائی کے ساتھ آ رہی تھی کہ راستے میں، میں سو گئی جب آکھ کھلی تو دیکھا کہ تیل گاڑی ویران چٹانوں میں کھڑی تھی اور میرے بھائی کا کسی ڈاکٹرنے خون لپی لیا تھا۔“

کہاں ہے تمہاری سواری؟

جی شہر سے باہر چٹانوں والے راستے میں!

بھائی کی تھکائی ہوئی اور تھم پاور چلنے کے لیے یہاں آ گئی ہو؟ راجہ طنز یہ لکھنے میں بولا۔

”نہیں مہاراج، یہ بات نہیں.....“ شکستہ یا سیت بھرے لکھنے میں گویا ہوئی۔

بات دراصل یہ ہے کہ بھائی کے سوا اب میرا دنیا میں کوئی نہیں رہا تھا اور اگر میں بروقت یہاں نہ پہنچتی تو مقابلے میں

شرکت نہ کر سکتی اور یہ سنبھری موقع، اگر ہاتھ سے نکل جاتا تو میں پھر بھری دنیا میں اکیلی اور بے یار و مددگار رہ جاتی۔

تو گویا سہیں دشواں ہے کہ تم بطور رانی یا پلنگ وادی منتخب کر لی جاؤ گی۔

پلنگ وادی نہیں مہاراج آپ مجھے رانی بنائیں گے۔ شکستہ لگاؤ بھرے اعتماد سے بولی۔

”بہت خوب.....“ راجہ بے کوشن ہنستے ہوئے بولا۔ ”لیکن کیا اس تنہو میں موجود ہر حسینہ کی خواب دیکھ رہی ہے۔“

تو پھر ٹھیک ہے۔ شکستہ بولی پہلے آپ ان تمام میں سے اپنی پسند چن لیں پھر میں آپ کو اپنا کھڑا دکھاؤں گی.....

سب سے آخر میں۔“

ہمیں منظور ہے کیا..... پرنتو اگر تو پلنگ وادی بننے کے قابل بھی نہ ہوئی تو پھر ہم تمہیں اپنی حرام سرائے میں کئی تیرہ بنا کر

رکھیں گے اور پھر تو سارا چون حرام حویلی سے باہر نہ نکل سکے گی۔

ٹھیک ہے مہاراج شکستہ ادب سے جھکتے ہوئے اپنے قدموں چلتی ہوئی اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئی۔

اب تمام دو شیزائیں باری باری راجہ بے کوشن کے سامنے سے گزرنے لگیں۔ پہلی نظر میں راجہ کو جو پسند آ جاتی اس کی

طرف انگلی سے اشارہ کروتا وہ لڑکی ایک طرف ہو جاتی، باقی لڑکیاں اپنی جگہ پر بیٹھتی گئیں۔ ایک طرف ہونے والی

لڑکیاں کھلی چھتیں اور اپنی جگہ واپس بیٹھنے والی لڑکیوں پر اس پر جاتی۔ اس طرح تمام لڑکیاں گزرتی جاتی گئیں اور راجہ پسند

آنے والیوں کو الگ کرتا گیا۔

اب تمام تا پسند لڑکیوں کو پھیلی قطاروں میں رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھا کر اگلی قطار میں خالی کر دالی گئیں!!

اور پہلے مرحلے میں کامیاب لڑکیوں کو چاروں اتار کر ایک بار پھر راجہ کے سامنے آنے کا حکم ملا لیکن اب مرحلہ ذرا

مختص تھا۔ راجہ کی خاص دو کئیڑیں ایک ایک لڑکی کو باری باری راجہ کے ہمیں سامنے کھڑا کر کے اس کی چادر اتار کر اس کو ہر

زاویے سے ٹھہرا پھر اسے لڑکھوید وار کر دیتیں۔ اس عمل سے کئی لڑکیاں بری طرح شرمنا اور لجا کر جسم کو چھپوتی موٹی بنا لیتیں۔

تمام لڑکیاں قدرت کی مناسی کا شاہکار تھیں۔

دوسرے مرحلے کے اختتام پر کامیاب لڑکیوں کی تعداد تقریباً بیس رہ گئی اور باقی تمام کو بھی پھیلی قطاروں میں بٹھا دیا گیا۔



لیکن ابھی مسئلہ بننا کہ انتخاب صرف گیارہ کا ہونا تھا، جبکہ لڑکیاں تیس تھیں۔ اس ساری کارروائی کے دوران شکستہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔

ایک بار پھر تمام لڑکیوں کو پری پری ریلوے کے سامنے لایا گیا اور علی صاحب انہنی جہان پٹنگ کرنے لگے۔ آخر کار گیارہ لڑکیوں میں سے کسی کو نہیں مانی اور اپنی سسٹنوں پر بھادنی نکلیں۔ گیارہ لڑکیوں میں ایک دم کھل اٹھیں کہ کم از کم پٹنگ داسی تو ہیں ہی مگر انہیں اور اگر نشست نے بادی کی نوافی بھی بنا سکتی ہیں۔

اب شکستہ کو سامنے آنے کا حکم ملا۔

شکستہ ایک مرتبہ پھر اپنی نشست سے اٹھی اور ریلوے سے کچھ فاصلے پر آ کر کھڑی ہو گئی۔

”اب تقاب پوش سہنہ“ ریلوے نوڈ پر ہاتھ پھیرنے سے بولے۔

اب تو اپنا جلوہ دکھانے آئے آپ پر برا مانا ہے۔ کئی برس کا پروڈا اردو۔ ”رہنوی کئی برس آگے جو عین اور شکستہ کے سن سے لپٹا سا لڑا اور اتارنے لگیں۔

اور پھر..... ایک شعلہ جوالہ پکا..... جسے ہر طرف روشنی پھیلتی پڑی ہو..... فنام دو باری..... شامی ابا کار..... عوام اور دل بے کس..... رہنوی نے انگلیاں دو اب کر دی گئے۔

شکستہ کا نرم گداز سا لگا لگا ہی رنگ لے لیے، کسا کسا تن بدن..... نفس نہ ہو سکا، سہنہ سہنہ مٹھی مٹھی سلیمہ رقصیں، شامی کھسے شامی تاج، شامی پاشاک جیسے معرکی شہزادی..... جسے اپسر انزوی ہوا کاش سے.....

بے کس کن کو تو سدا بدھ ہی نہری۔ دلو..... جیسی راہ..... نوئی رانی ہی گی۔ بے کس کن کی شامی پر نوئی راج کر سکتی ہے۔ بے کس کن سے تا پنا انداز لے لے کھنوا گیا تو شکستہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی، اس سرخ و سپید کمال بھندہ بنا گئے۔ گھر پر ہاتھ رکھ کر شکستہ ہولے ہولے جا رہی اور کھوم گئی!

رہنے آئے گے بڑھ کر شکستہ کا مٹا مٹا ہاتھ تمام کر کوج کا حکم پڑے۔



شامی کا نوانے چل پڑا۔ یہاں سے چند ہی کوس دور شامی محل تھا۔ وہاں پہنچ کر شامی کی رسومات شروع ہو گئیں۔

دوسرے دن شکستہ ایک بار پھر رانی ہی کی مگر فنام لڑکیوں کو ریلوے کی پٹنگ داسیاں بنا دیا گیا۔

یہ ایک چھوٹی سی ریاست شامی تھی جو سرسبز پہاڑوں کے پٹیوں سے ایک وسیع و عریض رانی پر منسلک تھی جس میں ایک خوب صورت دربار بھی بیٹھا تھا۔ پٹیوں کی بہتات تھی۔ شمال کی طرف ایک لامتناہی پہاڑی سلسلہ تھا۔ جن کے پار سے نہارنی کا نظل مال اسباب لے کر یہاں سے گزرنے اور فنام بھرا کرنے تھے۔ کچھ مال یہاں فروخت کرنے اور اس کے بدلے میں پھل اور میوہ جات لے جاتے اور پھر آگے نکل جانے جسے کسٹن گزشتہ نغز یا نصف صدی سے یہاں کے ساہوکار سفید کا مالک تھا۔ یہ ایک قد امت پرست حکمران تھا۔ فوج برائے نام ہی تھی کہ اس کے گرد کوئی دشمن حکومت نہ تھی۔ یہ ایک غریب ریاست تھی جس کی آبادی چند ہزار ہی تھی۔

لیکن شامی محل کی مٹا مٹا رہائش محل تھا۔ عوام ہر طرح طرح کے حصول کا نہ تھے۔ عوام غریب نہ جبکہ شامی خاندان پیش رو عسرت کی آسودہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ ریلوے بے کس کن کا ایک ہی جوان، بنا پر شاہ تھا جس کی باب کے ساتھ نفعاً نہ تھی مگر کیوں کہ اس کے خیال میں اب بے کس کن چونکہ بہت بڑھا ہوا چکا ہے لہذا اب اس کو رام رام کرنا چاہیے اور راج گدنی چھوڑ دینی چاہیے، لیکن بڑھاپے کسٹن صاحبات ریلوے رہنا چاہتا تھا۔ وہ ملان کرتا تھا کہ تخت تاج اگر اس نے چھوڑ دیا تو اس کی دھت کم تر ہو جائے گی! اور پھر پشاور ایک صحت مند ٹھکانہ جالے بالوں والا تخت کچھ جوان تھا۔ ریلوے اس کی ستاری بڑھی ریاست دن گزرتے ہی راجگدنی اور پ سے کی ہوتی تھی۔ اور اب ایک سازشی لڑکی تھی۔ وہی ہر وقت راجگدنی پر شاہ چینی اپنے بیٹی کو اگلائی رہتی کہ باپ سے راج گدنی حاصل کر لو کہ میں رانی اور ریلوے بن جائے۔ بے کس کن کے پاس عوام کی بھلائی کے کام کرنے کو بے شک رقت نہ تھا لیکن سخت تاج کو محفوظ رکھنے کے لیے روز باری اور امرا کو اپنا حلیف بنا کر

رکھتا تھا۔ یہی بوجھ تھی کہ پرشا وہاں سطلے میں ابھی تک ہے۔ بس تھا اور بے کشن کی حکومت پر گرفت بڑی مضبوط تھی۔ تاہم شاہی گل کے ایک بڑے حصے پر پرشا دار اور بک کا حکم ہی چلتا تھا، کیوں کہ بے کشن کی پہلی رانی خاصا عرصہ بیمار رہنے کے بعد پولوک سدھار چکی تھی اور راجہ بے کشن راج پاٹ کے کاموں میں مصروف رہتا تھا، لہذا ارپ کا شاہی گل میں زبردست اثر و رسوخ تھا۔ سرکاری انتظام اور عدلیہ کے لوگ جانتے تھے کہ آنے والے دنوں میں ارپ اور پرشا ہی حکمران ہوں گے، کیوں کہ پرشا رانی عرصہ سے دلی عہد مقرر تھا۔

شکستلا وہیں بن کر رہی تھی۔ ارپ اسے دیکھنے اور بدھائی دینے کے لیے پورے شاہی اعزازات کے ساتھ روانہ ہوئی۔ چوں کہ رشتے میں شکستلا ارپ کی ساس بن گئی تھی، لہذا رسم کے مطابق ارپ کو اس کے جن چھوکر باعدارائی کا اظہار کرنا تھا۔ ارپ پہلی بار شکستلا کے سامنے آ رہی تھی۔ دل ہی دل میں وہ سوچ رہی تھی کہ چونکہ شکستلا ان جوان ہے، لہذا اسے پہلی ہی ملاقات میں زبردستی کے وہاں لے جا کر آئندہ اسے سرفشانے کی تہنیت نہ ہو اور بے کشن کی موت کے بعد وہ رانی رہنے کا خیال کن سے کھرچ وے۔

شکستلا ارپ سے بے کشن کی محبت سے ذہنی طور پر خوش نہ ہوئی تھی۔ بے کشن اپنی طبعی زندگی گزار چکا تھا۔ ختام وقت وہ اپنی جوانی اور اختیارات کی سچی اور شکستلا کے حسن کی تعریف کرتا رہا۔ اپنی تعریف سننا شکستلا کے لیے نیا تھا۔ وہ کوئی چھوٹی سوتلی کہنا نہ تھی، زمانہ شاہنشاہ گھاگ عورت بن چکی تھی۔ البتہ ایک بات جو شکستلا نے برقی طرح محسوس کی تھی وہ یہ کہ بے کشن اپنے بچے اور بوسے خوف زدہ تھا اور شکستلا کو بھی ہر امت کر رہا تھا کہ ان سے چھبڑ چھا کر ان کے لیے ضرورت نہیں۔ شکستلا اس کی باتوں میں کرسکر رہی تھی۔ پہلے تو وہ شاید وہیں نہ وہی لیکن اب اس نے کچھ وقت خوش گوار گزارنے کا ارادہ کر لیا۔ اس کا کیا تھا یہاں سے نکل کر کئی جگہ جاسکتی تھی۔ البتہ یہاں آ کر اسے ایک بار پھر بتانا اور وہاں کے اختیارات بار آگے لے کر یہ بتائیں وہاں کہا کر رہی ہوئی البتہ حکمران کہاں ہوگا۔ اسے تلاش کرنا بھی ضروری ہے، اور نہ حکمران کی فوت اور اس کا پھیرا سے باوجود۔ ساسری جی کہاں ہوں گے۔ ایک بار بتانا ضرور چاہوں گی۔

ارپ آداب بکتی ہے رانی ماتا۔ "آواز سن کر شکستلا کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹا۔ اوہ باؤ کہ وہ رانی بن چکی ہے اور گرد و کنبہوں، غلاموں کا ہتھکانا لگا ہے اور وہ شاہی جھبہ کھٹ پر بیٹھی ہے۔ اس نے آہستگی سے سر اٹھا کر اسے سامنے شاہی پونٹاک میں ایک حسین و جمیل لڑکی جو کہ ارپ تھی، آؤ کھڑے پایا۔ اس کے ساتھ نوکروں کی ایک کوچ نظر موج بھی تھی۔ ارپ کی رنگت سائوئی لیکن ہلا کی کشش رکھتی تھی۔ گھنبرے سیاہ بال بھی خوب صورت تھے۔ لیکن سب سے بڑھ کر اس کے چہرے پر اس کی سبزی مائل بڑی بڑی ٹٹائی آنکھیں تھیں جنہیں وہ بار بار تیز تیز جھپکاتی بہت جلدی تھی۔ قد و قامت اس کا زبا دودھ تھا جبکہ بھی وہ پتلو تھی۔ لیکن آواز اس کی سرلی اور خامسی بلندی۔ چہلوں اور زورات کی بہت شوقین معلوم ہوتی تھی، کیوں کہ ہاتھوں، پیروں، گلے اور کانوں میں بھاری زورات کے علاوہ سر پر ایک ہالے کی شکل میں سرخ گلاب سجائے تھے۔ اسی طرح کھانیاں بھی سرخ گلابوں سے بھری تھیں۔ وہ ایک مکمل راجکارانی ہی تھی۔ لیکن شکستلا نے جب سر اٹھا کر اس کا رویہ جیسا حسن و کجیہ کہ ارپ آکھیں جو کچھ بھول گئی اور بھٹی نظر نہیوں سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کے ہمہ رنگان میں بھی نہ تھا کہ اس کی ساس اس قدر حسین ہوئی کہ اس کے سامنے وہ خود ماند پڑ جائے گی، لیکن پھر فوراً ہی سنبھل گئی۔

"آواز اور۔۔۔ تم کیسی ہو؟" شکستلا نے جان بوجھ کر نرم کا صیغہ استعمال کیا۔

"نہک ہوں رانی ماتا۔" ارپ نے طو باؤ کر بائیں کے پاؤں چھوئے ہوئے کہا اور پھر فوراً تمام غلاموں، کنبہوں اور اہلکاروں کی طرف دیکھ کر اوچی آواز میں ٹھکانا بولی۔ سب لوگ باہر چلے جاؤ اور کوئی اندر نہ آئے پانے۔

ایک اپیل بچ گئی۔ اور انہوں میں کمرہ خالی ہو گیا۔ شاید یہ سب ارپ سے بہت خوف زدہ رہنے تھے۔ سب باہر جا چکے تھے۔ اب ارپ کے چہرے پر ایک دلچسپ اور دوا دینا بخاری لہاس کھینے فرش پر کھینچی ایک مسرتی پر شکستلا کے سامنے بیٹھ گئی۔ دونوں سنبھلیاں اپنے پھیلے جانب مسرتی پر لگا کر اس نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بلا تا شروع کر دی۔

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



اور گلشنکا کے چہرے پر نظر میں جما کر طے یہ اور پر غرور انداز میں بولی۔ سنو گلشنکا ہم تن گڑھ کے راجہ کی بیٹی اور ہے کشن کے بیٹے اور شادوہنی کے ولی عہد پر شاہاوی مہتی ہیں۔ شادوہنی کی ہونے والی رانی اور سو جو دران کماری بھی ہیں۔ ہمارا تعلق شاہی خاندان سے ہے۔ تمہارے بھائی کے بیٹے کسی بیٹے کی ذات کی ہوتے ہوئے بھی شادوہنی کی رانی بن گئی ہوں۔ لیکن یہ سب غماضہ بات تمہارے لیے صرف بے کشن کے جیون تک ہیں۔ بے کشن ایک موذی مرض میں مبتلا ہے اور کسی بھی وقت مر سکتا ہے۔ اس کے مرنے ہی پر شاہ اور لجا اور ہم رانی بن جائیں گے۔

شاہی محل کے تمام راجائی تو ہماری انگلی کے اشارے پر آتے ہی ہیں لیکن پھر پوری ریاست پر صرف ارپ کا حکم چلے گا۔ نہ صرف شاہی بلکہ تن گڑھ میں بھی، کیوں کہ ہاں کا راجہ بھی ہمارا باپ اور ولی عہد ہمارا چھوٹا بھائی ہے! اگر کسی جیون گزارا جانتی ہو تو اس بند کمرے میں ہمارے پاؤں پر سر رکھ کر ہماری نظلی میں آ جاؤ۔ بظاہر ہم جسہیں رانی مانتا کر کے تمہارا ادب کیا کریں گے لیکن تمہاری میں جسہیں ہماری جوتی کے ٹکڑوں سے نیچے بیٹھا ہوا گا۔

اگر ایسا نہ کرو گی تو بے کشن کے مرنے ہی ہم رانی بن کر سب سے پہلے تیرا چہرہ جلا کر جسہیں بد صورت اور اندھا کروانے کے بعد تیرے ہاتھ پاؤں توڑ کر کسی بازار میں بھیک مانگنے کے لیے پھینکوا دیں گے۔  
 ”بولو جسہیں کیا پسند ہے؟“ یہ کہتے ہوئے ارپ انتہائی تحقیرانہ انداز میں گلشنکا کو دیکھتی رہی اور بائیں گھٹنے پر رکھی تا تک رکھ کر ہلائی رہی۔ گلشنکا چپ چاپ بیٹھی رہی اور تصور بھی نہ کر سکتی تھی کہ یہ وہاں پان ری را بنگلاری اس قدر سخت رویہ پنانے کی۔ لیکن گلشنکا کو تو رانی وی تھا۔ ارپ نے اس سے روٹوک بات کی تھی۔

☆.....☆

اگر میں اس کا حکم نہ مانوں تو بھی یہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اس کی حیثیت میرے سامنے بہت معمولی ہے! پر تو اس کے ساتھ مل کر دیکھتی ہوں کہ یہ ہے کیا چیز اور اس کے لیے ہاتھوں کی پہنچ کہاں جا کر ختم ہوتی ہے اور یہ ہے کشن کو تخت سے اتارنے کے لیے کیا سازش تیار کر رہے ہیں۔ چلو جب تک سامری، جسکر ان اور چنگا رکا کوئی سراغ نہیں ملتا تو ترجیح ہی کرتی ہوں۔ سوچ عمل ہوتے ہی گلشنکا اٹھ کر ارپ کے قدموں میں بیٹھ گئی اور پناہ اس کے جوتوں کے ساتھ لگا دیا۔

را بنگلاری کی ہاتھ کی رکھاؤں سے میں حضور کی ساس تو بن گئی ہوں مگر اتنے کی گلیس میری کم ذات ہونے کی چٹلی کھاتی ہیں۔ آپ سسل اور سسل شاہی خاندان کی چشم و چراغ ہیں۔ منہ میں سونے کا نوالہ لے کر پید ا ہوتی تھیں۔ جہاں سے آئی ہیں وہاں بھی را بنگلاری جیسے یہاں بھی را بنگلاری ہیں، آنے والا ہے یہ بھی آپ کے رانی بننے کا اعلان کر رہے ہیں اور میں کیا کہیں خاندان سے اٹھنے والی بد بو ہوں.....“ قریب المرگ دلچ کی چٹنی بنا صرف اس لیے قبول کر لیا ہے کہ غربت سے چھٹکارا پاسکوں۔ یہاں پہنٹ بھرنے کے لیے کھانا، رنے کے لیے عالی شان چھت تو میسر آنے کی۔ میر اور حضور کا کیا مقابلہ آپ راجہ بیجوت میں لنگوا تلی..... میں چھٹکی آپ ڈھنڈھ ہیں۔ آپ کی شان و شوکت آ کا ش چٹنی بلند میری بیستی پاتل سے بھی گھری..... حضور جیسا کہیں کی میں ویسا ہی گروں کی۔ بس مجھے دھکا دے گا نہیں..... میرا رانی میں کوئی نہیں ہے۔ گلشنکا زار قطار رو رہی تھی اور ارپ غرور سے گردن بلند کیے اپنی کامیابی پر بازاں اور شاہاں ہو رہی تھی۔

”اٹھ کھڑی ہو جا۔“ ارپ نے شان بے نیازی سے کہا۔ تو گلشنکا آٹسو ڈھکا کرنے کے انداز میں باؤب کھڑی ہو گئی۔ سنو ہمارے تمہارے بیٹے ہونے والی گلشنکی بھیک بھی کسی کے کانوں میں پڑی تو ہم تم پر کوئی گھناؤنا اثر ام لگا کر اس سے پہلے کہ راجہ کو پتا چلے تمہیں بائیں کے پاؤں تلے کھوا دیں گے۔ پورے محل میں ارپ کے فضا کے بنا کوئی آکھ بھپکا نے کی جرات نہیں کر سکتا۔ بے کشن صرف ہم کے راجہ ہیں۔ تمام فیصلے پر شاہ اور ہم کرتے ہیں۔ ارپ سینتاتن کر بولی اور یہ بات بھی یاد رکھنا کہ اس و چار میں نہ رہنا کہ تم کچھ عرصہ بعد یہاں قدم جما کر بھگ کر کے قابل ہو جاؤ گی۔ ارپ نے بھی گویا نہیں سمجھیں۔ تمہارے ارد گرد رہنے والی باندیاں اور کثیروں میں اکثر میری ہی بھگ خوار ہیں اور تمہاری ایک ایک حرکت کی مکمل رودار بھگ تک ہر بات کو اور ہر جگہ کو فحش جایا کرے گی۔ جا بے تم جتنی مرضی راز و راری برت لو۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ جہاں ہی ہوں کہ پورنی کوشش کے باوجود بے کشن سے گزری رات کچھ نہ ہو سکا اور

تہیاری انگلیوں پر بھی اسی پڑ گئی ہے، لیکن تم چٹان کرو اگر ہمارے سامنے دم ہلانے کی عادت بال لوگی تو تمہارا یہ مسئلہ بھی حل کریں گے۔ اروپ معنی خیز انداز میں مسکراتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی..... اور پھر ایک جھٹکے سے لباس کی سٹوٹس درست کرتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئی اور ٹھٹکا مسکرا کر گھر کے سانس لے کر درگئی۔ ”تمہارے ساتھ درگروں کی شہزادی“ ٹھٹکا زرب لب ہوئی۔

”جواریہ کے ساتھ بھی نہیں کیا“ ٹھٹکا کے لہجے میں یہ کہتے ہوئے سفایا کی آواز آئی۔

☆.....☆

جے کشن ٹھٹکا جیسی رانی پا کر پھر سے جوان ہو گیا تھا۔ ٹھٹکا کا قیامت خیز سراپا بے کشن کو دنیا بھلا دینے کے لیے کافی تھا۔ ٹھٹکا نے حالات کو عملی بخینے کے لیے ایک ہی ہوئی شرمیلی بیوی کا کردار ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔ جے کشن اپنی بہو کے جارحانہ عزائم سے واقف ہونے کے باوجود اس کے مضبوط میکے کی وجہ سے ڈرتا تھا۔ جبکہ جے کشن کا بیٹا شادھی اپنی بیوی اروپ سے دھتا اور اس کے اشاروں پر چلتا تھا، یوں پورے محل میں اروپ وندنا تھی پھرئی۔ ہر شعبہ میں ٹانگہ اڑا اور زرا تا رہا کھانا اس کا شوق در مشاغل تھے۔ دن چڑھے تک وہ سوئی راتی اور پھر سہ پہر سے لے کر شام ڈھلے تک سوجالی اور شام کے بعد وہ ملازمت اور کینٹروں غلاموں کے کاموں کی پرتالی شروع کر دیتی اور رات گئے تک سخت گیری سے پوچھ چھ کر لی اور تمام لوگ اس کی سزا کے ذرے سے جاملے رہتے، جبکہ صبح اروپ کا تمام لوگوں کے لیے حکم تھا کہ طلوع آفتاب سے قبل کام پڑا جائیں، اس کی ان غیر منصفانہ حرکات سے تمام لوگ مجبوراً روتخت ٹنگ تھے۔

ٹھٹکا کو چند ہی دنوں میں اس کی تمام حرکات کا پتا چل گیا! غیر عسوی طریقے سے ٹھٹکا نے اروپ کی جانب سے فراہم کردہ کینٹروں کو اپنے سے دور کر دیا اور اپنی خدمت کے لیے اپنے ساتھ منتخب ہونے والی پبلک داسیوں کو رکھ لیا تھا۔ ان میں سے آدھی دن کو اور کچھ رات اس کی خدمت کرتیں اور پھر واپس اپنی حویلی چلی جاتیں کیوں کہ وہ عام باندیاں نہ تھیں بلکہ راجہ کی چنگ وایساں تھیں جن کو باقاعدہ حویلی اور ملازمت ملے تھے..... صرف رانی کی خدمت بارہجہ کے پہلو کو گراہان کا کام تھا۔

چھکار ہوتا پھر تو ٹھٹکا کو کچھ مشکل نہ تھی لیکن اس کی عدم موجودگی میں اروپ کی سرگرمیوں کا پتا چلانا ٹھٹکا کے بس میں نہ تھا، جبکہ سائب بن کر وہ اس کی حدود میں جانا نہ چاہتی تھی کہ سارا دیکھیں ارجنن والا انعام نہ ہو جائے، پھر یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ بھی نہ تھا جس کے لیے درجان جو کھوں میں ڈالتی پھرئی۔ درتو محض تفریحی طبع کر رہی تھی، لہذا اب کے اس نے زبانت سے کام لینے کا ارادہ کر لیا تاکہ رتی درزش بھی جا رہی ہے۔

ادھر پرشاہ جو راجہ جے کشن کا سگا بیٹا تھا اس نے جب ٹھٹکا کو دیکھا تو دھک سے زر گیا۔ یہ تو اروپ سے بہت خوب صورت اور فخری تھی۔ کسی طرح سے اس کا سے اس کیسے کا دل نہ چاہا لیکن اروپ سے بے نیکی وجہ سے اس کے سامنے دل پر پتھر رکھ کر ٹھٹکا کو رانی ہاں کہتا، لیکن اس کے غلوں کے درپن پر ہوس کی دراز آٹھ گئی۔ درہر ہانے ہانے سے ٹھٹکا کے گھر سے میں آنے لگا۔ ادھر ٹھٹکا بھی اس کی نگاہوں کا سوال بوجھ چکی تھی بس پھر کیا تھا؟ یہ کیسی ٹھٹکا کے لیے نہ تھا۔ مرد کی رُپ رگ سے وہ واقف تھی۔ چند ہی دنوں میں سوچ بچار کے بعد اس نے عشق و سستی کی بساطا بچھانے کا فیصلہ کر لیا اب میں دیکھتی ہوں اروپ کہ تیرا اروپ زباز سے یا ٹھٹکا کے چلو سے مہمان ہیں۔

لیکن ان تمام باتوں سے پہلے ٹھٹکا کے لیے ایک کام جو بہت ضروری تھا اور تھا انسانی خون کا حصول، کیوں کہ حویلی پہاس بچھائے اسے خاصے دن ہونے کے تھے اور اب وہ بے تاب ہو رہی تھی لیکن سارا دن مبارکباد دینے والوں اور کینٹروں اور غلاموں کا رش اور رات کو راجہ جے کشن کی موجودگی کی وجہ سے اسے موقع نہ مل رہا تھا، کیوں کہ جے کشن کو نیند بہت کم آتی تھی۔ اسے بے خوابی کا مرض بھی ملا تھا۔ ساری رات وہ رکتی وجہ سے کھانا نستا اور جاگتا رہتا، بعض اوقات تو اس کی کھانسی اتنی شدید تھا کہ رانی کے ٹھٹکا کو گمان گزرتا کہ بڑھا بھی پار ہو جائے گا۔

ٹھٹکا اس وقت اپنی مسہری پر یعنی آرام کر رہی تھی اور چنگ وایساں اسے مورچل جمل رہی تھیں۔ ایک اس کی



تاگم۔ دائے میں مصروف تھی، اچانک ٹھٹھکا کر کمرے کی چھت پر ایک طرف دائرے کی شکل کا سوراخ دکھائی دیا جس میں لوہے کی چالی لگی ہوئی تھی اب جو اس نے خود کیا تو کمرے کے چاروں کونوں میں ویسے ہی چھوٹے چھوٹے سوراخ ہیں۔ فالٹار دھنی اور بوا کی آمدورفت کے لیے بنائے گئے تھے۔ اب نوبہا باہر جا کر خون کا حصول آسان ہو گیا ہے۔ اس نے تمام کتیزوں کو خرابی طبعیت کا بہانہ بنا کر کمرے سے دھشت گردا با دو حکم دیا کہ کوئی اندر نہ آنے پائے۔ رانی تھک جاتی ہے۔ خیالی ہوتے ہی اس نے اندر سے کواڑ بند کر لیے اور ذرا ہی ایک چھوٹے زہریلے سانپ کی شکل میں آئی اور چھت کی طرف بڑھی، لیکن اس اثنا میں چند لمبی چلی چھین سائی دیں جو چھت کی طرف مت آئی تھیں۔ ٹھٹھکا یزنی سے دوپاؤ پر پڑھا کر چھت کی اندرونی سطح پر لٹکنی ہوئی سوراخ تک آئی تو اسے چھت پر کچھ لوگوں کی بانوں کی آواز آئی۔ درود واچھت کے اوپر آگئی تو فو واہی اس کی چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا اور وہ اچھل کر دو باہر گئی اور اگر وہاں نہ مرنے کی تو ان لاشوں کی زد میں آ جاتی جو بیک وقت اس پر برسائی گئی تھیں۔ ٹھٹھکا بکدم سنبھل گئی اس نے دیکھا کہ چار آدمی ہاتھوں میں لاشیاں اٹھائے اس کی طرف لپک رہے ہیں۔ اب ٹھٹھکا نے جان بچانے کے لیے انجانی بھرتی سے اچھل کر دھڑک کر رہی اور پھر دواؤں گیتے ہی ایک آدمی کے ہاتھ کا نشانہ لے کر پورے زور کے ساتھ ان کے منہ پر جا لگی۔ ٹھٹھکا کا زہرا نا شدید تھا کہ وہ شخص نورا بو کر گر اور گودنے ہی نیلا پڑ گیا۔ اس کے ناک اور منہ سے نیلی جھاگ نکلنے لگی اور آٹھ کھینس چھرا کھینس اور ٹھٹھکا میں اس کا دجو ختم ہو گیا۔ اس کے سر نے ٹیک ٹھٹھکا دوسرے شخص کو ٹھٹھکا کر پھینکی تھی اور جلد ہی تیسرے آدمی کی دوح بھی زہر کی مدد سے نفس غصرتی سے پرواؤ کر گئی تو چوٹھا آدمی ٹھٹھکا کی وسیع چھت پر ٹھٹھکا کو دوسری طرف سر پہن دو زنا نظر آجا۔ ٹھٹھکا برن رفتار کی سے اس کے پیچھے لپکی اور دھنسنی ہی در در سے جا لیا۔ ان کے عین سامنے جا کر ٹھٹھکا زور سے پھنکارنی اور رانی بن گئی۔ یہ منظر دیکھ کر اس شخص کی ٹھٹھکا بند گئی۔ اب ٹھٹھکا بر سکون ہو چکی تھی اور کمر پر ہاتھ رکھے ان کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی اور بولی جھانکے کی کوشش میں نہار ا انجام بھی ساتھ ہی کی طرح ہوگا۔ جیون بھکشا چاہتے ہو تو جی جی تیار تم کون تھے اور تم نے حملہ کیوں کیا؟ جواب میں اس شخص کے صرف ہونٹ کانٹ کر رہ گئے۔ در اتنا خوف زور ہو چکا تھا کہ اس کے ہونٹ اس کا ساتھ دینے سے فاصلہ تھے۔ اس کی حالت دیکھ کر ٹھٹھکا اسکرانی اور دھنسنی ٹھٹھکا ہوئی ان کے قریب جا پہنچی۔ گھبراؤ نہیں، کچھ نہیں کہوں گی صرف میری بانوں کا تسلی بخش جواب دے دو۔ ٹھٹھکا کا روہر کبہر کر اس کی حالت نذر سے بہتر ہوئی تو ٹھٹھکا اس کے بالکل قریب ہو گئی۔ اتنے قریب کہ اس کی سانس اس شخص کے منہ پر آنے لگیں! ٹھٹھکا نے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیے۔

دیکھو! ٹھٹھکا اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ میرے سوا میں کا جواب درست دے گے تو جانے دوں گی روز اپنے ساتھیوں کا حشر تو تم نے دیکھ ہی لیا ہے! میں ایک جاوہر گری ہوں جب ماہوں جو مرضی دوپ اختیار کر لوں لیکن ہوں بہر حال میں ایک عورت اور وہ بھی جوان۔ ٹھٹھکا نے اس کا خوف کم کرنے کی غرض سے سانپ کا ذکر نہ کیا تھا۔ اور یہ جہ خاصا کا ڈر ثابت ہوا۔ کیا؟ کیا؟ کیا؟ ٹھٹھکا نے اس کو کئی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”امت.....“ اور بھٹکل ہوا۔  
 ”کیا کمرے سے تھے یہاں پر.....؟“  
 ”آپ کی عمرانی!“  
 ”کس نے بھیجا ہے نہیں؟“  
 ”وا بھلا میری ادب کے حکم سے ہم آئے تھے۔“  
 ”کب سے کھڑے ہو!“

”جب آپ نے تمام کتیزوں کو کمرے سے نکالا تو نیا اور پھانپانے جھاگ کہا وہ اب جی کا اطلاع کر دینی تھی کہ آپ نے سب کتیزوں کو کمرے سے باہر نکال دیا ہے تو ادب جی نے ہمیں فو واچھت سے آپ کی عمرانی کا حکم دیا۔ ہمارے دیکھنے

ہی دیکھتے آپ سانبہ بن گئیں اور چھت کی طرف آئیں تو ہم نے لاضیاں اٹھائیں۔  
 ”ہیوں.....“ کھٹکھٹا سوچ میں پڑ گئی۔

”تم کس جگہ کام کرتے ہو؟“  
 ”ہم کھوٹی ہیں۔ راجکھاؤ اردپ کے۔ وہ جہاں کہیں ہیں وہیں دفن خاٹے کے بغیر وہاں پہنچا پتا ہے۔“  
 ”اب تمہیں چھوڑ دیا جائے تو اردپ کو جا کر کیا کہو گے؟“

جو آپ کہیں گی وہی جا کر کہہ دیں گا۔ رانی جی اپنی بات کھٹکھٹا کھٹکھٹا کر نہیں پڑتی۔ بے نوم نم بڑے خوب صورت ہوا در پھر پورے جوان بھی۔ میں جا دو گئی ضرور ہوں لیکن ہوں تو جو ان لڑکی ہی نہیں لڑکیہ کہ میرا جی چلے اٹھا ہے۔ جے کشن تو بوزھا کھوسٹ ہے کہ کھونٹ جوان اور حسین ہوا لہر بہ باور کھوکھوکھو جا رہی ہوں لیکن میری سانبہیں اس کرکٹنی ہوں اور اگر تم مجھ جیسی نو بہ شکن جوانی سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہو تو جاؤ اردپ کو جا کر کہہ دو کہ گل کی چھت پر چڑھنے ہی ایک سانبہ نے جو وہاں چھپا بیٹھا تھا ہم پر حملہ کر دیا اور ساتھ ہی نیپوں آدھیوں کو باگ کر دیا اور میں بڑی مشکلی سے جان بچا کر آئی ہوں اور پھر رات کو ہم اسی جگہ پر آ جاؤں میں سانبہیں ابنا خوش کر دیں گی کہ بار کھو گے۔ آخر ہی نافر دیکھنے ہوئے کھٹکھٹا نے خوب بان اٹھا دیا بتانے ہوئے اپنی گھنبرنی پر نہیں اسبت کے جیرے پر پھینکیں اور بالکل اس کے ساتھ لگ گئی جس سے اسبت کے جذبے پر اچھٹ ہونے لگے۔ اس کے دل کی دھڑکن انتہائی تیز ہو گئی۔

”مہ..... میں بالکل آؤں گا۔ رانی جی۔ آپ..... آپ کا حکم کیسے نال سکتا ہوں۔ اسبت نے بے خیالی میں اپنے ہاتھ کھٹکھٹا کے سڈول وراٹھم باز در پھر رکھ دئے تو کھٹکھٹا اچھے بہت گئی اور بولی۔

”دیکھو اسبت..... میرا نام کھٹکھٹا ہے میں رانی جی ہوں اور سارہ بھی۔ میری جوانی اپنی معمول نہیں کہ تم جیسا معمولی آدمی اسے ٹھکراوے اگر تم نے وعدہ خلاتی کی تو میں سانبہیں باہال کی گھرا نہیں سے بھی نکال لاؤں گی رات گھرنی ہونے ہی نام یہاں آؤ گے۔ میں نہ بھی ہوں تو نم خاصوٹی سے میرا نظارہ کر دے آرا نہیں دین اور اگر میں پہنچ گئی تو نم نہ بچے تو پھر میں نمبہاری دشمن بن جاؤں گی اور سوئی لگاؤں کان نیرنہ ہوا آج کے بعد تم مجھے اردپ کی خبر بھی دینا دیا کرو گے۔“

”مجھ کیا..... رانی جی۔“ اسبت بری طرح بدچراں تھا۔ اس کی تو کھٹکھٹا ہی کا کام کرتا چھوڑ چکی تھی۔  
 ”جلو اب جاؤ۔“ اور اسبت تیز تیز نڈنوں سے ایک طرف چل دیا اور کھٹکھٹا اٹارنا نظر دیا سے گل کی چھت کا جائزہ لینے لگی۔ ہزاروں ایکڑ پر پھیلا ہوا نیل تر باسو کرویوں پر خشک تھا اور ہر کمرے پر کھٹکھٹا کے کمرے کی طرح جا رہا جانی دار دوشندان تھے لیکن تمام نکل ایک منزلہ ہی تھے اور ہر سے تمام کمرے کی چھت ایک ہی تھی۔ ساری چھت پر پٹی ڈال کر گھاس اگائی گئی تھی جس کی جہ سے ہر ایک بہت بڑا میدان دکھائی دیتا تھا جبکہ چاروں طرف سبز خاٹا جس کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے گھلوں میں سرد کے پورے لگانے گئے تھے جو چھت کی خوب صورتی کو دیکھ کر رہے تھے۔ گل کی بیرونی چار دیواری اصل عمارت سے خاصی دور تھی اور درمیان میں کئی چھوٹی عمارتیں ابھری تھیں جن میں سے ایک بڑی چھت پر چار پتلا ک چھت کے چاروں کونوں پر میزھیاں نکلتی ہیں جن کے آگے لوہے کے چنگے لگے ہیں جن پر اندر میزھیاں کی طرف سے تالا لگا ہوا ہے، بیٹھیا میزھیاں کے نیچے پھرا لگا ہوا گا اور اسبت اور اس کے ساتھی اردپ سے خصوصی اجازت نامہ رکھنے ہوں گے اور آئے گا۔“

اب کھٹکھٹا اپنے کمرے کی چھت پر آگئی ایک ہی چھت چھت ہونے کی وجہ سے شاید وہ اپنے کمرے کی چھت بھول جاتی لیکن نشانی تھی کہ وہاں نین حملہ آور ہیں کئی سڑنی لائیں پڑنی تھیں۔ لاشوں کے پاس آ کر کھٹکھٹا نے ایک شخص کی لاش کو پاؤں سے جڑا اور اپنی چھت سے خاصی دور لے جا کر چھوڑ دیا۔ اس کے بعد دوسرے شخص کی لاش مخالف سمت میں لائی دور لے جا کر چھوڑا اور دوسرے کی لاش چند گز دور لے جا کر چھوڑ دی تاکہ اگر تفتیش ہو تو نیک ان کی طرف نہ جائے اور یہ سمجھا جائے کہ اخفا فانی وہاں کوئی سانبہ نہیں سے نکل آتا تھا۔

سارنی بانوں سے مطمئن ہو کر ناگن جی اور پھر کھٹکھٹا اپنے کمرے میں آ کر دو بارہ دانی بن گئی، اندر سے چٹنی کھول

وئی۔ پانگ راسیاں باہر برآمدے میں بیٹھی بیٹھی لگ رہی تھیں۔ شکستہ نے انہیں اندر آنے کا اشارہ کیا اور وہ سب خاموشی سے اپنی اپنی جگہوں پر کھڑی ہو گئیں اور شکستہ نے مسہرے پر لبت کر آنکھیں موند لیں۔

اپنے جسم پر چھین کا احساس ہوتے ہی شکستہ کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو اردپ بھوری جج روج سے کھڑی تھی باقی کروہالی تھا۔ دروادر شکستہ ہی تھیں اور چھین خنجر کی نوک کی تھی جس سے شوکارے کو اردپ نے شکستہ کو جگا با تھا اور اردپ ایک پاؤں مسہری کے کنارے پر نکائے ہوئے کھڑی تھی۔

☆.....☆

یہ گستاخی رکھی کہ شکستہ کا خون کھول اٹھا لیکن وہ کچھ سوچ کر ضبط کر گئی۔

”کیا بات ہے دروادر بھاری بھاری غصے میں نظر آتی ہیں؟“ شکستہ سیدھی ہو کر کھڑی ہو چکا ہے جھکا کر اردپ سے بولی۔

”کتنے کی پچی، ہم تمہارنی ہائیں چہرے میں گئے۔“ غصے کی شدت سے اردپ کی سرئی آواز پھٹ رہی تھی۔

”کیا.....؟“ شکستہ نے ایک دم نظر سنا اٹھا۔ پورے جیون میں اس قدر کھٹیا طریقتے سے اسے مخاطب نہ کیا گیا تھا۔ ایک دفع پھر اس کی کھوپڑی کھونٹنے لگی، مگر کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے رو غضب نہ کی گئی۔

”میں کچھ بھی نہیں راج کما رہی جی۔ آپ آرام سے بیٹھیں۔“ شکستہ مسہری سے اتر کر اردپ کو سنانوں سے پکڑ کر صوفے پر بٹھاتے ہوئے بولی۔ آپ کو لگتا ہے میرے بارے میں کچھ غلط سمجھی ہوئی ہے!

”تمہارے کمرے کی چھت پر ہمارے تین خاص غلام سناپ کے ذہن سے مر گئے ہیں۔ ان پر سناپ کسی نے چھوڑا۔“ اردپ نے گہری لگا ہوں سے شکستہ کو گھورتے ہوئے اتھے پر سولوں میں ڈال کر سوال کیا۔

”سناپ؟ چھت پر.....؟ غلام نکالے ہوئے؟“ شکستہ بیولہن سے حیران ہوتے ہوئے اردپ کے سامنے قالمین پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”مجھے تو کچھ پتا نہیں راج کما رہی جی۔ میں تو کچھ نہیں جانتی۔“

”اچھا تم پھر تم نے سب باندیوں کو نکال کر کمرہ اندر سے کیوں بند کیا تھا.....؟“

”میرنی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے اس لئے۔“

”تو پھر تمہوڑی دیر بعد بارہ تم نے کمرہ کھول کر انہیں خود اندر بلا لیا، جبکہ تم کہہ رہی ہو کہ طبیعت اب بھی ٹھیک نہیں۔“

یہ درپے سوالات سے شکستہ سٹ پلائی۔ اردپ تو خوب صورت ہونے کے ساتھ خاصی زہین بھی ہے لیکن فوراً ہی سنبھل گئی اور اس کے پاؤں چھوتے ہوئے بولی۔ ”باندیوں کو حضور باہر ان لیے نکالا تھا کہ طبیعت ٹھیک نہیں تھی لیکن بلا یا اس لیے کہ مجھے کچھ گہری محسوس ہوئی اور پھر پانی پینے یا دہرنی ضروریات کے لیے مجھے کئی بار اٹھنا پڑا تو تک آ کر میں نے انہیں اندر بلا لیا۔“

”اچھا جی!“ اردپ نے سہزی مال بڑی بڑی آنکھوں کو تیزی سے جھپکاتے ہوئے کہا۔ ”کل تک کیزے کو زوں جیسا جیون بسر کرنے والی شکستہ آج خود بانی بننے کے لیے اٹھنا نہیں جانتی۔“

”پرنتو کما رہی جی..... آپ کے غلام میرے کمرے کی چھت پر کیا کر رہے تھے؟“

”گوا اس بند کر..... ہم مجھے جواب دینے کی پابند نہیں۔“

یہ کہتے ہوئے اردپ خوب صورت لباس سنبھالتے ہوئے کھڑی ہو گئی اور پھر بولی۔

”دیکھو شکستہ تم نے مجھے پہلے بھی کہا ہے کہ پر پوزے لگانے یا زیادہ دنگل نہ دیکھانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا باپ راج اور بھائی راجتکمار اور رام شلجی کی رہائی بننے والے ہیں۔ بس جے کسٹن کی ہتھیاء کا انظار ہے۔ اسے راستے میں رکاوٹ بننے والی ہر چیز ہم روند کر گزار جانے کے عادی ہیں ہمیں مجبور نہ کر کہ تمہارے بارے میں کوئی سخت فیصلہ کر ڈالیں۔“

”راج کما رہی۔“ شکستہ ان کے قدموں سے لپٹ گئی اور سر اس کے جوتوں پر رکھ رہا۔ ”میں ایک غریب اور مجبور لڑکی ہوں۔ مجھے عمل سے نہ نکالنے گا۔ میں آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر آنکھوں کی۔“

”ٹھیک ہے نو بجہ۔“ اوپ نرمی پڑتے ہوئے بولی۔ ”جو باجیاں پہلے نمبرارے لیے نصیحت نہیں ان کو بھی رکھو۔ پگک واسیوں کو بھی اچھری پارہنے دو مگر وہ بھی نہیں رہیں گی۔“ اوپ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو گلشنٹا عاجزی سے بولی۔ ”ٹھیک ہے راجکھاری جیسے حضور کی مرضی میں تو آپ کے حکم کے جاساںس بھی نہیں لوں گی!“

”اوسا گروٹی۔“ جس نے تو ابھی چکر کھدکھا ہوا تھا۔ ”کہتے ہوئے اوپ نے خنجر گلشنٹا کی سسرہ پر پھینکا اور باہر چل دی۔ اس کے باہر جاتے ہی گلشنٹا فرش سے اٹھی اور ایک آرام کرسی پر سر ٹکانے ہی خنجر کی طرف دیکھ کر اسے آپ سے مخاطب ہوئی۔ ”تاہمیں نو میں چیدوں کی تمہاری شہزادی عالیہ ابھی تمہیں گلشنٹا سے واسطی کب پڑا ہے۔ اتنی ہی دیر میں ایک باندی آئی۔“

”پر شادی کو جا کر کہو کہ اگر مناسب فرمایاں تو مجھے آکر ملیں!“

جی رانی تھی۔ باندی فرشی سلام کرنی ہوئی اس لئے قدموں باہر نکلی تھی!

خاصی درپر کے بعد پر شادہ باوآ نے ہی گلشنٹا کے چمن چھوئے۔

”جی رانی ماما۔“ وہ گلشنٹا کے چہرے پر آنکھیں جما کر بولا۔

”بھیو پر شادہ۔“ اور اس کے بیٹھے ہی ہالی سب کو آنکھ کے اشارے سے کرو چھوڑنے کا حکم دیا۔

”دیکھو کئی دنوں سے میرا دم گھٹ رہا ہے میں ذرا شہر کی سیر کرنا چاہتی ہوں!“

”ٹھیک ہے میں باختمام کروا تا ہوں۔“ پر شادہ گہری نظر سے گلشنٹا کے چہرے پر جھانکتے ہوئے بولا۔

”نہیں پر شادہ۔“ گلشنٹا دکھت سے بولی۔ ”میں اب کبھی نہیں جانا چاہتی۔ تم بھی ساتھ چلو۔“

”باہر فغان ہو جائیں۔“ پر شادہ نے سوال اٹھایا۔

”ان کی چتا نہ کرو۔ وہ کچھ نہیں کہیں گے اس میں کہوں گی کہ میں خورساتھ لے کر گئی ہوں۔“

”ٹھیک ہے جسے آپ کی مرضی۔۔۔۔۔ آپ تیار ہو جائیں باگلی میں جا بیٹھی ہوں۔۔۔۔۔“

گھوڑوں والی ہنسی ٹھیک رہے گی۔ ذرا آرام سے بھی چلیں گے۔ تیز رفتار بھی ہوتی ہے۔ شہر گھوم لیں گے! پرنو وہ جنجلی۔۔۔۔۔ اوپ کو پتا نہ چلے۔“

”میں بندوبست کرتا ہوں۔ شام کی چائے میں آپ کے ساتھ چپوں گا اور پھر نکلیں گے!“ اوپ کی آپ نکر نہ کریں۔ پر شادہ خود گلشنٹا کے نزدیک آ جا جا رہا تھا۔

حسب وعدہ پر شادہ سیر کو آ گیا لیکن گلشنٹا پر نظر پڑنے ہی اس نے دل خاص لیا۔۔۔۔۔ خوب صورت چست گلابی اور سبز رنگ کی پوشاک اور کھلی رانیں اور چی اڈی والے سنہرے جوئے۔۔۔۔۔ سوچے کے بچرے۔۔۔۔۔ ہر لحاظ سے ارادپ کو مات دیتی جوانی کھلتی رنگت پر شادہ اپنے ہاؤ کی قسمت پر حسد کرنے لگا۔

”آؤ پر شادہ۔“ گلشنٹا اسے دیکھتے ہی مسکرا کر بولی تو گالوں کے گڑھے گہرے ہونے چلے گئے۔

اوہ گلشنٹا نے ہاتھ پکڑ کر پر شادہ کو فریب ہی بٹھایا۔

”ارادپ کو پتا نہیں چلا۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ رانی۔“ ماما پر شادہ اب ماما کہنے ہوئے جھجکا۔

”ارادپ اس وقت گہری نیند سوئی ہوئی ہوتی ہے۔“

نھوڑی ہی دیر بعد پر شادہ اور گلشنٹا چار سفید گھوڑوں والی بچھی پر شہر کی سیر کو نکلے ہوئے تھے۔ ان پر چلنے سے کافی دیر پہلے ہی سپاہی ان واسطوں پر کھڑے ہو کر بازار خالی کر دیا ہے تھے۔

بچھی کے آگے آگے بچھی سیا گھوڑوں پر سوار دو لہکار نفا میں گوزے گھماتے ہوئے چل رہے تھے۔ گوزوں کے گھوڑے سے چلائیں شاہی کی آواز سے لوگوں کو پتا چل رہا تھا کہ شاہی سواری آ رہی ہے۔

اسی طرح بچھی کے پیچھے پیچھے بھی محافظ موجود تھے۔

گنگنلا اپنی نشست پر تانگ پر تانگ رکھے ایک ہاتھ سے کبھی کی بالکونی خانے دوسرے ہاتھ سے خوب صورت بال سنوارنے میں مصروف تھی۔ بات بات پر اس کی ہنسی نکل رہی تھی مونیوں ایسے دانت اور گھائی گالوں کے گڑھے پر شاوکی خوبت کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ اروپ ڈوہاب بان کی تھی جب کہ گنگنلا دارنڈ اور جگرے ٹھہرے سر ایسے کی بالک تھی۔ وہ جان بوجھ کر اداؤں کے جادو چگائے گی اور غیر محسوس طریقے سے پرشاو کے ساتھ نگرانی لگی۔ کبھی اس وقت کسی سنجان بازار سے گزر رہی تھی وہاں اطراف لوگ کھڑے شاہی سواری اور سواروں کو دیکھ رہے تھے۔ پرشاو نے بتا دیا تھا کہ یہ ہماری ریاست کا سب سے بڑا اور بہت پامانا بازار کرمی پر دست ہے۔ جا بجا کھانے پینے اور زبورات کی دکانیں تھیں۔ یہاں کبھی رکوا کر گنگنلا بازار میں گھومنے لگی پرشاو اس کے ساتھ ہی تھا۔

نی رانی گواہے در میان پاکر عوام خوش ہو گئے۔ فقیروں نے ہاتھ پھیلا دیئے، مظلوم زباؤں نے کراہے۔ گنگنلا نے پرشاو کو کہا کہ ان کی ناداری کر دو۔ پرشاو نے محافلوں کو کہا کہ تانے کے سٹکے لاؤ..... ایک بڑا تھاں آگیا گنگنلا اپنے ہاتھوں سے غریبوں میں بانٹنے لگی۔ پرشاو مختلف درخواسوں پر فیصلے بنا کر شاہی اہلکاروں کو نئی درآمد کے لیے کہنے لگا۔ دکانوں اور درجیوں سے گنگنلا بیزس چکھنے لگی۔ عوام کا ایک جرم غضب اکٹھا ہو گیا لوگ خوش ہو گئے۔ کانی و برہند گنگنلا نے طے کا عند بدبا، اہلکار کوڑے برساکر کبھی تک راستہ خالی کروانے لگے۔

تھوڑی دیر بعد کبھی شہر سے باہر خوب صورت پیڑوں کے درمیان، ہموار راستوں پر چل رہی تھی۔ یہ ایک نیم چند سڑک تھی جو آگے سے عجیب پھر کر رہا بس شہر کو جاتی تھی۔ خشک ہوا چل رہی تھی۔ گنگنلا بلند پیازوں کو دیکھ رہی تھی۔ جبکہ پرشاو گنگنلا میں کھویا ہوا تھا۔ پرشاو کی خوبت کو محسوس کر کے گنگنلا نے اسے کہنی ماری۔ ”کیاں ہو؟“

”آں..... ہاں“ پرشاو چونک کر شرمندہ سا ہو گیا۔ بلند یوں میں کھو گیا تھا!

”خوابش کو خفیت کبھی بنا جا سکتا ہے۔“ گنگنلا بولے سے اولی۔

”کیا مطلب؟“ پرشاو اس کے دیکھنے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا۔

”مطلب یہ کہ“ گنگنلا نے آہستگی سے اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر کہا۔

”نہ مجھے رانی اتانا کیا کر دو۔ تمہیں عجیب سا نہیں لگتا..... مجھے تو بڑی شرم آتی ہے۔ ہم عمری تو ہوم مہرے۔“

”آہ.....“ پرشاو نے پرشاو کی سرور و نکل تھی۔ ”گنگنلا کھلکھلا کر ہنسنے لگی اور پرشاو کے ہاتھ پزدوست اپنا ہاتھ مارا۔

”میں سمجھتی..... ہم اپنی وجہ سے مجھے رانی اتانا کہنے ہو۔“

”بہی سمجھ لو۔“ پرشاو کا دل آداس خاشا بد.....

”رانی تو سفندوں والی ہوتی ہیں..... میں تو بس مہمان ہوں۔“

رات بھی اوجھے کھن و سہ سے نہ نہ نہ طرح کھاس رہے تھے۔ پدوں کے پاس شاید کوئی علاج نہیں۔ اب تو نہیں بخار

بھی بہت نیر آنے لگا۔ گنگنلا کدم چہرے کے تاثرات بدل کر گہری آواز سے بولی۔ رام نہ کرے اگر نہیں کچھ ہو گیا.....

تو..... بانو مجھے بھی ساتھ ہی بی کر دیا جائے گا اور با پھر ارب پھینکے گل سے دھکے دے کر نکال دے گی۔ دونو مجھے پسند نہیں

کر لی۔ میرا تو کوئی سہارا ہی نہیں کیاں جاؤں گی۔ گنگنلا نے بلیں اٹھا کر دیکھا تو پرشاو کو ان میں نہرلی کی دکھائی دی۔

”نہیں گنگنلا.....“ پرشاو نے اس نے گنگنلا کا چہرہ ہاتھوں کے پالے میں لے لیا اور گنگنلا اس کی آنکھوں میں منہ

چھپا کر نہی طرح سکتے لگی..... اوپر شاو نے غیر ارادہ طور پر اسے بچھ لیا۔

گنگنلا نے اسے آہ کوٹھیا چھوڑ دیا۔ اس کے وجود کی سوزنی خوشبو نے پرشاو کو سب اجزا مہ اور جھک بالا آئے طاق

رکھنے پر مجبور کر دیا۔ گنگنلا کسمانے لگی اور پھر زور لگا کر اس کی گرفت سے نکل کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور نہی رمال سے اپنی

آنکھیں صاف کرنے لگی۔ اس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ پرشاو کے دل پر اس کے سمور کن وجود کا جادو چھلا شروع ہو گیا تھا۔

کبھی واپس اپنی منزل کی طرف رداں وہاں تھی اور گنگنلا اب پھر خوشی سے بانہیں کر رہی تھی تاکہ آخری وقت میں



اس کا چہرہ پر شاہ کو خوش کن لگے۔ شاہی سواری جب محل پہنچی تو رات ہو چکی تھی۔ بے کسین دربار سے آپ چلے تھے اور روپ کو بھی پتا چل گیا تھا۔ اس کا باراجڑ صاحب اور انھارو شے میں وہ بھری ہوئی تھی۔

پر شاہ و شہنشاہ کو چھوڑنے کے خواہش تک آیا جہاں راجہ بے کسین اور روپ دونوں بیٹھے تھے۔ شہنشاہ کو دیکھنے ہی روپ کھڑی ہو گئی اے کسینا کی موجودگی کی وجہ سے وہ محل کرا تھا و خیال نہ کر سکتی تھی۔

”کہاں گئی تھیں وہاں ماما۔۔۔؟“ روپ ان کے چہرے پر نظر پڑا گاؤ کر طرب انداز سے بولی۔  
”شہر کی سڑکوں پر نکلے تھے۔۔۔ شہنشاہ اشرف جواب دے کر ایک طرف لا پرواہی سے بچھ گئی۔

”آپ کے پیچھے باپ کے ساتھ ہوئے ہیں۔“  
”ان کی طبیعت تمہیں پتا ہے روپ ٹھیک نہیں۔“ شہنشاہ دیکھنا چاہتی تھی کہ بے کسین کا کتنا لحاظ ہے۔

”پر شاہ آپ نے بھی مجھے نہ پتا باور ساتھ چلے گئے؟“ روپ بڑی مشکل سے ضبط کر رہی تھی۔  
”گیا ہو گا ہے تمہیں روپ۔۔۔ کون سی قیامت آگئی ہے۔ آخر کو ہماری رانی ماما ہیں۔“

پر شاہ کی سر دھرنی دیکھ کر روپ پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی اور ٹھوڑی ہی دیر بعد پر شاہ بھی اجازت لے کر چلا گیا تو شہنشاہ اور بے کسین شہرہ گئے۔ بے کسین تمام وقت خاموش رہے۔ وہ اس وقت چالے سے کوئی دو دو غیر وہی وہے تھے۔  
دو چالنے کے بعد کسین نے ان کا منہ کپڑے سے صاف کر دیا اور باادب کھڑی ہو گئی۔ دوسری کسین نے آگے بڑھ کر شہنشاہ کے پاؤں گھومیں رکھنے کے بعد جوئے اتا دے اور ان پر ملاحت سے ہاتھ پھیرنے لگی۔

☆.....☆

”دلا اور۔۔۔“ کوٹھاری باریک آواز میں غرابا۔

”جی سرکار۔۔۔“ دلا اور روپ سے بولا۔

”خوب بہت خوب کوٹھاری چیکا۔ اب تو اپنی اوقات پر آ واپس!“

”نم بہت شگنی مان ہو کوٹھاری۔ دلا اور نم سے پار بھی مانا ہے۔“

”سچ کہہ رہے ہو دلا اور؟“ کوٹھاری کی باریک آنکھوں میں شہبے کے آثار تھے۔

”جب تمہاری بات نہیں ماننا ہوتی تھی تب بھی سچائی سے کہہ دیتا تھا۔ اب بھی سچ ہی کہہ رہا ہوں شاہاں۔ دلا اور!“

کوٹھاری اس کے شانے چھینتا ہے بونے خوفناک انداز میں مسکرا رہا۔

”آج سے تم میرے تابع ہو میرا حکم ماننا تم پر فرض اور تمہاری خواہشات پر تکمیل میرا فریضہ رہا۔ اب چھوٹے موٹے کاموں کیلئے مجھے نہیں چاہنا پڑے گا۔ تم جا کر رو گئے اور شکر ان نہمازی سہاگنا کے لیے نہماڑے ساتھ ہو گا لیکن تمہیں نظر نہیں آئے گا۔ پرتو بارونما۔ دلا اور کوٹھاری کی نظریں پہاڑوں کے اندر بھی دوکھتی ہیں اور بازو۔۔۔ نہماڑی سوچ سے بھی لیے ہیں۔ کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔“

”دلا اور۔۔۔ اب تمہارے ساتھ ہے کوٹھاری جیسا امتحان چاہے۔ لے لو۔“

”تو بھر ٹھیک ہے۔ آج رات تم ایک ایسے سفر پر نکلو گے جس کے دورا سے ہیں۔ کامیاب یا موت۔۔۔ اس

کے علاوہ کچھ نہیں۔“

”دلا اور حاضرے کرو۔“ و تفصیل بتا دی جائے۔

”جہاں سے مشرف کی طرف۔۔۔ کئی سو کوس دور۔۔۔ ایک بہت بڑا جنگل ہے۔ جس کا نام بارا کارنی ہے۔“

”بارا کارنی؟“ دلا اور نے زرباب دہرا رہا۔

”ہاں بارا کارنی۔ بارا کارنی کا مطلب ہے خوب کٹی۔ یعنی اس جنگل میں گھسنے والا۔ اپنی موت کا سامان پیدا کر لیتا ہے بیج کرا تا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے اس جنگل کے بیجوں بیج ساو پھروں سے بنی ہوئی ایک عمارت ہے جو صدیوں سے وہاں کھڑی ہے۔ وہاں ایک ایسا قبیلہ آباد ہے جس کے لوگ ایسی ایسی زندگی پاتے ہیں کئی سو سال کی زندگی۔ یہ دو

جیسی لوگ ہیں ہزاروں سال سے وہاں کے باشندے ہیں اس قبیلے کا سردار تیریشا نام کا ایک آدمی ہے۔ تیریشا نام معلوم کب سے زندہ ہے تا معلوم کب تک زندہ رہے گا۔ لوگ انسانی گوشت کھاتے اور انسانی خون پیتے ہیں اور انسانی کھوپڑیوں کے گھر بنا کر وہاں رہتے ہیں۔ زندہ انسان حاصل کرنے کے لیے یہ لوگ اپنی ہستی سے نکل کر جنگل کے کناروں تک آجاتے ہیں۔ جنگل شروع ہونے سے نکل سرخ پیمانیاں اور ان سے نکل ریگستانی علاقہ میں سفر کے دوران کئی دفعہ نکلوں کے قافلے راستہ بھول جاتے ہیں اور سرخ پیمانوں کی طرف جاتے ہیں جہاں سے یہ بارکاری قبیلے کے ہاتھ چڑھا جاتے ہیں۔ بارکاری قبیلے کے لوگ انسانوں کو انوکھے طریقوں سے مارنے ہیں اور ان کو کھانے کے لیے ان کے پاس وافر انسان موجود ہوں تو پھر قیدیوں سے مختلف کام بھی لیتے ہیں!

”لیکن کوٹھاری بی بی ان کو وافر تعداد میں اس ریگستان سے انسان کیسے لے جاتے ہیں۔ وہاں سے تو بہت کم قافلے گزرتے ہوں گے۔ جبکہ وہاں سے انسان انگو اوتے ہیں۔“

”تمہاری بات ٹھیک ہے دلاور لیکن بارکاری قبیلے کے لوگوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں وہ صرف دوسرے بہت کم ان کے ہاں اولاد ہوتی ہے اور جب ایک بچہ پیدا ہوتا ہے تو ان میں سے کسی ایک کا مرنا ضروری ہو جاتا ہے اس کے لیے باقاعدہ دنگل ہوتا ہے جو گزردینا ہے وہ قتل ہو جاتا ہے۔“

”اس کے علاوہ ان لوگوں کے انسانوں کی تجارت کرنے والوں سے بھی رابطے ہوتے ہیں۔“

”ہمارا کام کیا ہوگا سرکار؟“ دلاور اصل موضوع پر آتے ہوئے بولا۔

”تمہیں قبیلے کے سردار تیریشا کا سرکاب کرانا ہوگا لیکن بارکھ کہ تیریشا صدیوں سے زندہ ہے اور اس کی جان ایک اچھا و حارئی ناگ کے اندر ہے! جو اس نے کسی ایسی جگہ پر چھپا کر رکھا ہے جو ہر طرح سے محفوظ ہے۔“

”تم اس کا کیا کرو گے؟“ دلاور کو یہ کام شاید فضول سا معلوم ہوا۔

”ہا ہا ہا..... اس کے سر کے اوپر ایک خاص قسم کا جاود کروں گا تاکہ امدی جیون بچھے ہو جائے..... اور پھر میں تم دونوں کو آزاد کروں گا اور خزاں کو بھی تم سے ملا دوں گا۔“

”خزاں..... خزاں کا نام آتے ہی دلاور اداں ہو گیا۔ اس کی دمگ بچے میں یا سیت سراہت کر گئی۔“ تم مجھے خزاں کی ایک جھلک دکھا دو ڈھاری..... میں اس سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”ناممکن..... اب یہ بات ناممکن ہو چکی ہے کوٹھاری فیصلہ کن لہجے میں بولا۔“ پہلے تیریشا میرا دوست تھا اور اب ہم جانی دشمن ہیں۔ حکومت اسی کے قبضے میں وہ جن ہے جو اس کے حکم سے خزاں کو اٹھانے لیا ہے!“

”کیوں کہ خزاں کا جیم ایک اہم ساعت میں ہوا۔ اس لڑکی کی تیریشا کو صدیوں سے تلاش تھی جو وہ صدیوں کے سین سٹھم میں پیدا ہوئی ہے اور ایک صدی ختم ہوئی اور دوسری شروع ہوئی ان دونوں کے درمیان والا وہ وقت جب پہلی صدی کے بعد دوسری صدی کی پہلی لکڑی ختم ہونے سے پہلے پیدا ہوئی ایسا چشم ہزاروں سالوں میں ہوتا ہے۔ خیر چہرہ وہ ان باتوں اور

وقت ضائع کرنے سے کوئی فائدہ نہیں تم اگر ننگسراں کی مدد سے تیریشا کو لے کر کے اس کا سر لانے میں سہل ہو گئے تو دونوں کو آزادی بھی مل جائے گی اور خزاں بھی تم سے آٹے کی، پھر میں تمہیں دولت کے انبار بھی دے دوں گا اور باقی جیون تم

میں عشرت سے بسر کرو گے اور اگر تم مارنے کے لئے تو خزاں بھی ماری جائے گی اور تمہارا ٹھیکل ختم ہو جائے گا اور اگر تم نا کام

وہاں آئے تو میں تمہیں بھی بری داس کی طرح خارش زدہ کرنا بنا کر چھوڑ دوں گا۔“

☆.....☆

کھٹنا شب خوافی کے سین لباس میں تھی۔ بے کوشن سلسل کھانٹے کھانٹے اب مذہب حال ہو چکے تھے۔ ابھی ابھی شامی طیب انیس وادو ہجرہ پلا کر گئے تھے اب وہ آہستہ آہستہ خند کی واہی میں اتر رہے تھے۔ کھٹنا لگی ڈوں سے ایسا ہی تماشا

دیکھتی تھی وہ جب سے رانی بن کر آئی تھی رانی کی حالت بگڑتی جا رہی تھی اور اس کی ہر بات کا نواں مرکز رہی تھی، جبکہ دیگر پلنگ داسیاں تو بیچاری کینریں تھیں بن کر رہی تھیں راج کا پلنگ تو کھٹنا کو نصیب نہ ہوا تھا ان کے مقدر کیسے مٹتے۔

بے کسٹن سو گیا نہ ٹھکتلا آہستگی سے اٹھی اور اٹھی سی چھنکار کے ساتھ تاگن بن گئی اور روشندان کے راستے سچت پر آگئی۔ ادھر امت جو اس کے اظہار میں سچت پر سے روشندان کے اندر جھانک رہا تھا اس نے جو ٹھکتلا کو انسان سے تاگن بننے دیکھا تو بے اختیار اس کی دلخراش سچ نکل گئی۔ سچت پر آتے ہی ٹھکتلا تیزی سے دوبارہ انسان بنی اور سرعت سے امت کی طرف لپکی جو ششدر رہا ہوں سے اسے کئے جا رہا تھا۔

”آ..... آ..... آپ تاگن ہیں رانی ہی؟“ امت کی آواز ٹھکتلا کی اور اس کا سر ڈھلک گیا اور وہ دھڑم سے گر گیا۔

”تو عجیب صورت حال ہو گئی ہے۔ ٹھکتلا بڑ بڑائی۔ چلو جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ آگے بڑھی اپنے دانت امت کی شہرگ پر رکھ دیے۔

☆.....☆

اگلے دن رنجیدہ بر سے دربار گئے ان کے جاتے ہی پرشاڈ آدھکا۔ افغان سے ٹھکتلا اس وقت بالکل اکیلی تھی۔ وہ دربار سے اٹھی تھوڑی سی باہیں اٹھا کھین لیکن پھر شرانے کے انداز پلٹیں جھکا کر مسکرائے گی۔ پرشاڈ اس کی اس ادرا پر فرما دیا۔

”آؤ ہنھو پرشاڈ بھوجن کر لیا.....؟“

”جی..... ٹھکتلا۔“ میں من اندھیرے بھوجن کرنے کا عادی ہوں۔ پرشاڈ کرسی پر بیٹھے ہوئے بولا۔

”لیکن راجکارا تو..... بر سے آتھی ہے؟“ ٹھکتلا نے اسے نولا۔

”ہاں میں اکیلا ہی بھوجن کرتا ہوں۔“

”اور دوپہر کو.....“

”دوپہر اور شام کا کھانا میرے ساتھ ہی کھانی ہے۔“

”بھی مجھے بھی موقع دو۔“ ٹھکتلا نے پتا پھینکا۔

”ضرور ضرور ٹھکتلا تم کو تو میں کیسے انکار کر سکتا ہوں۔“

”اجھا بتاؤ کیا کھاؤ گے؟“

”اٹھی.....؟“ اس نے انا سوال کیا۔

”ہاں ہاں.....!“

”جو نہادی مرضی؟“

ٹھکتلا نے فوراً تالی، چھائی تو کینڑا آگئی۔

”فوراً آگئی ہی جائے اور ساتھ میں برن کے گوشت کے کباب بناؤ۔“

”بہتر رانی مانا.....“ کینڑا فری آداب کرتی ہوئی اٹلے قدموں جانے لگی..... اور سنو..... کوئی اندر نہ آنے پانے۔“

”جو حکم سرکار۔“

”اور سناؤ پرشاڈ.....“ ٹھکتلا چہرے پر مسکراہٹ بھانکے بولی۔

”بالکل ٹھیک تھاگ ہوں۔“

”رات اردپ نو ناراض ہوئی ہوگی!“

”ہاں دردیت غصے میں تھی۔“

”من مانی کرنے کی عادت ہے اسے، میرا خیال ہے بہت پیار کرتی ہے بھوت.....“

”پیار کرے یا نہ کرے..... البتہ اپنی منوانے کی اسے بہت بری عادت ہے!“

☆.....☆

(حیرت کے نئے رنگوں سے آبدان سلسلے دار ناول)

کی اٹھی سدا انشاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

# مطلبیہ

خلق خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! "مطلبیہ" کا سلسلہ تعلق خدہ کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ "پہلی کہانیاں" کے اولین شمارے سے شامل اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجزیہ و تفسیر اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس ماہی دنیا میں آیات قرآنی اور ان کی روحانی طاقت کے حیران کر دینے والے تجربے رکھے۔ جیسے بیسے لوگوں کو ان دعاؤں سے فائدہ پہنچا رہا، اسی تناسب سے ہر ماہ مسلسل ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورت حال یہ ہوئی کہ اگر ماہنامہ "پہلی کہانیاں" میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پچھلے برس میں صفحات کی تعداد بہر حال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا لیکن اس سے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، ان کا ریڈنگ کرنا اور انہیں سہر و ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو ہم ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہ راست جوابات کے لیے ہر ماہ اضافہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی ضمانت مسلمین و مسلمات (خوادوہ زندہ ہوں یا مرد) کے لیے دُعا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعا ہے خیر سے بڑا ماحول اور جتنی حکمت کی کوئی دُعا ہو سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر ادارے کو فائدہ ایسا ملے جو خطوط کا ریڈنگ کر کے اور انہیں سہر و ڈاک کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اگر آپ اسے سنبھالنے کا کوئی جواب جانتے ہیں تو ادارہ کو کم جراتی لکھانے کے ساتھ =/300 روپے کا سٹی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ "پہلی کہانیاں" کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم ان افراد کی نواہ کی دُعا ہے، آپ کی آمدنیوں کی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ سٹی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجئے کے علاوہ خط میں سٹی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ یہ سب استطاعت حضرات کو کم سٹی =/300 روپے کو آخری حد تک سمجھیں، دو سب استطاعت اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم ان نواہ کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے سٹی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجئے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

- (1)..... سب سے کم سٹی اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت ضرور ہونے پر خود بخود فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جو خط لکھیں انہیں روزانہ فائدہ کے جوابات نقصان کا احتمال ہے۔
- (2)..... سٹی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ "پہلی کہانیاں" کے نام ارسال کریں۔
- (3)..... اپنا سب صاف اور واضح الفاظ میں کافد کے ایک طرف تحریر کریں۔

ماہنامہ "پہلی کہانیاں" 110، آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ۔ کراچی

□ ام۔ کراچی

○ جناب باباजी السلام علیکم؛ میں پہلے بھی آپ کو خط لکھ چکی ہوں، مسئلہ یہ تھا کہ ہم پر بے انتہا قرض ہے۔ اس قرض کو اتارنے کے لیے میرے بھائی نے شادی شدہ بہنوں کا زچہ تک بیچ دیا لیکن قرض جوں جوں اٹا ہوا ہے۔ آپ نے سو دنوں کی آخری آیت نہ پڑھنے کو کہا تھا 21 دن تک میری والدہ نے مسلسل نہیں سمیٹے تک آیت پڑھی لیکن مسئلہ حل نہیں ہوا۔ میری بہن، بہن، بہن کے دشمنی نہیں آنے ہیں، آتے ہیں تو انکار ہو جاتا ہے، اپریل میں ان کا رشتہ آبا لڑکا اچھا ہے، بابا جی ہمارے پاس تو کچھ بھی کرنے کو نہیں تھا۔ ہم خود باہلی پالی کے مضافات ہیں بڑے والوں کی دن تاریخ گھبرائی ہوئی تھی، 12 اکتوبر۔ بال بک بھنے سب نے ہم پر زور دیا کہ لڑکی کی شادی ہے اس کو دو لڑکی کے معاملے میں اللہ تعالیٰ خود مدد کرتا ہے لڑکا اچھا تھا ہم نے پاں کھدنی لیکن بابا جی اب مسئلہ یہ ہے کہ شادی میں صرف دو سینے رہ گئے ہیں اور ہمارے پاس کوئی انتظام نہیں ہے، میرے بھائی ناراضی کبڑے کی بیگنگ کا کام کرتے ہیں۔ دو بالکل ختم ہو گیا ہے گھر میں پیسے کی کمی ہے، بھائی نے جہاں جہاں کام کرتا ہے سب سے مدد کے لیے کہا لیکن کوئی مدد کرنے کو تیار نہیں ہے، اب بھائی نے بھی منع کر دیا ہے کہ وہ کسی کے گھرے یا گھر نہیں پھیلانے گا اور وہ بہت بڑا گھبراہٹ ہے لوگوں سے نہیں کر کے اور اب دو شادی نہیں کرے گا۔ بابا جی اب ذرا غور کیجئے کہ شادی میں صرف 2 سینے پائی ہیں، ہمارا بھی بال بک ہے سب لوگوں کو پتا ہے کہ ہمارے گھر شادی ہونے والی ہے اور ہماری تیار ہی نہیں ہے اور اب شادی سے دو سینے پہلے بھائی نے بھی دلیرداشتہ ہو کر شادی سے انکار کرنے کا کبہہ دیا ہے۔ گھر میں تو ہم جیسے کسی گزارا کر رہے ہیں کہ بہ وقت بھی گزار جائے گا لیکن بابا جی اب بہت جواب دے رہی ہے۔ ہم جس کرب و دکھ میں ہیں اس کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں۔ میں بہت ذہنی دل سے آپ کو یہ خط لکھ رہی ہوں۔ اب نو ذکا کف کر کے بھی دل گھبرا گیا ہے کہیں سے کوئی نئی امید نظر نہیں آ رہی۔ بابا جی ہماری عزت کا سوال ہے۔ اب آپ بتائیے ہم کیا کریں؟ آپ سے انتہا کے کوئی ایصال متا ہے جس سے ہمیں بہن، بہن، لڑکی کی شادی 12 اکتوبر کو بخیر خوبی ہو جائے اور

ہم پر جو پرانا انکار قرض ہے، وہ بھی اتر جائے اور ہمیں مزید کوئی نیا قرض بہن کی شادی کے لیے نہ لینا پڑے آپ ہمارے لیے خصوصی دعا بھی کروا دیجئے بہت بہت مہربانی ہوگی، مجھے اس خط کا جواب جلد ہی دیجئے اور اسے ڈائجسٹ میں بھی شائع کروا دیجئے، شکریہ۔

بڑی سچی شہدائی خواہش پر شہادہ خط شائع کر رہا ہوں۔ اس دعا کے ساتھ کہ کوئی تک انسان نہ ماری سفید پٹی کا نعیم رکھنے ہوئے نہ بنا دیا مدد کرے، کا کش کر لوگ یہ بات سمجھیں کہ جائز ضرورت مند اپنے پورے کنبے کو لے کر لینی اسکرین پر اپنی بے بسی کا نشانہ نہیں لگا تا اللہ ہدایت دے کہ یہ لوگ مدد کرنے والوں کے جذبات سے تھکنا نہ کر سکیں۔

□ جناب۔ شبندر

○ بابا جی کیسے ہیں آپ؟ امید ہے خیریت سے ہوں گے، نحوہ بڑھوانے کا بہت بہت شکریہ۔ بابا جی تعویذ کے تحبک 21 دن بعد بہنوں کا فون آتا تھا کہ دو بہنوں بہن کو لے جانا چاہتا ہے۔ لیکن اب خاموش ہیں، اب عدالت میں کس کس بھی چل دیا ہے کہ با فون بہن کو گھر لے جائے یا ہجوز دے۔ پلیز بابا جی، ہم بہ حال میں، بہن کا گھر بچا جاتا ہے ہیں۔ بابا جی شاعرے میں جواب دینے کا بہت بہت شکریہ۔ ہمارے لیے خاص دعا کریں۔

بڑی سچی شہادہ لیکن سے کہو، وہ جاری رکھے، روانے اللہ کے کسی سے مدد کی طلب گار نہ رہے، جو لوگ پورے لعین سے اللہ سے مانگتے ہیں وہ ضرور کامیاب ہوتے ہیں۔

□ ایمان خان۔ ملتان

بڑی سچی ایمان! اللہ تمہیں خوش رکھے، سچی نماز کی پابندی رکھو اور زور و دوشرف بہت بڑھو۔ اس وقت سے کہنا پڑتا ہے کہ تمہاری والدہ کے ساتھ شدید قسم کا نفسی مسئلہ ہے۔ انہیں علاج کی ضرورت تھی لیکن اب بہت دھن گزر چکا ہے۔ ہم لوگوں کو اب ضرور بہت سے حالات کا سامنا کرنا ہوگا۔ گھر میں قرآن شریف کی تلاوت ضرور کیا کرو۔ حسب استطاعت ضرورت مندوں کی مدد کرو، الحمد شریف نرنے کے ساتھ بہت بڑھا کرو، روزتے پر غور کرو کہ اللہ تعالیٰ کیا فرما رہا ہے۔ جہاں تک تمہاری بہن کا تعلق ہے اس سے کہو ہر نماز کے بعد سووہ الناس اور سووہ الفلق ضرور پڑھا کرے۔ کرم ہوگا۔ سچی تم مجھے اب بعد حالات سے



آگ لگا کر اور تعویذ و بنا ضروری ہوا تو میں تیار کر دوں گا۔

□ نمبت، ہالینڈ

☆ بی ٹی نمبت! اللہ نہیں ڈھیروں خوشیاں عطا فرمائے، عظیم تک بہت تاثیر سے پہنچ رہے ہیں اسی لیے کالم میں جواب دے رہا ہوں تمہارا خط مجھے مل گیا ہے آئندہ بھی حالات سے آگاہ رکھنا۔

□ زبیدہ کوکتہ

☆ بی ٹی زبیدہ! تمہارا خط تمہاری خواہش و مسالحت نہیں کیا ہے، تم نے درست لکھا ہے کہ بردہ اور عورت کے لیے زندگی بہت مشکل ہے۔ ہر شخص مدد کے نام پر سر پر ہاتھ رکھنا چاہتا ہے، بی ٹی تم پرین اور خاتون ہوا، یقین رکھو اللہ کی اس دنیا میں کوئی ایک انسان ایسا ضرور ہوگا جو تمہارا تمام سناگا لے بنا تمہاری اور بچوں کی مدد کرے گا صرف اور صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے، میں بھی منتظر ہوں تم بھی صبر کے ساتھ انتظار کرو۔

□ انور، ہزارو

o بابا جی! میری بہن نے آپ سے تعویذ لیا تھا۔ اس کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اللہ کا احسان ہے مگر پچھلے سنیے سے اس کے دونوں پاؤں اٹک گئے ہیں۔ لڑکے والے سناؤنی کی تاریخ مانگ رہے ہیں مگر ان پرینائی نے ہمیں بہت تنگ کیا ہے۔ بہن نے مجھے بتایا کہ پہلے تعویذ کے بعد دوسرا تعویذ بھی لینا ضروری تھا جو اس نے نہیں لیا۔ کہیں یہ اس کی وہ۔ سے تو نہیں؟ بابا جی! آپ مجھے تعویذ تیار کر دیں میں پیہہ ارسال کر دوں گا۔

☆ بیٹے انور! ہر کام کا ایک خاص طریقہ ہے میں ہر مسئلے میں دو تعویذ نہیں دیتا۔ جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں دیتا ہوں۔ تمہاری بہن نے صرف بات نہیں مانی۔ ظاہر ہے جب علاج نامکمل ہوگا تو تکلیف پھر پلٹ آئے گی۔ انسان اپنا مقصد پانے کے بعد اللہ کا شکر ادا کرنا ہی معمول جاتا ہے۔ بہن سے کہو اللہ سے معافی مانگئے۔ بے شک وہ معاف کرنے والا ہے۔ تعویذ میں تیار کر دوں گا۔

□ غرہ نعل۔ کینیڈا

o بابا جان! میری اور بہت اچھی نہیں ان لے کوئی نفلگی ہو تو معاف کر دیں۔ بابا جان! میں عید پر پاکستان آؤں گی کیا میں آپ سے مل سکتی ہوں؟ مجھے بہت شوق

ہے کہ آپ کو دیکھوں۔ آج سے دس سال پہلے جب اپنی والدہ کے ساتھ ایٹانس "بچی کیا نیاں" کے دفتر آئی تھی تب آپ کی ایک جھلک دیکھی تھی تب سے ارمان ہے کہ آپ کو دیکھوں۔

☆ بی ٹی غرہ! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ میں اب اپنا سارا وقت عبادت میں صرف کرتا ہوں اس لیے گھر سے نکلتا ہی برائے نام کر رہا ہے۔ پھر ملنا ضروری تھی نہیں۔ میں اپنے بچوں کو بیٹھاپنی زبان میں یاد رکھتا ہوں۔

□ رحمان نعل۔ خان پور

o بابا جان! اللہ آپ کو بھی عطا فرمائے۔ میں بہت مشکل کا شکار ہوں۔ 6 ماہ قبل میری والدہ کا انتقال ہو گیا۔ والد صاحب نیا جیا ہیں۔ ہم دونی بہن بھائی ہیں۔ بہن شادی شدہ ہے اور وہ اسلام آباد میں رہتی ہے۔ میرے لیے بہت مشکل ہو رہی ہے کہ نوکری پر جاؤں یا والد صاحب کو سنبھالوں؟ رو بھی کچھ ضدی طبیعت کے ہیں۔ گھر سے باہر نکل جاتے ہیں اور اسی لیے اکثر گر پڑتے ہیں اور جوت لگ جاتی ہے۔ بابا جان! لوگ کہتے ہیں کہ نیچے شادی کر لینی چاہیے تاکہ گھر یا سنبھالنے والا کوئی تو ہو مگر میں ذہنات ہوں کہ چاہ نہیں آئے والی نہیں برداشت بھی کرے گی یا نہیں؟ تانے میں کیا کر دوں؟

☆ بیٹے رحمان! تمہارے گھر کو بے شک ایک ذمے دار عورت کی ضرورت ہے۔ اسے جاننے والوں ہی میں سے کوئی سمجھو اور ذمے دار لڑکی کچھ شادی کر لو۔ یہ درست ہے کہ عورت ہی گھر کے معاملات کو سنبھال سکتی ہے۔ وہم دل میں مت لاؤ۔ ظاہر ہے جو لڑکی بھی تمہارے گھر میں آئے گی وہ اب کی محبت اور حیثیت سے راتف ہوگی۔ اللہ سے دعا کیا کر دوں کہ وہم پر رحم فرمائے۔ نماز فجر کے بعد ایک بار سورہ سبأ ضرور پڑھو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ ایسٹ۔ ہندوستانی

o بابا جی! بڑی مشکل سے آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ ہمارے علاقے میں ڈاک کا نظام بہت اچھا نہیں ہے۔ آپ مجھے کالم میں جواب دیں۔ مالی حالات بہت خراب ہیں پھر موسم بھی بہت شدید ہو جاتا ہے۔ پہلے میں کراچی میں نوکری کرتا تھا مگر ڈولے کے بعد گھر کے سارے عرصے

□ غفور رحیم۔ فیصل آباد

○ چاؤے باباجان! السلام علیکم ائندہ سلامت  
ہیں۔ (آمین!) باباجان! بڑی امید لے کر حاضر  
ہوں۔ بہت زیادہ پریشان ہوں۔ والد فوت ہو چکے  
ہیں۔ میں عرصہ آٹھ سال سے وودر کی ٹھوکریں کھا رہا  
ہوں۔ دوسرینہ کراچی میں ملازمت کے لیے جا چکا ہوں  
لیکن کہیں بھی کام نہیں ملتا ہے۔ جہاں بھی کام کرتا ہوں  
کوئی نہ کوئی رکاوٹ ہو جاتی ہے۔ اپنا وودر کی دلا کام  
شروع کیا اس میں بھی بہت نقصان ہوا ہے۔ اب نو  
زندگی سے ہی ماہوں ہوں۔ بوزگی والد وودر اس  
آسرے پر مبرا اظہار کرتی ہیں کوئی کام مل گیا ہوگا لیکن  
انہیں ماہوں کرتا ہوں۔ نہ معلوم کسی نے کہا جاوے یا بندش  
کردی ہے کہ پریشانی نے گھر کا راستہ دیکھ لیا  
ہے! باباجانی! آپ کو خدا اور ولولہ کریم پاک نبی کریم کا  
واسطہ سے میرے لیے کوئی نعوذ یا وظیفہ دیں۔ میں نماز کا  
پابند ہوں۔ رزق حلال چاہتا ہوں۔ کئی مرتبہ تبلیغ کے  
لیے بھی والد کے ساتھ جا چکا ہوں۔ گھر میں ہی وہی شیپ  
کچھ بھی نہیں ہے پھر بھی مفید خراب ہو گیا ہے۔ نہ معلوم  
میرے لیے اچھے دن کب آئیں گے؟

○ چاؤے غفور! نماز کی پابندی رکھو اور نماز فجر کے بعد  
ایک باسوہہ و خونِ ریحوم رزق میں برکت کی دعا کرو۔  
ہے! ایک بات یاد رکھو جو لوگ اللہ کو یاد رکھتے ہیں اللہ  
بھی انہیں یاد رکھتا ہے۔

□ بشری انومان۔ کھارباں

○ باباجانی! السلام علیکم! مسئلہ ہے کہ دوسری شادی  
کے لیے مبرا کوئی دشنہ نہیں آتا۔ میری عمر 26 سال ہے۔  
جس شخص سے میری پہلی شادی ہوئی تھی وہ میرے ساتھ  
اجھا نہیں تھا۔ وہ بہت کند و آدی تھا۔ اب میں چاہتی ہوں  
کہ دوسری شادی کر لوں۔ میرے بڑے سے مال باپ بھلا  
کب تک مبرا خیال رکھیں گے؟ مبرا دوسرا مسئلہ بہنے  
مجھے دوسرے بھی پڑنے ہیں اور جب میری طبیعت خراب  
ہوئی ہے تو مجھے کچھ بھی پتا نہیں چلتا کہ میں کبا کر رہی  
ہوں؟ باباجانی! کوئی اچھا سا وظیفہ بتا دیں کہ میرے دوسرے  
ختم ہو جائیں۔ میری شادی کے لیے بھی کوئی اچھا سا  
وظیفہ بتا دیں کہ میں بھی اپنے گھر کی ہو جاؤں۔ باباجانی

ہو گئے تھے۔ صرف بوزگی ماں اور مفید لیکن بچے ہیں۔  
تب سے میں ہی ان سب کا بڑا ہوں انہیں چھوڑ کر گئی نہیں  
جا سکتا۔ اس جاؤے کو حالانکہ برسوں ہو گئے لیکن باباجانی!  
بے وودر گاوی نے گھر کا دستہ دیکھ لیا ہے۔ اب تو کھانے  
کے بھی لالے پڑے دے ہیں۔ کوئی ایسا عمل بتائے کہ  
رودر کی وافر ہو جائے۔ آپ کا بڑا احسان ہوگا۔

○ چاؤے ہوسٹ! اللہ تمہارے مسائل حل  
فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور وودر شریف بہت پڑھو۔  
بے شک حالات بہت تکلیف دہ ہیں مگر صبر اور صبر سے  
حالات کا مقابلہ کرو۔ نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے  
بعد 7 سبوح پڑھو ناسخسی یا مغنی اور اللہ تعالیٰ سے دعا  
کرو۔ مدت 12 ماہ ہے۔

□ آئندہ سرگودھا

○ محترم باباجانی! السلام علیکم! امید ہے اللہ کے  
فضل و کرم سے آپ خیر بہت سے ہوں گے اور آپ  
کے درجات میں اللہ تعالیٰ ترقی فرمائے۔ (آمین!)  
باباجانی! میں نے پہلے بھی آپ سے وظیفے منگوانے  
ہیں۔ جو کئی دفعہ بھی اپنے بچوں کے لیے آپ سے وظیفہ  
منگوا اب غنا کہ وہ بڑھائی پر توجہ نہیں دے اور ہمدی بہت  
ہیں۔ باباجانی! آپ نے مجھے ایک ماہ تک ہر نماز کے  
بعد چاروں قل پڑھ کر دے کرنے کے لیے کہا تھا۔ میں  
نے ایک ماہ تک یہ وظیفہ بھی کیا۔ پورا ماہ وظیفہ کرنے  
کے دوران کچھ فرق پڑا لیکن اب پھر وہی ہی بد سیز ہیں  
اور بڑھائی پر توجہ نہیں دے اور بڑوں کی بات بھی نہیں  
مانتے۔ اس کے بعد دوسرا وظیفہ کسی اور نے بچوں کے  
لیے وظیفہ بنا یا کہ سورہ زمر کچھ کو پانی پر دم کر کے ملاؤ  
اور سورہ موسیٰ کی آخری آیت ہر نماز کے بعد ایک سبوح  
پڑھ کر دعا کرنی ہوں۔ تقریباً ایک ماہ ہو گیا ہے۔ یہ وظیفہ  
پڑھتے ہوئے لیکن پھر بھی کچھ فرق نہیں پڑا۔ باباجانی!  
میں اپنے بچوں پر پوری توجہ دیتی ہوں اور ان کا پورا  
خیال رکھتی ہوں لیکن پھر بھی وہ نہ میری بات مانتے ہیں  
اور نہ ہی بڑھائی پر توجہ دیتے ہیں۔

○ چاؤے آئندہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔  
نماز کی پابندی کے ساتھ وظیفہ جاری رکھو۔ انشاء اللہ و قدر  
دفعہ سب خیر ہوگی۔ مدت 41 دن ہے۔

سہرے خذ کا جواب ذرا جلدی دینے کا شکر ہے

ﷺ نبی شریفی اللہ نہیں کھل بٹھا، عطا فرمائے۔ نہیں پہلے اپنا کھل علاج کرنا چاہیے۔ تم نماز عشاء کے بعد ایک بار سورہ جن پر حضور ذکا کر۔ مدت 21 دن ہے۔

□ مونس۔ کندہ کت

۵ بابی مسئلہ سہری بہن کا ہے۔ رشتے آنے ہیں لیکن لوگ بٹھ کر رہا رہیں آئے۔ جس نے جوڑنے کا بنا دیا وہ بڑھا۔ بہت دلفی پڑھے ہیں لیکن شادی کا مسئلہ جوں کا توں ہے۔ عمر تیزی سے بہت رہی ہے۔ اس کے بعد ایک اور بہن اور ایک بھائی تین ان کی بھی شادی کی عمر ہو رہی ہے۔ آپ سے تعویذ مسئلہ مانا تھا جو کافی عرصے پہنا پھر اتار دیا اور ٹھنڈا بھی کر دیا۔ آپ کو وہ پارہ خط لکھا آپ نے کہا کہ تعویذ ٹھنڈا نہیں کرتا تھا۔ آپ ہم سے غلطی ہوئی ہے۔ اللہ میں صاف کرو۔ آپ سے بھی بھائی مانگتے ہیں۔ آپ کہا کہتے ہیں کہ وہ پارہ تعویذ منگوا لیں؟ جواب ضرور دینے کا۔ ہم سب بہت پریشان ہیں۔ سہری راتوں کی نیند آتی ہے۔ آپ کی میرا بی بی۔

ﷺ نبی مونس! یہ مسئلہ بہت عام ہوتا جا رہا ہے۔ لڑکی والے بہتر سے بھتر کی تلاش میں اور لڑکے والے مائی آسوگی کے انتظار میں مسائل کو بڑھا رہے ہیں۔ شادی کی ایک عمر اور خاص وقت ہوتا ہے وہ گزر جائے پھر بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ بہر حال تعویذ پارہ منگواؤ۔

□ صبدولی۔ کرک

۵ بابی اللہ آپ کو صحت دے۔ سہرے دنوں جینے ایک عرصے سے باہر جانا چاہ رہے ہیں۔ آپ نے وظیفہ دیا تھا ان کی ماں کو پڑھنے کے لیے۔ ان کی بدکت سے لڑکوں کی بڑی بہن نے ان کا دیرانیج دیا ہے۔ آپ سہری آپ سے یہ گزارش ہے کہ ایسا جلائی وظیفہ دےں کہ وہ ان کو وہاں اچھا کام مل جائے اور ان کا دل بھی ٹھک جائے۔ میں اور میرے گھر والے آپ کے شکر گزار ہیں گے۔

ﷺ بٹھے عید۔ اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں دکھائے نماز کی پابندی رکھو اور ذرا شریف بہت پڑھو۔ والدہ سے کہو صحت استقامت صحت خیرات کیا کریں۔ بعد نماز عشاء 1100 بار سورہ المائدہ آیت 6 پڑھیں اور دعا کریں۔ مدت 41 دن ہے۔

□ شاذیہ۔ گوت ازو

۵ بابی! ہم لوگ بہت پریشان ہیں۔ ہر ایک ہی بھائی ہے، شادی سے پہلے وہ ہم بہنوں اور ماں باپ کا بہت خیال کرتا تھا مگر اب بہت بدل گیا ہے۔ ہمیں بغین ہے کہ ہماری بھائی اس پر جاؤ گئی ہے۔ آپ ایسا تعویذ دیں کہ وہ پھرت تھاری بات ماننے والا نہ بن جائے۔ اس کے علاوہ بابا جان! ایک مسئلہ اور ہے، وہ یہ کہ ہمارے ازو بہت گندی گندی گالیاں دیتے ہیں اور ہماری ماں، ہانڈ بھی اٹھاتے ہیں، ان کا بھی عمل بنائے۔

ﷺ نبی شاذیہ! تم نے اتنے رویے کی وجہ سے بھائی کو دور کیا ہے۔ پہلے وہ مجبور تھا مگر اب اس کا اپنا کتبہ ہے۔ اولاد ہونے کے بعد وہ دور ہو جائے گا لہذا ہم لوگ اور تاروہ پڑھو، اس کی بیوی کو پستان مس کرو۔ معامات میں خاموشی اختیار کرو اور ہر نماز کے بعد بیسھتر یا کبیر کا بہت ورد کیا کرو۔ مدت 21 روز ہے۔

□ شرمین۔ کھمر

ﷺ نبی! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور ذرا شریف بہت پڑھو۔ تمہارے شوہر درست کہنے ہیں مگر نبی اولاد میں بہت جتنی سہا بہ ہیں۔ تم ان سے ملنے ضرور جا کر داد کھڑے کھڑے جا کر دو۔ شوہر کو ساتھ من لے جاؤ۔ نبی اولاد بن کی خبر گیری کرنا تمہارا فرض ہے۔ بھائی یا بھانج کے رہنے کی وجہ سے جانا ترک مس کرنا کہ زندگی میں تمہیں ہمیشہ اطمینان قلب رہے۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد 71-71 بار سورہ فاتحہ پڑھو اور ذکا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ فرحانہ۔ کراچی

ﷺ نبی فرحانہ! بڑا ذکا اور انوس ہوتا ہے جب مسلمان گھروں کے افراد نے سب سے گھمٹے گھمٹے کر دئے والوں کے پاس جاتے ہیں۔ جہ ایمان کی شدید کمزوری ہے اور باور رکھو اللہ کے پاس بھی اس کی معافی نہیں۔ پریشانی خوشی بیماری صحت سب خدا کی طرف سے ہے۔ خوشی میں شاکر دینا اور پریشانی میں صابر رہنا ہی ایک مومن کا فرض ہے۔ اللہ سے خوب معافی مانگو۔ حسب استطاعت صحت خیرات نکالو اور ہر نماز کے بعد الحمد شریف چاروں اہل اور آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر ضرور

ذم کہا کرو۔ مجھے ایک ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کرو۔

□ ابنہا۔ بھونگی

ہذا بنی انبلا! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور ذرہ دشریف بہت پرصوم۔ میرا مقصد تمہیں پریشان کرنا نہیں ہے مگر بنی کچھ باتوں کا جانتا بہت ضروری ہے۔ میرے اندازے کے مطابق بنی! تمہارے گھر پر اثرات ہیں جو تم لوگوں کو کافی پریشان کر سکتے ہیں اور تمہاری خوشبختیوں میں رکاوٹ بھی ڈال سکتے ہیں، لہذا بہتر یہی ہوگا کہ جلد از جلد دونوں مسئلوں کے لیے مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ جب تک تعویذ نیا نہیں ہونے روز بعد نماز عشاء ایک بار سورۃ جن ضرور پڑھو۔ خط جو ابی لثانے کے ہمراہ لکھو۔

□ حضرت بنی۔ مقام نامعلوم

ہذا بنی! تم نے ایک خط میں کئی مسئلے لکھ دیے ہیں۔ بہر حال بہنوں سے کہو شادی کے لیے بعد نماز فجر ایک بار سورۃ اعراب پڑھیں۔ رزق میں برکت کے لیے سورۃ واقف پڑھنا بہت بابرکت ہے۔ جہاں تک بھائی کا تعلق ہے تو بھادج سے کہو نماز فجر اور عشاء کے بعد 11-11 بارۃ بت الکرسی پڑھ کر تصور میں شوہر پر دم کر دیا کرے۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔ مدت 41 دن ہے۔

□ ندرت بتول۔ چک شہزاد

ہذا بنی ندرت! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور ذرہ دشریف بہت پرصوم۔ بعد نماز فجر ایک بار سورۃ مزمل پڑھو اور ذمہ کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ بنی! تمہارے خواب نشانہ دہی کرنے ہیں کہ کوئی بہت قریبی شخص تم لوگوں کو پریشان کر کے خوش ہوتا ہے۔ خوب صدمہ خیرات کہا کرو۔ چلنے پھرنے گھر کے سامنے افراد ناز حضرت کا ورد کریں۔ اللہ حاجی دہا صبر ہو۔

□ آمنہ شہوار۔ بالینڈ

ہذا بنی شہوار! میں تمہارے ہر خط کا جواب بہت پابندی سے دے رہا ہوں مگر جانتا ہوں کہ تمہارے پاس ذمہ کے نظام کی صورت حال کیا ہے۔ بہر حال دل میں کسی قسم کا وہم بھی مت لانا۔ تم نو میری بہت اچھی بنی ہو۔ فون کر کے خط کی بابت دریافت کر لیا کرو۔ تم سے کوئی بھی ناراض نہیں ہو سکتا۔ کبھی کبھی فون میں بھی مسئلہ

ہو جاتا ہے۔ اصل میں سارا مسئلہ فاصلوں کا ہے۔ تم محبت کرنے والی ہو لہذا سب تم سے محبت کرنے ہیں۔ بے فکر ہو کر فون کہا کرنا کرو۔ خوش رہو! آباور ہو!

□ عروبہ غفار سلطان

ہذا بنی عروبہ! اللہ تمہیں مکمل شفا عطا فرمائے۔ دل میں وہم مت لاؤ۔ کچھ نہ کچھ رقم اپنے اوپر سے ضرور خیرات کیا کرو۔ جہاں تک بیٹی کا تعلق ہے تو تم لوگ معاملات میں خاموشی رکھو۔ کوئی فیصلہ بھی جلد بازی میں مت کرنا۔ مجھے 21 روز بعد صورت حال سے آگاہ کرو۔

□ فرحمن۔ خذو جام

ہذا بنی فرحمن! نماز فجر کے بعد ایک بار سورۃ مائدہ پڑھو اور ذمہ کرو۔ یہی عمل بعد نماز عشاء کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ انشاء اللہ ضرور حالات میں مثبت تبدیلی آئے گی۔

□ حنیفہ علی۔ لاہور

ہذا بنی حنیفہ! اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وظیفہ کرنے سے نبرد بنی تو آتی ہے اور یہی مثبت تبدیلی ہے۔ انشاء اللہ جلد کرم ہوگا۔ والدہ کی صحت اور تندرستی کے لیے دعا کر رہا ہوں۔ بے شک اس دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ وظیفہ مزید ایک ماہ جاری رکھو۔

□ گوہر بی۔ داؤد

ہذا بنی گوہر! تمہیں برا دراست بھی جو اب دیا ہے اور کالم کے ذریعے بھی جواب دے رہا ہوں۔ یقیناً تمہارے حالات بہت تکلیف دہ ہیں۔ ماں باپ کے سامنے اولاد وہم تو دے صرف اس لیے کہ خانہ نہ ہو سکے کہ پیسہ نہ ہو بہت تکلیف دہ بات ہے۔ جہاں لوگ روزانہ ہزاروں روپے ضائع کر دیتے ہیں وہاں ایسے کبھی لوگ ہیں جو اولاد کا علاج ہی نہیں کروا سکتے۔ بہر حال بننے والی باتیں اچھی سمجھ لوگ باتیں ہیں۔ تم اللہ سے مدد مانگتے رہو۔ بننے والی باتیں جو بھی ہو سکتی ہیں وہ ضرور کروں گا۔

□ انسبہ اشرف۔ حافظ آباد

○ بابا بی! میری عمر ابس وقت 45 سال ہے۔ میں نے ساری زندگی انتہائی غربت میں گزارنی۔ ماں باپ کے گھر بھی رخصتی رہی اور شوہر کے ساتھ بھی زندگی ڈکھوں ہی میں گزری۔ بابا بی! میں نے بہر حال میں اللہ کا شکر ادا

کیا گمراہ ہے۔ جب جوان بیٹوں کو ایسی دیکھتی ہوں تو بہت دکھ ہوتا ہے۔ خود کو بہت بے بس اور بے کار محسوس کرتی ہوں۔ بچے مجھے کچھ نہیں کہتے مگر میں ان کا دکھ محسوس کر سکتی ہوں۔ باباجی! اب اللہ سے شکوہ کرنے کا دل چاہتا ہے مگر پھر ڈر جاتی ہوں، کہیں دو مارش نہ ہو جائے۔ باباجی! بہت مایوس ہوں، میری مدد کریں۔

جی ہنسی انیسہ! تم مایوس ہو، اس لیے بچے بھی مایوس ہیں۔ تم نہیں جانتیں کہ مال اپنی اولاد کو کہاں سے کہاں پہنچا سکتی ہے۔ تم ان سخت حالات میں بچوں کو مقابلہ کرنا سکتاؤ۔ مایوسی تو سوت ہے۔ تمہارے حالات کبھی ایسا لیے نہیں بدلے کہ تم مایوس رہیں۔ بتاؤ اللہ اس شخص کو نوازے گا جو شدید حالات کے باوجود مایوس نہیں اور مستقل جدوجہد کر رہے یا اس کو نوازے گا جو مایوس سے اور اچھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہے؟ نبی! ہر حالت میں اللہ کی شکر گزار رہو۔ سب سے پہلے نماز کی پابندی کرو۔ زور و شرف بہت بڑا حاکم۔ نماز فجر کے بعد ایک بار سورہ جزل پڑھو اور دعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ خیال رہے، نماز کی پابندی بہت ضروری ہے۔ مجھے حالات سے ضرور دعا گوارو کہ اللہ حامی و مددگار ہو۔

□ سراب۔ پندہ دارن خان  
 ملا بیٹے سراب! میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ اپنی بیوی کا بہت خیال رکھو۔ اس سے کہو کہ بعد نماز ظہر ایک بار سورہ یوسف ضرور پڑھے۔ اپنی والدہ اور بہن کو کھانا دینے اور شوق میں توازن رکھو۔ زیادتی کرنے کا حق کسی کو نہیں۔ تمہیں اپنا رویہ سخت کرنا ہوگا، صرف اسی رویے سے گھر میں سکون ہوگا، گھر میں سکون ہوگا تو روزی میں بھی برکت ہوگی۔ جب جب یاد آئے وہاں حافظہ یا حافظ کا ورد کیا کرو۔

□ ام عائشہ! سلام آباد  
 0 باباجان! السلام علیکم! آپ سے مسلسل رابطے میں رہتی ہوں اور اللہ کا بڑا احسان ہے کہ آپ کی بددلت بہت دفعہ مشکلات سے بھی بچی ہوں۔ بے شک بڑوں کا سایہ بہت ضروری ہے۔ باباجان! آپ تو جانتے ہیں کہ میرے مسائل والے مجھے بہت تنگ کرتے ہیں۔ شوہر بھی انہی کا ساتھ دیتے ہیں۔ میں کچھ بھی کر لوں سب

کے منہ بنے رہتے ہیں۔ انہی سیدھی شکایتیں شوہر سے کرتے رہتے ہیں اور وہ مجھ سے بات پوچھے پناہوں منہ بنائے پھرتے ہیں پھر مجھے بھی غصہ آتا ہے اور میرا سارا غصہ بچوں پر اترتا ہے۔ ان کو مارنے کے بعد مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ باباجان! مجھے بتائے کہ کیا میں کسی کی بچی نہیں؟ کیا میری کوئی عزت نہیں؟ جب میں دیکھی ہوں تو کس سے کہوں؟ شوہر بھی بات نہیں سنتے۔ باباجان! زندہ رہنے کا ہی دل نہیں چاہتا۔ کوئی خوش، خوش نہیں لگتی۔ ہر وقت لوگوں کی تار دیکھنی کا خوف رہتا ہے۔ مجھے کوئی ایسا وظیفہ نہیں جس کی بددلت میں بھی سکون سے رہ سکوں۔

ملا بیٹی عائشہ! ایک بات تو ذہن میں رکھنا کہ زندگی اللہ کی آمانت ہے۔ جب اللہ چاہے گا، اپنی آمانت واپس لے لے گا، لہذا باندوں کو یہ فکریں ہونا چاہیے کہ زندگی کو کب اور کیسے ختم کیا جائے؟ جہاں تک دوسرے مسئلے کا تعلق ہے تو نبی! ہم ہر وقت ہر کسی کو خوش نہیں رکھ سکتے۔ اچھائی کی امید اللہ سے رکھو۔ بندہ کہاں اس قابل کہ کسی کو کچھ دے سکے؟ جتنا بس میں سے دو کرو اور صلہ اللہ سے چاہو۔ نماز کی پابندی رکھو، زور و شرف جہت پڑھو۔ جس قدر ممکن ہو سورہ الفاتحہ کا ورد کیا کرو۔ حسب استطاعت صدقہ خیرات ضرور کرو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔

□ نور حسن۔ گوجران  
 0 باباجی! میں مانی طور پر بہت پریشان ہوں۔ گھر سے دور پڑا ہوں صرف روزی کے چکر میں مگر پھر بھی حالات تنگ ہی رہتے ہیں۔ گھر والے پکوال میں ہیں۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی بیماری یا پریشانی رہتی ہے۔ مجھے کبھی لگتا ہے جیسے کسی کو میری ضرورت نہیں صرف پیسا اہم ہے۔ ماں باپ ہوں! ماں بہن بھائی یا بیوی بچے سب مجھ سے پہلے اپنی ضرورت کی بات کرتے پھر مجھے پوچھتے ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے پوچھنا ہی بھول جاتے ہیں۔ مجھے یہ احساس اب شدت سے ہونے لگا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ اب ملک سے باہر چلا جاؤں اور کسی دانہس نہاؤں۔ صرف پیسا بھینچتا رہوں۔ باباجی! میں نے اپنا دکھ کبھی کسی سے نہیں کہا۔ آپ کا کالم پڑھ کر دل چاہا کہ آپ سے اپنا دکھ کہوں۔ باباجی! میں بہت جمالی عمر سے محنت مشقت کر رہا ہوں اس لیے محنت کرنے سے نہیں گھبرا



بہت سارے مسائل حل کر دیتا ہے مگر پھر بھی ہم میں سے  
بیشتر کو اپنے ملک کی قدر نہیں۔ یعنی تم ملتے پھرتے یا غرضی  
یا غرضی نکالو کر دو۔ کو کھس کر دو کچھ نہ پوچھو مگر ضرور خیرات  
کر دیا کرو۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے مطلع کرو۔

□ ناہید ورگ۔ لہور الائی

○ پیارے باباجان! السلام علیکم اہل ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ  
اپریل 2013 سے میری امی کے گھر مسلسل چوریوں  
ہو رہی ہیں۔ کچھ میں نہیں آ رہا کہ یہ چوریاں کون کون کر رہی  
ہیں؟ کیونکہ گزشتہ سولہ سترہ سال سے ہمارے گھر میں کبھی  
کوئی چوری نہیں ہوئی کیونکہ سب کو پتا ہے، ہم بہت  
غریب لوگ ہیں۔ ہم ماں بیٹیاں گھروں میں بھلا ڈرتے ہیں تاکہ  
کام کر کے گزرا رہ کر رہیں۔ ہمارا ایک ہی بڑا مکانی ہے  
جو کہ کچھ بگڑے ہوئے لوگوں کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ وہ  
اپنی کمائی کا کوئی نیکو کام نہیں دیکھا جاتا۔ ہماری امی  
نے بہت محنت سے ایک ایک پائی جوڑ کے ایک لاکھ دس  
ہزار روپے جمع کیے ہیں۔ وہ میری چھوٹی بہن کی شادی  
کرنا چاہتی ہیں۔ وہ بیسوا چور لے گیا۔ مجھے سنے کے بعد  
دو بارہ چور آیا، تب ہماری امی کی پانچ ہزار کی تنہائی تھی وہ  
کبھی چور لے گیا۔ اس کے تقریباً تین مہینے بعد پھر سے چور  
آیا۔ اسے چھوٹی مالین میری امی نے پھرتے خواب میں  
دیکھا، چور چھوٹی مہرے چور آیا ہے اور گھر کا سامان لے کر جا  
رہا ہے کیونکہ کبھی مرتبہ چور آیا، آنے سے پہلے ہماری امی  
نے خواب میں دیکھا ہے۔ باباجان! ہم کرائے کے مکان  
میں رہتے ہیں۔ اس ہنگامی کے زمانے میں ہم مکان میں  
نہیں بدل سکتے۔ برائے مہربانی آپ اس مسئلے کا حل تجویز  
فرمائیے۔ ہم کچھ اور نہیں چاہتے، ہم صرف یہ چاہتے ہیں  
کہ یہ مسئلہ چوریوں کو جائیں کیونکہ ان چوریوں کی وجہ  
سے ہم کوڑی کوڑی کو بیخواب ہو گئے ہیں۔ قرضہ پڑھتا جا رہا  
ہے۔ ہمارے جتنے بھی رشتے دار ہیں، سب ہمارے دشمن  
ہیں۔ جن لوگوں پر شک ہے، ان لوگوں کے نام لکھ دی  
ہوں۔ آپ ہمیں ایسا اور دیکھیں جو ہم جلتے پھرتے پڑھ سکیں  
کیونکہ دیکھتے پڑھتے کا ہمارے پاس ہتھیار نہیں ہے۔  
ہلا ہوا ناہید! جب جب یاد آئے، آیت الکرسی  
ضرور پڑھا کرو۔ پیسوں کے بارے میں اپنے بھائی سے  
پوچھو۔ باہر والا کوئی نہیں ہے۔

مگر چاہتا ہوں کہ کم از کم میرے اپنے تو مجھ سے محبت  
کریں۔ صرف مجھے ضرور تمہارا پوری کرنے کی مشین نہ  
کھینیں۔ آپ مجھے بتائیے اگر میری سوچ غلط ہے تو پھر  
میرا دل و ذہن دونوں صاف ہو جائیں؟

ہلا ہوا ناہید! میرا تم مجھے اپنا بڑا جان کر اپنا مسئلہ بتا رہے  
ہو، لہذا میرا بھی فرض ہے کہ تمہیں بڑوں کی طرح مشورہ  
دوں۔ افسوس یہ ہے کہ آج کل ہر جگہ سے، بچوں کی طرح اپنا  
دوہہ دیکھتے ہیں۔ بیٹے! تمہاری سوچ غلط ہے۔ لوگ اپنی  
ضرورت انہی سے کہتے ہیں جو اس کا قائل ہوں کہ ان کی  
ضرورت پوری کر سکیں۔ ہر شخص ہر کسی کے سامنے اپنی  
ضرورت نہیں رکھتا صرف جن پر بھروسہ کرتا ہے اور محبت  
رکھتا ہے ان سے کہتا ہے جیسے تم نے اپنے دل کی بات مجھ  
سے کی کیونکہ تمہیں یقین ہے کہ میں تمہیں درست مشورہ  
دوں گا اسی طرح تمہارے گھر والوں کو تم پر یقین ہے۔ ان  
کے یقین کو مت توڑو۔ کہتے سارے لوگ تم سے درست  
ہیں۔ اپنے تمام رشتوں کو سنبھال کر محبت کے ساتھ چلو۔  
خوشی خوشی اپنی ذمے داریاں پوری کرو۔ نماز ضرور پڑھا  
کرو۔ جتنا اللہ کو یاد کرو، گھر آتا ہی دل کو سکون ملے  
گا۔ رشتوں پر اعتماد بڑھے گا۔ وہم کو دل میں جگہ مت دو۔  
خوش رہو۔ زندگی بہت مختصر ہے۔ بیٹے! وہم پال کر اس کو  
ضائع مت کرو۔ میری بات کا کیا اثر ہوا مجھے ضرور بتاؤ۔

□ عندلیب۔ گنڈیوا

○ باباجانی! میں بہت دور سے آپ کو خط لکھ رہی  
ہوں۔ امید کرتی ہوں کہ تم جی فرارے میں جواب دیں  
گے۔ میں اور میرے میاں قرضوں کی وجہ سے بہت  
پریشان ہیں۔ بچے چھوٹے ہیں، اس لیے میں جواب نہیں  
کر سکتی۔ میرے شوہر جو کہ کھانے پینے اور گھر پر بھی خرچ  
ہوتا ہے اور پاکستان ماں باپ کو بھی بھیجتے ہیں۔ اس کے  
بعد ہمارے پاس کچھ نہیں بچتا بلکہ قرضہ نما بڑھ جاتا ہے۔  
باباجانی! یہاں زندگی بہت مشکل ہے مگر پاکستان میں بیٹھے  
رشتے دار نہیں سمجھتے۔ مجھے آسان سا دھندو دینا تاکہ میں  
بچوں کے ساتھ آسانی سے زندگی گزار سکوں اور قرض  
اتہار کر سکوں۔

ہلا ہوا عندلیب..... اے شک پروریں میں زندگی  
بہت مشکل ہے۔ اپنے ملک میں اپنیوں کے درمیان رہنا

میری بہن کا۔ بہن کا مسئلہ یہ ہے کہ اس کی شادی چھوٹی کے لڑکے سے ہوئی ہے۔ شادی کو 9 سال ہو گئے مگر کوئی اولاد نہیں ہوئی، جس کی وجہ سے اس کا خاندان اور ساس لڑتے ہیں۔ باباجی امیر کی والدہ والدہ وراثت پا گئے ہیں، جس وجہ سے انہیں کوئی روکنے توکنے والا نہیں۔ باباجی! بہن کو کوئی ڈاکٹر وغیرہ دکھا لیا مگر اس میں کوئی خالی نہیں اور نہ ہی خاندان میں خرابی ہے۔ باباجی! ایک مولوی نے اس مسئلے کو بہن پر بندوبست کی کا سبب بتایا ہے مگر وہ مولوی میر پور خاص میں رہتا ہے۔ وہاں اس کا خاندان نہیں جاتا۔ باباجی! آپ میری بہن کا کوئی علاج کریں۔ دو کم کے بارے کا ٹکا ہو گیا ہے۔

باباجی! میری بہن پانچ اہت کی نمازی اور قرآن پاک پڑھتی ہے پھر اللہ نے اسے کن آفتوں میں ڈال رکھا ہے؟ باباجی! میرے چاچو کے ساتھ بھی یہ مسئلہ تھا ان کے بھی بارہ سال تک بچے نہیں ہوئے تو انہوں نے 3 سال تک عبداللہ شاہ ڈھمائی گئے دربار پر حاضری دی پھر ان کی اولاد ہوئی۔ باباجی! میرے گرم میری بہن کا علاج کریں۔ بھائی آپ کو مرتے دم تک دعا میں دے گا۔ باباجی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے کراہی آئے ہوئے 5 سال ہو گئے مگر روزگار کے حوالے سے کوئی خاص کام نہ کر سکا، جو کم از کم بیٹاری کی نذر ہو جاتا ہے۔ کبھی سینے میں کبھی گردے میں کبھی پیڑوں میں تو کبھی سارے بدن میں درد ہوتا ہے۔ رات کو سردی سے بخار چڑھتا ہے، کبھی ڈراؤنے خواب اور کبھی حقیقت میں کچھ چیزیں نظر آتی ہیں۔ اگر میں نماز پڑھنے لگتا ہوں تو سر میں درد اور سینے پر دباؤ سار ہوتا ہے۔ باباجی! میں اندرون سندھ کا رہنے والا ہوں، جہاں ہم رہتے تھے وہاں پہلے بندوبست کا مرحلہ تھا۔ یہ ہم نے لوگوں سے سنا ہے۔ باباجی! کوئی ایسا عقیدہ دیں جو یہ سب دور ہو جائے۔ باباجی! مجھے اور بہن کو کبیرے کی بیماری ہے۔ مجھے تو زیادہ یہ سینے پر گرتا ہے۔ باباجی! سنا ہے جس کے اوپر سائے کا اثر ہوتا ہے انہیں سینے گردے، کھلم کبیرے وغیرہ کی بیماری ہو جاتی ہے۔ ہمارے ساتھ بھی ایسا معاملہ ہے۔ باباجی! ہمیں بیماری کی دوا اور ایسے عقیدے بتا دیں جس سے یہ آفت دور ہو جائے۔ باباجی! میرے کاروبار کا بھی کچھ کریں جو میں خود اپنا کام کر لوں۔

بھائی شاہ حسن! اپنی بہن سے کبوتر نماز عشاء کے

باباجی! میں بہت مصیبت میں ہوں۔ کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟ باباجی! میں پسند کی شادی کرنا چاہتی ہوں۔ میرے گھر میں تمام لوگ اس رشتے پر تیار ہیں، بس ایک بڑا بھائی ہے جو کہتا ہے کہ تمہارا رشتہ خاندان سے باہر نہیں کرنا۔ باباجی! ہم نے استخارہ بھی کر دیا تھا وہ بھی بہت اچھا نکلا ہے۔ لڑکے کے گھر والے بھی اس رشتے پر تیار ہیں۔ وہ تو اس سلسلے میں ہمارے گھر آنا چاہتے ہیں، لیکن بڑا بھائی انہیں رہا۔ باباجی! آپ کوئی ایسا وظیفہ دیں کہ میرا بھائی فوراً مان جائے۔ باباجی! میں ڈاک کے ذریعے جواب نہیں منگوا سکتی۔ آپ رسالے میں میرے مسئلے کا جواب دیں۔ یہ کام فوراً ہونا چاہیے کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ بھائی میرا رشتہ کیسا اور نہ کریں۔ میری شادی کی عمر بھی نکل رہی ہے۔ باباجی! میری مدد کریں، میں کیس اور شادی نہیں کرنا چاہتی۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ ہاں ماہ میرے مسئلے کو شائع کریں۔ اللہ آپ کو کئی زندگی دے۔ یہ خط آپ طلبہ۔ کویٹ کے نام سے شائع کرنا۔ باباجی! میں بڑی امید لے کر حاضر ہوئی ہوں، میرا مسئلہ ضرور حل کرادیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ مجھے وظیفہ ضرور بتادیں۔ باباجی! میں چاہتی ہوں کہ میں کوئی نفاذ قدم نہ اٹھاؤں، سب کچھ ٹھیک طریقے سے بڑوں کی رضامندی سے ہو۔ اللہ آپ کو اس کا نیک اجر دے۔ (آمین!)

بھائی زریں! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور ذر ذر شریف بہت بڑھو۔ نماز عشاء کے بعد ایک بار سورہ شمس پڑھو اور دعا کرو۔ مدت 14 دن ہے۔

□ شاہ حسن - پریس

باباجی! السلام علیکم وعلیٰ آہل بیتہم وعلیٰ آلہم! اللہ تعالیٰ آپ کو خیریت سے رکھے اور آپ کی عمر دراز کرے۔ (آمین!) اور آپ کو یوگی درد کے ارادوں کا علاج کرتے رہیں۔ باباجی! میں نے پہلے بھی آپ کو خط لکھا مگر آپ نے جواب نہیں دیا جبکہ خط کے ساتھ جیہ بھی بھیجا تھا۔ باباجی! اس خط کا جواب ضرور دیجیے گا آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ باباجی! میرے دوست ہیں ایک میرا اور ایک

بہن دو مہر کی بات سمجھتی تھی نہیں۔ میرے بچے بھی نماز پڑھتے ہیں مگر ان پر اثر نہیں ہوتا، اس وجہ سے ہمیں میں کافی پریشان ہوں۔ ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ میرے بہن بھائی آپس میں اداش رہتے ہیں، اس کے لیے ہمیں کوئی درد بتادیں۔ باباجی! مہر کی ایک بہن جس سے مجھے بہت محبت ہے، وہ مجھ سے نہیں ملتی۔ میں ان کے گھر جانی ہوں تو غصہ کرتی ہے۔ فون کرتی ہوں تو جواب نہیں دیتی۔ چارے باباجی! ذرا فرمائیے کہ اس کی رشتہیں دور ہوں اور وہ مجھ سے ملنے لگے۔ (آمین!)

☆ بی بی گلزار.....: صلہ رحمی بہت اچھی بات ہے ہم اپنی بہن کو بھگاد کر قلعہ جی اللہ کو پسند نہیں۔ کسی عزیز سے کہہ کر آپس سے تعلق منگوانا اور سر دھونے کے بعد جزوں میں بہ تیل لگا کر فائدہ ہوگا۔ بیوی برا کھد شریف اور چاروں فل پڑھ کر دم کرتی رہا کرو۔ ہر نماز کے بعد 3 صحیح "اللہم ھدی صبری یقین" پڑھو اور ذرا کرا۔ مدت 41 دن ہے۔

☆.....☆

بہن ایک بار سوڑا انبیاء پڑھے اور دعا کرے۔ بچے اُم احمد شریف اور چاروں فل پڑھ کر دن میں 3 سے 4 بار اپنے اوپر ضرور دم کرو۔ رات کو سونے سے قبل ایک گلاس گرم ذرا دھنسم اللہ پڑھ کر ضرور پو۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔ ابھی فی الحال تونہ کی ضرورت نہیں۔

□ گلزار۔ چچو کی ملیاں

○ محترم باباجان! السلام علیکم! باباجان! میں نے آپ کے دیے ہوئے درد کو پڑھنا شروع کر رہا ہے۔ آپ لیٹیں کریں، مجھے کافی سکون ملا ہے۔ باباجان! میں نے کچھ عرصے پہلے آپ سے بچی کے رشتے کے لیے تونہ بزا در بال لیے کرنے کے لیے ذرا منگوائی تھی مگر آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چارے باباجان! براہ راست کرم بچی کے رشتے کے لیے کوئی تونہ بزا درساں کر دیں اور یہ بھی بتائیں کہ بالوں کے لیے کون سی خاص غذا بائیں استعمال کریں؟ باباجان! مہر سے شوہر کی ترفی کے لیے ذرا فرما دیں، اور یہ دعا بھی فرمائیے کہ وہ نمازی بن جائیں۔ میں نماز کے لیے کئی زور دینی ہوں

## علاج اور مکمل شفاء

مہر سے عزیزو!

اللہ تعالیٰ: سب کو اپنی امان میں رکھے۔

☆ اگر آپ اپنے طلق اور گلے کے سانس اور دوسری جلدی بیماریوں سے پریشان ہیں؟

☆ اگر آپ بالوں کی بیماریوں، سکرٹی اور بال خورد سے توجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

☆ اگر آپ دانوں کی گونا گوں تکالیف میں مبتلا ہیں۔

☆ اگر آپ موٹاپے جیسی موذی بیماری کا شکار ہیں۔

آپ سب کے لیے خوش خبری ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے ان تمام عوارض کا مکمل علاج اور دوا نہیں موجود ہیں۔ ان شاء اللہ شفا ہوگی۔ علاج معالجے اور دواؤں کی طلب کے لیے جوابی لٹائی کے ساتھ اپنا مسئلہ نقل فرمائیے۔

110 257 287 کریمہ ٹیٹ روڈ چار ساکھڑا ڈیرہ



## غزل

بھری آنکھوں کے ہوا کی روانی کیوں نہیں دیکھتی  
 اُسے اجڑی ہوئی بھری جوانی کیوں نہیں دیکھتی  
 مرا کردار شامل دو اگرچہ کیوں نہیں کرتا  
 اُسے یہ غم زور مری کہانی کیوں نہیں دیکھتی  
 کہ جس پر دل کی دیا بھی لگائی جا چکی بھری  
 میرے دل پر اسی کی حکمرانی کیوں نہیں دیکھتی  
 میری آنکھیں سگلتے رشت کی صورت ہوئیں آخر  
 کسی کے پیار کی کوئی نشانی کیوں نہیں دیکھتی  
 زانہ جاتا ہے میں اسی سے پیار کرتی ہوں  
 اُسے میری محبت راجہ دھانی کیوں نہیں دیکھتی  
 جہاں بھرتے دو کہرتے ہیست ہی پیار کی باتیں  
 اُسے اپنی یہ تمثیل بھی دانی کیوں نہیں دیکھتی

شاعر: تمثیلہ لطیف، جدو حال

دیر سے لولنا نہیں کرتے

کہا تھا!

گھر دیر سے لولنا نہیں کرتے

نئی کھسیا، نئے چہرے

نئے اب لوگ بہت ہیں

تہہ دار منتظر نہیں کوئی

تہہ دار بھرتی نہیں کوئی

تھیں مہن گھر میں رہنا ہے

مگر اک اجنبی بنا کر

تم ہا ہو گے بھی تو کوئی

تہہ دار میں نہیں سکتا

کہر مٹتی ہی بنانے میں

## غزل

جانا تیرے مرا ہر جگہ کئی صدیوں پہ بھاری ہے  
 تمہاری یاد میں جلی قیامت مجھ پہ طاری ہے  
 بہت سے گل ہوئے گل شب تہہ داروں نہ آیا  
 یہاں لفظوں میں کہے ہو کہ مجھے شب گزارنی ہے  
 جو اپنے آپ میں ٹھوکر ہیں بھی بھول جاتا ہے  
 بھاری زندگی ہر بل اُسی کی یادگاری ہے  
 زمانے کو بچ کرنا بہت آسان تھا لیکن  
 خرد اپنی زندگی تم سے تیری جاہت میں باری ہے  
 تمہیں پانے کو نالہ نے بہت صدمے اُٹھائے ہیں  
 تمہارے واسطے ہر اک خوشی ٹھوکر پہ ماری ہے  
 شاعر: نالہ نہیں۔ کراچی

## غزل

خوشی کا نکات مرثی اے زہرہ تیشال  
 غزال کے ہر صدمے میں گھوں تیرا زہرہ جلال  
 کتنی مندو آنکھیں تیری کتنے مندو ہال  
 کتنے مندو ہونٹ ہیں تیرے لال گاؤں گال  
 کتنا مندو کھنڈا تیرا کھڑے پہ اک خال  
 کتنی مندو چلیں تیری آبرو توک بادل  
 کتنے مندو جاے تیرے کتنی مندو شامل  
 کتنی مندو جھاٹت تیری کتنی مندو چال  
 دھم دھم لچے تیرے کتنی مندو کال  
 کتنے مندو تیرے دل کی دھڑکن کے سر ہال  
 تو کلفت خور شامل دہر ہا کمال  
 ”جی آجک میں زعفرانہ پاپا تھی کوئی مثل  
 شاعر: عبدالغفور بھٹی۔ آجکوال ہٹی



عمر ایست جانی ہے  
میرے سامھی کیا تھا نا  
دہرت لو نا نہیں کرنے

شاعر: شائستہ جمال کراچی

موصوم دستک

وروازے کی دستک پر  
دو مصوم دہرائی بیچ  
جن کے ہاتھوں میں  
جلنے گلاب کھلتے ہیں  
جن کی آنکھیں بھی خواب بنتی ہیں  
کہ؟!

وہ کہا ہیں جنہیں پڑھنا چاہیے  
دو مصوم بچپن سے بیٹھا تھا ابھی  
نہ جاتے کیوں!!  
کھوٹا کھیا

انٹاس کی راہوں میں  
اے دل تو ہی تھا!!

کہا میرا بچپن کئی ہے؟  
جس کے مصوم بچپن میں

ہر فن خواہشیں ہیں میں وہی کی سکیاں ادا رہیں ہیں  
جنہوں نے میرے رہن سہن کی سبیل کے خواب دکھائے تھے  
وہ دکھارے وہی ہیں  
جوا نگھوں کو خندک پہنچانے تھے  
وہ نام سے ہی دل کے ساتھ فوت گئے

جنہیں سوتے سوتے میری روح تک گھاٹیں ہو گئی ہے  
میری خاموشی آنکھیں تم سے سوال کرتی ہیں!!  
میرا بچپن لو نا دو مجھے!! ادا دو مجھے.....  
میرا بچپن.....؟

شاعر: شبنم ناز کراچی

عید کا چاند

کسی کا چمن کسی کا فرار عید کا چاند  
کسی کے واسطے لایا بہار عید کا چاند

کبھی کو ایک سی ماہ میں لایا پروا ہے  
کہ مجھے بن گیا ہے جگنو پار عید کا چاند  
انگ ہی روٹھیں گھڑی ہنسا جا بجا ہر شو  
سٹائے گھوڑے گئے سب ہزار عید کا چاند  
کھینتا پہ بندھی کیسکی چڑیاں کھینکا خوشبو  
کھینکا پہ پار کھینکا پہ شگھار عید کا چاند  
مقام وقت بہت ظلمتوں میں کاٹا ہے  
مٹائی تیرگی لایا گھمار عید کا چاند  
یہ عید عید رہے اور سب رہیں شاداں  
بچا دعا ہے کئی ہے پکارا عید کا چاند  
شاعر: فریح علی کراچی

اکیلی ہوں

دیکھ حورا میں اب بھی اکیلی ہوں  
سارے بچاں میں شوہر ہی اپنی سوتیلی ہوں  
دردو ان کا ساٹھاں سمجھا تھا  
شاہد خرابوں میں ان سے لٹی ہوں  
تمام ہم سفر میرے سامنے کے ساتھ تھے  
مفرحت میں بچھڑ بھی اٹلی ہوں  
کمرے کی گھڑکی کھلی ہے اب تک  
تیرت شبن، تیرے انتظار میں تلی ہوں  
پر چنے پر منظر میں تو ہی تو  
نہم نہادی نہ آج بھی برلی ہوں  
گلاب بھی تجھوں میں پناہ لیتا ساحل  
زمانے میں جنگ، شعور خالی ہوں

شاعر: ساحل ایزد ذرا بھد یادلو چستان

جانے والے

دوران دوران سا چہرہ اور دستوں آکھیں  
آنسوؤں سے پوٹھل پھیں  
آج: اول کا داک کونا  
نیا ہی تصور باتوں میں تھامے  
سوج رہی ہوں کہ  
تم کب آؤ گے واہیں



کب آئیں گے ہماری بنائیں  
خوشیوں بھرے لحاظ  
کب کھلے گی ہمارے دل کی کلی  
کب ہوگی زندگی میں سرسوزی کی بادشاہی  
کب تم کہیں گے لگا کر اک دو بے کو کھے  
"عید مبارک"  
مکرو!

منی میں سوجانے والے  
بھناکب واپس آتے ہیں

شاعر: سدرہ انور بی۔ بھنگ صدر

اے میرے وطن

اے برے وطن تجھ کو ایسے سنواروں  
تھی ایک دلہن سا تجھ کو نکھاروں  
کہ خونِ جگر سے کھلاؤں ترے گل  
نو سینہ خدو پہ سجاؤں تیرے گل  
پہ سبز جو سینہ سنگ سے اٹھے ہے  
چشمین لنگ بھی کہیں پہ بچکے ہے  
پہ لنگ جگر تیرے ماتھے کے بچکے  
ہیں تیرا کشش کو بلا جانے کے سینے  
ہے عصمت تری ابرو ہم کو بہاؤں  
ترا پتا پتا ہو خد برک جیسے  
بوللا گل تیرا پر پھول جیسے  
میں اپنی پہ گل زندگی تجھ پہ واروں  
میں توئی ترخ جھڑوں میں پھر ملاؤں  
لنگ پر ترا نام لکھ جس سے پاؤں  
کہ فہرے گا کڑ آسمان زمیں پہ  
نہ پھر تاب لانے گا سورج کہیں پہ  
کہ امم <sup>مختصہ</sup> ہے بنیاد تیری  
ہے وطن خداداد بچان تیری  
نئی کوئی زمین کا کہا روپ ہوگا  
جو تیرا حافظہ وہ غبور ہوگا  
شاعرہ: کنسالا احمد شہ۔ کراچی

شعر عید  
کتنی عیدیں گزر چکیں تم بن  
اب خدا کے لیے نہ نپٹاؤ  
دیکھو پھر عید آنے والی ہے  
عید کے ساتھ تم بھی آنا  
شاعر: کاشف عید کاوش۔ بدھ سوری بنگلہ رام

تھر کے معصوم بچوں کے نام

ماڈن سے اپنا ہیرو جھپکے چلے گئے  
کچھ بچے خرقہ کی پٹیاں بچھا کے چلے گئے  
ہے کر بلا کا باک ہے ہر فرقہ کوئی دشت  
حکم اہل کو فرض دکھا کے بچے چلے  
کھلے گئے ہیں جھوک کے قدموں تلے یہ پھول  
بر جبر سے نقاب بنا کے چلے گئے  
چھوڑا ہے اڑھا دردہ کسی اور کے لیے  
پانی کا رزق خود ہی بہا کے بچے چلے  
ام ہے فریسی اپنے فریسی کچھ میں خوش بہاں  
بدر دلوں کا دن دکھا کے چلے گئے  
شاعر: ام ہے فریسی۔ ذنی آئی خان

غزل

ایسا نہیں کہ شمس کا شيطان مرگیا  
شيطان تو ہے زندہ ہاں انسان مرگیا  
عبدوں میں سر بٹکانے کی فرمت نہیں رہی  
مومن کی روں میں تو مسلمان مرگیا  
سچہ تو کچا بن گئی اور شاندار بھی  
کچا جی رہا گیا چاہیں ایساں مرگیا  
باہل کو جھوت کہنے کی طاقت نہیں رہی  
ہو حق کا سر بلند یہ ارہاں مرگیا  
شاعرہ: کنول تازہ بھگت۔ راجپاں

غزل

عجبت کہ امر کر جاؤں گی  
ان بات سے نہ میں سکر جاؤں گی

کوئی بس دہرادوہنا ہے کوئی سرد بار داتا ہے  
شاعر: نصرت سرفراز۔ اسلام آباد

ہائیکو

صرف چند روزوں نے  
زندگی بدل ڈالی

آج اس نے "ہاں" کہہ دی

شاعر: مسعود شبیم چوہدری۔ گوجرانوالہ

اک شخص

کل بات بے بات جو نہیں رہا غنا  
اندو سے بہت بھرا برا لگ رہا غنا  
سہری آمد سے وہ کیوں بولکھا غنا  
جو کسی کام کے بھانے محفل سے اٹھ رہا غنا  
شاعر: عزیز بن شبیم۔ کراچی

غزل

بٹھا ہے زسے اجرنے انعام مسلسل  
ہوتا ہے زری باؤ کا ایہام مسلسل  
مجھ بے کس وقادار کو لگا ہے دلاسہ  
آتا ہے زسے در سے جو چٹام مسلسل  
دہا کے غلوں سے مجھے پیادہ ہے تراغم  
آئی ہی نہیں اس چسبھی شام مسلسل  
بہ فریب محبوب ہے چکوں کو بچھاؤ.....! مسلسل  
لازم ہے ہر اک کام سے اکرام مسلسل  
بجائے میں کافر و مومن کی فہمیں چٹان  
سانی کی نکابوں سے چلے جام مسلسل  
اس دل کی نصیبوں پہ زری یاد کے طائر  
ون وات چلانے ہیں یہ کہرام مسلسل  
پہل کی دکاہوں میں ٹھکتا ہوں میں ناخن  
کرتا ہوں "فتیروں" کا جو اکرام مسلسل

شہر میں ہے آج اپنے شعر کا چڑھا بہت  
کیوں کہ اس میں پیار تم لکھا ہے اودھک بہت  
شاعر: عمران ناخن۔ کابل پورسوی، مصر و انک

تم سے محبت ہے نہ محبت مجھے  
بہ جھوٹ بول کہ کدھر جاؤں گی  
بار مان لی میں نے جو کہنی تھی  
غم نہ لے تو مرجاؤں گی  
تم بے وفا ہو یہ جان کر میں  
سین کر دیکھ جاؤں گی  
لوگ محبت سے ڈونے ہیں عاٹا  
نہر لے میں اس میں آرز جاؤں گی  
شاعر: جانشین فرحان۔ شاہ پور، بہاول نگر

غزل

شب بھر کے بعد دیکھے ہیں سنے سہانے کہاں  
وہ چلا گیا اس کی باہریں ہیں جانے کہاں  
ابھی اک لہلا میں خمیری ہوئی ہوں  
مجھے آنے ہیں تیرے خواب دنانے کہاں  
اس خود غرض کی باؤ کو چھاؤں کہاں  
بے دقاؤں کے لیے ہیں صنم خانے کہاں  
تیرے ہانوں میں ہاتھ ڈالے میں چلنی تھی  
ڈھونڈنی ہوں، اب وہ ڈونے کہاں  
تیرے نام کا جگ لے پھرتی ہوں  
انگٹے سے بھی ملیں گے وہ نسانے کہاں  
شاعر: انصاری تکیں۔ شاہ پور، بہاول نگر

غزل

جھوٹ بھی بولے تو ابتہاد آتا ہے  
اس کی باہریں پہ پیاد آتا ہے  
کسی نے آج دو دل پہ ایسے دستک دی  
جیسے شب غم میں کوئی رقم شمار آتا ہے  
طویل شب کے بعد وہ لوٹا تو ہوں لگا  
سہری محبت میں دلوں جہان بار آتا ہے  
مشق میں ہم تو غالب کے طرف دار ہے  
کہ ہم کو ان کے غنیے پہ پیار آتا ہے  
تیرے دہار کے شانیں ہیں جیسے بھی ہیں ہم دار

## اس باہ کی خاص کہانی

### فیض عشق

احمد جاوید

عشق کے مناظروں کے لیے عشق میں ڈوبی ایک خاص الماس کہانی

.....

#### فصل نمبر 3

”اس کا گھر..... چلو، جس نہیں اس کے گھر لے چلا ہوں۔ آپ آؤ۔ اور دفتر میں بیٹھو۔“ بھاء، مجھ سوچنے ہوئے کہا۔ مادی رکھنے سے اجزی۔ پس کھول کر اس میں سے ایک بڑا نوٹ نکال کر رکھنے والے کو ربا اور دفتر میں آگئی۔ اس نے اپنا فون نکال لیا مگر آخرت بات کر سکے۔

”جی۔! کیا اختر کو فون کرنے لگی ہو؟“ بھاء، مجھ نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”جی۔“ اس نے انتہائی اخلاص سے کہا۔

”ابھی ٹھہر۔ میں معلوم کر رہا ہوں۔“ بھاء، مجھ نے کہا اور دفتر سے باہر آ گیا۔ اس نے اپنے سبل سے شعیب کے گھر کا نمبر ملا، ڈراما اور میں زہیدہ خانوان نے فون اٹھا لیا۔

”خیر بت تو ہے، بھاء، مجھ نے فون کیا آپ نے؟“

”اوہ آپ کو پتا ہے، لیکن اپنا شعیب جو ہے۔۔۔“

آخر کے ام سے شاعر نے کہا۔ ”اس نے کیا۔“

”ہاں..... ہاں..... ہوا کیا ہے۔“ پریشان ہوتے ہوئے بولیں۔

”اسے ملنے کے لیے ایک لڑکی یہاں در کتاب میں آگئی ہے۔ دفتر میں پہنچی ہے۔ اب یہاں شعیب تو ہے

نہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی ہے، کیا کروں اس کا؟“

”لڑکی آگئی ہے۔ اس نے شعیب کو فون نہ نہیں کہا ابھی تک.....“ زہیدہ نے پوچھا۔

”پتا نہیں۔۔۔ گھٹا ہے نہیں کہا ہوگا، اور نہ دوپہں گھر جانے کی بات نہ کرنا..... اپنے اختر کے.....“ بھاء، مجھ نے خاصا پریشان ہو گیا تھا۔

”ات سمجھا بھاء، کہ وہ اس بیچ رہیں۔“ زہیدہ نے کہا

”ابے کیسے بیچ دوں، لیکن۔ کوئی اس کے بارے میں معلوم نہ ہو۔ میں نے تو اب کو اس لیے فون کیا ہے کہ شعیب اپنی رور ہے، اسے کہا پریشان کرنا، پھر اپنی لڑکی ہے۔ کچھ پتا تو چلے اس کے بارے میں۔ اب میں اس سے کہا پوچھوں؟“ بھاء، مجھ نے بے بس لہجے میں کہا

”اگر ایسی بات ہے تو بھاء، مجھ سے یہاں میرے پاس ہی پوچھو اور میں۔ پتا نہیں کہاں سے آئی ہوگی۔ فون کر کے شعیب ہی کو پریشان نہ کرے۔۔۔ آپ بس ات میرے پاس بیچ رہیں۔“ زہیدہ خانوان نے تیزی سے کہا اور فون بند کر رہا۔

کچھ دیر میں بھاء، مجھ نے ہوشا کر اپنی گانا ٹی میں شعیب کے گھر پہنچا اور اپنا۔ زہیدہ خانوان اس کے انتظار ہی میں تھی۔ مرن اس خاتون کو کچھ کچھ لگ گیا۔ اسے ہوں





نوجوان پولیس آفسر اس کے قریب آ گیا اور پوچھا۔  
 ”جی۔ آپ دلا در شاہی ہیں۔“

”ہاں۔ میں ہی ہوں۔ گاڑی۔۔۔۔۔ گاڑی۔۔۔۔۔ اس نے  
 پوچھنا چاہا لیکن اس نے پہلے ہی پولیس آفسر نے کہا۔  
 ”نہیں آنے تو کافی دیر ہو چکی ہے۔ جس قسم کا طلبہ  
 آپ نے بنانا تھا وہ کسی ایک لڑکی یہاں دیکھی تو کئی  
 ہے۔ دو ایک رکشے میں سوار ہوئی تھی۔ ہم اس رکشے  
 والے کی تلاش میں تھے۔ جس کا پتا تو چل گیا ہے لیکن  
 ابھی وہ ملا نہیں۔“

”کب تک ملے گا وہ۔۔۔۔۔“ پیرسائیس نے اضطرابی  
 انداز میں پوچھا۔

”ابھی کچھ دیر میں مل جائے گا۔ اس کے پیچھے بندے  
 پھیل گئے ہیں، جلدی معلوم ہو جائے گا۔ آپ آس،  
 ٹھانے چلے ہیں۔ وہیں انتظار کرنے ہیں۔“ پولیس آفسر  
 نے کہا اور اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔ پیرسائیس نے خود  
 پر تکیا پانے ہوئے زرا تھوڑے کواں کے پیچھے چلے گا اشارہ  
 کیا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی چار دیواری نہیں تھا۔

☆.....☆

شعبہ اپنے آفس کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ وہ  
 ڈرائیوگ روم میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس کا سارا  
 دھیان نادے کی طرف تھا۔ رات بھر اس کا نوٹ بند رہا  
 تھا۔ پہلے پیرسائیس تو وہ خود اس کے فون کا انتظار کر رہا  
 رہا، پھر جب خود اس نے اس کا فون کیا تو بندھا، کوئی  
 جواب نہ ملا۔ چند بار جب اس نے کوشش کی اور فون بند  
 ہی ملا، تب اس نے سوچا کہ کوئی نہ کوئی جھوٹی ہو گئی ہو  
 گی۔ اس لیے وہ بھی سو گیا، لیکن ایک بے چینی اس کے  
 اندر آئی۔ ابیا پہلی بار ہوا تھا۔ نجانے اسے کون سا خیال  
 آتا ہی چلا جا رہا تھا کہ کچھ ایسا افسردہ ہوا ہے، جس کی یہ  
 سے اس کی بات نہیں ہو سکی۔ حالانکہ پہلے کئی دن گن گنڈر  
 جانے سے اندازن کی بات نہیں ہو پا رہی تھی۔

دو ادنیٰ خیالوں میں کھو جا ہوا تھا کہ اس کا ملازم  
 ایک چٹ ٹھا سے اندر آ گیا۔ ملازم نے وہ چٹ اس کی  
 طرف بڑھا دی۔

”صاحب آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔“  
 ”کون ہے۔۔۔۔۔؟“ چٹ کھڑے ہوئے ان نے

لگا جیسے یہ چہرہ اس نے پہلے دیکھا ہوا ہے۔ جانا بیچانا سا  
 چہرہ، ابیا کیوں ہے؟ اور ملا صاحب نے سوچا۔

”اگر تم کون ہو اور کہاں سے آئی ہو؟“ زبید نے  
 پوچھا تو وہ اپنے حواسوں میں آئی۔

”میں نادبہ ہوں اور اختر مجھے بہت اچھی طرح  
 جانتے ہیں۔“ اس نے فوری طور پر اپنے بارے میں  
 تفصیل بتانے سے مگر بڑکا۔

”کہا تمہارے پاس اس کا فون نمبر نہیں ہے۔ تم نے  
 اس سے رابطہ نہیں کیا۔“ زبید نے نقد پن کی خاطر پوچھا۔  
 ”فون نمبر تو ہے۔ لیکن ابھی میں نے اس سے رابطہ  
 نہیں کیا۔ وہ گھر پر نہیں ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”تمہیں وہ گھر پر نہیں ہے۔“ زبید نے کہا پھر ذرا  
 ہی بولی۔ ”تم اس سے ابھی رابطہ مت کرنا، ابھی تم فریش  
 ہو کر ناشتا کرو، میں خود اس سے رابطہ کرتی ہوں۔ جلو  
 شاہاں۔۔۔۔۔“ زبید نے اس کے چہرے پر دیکھنے ہوئے  
 کیا۔ نادبہ نے اپنا پرن وین پر رکھا اور ابھڑکی۔ نجانے  
 کیوں وہ یہاں آکر بڑا سکون محسوس کر رہی تھی۔

☆.....☆

پیرسائیس کی ٹورڈ مل جب لاہور کے مضافات میں  
 پہنچ گئی تھی۔ ذرا تھوڑے نذر نیز گاڑی چلا سکتا تھا، اس  
 نے چائی۔ اگرچہ پیرسائیس غصے کی شدت کے باعث  
 اپنے آپ میں نہیں تھا، لیکن وقت اور حالات کا تقاضا یہی  
 تھا کہ نہایت گل اور جوصلے سے اس معاملے کو حل کرنے  
 کی کوشش کی جائے۔ نادبہ کی ٹوریٹی سے نکل جا، کوئی  
 معمولی بات نہیں تھی اور وہ بھی اس وقت جب اس کا  
 نکاح ظہیر شاہ سے ہونے والا تھا۔ ایک طرف ان کے  
 سارے منصوبے چوتھ ہو سکتے تھے اور دوسری طرف یہ  
 خرابی پھیل جاتی تو اس کی اپنی حیثیت کبارد جاتی۔ نادبہ  
 کے بارے میں شاید اس نے غلط اندازہ لگا ہوا تھا۔ دو اسے  
 ایسی لڑکی سمجھ رہا تھا جسے باہر کی دنیا کی خبریں نہیں تھی اور  
 اسی وجہ سے وہ حیرت میں ڈوبا ہوا تھا کہ دو باہر نکل کبھی  
 یہ معنی تھا اس کے لیے جو اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

جس وقت پیرسائیس لاہور اسٹیشن پہنچا، اچھی  
 خاصی دھوپ نکل آئی تھی۔ اس نے اسٹیشن پر ایک جانب  
 کھڑی پولیس جب کہ دیکھا، پھر فون پر رابطہ ہوا تو ایک



یہی سرسری سے انداز میں پوچھا۔

سے پوچھا۔

”نہیں، خضانیے کا یہ پیرا عملہ بہر حال پھر سائیکل کے زبردستی تھا۔ انہوں نے سارا دانہ گول مول کر کے افغانیہ موت قرار دے دیا تھا۔“ اس نے وضاحت کرنے ہوئے کہا۔

”اتنی پرانی بات کا اب۔۔۔“ اس نے کہنا چاہا تو شاہ اللہ تیزی سے بولا۔

”وہی عرض کر رہا ہوں نا اب پھر وہی تاریخ و ہرانی جاری ہے۔ شہر میں مائی کی بیٹی تاجاں مائی بھی جو بلی میں کام کر رہی تھی۔ اب وہ جو بلی میں بند ہے۔ کچھ معلوم نہیں کہ جو بلی والوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ غالب امکان ہے کہ اسے کل کر رہا گیا ہوگا پھر اس کا قتل کر دیں گے وہ۔۔۔“ اس نے اپنی بات پر زور دینے ہوئے کہا۔

”یہ آپ اتنے بظن سے کہتے ہیں۔“

شعب نے پوچھا۔

”کیونکہ پیر سائیکل کی نگاہ میں تاجاں مائی نے بھی وہی جرم کیا ہے، جو شہر میں مائی نے کیا تھا۔ شہر میں مائی کے زمانے میں پیر سائیکل کی بیٹی تاجاں مائی سے فرار حاصل کر لیا تھا اور اب اس کی بیٹی جو بلی چھوڑ کر غائب ہو چکی ہے۔ ان روزوں میں خواتین نے ان روزوں میں جو بلی والی خواتین کی مدد کی ہے۔ ان نے پوری طرح مسئلہ بیان کیا۔“

”آپ کو یہ باتیں کہتے معلوم ہوئیں۔“ اس نے پوچھا تو شاہ اللہ نے کہا۔

”شہر میں مائی کے وقت میں کچھ نہ کر سکا لیکن بعد میں مجھے بہت سارے شواہد مل گئے۔ ان لوگوں میں سے میں نے خود رابطہ رکھا تھا۔ آج سچ تاجاں مائی کے بیٹے نے مجھے اطلاع دی ہے تو میں آپ کے پاس آ گیا ہوں۔“

”ٹھیک ہے آپ میرے پاس آ گئے لیکن یہ معاملہ نو پولیس کا ہے۔ ہمارا دل اندازنی کا جواز کیا ہے بھلا۔“ اس نے کہا۔

”میں اتنا ہوں کہ ابھی کوئی جواز نہیں ہے مگر معاملہ ایک زندگی کا ہے۔ تاجاں مائی کے بیٹے نے خضانیے میں درخواست دے دی ہے مگر بہت مشکل ہے کہ اس پر

”چوہدری شاہ اللہ ہیں، جی یہاں کافی عرصے پہلے ذی اہلیس لی رہ چکے ہیں۔ سب یہ دستانہ ہو گئے ہیں۔“ ملازم نے تیزی سے بتایا تو اس نے کاغذ کے اس پرزے پر نگاہ ڈال کر ایک طرف دیکھ دیا اور اسے چلانے کے لیے کہا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک ادیب عرصت مند شخص اندر آ گیا۔ سلام بوجھ کر کرنے کے بعد شعب نے سامنے صوفے پر بیٹھ کر اشارہ کرنے ہوئے کہا۔

”جی فرمائیں۔“ کہتے تشریف آوری ہوئی؟“

”میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ چند باتیں ہیں جو میں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے آپ کچھ جانیں گے کہ میں کس مقصد کے لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔“ اس نے براے پنے تیلے انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔

”جی فرمائیں۔“ اس نے کہا۔

”میں سن رہا ہوں۔“ اس نے نقل سے کہا تو وہ کافی حد تک شائستہ انداز میں کہنا چلا گیا۔

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ وہ پہلے آفسر ہیں جنہوں نے سلامت نگر آفسر سائیکل کی تابعداری نہیں کی۔ ایک ڈومس آپ کو دیکھنے آیا تھا اور آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ دوسرا مجھے آپ جیسے آفسر کی ہدایت ہے۔ دو دراصل میں نے پیر سائیکل کی بڑی مخالفت کی تھی۔ جب میں یہاں تعینات تھا۔ اس کے باجواز کام نہیں کیے۔ ظاہر ہے مجھے پھر یہاں بڑا مشکل وقت گزارنا پڑا۔ اس کے چھوٹے صوفے پر کام نچلے درجے کے اہلکاروں نے نقل جا با کرتے تھے۔ اصل مخالفت اس وقت ہوئی جب ان دنوں جو بلی ہی کی ایک ملازمہ شہر میں مائی کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کے لواحقین بجاوے بہت بھاگے دوڑے۔ مجھ سے رابطہ کیا۔ میں نے جہن رفت کی ہی تھی کہ اچانک لواحقین خاموش ہو گئے۔“

”وہ کیوں خاموش ہو گئے؟“ شعب نے دلچسپی سے پوچھا۔

”خوف زدہ ہو گئے تھے۔ بہت بعد میں پتا چلا تھا کہ پیر سائیکل نے ہر طرح سے وبا ڈالا اور کچھ دے دلا کہ انہیں خاموش کر دیا تھا۔“ وہ بولا۔

”آپ کچھ نہیں کر سکتے اس وقت؟“ اس نے سکون

سامنے رکھی، پھر چند سوپ لینے کے بعد اس کے چہرے پر دیکھا اور بڑے پرسکون لہجے میں بولی۔

”دیکھ، نبیؐ نادیر۔ ایسے نہیں جانتی کہ شعیب تمہارے ساتھ آخر زمین کرات کیوں کرتا رہا۔ میں یہ بھی نہیں جانتی کہ تم دونوں کی آئیں میں کیا بات ہے۔ وہ ساری باتیں ہم بعد میں کر لیں گے مگر تم یہاں بوجہ اس بارے میں ابھی شعیب کو بتانے کی ضرورت نہیں۔“

”وہ کیوں آئی۔ میں۔“ نادیر نے حیرت سے پوچھا۔  
 ”وہ یہاں اس شہر میں نہیں ہے۔ میں نہیں جانتی کہ اتنی دور جینا میرا چنا پریشان ہوتا رہے۔ جب ضرورت ہوئی تو اسے فون بھی کر لیں گے۔ میں خود بتاؤں گی اسے تمہارے بارے میں، بلکہ خود تمہاری بات کراؤں گی۔“ انہوں نے اس محل سے سمجھاتے ہوئے کہا۔  
 ”آپ میری بات سنیں۔“ نادیر نے کہا جابجا مگر وہ اس کی بات کانتے ہوئے بولی۔

”اور دوسری بات! یہاں میرے پاس بہت ساری لڑکیاں کام کرنے کے لیے آئی ہیں۔ انہیں تمہارے بارے میں قطعاً معلوم نہیں ہوتا چاہیے کہ تم گھر سے بھاگ کر آئی ہو۔“

”تو پھر میں کیا کیوں گی ان سے، اگر کسی نے پوچھ لیا تو۔۔۔۔۔“ اور چیخوٹے ہوئے بولی۔

”یعنی کہ تم میری دور پارکی رشتے دار ہواور چند دن کے لیے یہاں میرے پاس رہنے کے لیے آئی ہو۔“ اس نے قدرے سختی سے کہا اور برتن چینی لے کر جلدن سے اٹھ کر خود برتن سینے لگی اور پھر انہیں لے کر کچن میں چلی گئی۔ وہ زہیدہ خاتون کا سامنا کرتے ہوئے گھبراہٹی لگی۔ وہ کچن میں بھی اور زہیدہ خاتون کمرے میں، دونوں کے ذہن میں لگی خیال گردش کر رہے تھے۔  
 نادیر نے کبھی کبھی میں کام نہیں کیا تھا۔ زہیدہ نے دیکھا کہ وہ اگلے سپر سے ہاتھ مار رہی ہے۔ تب اس نے نادیر کو روکتے ہوئے کہا۔

”بس کرو، یہ تم سے نہیں ہوگا آؤ، میں تمہیں شعیب کے کمرے میں چھوڑ آؤں۔ وہاں جا کر سو جاؤ۔ ساری رات جاگتے ہوئے تم تھک گئی ہوگی۔“  
 ”ہاں، مجھے نیند تو آ رہی ہے، لیکن میں یہ کراؤں

عمل در آمد ہو۔“ وہ اس طرح بولا جیسے بے کسی ہو۔  
 ”آپ کیا چاہتے ہیں۔“ اس نے کس سے پوچھا۔  
 ”بہن کی حقانے، والوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس واقع سے آپ کو بھی آگاہی ہے۔ آپ کے علم میں ہے۔ میرا مقصد ہے کہ وہ جاہاں مائی کوئی انور کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔“ شام اللہ نے تیزی سے کہا۔

”اس وقت، وہ جاہاں وہاں کہاں ہے؟“ اس نے پوچھا۔  
 ”بھول اس کے بیٹے کے رات حویلی کے کچھ ماہرین ان کے گھر آئے تھے اور اس کی ماں کو زبردستی اپنے ساتھ حویلی لے گئے تھے۔ اس کے بعد معلوم نہیں۔“ وہ تشویش سے بولا تو شعیب نے کہا۔  
 ”ٹھیک ہے۔ میں زنی انیس فی صاحب کو بلا کر ان سے بات کر لیتا ہوں۔ اپنی آپ دیکھ لیں۔“

”میں سنبھال لوں گا۔ مجھے ابھی کچھ پریش والوں سے بھی ملنا ہے۔ اخلاقی طور پر ہی سی، آپ ضرور مدد کیجیے گا۔ روحانی شخصیت ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ دوسروں کی زندگیوں سے پونہی کھیلتا رہے۔ بہر حال میں نے جو عرض کرنا تھا وہ آپ سمجھ گئے ہیں۔ اب مجھے اجازت دیں۔“

شعیب اس کی پچھلی بات سمجھ رہا تھا۔ اس سے مزید بات کرنا فضول تھا۔ اس لیے کوئی بات نہیں کی۔ وہ چلا گیا۔ تب وہ سوچنے لگا کہ شاید یہاں کے لیے یہی مدد گئی ہے یا پھر اس کے خلاف کوئی سازش ہے۔ کیونکہ ہمارے ہی اس معاشرے میں جہاں دوسری برائیاں ہیں، وہاں ایک اور برائی منافقت بھی ہے۔ جو بہر حال اٹل اور بے نی خفاست ہے۔ جب مخلصانہ کے لوگ کسی کا کچھ بگاڑ سکیں اور حسد کی آگ میں جلتے ہوئے بے بسی محسوس کریں تو منافقت ہی وہ ہتھیار ہے جس سے دوسروں کی زندگی تباہ برادر کرنے کی کوشش کی جاہل ہے، حالانکہ وہ اپنی زندگی اور آخرت پہلے ہی تباہ برادر کچکے ہوتے ہیں۔

☆.....☆

نادیر فریض ہو کر ناشتا کر چکی تھی۔ زہیدہ خاتون نے اس کے ساتھ ہی سب کچھ کھا یا تھا اور ایک لمحے کے لیے بھی اپنی نگاہوں سے اوچھل نہیں ہونے دیا تھا۔ اب اس نے چائے کی پیالی تازہ کر دیتے ہوئے دوسری اپنے

تو..... اس نے کہا جاہا۔

”آؤ! آؤ! آؤ! آؤ!“

”جی اجھا! اس نے دھڑکتے ہوئے کہا اور چلتے ہوئے شعیب کے کمرے تک آئی۔ زبیدہ خاتون باہر سے باہر چلی گئی اور ناؤ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اندر چلی گئی۔ سرد ویسا ہی صاف ستھرا تھا، جیسے وہ ابھی یہاں سے گیا ہو۔ اس کمرے کو دیکھ کر شعیب کے اہلی ذوق کا اندازہ ہو رہا تھا۔ سامنے دیوار پر اس کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ ”اجھا! تو یہ ہے اختر۔“ میرا مطلب ہے شعیب۔ ”وہ کافی دیر تک اسے دیکھتے ہوئے اپنے من میں اتارتی رہی اور پھر بند پر پھیل گئی۔ اسے وہ بالکل منفرد مسانگہ تھا۔ اس کا چہرہ ویسا نہیں تھا جیسا وہ سوچتی رہی تھی۔ ان لمحات میں اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا کہ اختر کو فون کرے اور اسے ستائے۔ اس کے سین ٹپس بارے باتیں کرے اسے حیران کرے۔ بگرا گلے ہی لمبے است ذبیدہ خاتون سے کیا ہوا بندہ یا دا گیا۔ اس نے اپنی اس خواہش کو دہرایا اور کروت بدل کر لیت گئی۔ انٹھیں بند کرتے ہی پہلی سوچ اس کے ذہن میں یہی دور آئی کہ جب زبیدہ خاتون اس کے باوے میں پوچھے گی تو وہ اسے کیا جواب دے گی۔ وہ اپنے بارے میں سچ بتائے یا وہی جو اس نے ”اختر“ کو بتایا ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا کہ کیا کہنا چاہیے۔ سکون سے لیتے ہی ٹھنک اور نیند اس پر غالب آ گئی اور اسے کچھ ہوش نہ رہا۔ نیند میں گھوٹ گئی۔

باہر والا ان میں پہنچی ہوئی زبیدہ خاتون پریشان ہو گئی تھی۔ گھرت بھاگی ہوئی ایک لڑکی اس کے ہاں آ گئی تھی۔ وہ بھی اس کے اپنے اٹھتے بیٹے کے لیے۔ نجانے ان دونوں میں ایسا کیا چل رہا تھا کہ لڑکی اپنے گھرت بھاگنے پر مجبور ہو گئی۔ ناؤ کے یوں گھرتے بھاگنے والے میں شعیب اس لیے حضور وار دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ اس کا اپنا بیٹا ہے بلکہ سالانہ دو اوقات بتا رہے تھے۔ اگر اس میں شعیب کی مرضی شامل ہوتی تو وہ یوں اکیلے یہاں تک نہ پہنچ سکتی، بلکہ کم از کم اسے اسٹیشن سے ضرور لانا۔ ان کا آپس میں وابہ ہوتا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ شعیب اس سے جھوٹ بولے گا!

پھر کوئی بات چھپالے گا۔ وہ سبکی سوچتی رہی اور وہ پھر سر پر آ گئی۔ لڑکیاں اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھیں، مگر اس کے ذہن سے سوچیں ہی نہ نکل رہی تھیں۔ نہ جانے وہ لڑکی کس خاندان کی ہے۔ اس کا کوئی آگے پیچھے ہے بھی یا نہیں یا پھر بھرا پر گھر چھوڑ کر آئی ہے۔ زبیدہ خاتون کو اس کا اپنا نامی بار بار اپنی جانب کھینچ رہا تھا اور وہ اس سے اپنا ذہن بھاری تھی۔ وہ جیسے جیسے نادیدہ کے بارے میں سوچتی جاتی تھی، اس کا اپنا آپ اس کے سامنے آنے لگا ہوتا تھا۔ اور وہ گھبرا کر ننگا ہر چراتی تھی۔ دوست ہی سے اسی نکلتی میں تھی۔ اس کی شکل یہی تھی کہ رہی تھی کہ پہلے اسے کریدنے کی کوشش کرے کہ وہ کون ہے؟ پھر اپنے بیٹے کو بتانے، چنانچہ شعیب کا باوے کے بارے میں کیا خیال ہے۔ یہ سب اسے بلاے عمل اور حکمت عملی سے کرنا تھا۔ یہ سوچ کر اسے ڈھارس بندھی کہ وہ اس معاملے کو حل کر لے گی۔ وہ انہی سوچوں میں ابھی ہوئی تھی کہ دروازے پر بتل ہوئی، پھر یوں مسلسل بتل ہوئی۔ جلی گئی جیسے کسی نے شبن پر ہاتھ دھک دیا ہو۔ اس سمیت کبھی لڑکیاں چونک گئیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ ایک لڑکی نے اندھ کر باہر جانا چاہا مگر اس نے روک دیا اور خود دروازے تک گئی۔ اس نے دروازہ کھول کر اوٹ میں ہوتے ہوئے پوچھا۔

”کون ہے؟“ اس کے بچے میں ہر جھکی تھی۔

”وہ بہن..... میں ہوں بھائی، حید! وہ لڑکی.....“

باہر سے آواز آئی تو اس نے بھاء حید کے بچے میں حدود پر گھبراہٹ محسوس کی جسے کراس کا اتھا ٹھنکا۔ اس نے اوٹ ہی سے باہر دیکھا تو کبھی گاؤں کھڑی تھیں، جن میں پوپس کی گاڑیاں نمایاں تھیں اور پوپس والے لوگ بھی موجود تھے۔

”کیا بات ہے بھائی، خیریت تو ہے؟“ اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

”وہ لڑکی جو میں یہاں صبح جھوڑ گیا تھا۔ اسے یہ لوگ لینے آئے ہیں، وارث ہیں اس کے۔“ اس نے جواباً تیزی سے کہا۔

”بھائی، آپ نے تصدیق کر لی ہے۔ یہ واقعی ہی اس کے وارث ہیں۔“ اس نے گل سے پوچھا مگر نہ جانے

کے اس طرح بولنے پر پھر سائیں نے خود ہی اونچی آواز میں جواب دیا۔

”ہاں! میں ولاور شاہ ہوں۔ دنت خلیع منت کرد اور اس لڑکی کو باہر بھیجو، ورنہ میں خود مرمت نکال لاؤں گا۔“

بھی زبیدہ خانوں نے دروازہ کھول دیا اور خود دروازے میں فن کر کھڑی ہوئی، پھر ان کی طرف دیکھنے ہوئے غصے میں کہا۔

”اگر تم میں سے ہے ولاور! تو میرے دروازے کی بددیہیز پارکے دکھاؤ۔“

پھر سائیں اس کی طرف دیکھا وہ گھبا۔ دنت نے اس کے چہرے پر اپنی پرجھٹھی منوں زوالی نہیں مگر اتنی بھی نہیں کہ نفش مت جائیں۔ چند لمحوں میں وہ پہچان گیا کہ سامنے کھڑی عورت اس کی بہنوئی زبیدہ خانوں ہے۔

”نہم... نہم... ابھی تک زندہ ہو۔“ وہ انہائی جبرت سے بولا

”تمہارا کیا خیال ہے... میں مر گئی ہوں... میں زندہ ہوں ولاور... اور اب اس مقصود کو مرنے نہیں دوں گی۔ جسے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہے دوسرے گھر میں بنا دے چکی ہے۔“

”کہا میں اندو آسکتا ہوں۔“ پھر سائیں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اتنی گاڑیاں دیکھ کر وہاں پر کائی لوگ جمع ہو گئے تھے۔

”اگر دشمن بن کر آئے تو قرابنی خدمتوں پر دایم چلے جاؤ۔ مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ میں خیر سے مجھے دشمن کا راستہ روک سکوں۔ زمانا چاہو تو آؤ مالو۔“ اگر بھائی بن کر آئے تو قرابنی دروازہ پار کر تو آ جاؤ۔“ زبیدہ خانوں نے انہائی سرد لہجے میں کہا تو پھر سائیں نے پوچھیں آفسر کی جانب دیکھ کر کہا۔

”آفسر! آپ کا بہت شکر ہے۔ آپ نے میری بہت مدد کی۔“

”تھک ہے۔ مگر ضرورت ہو تو کال کر لیں۔“ اکتائے ہوئے لوگس آفسر نے کہا اور فوراً ہی پلٹ کر اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اپنی ساتھ لائی نظری سمیت وہاں سے چلا گیا۔ وہ اپنے بندوں کو گاڑی

کیوں اس دنت ان کا دل نہیں مان رہا تھا کہ نادبہ کیوں ان لوگوں کے ہاتھ لے کر دے۔ اگر خوات اسکی صورت حال کا سامنا ہوگا۔ کاشف کے ہاتھوں سے اسے جو بنا دے اور وہیں لے جائے تو کیا وہ اب تک زندہ ہوئی؟

”آفسر! یہ ایسے نہیں مانیں گے۔ اندر جائیں اور ہارے آپس میں اسے با پھر میں جاتا ہوں۔“ پھر سائیں نے انہائی اکتائے ہوئے مجھ میں کہا جس میں غصہ اور حقارت تھی۔ ابھی بھاء حمید نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے غصے میں کہا۔

”اڑ بھائی، جو کوئی بھی ہے اتنی اونچی آواز میں بات نہیں کرو۔ یہ میری بہن کا گھر ہے اور یہاں پر کئی گھروں کی بیٹیاں آتی ہیں۔ میں نے یہ بات تم لوگوں کو پہلے بھی سمجھا دی تھی۔ اس لیے خاموش ہو۔ دو بچی آ جانی ہے ابھی۔“

”تو پھر لاؤ تا جا کر اپنی بہن کے گھر سے۔“ پھر سائیں نے اسی حقارت بھرے لہجے میں لولا کہا جیسے ٹھہرے انداز میں گالی دے رہا ہو۔ بھئی زبیدہ خانوں نے اس شخص کو دیکھا، جس نے اتنی سخت بات کی تھی۔ با خدا! یہ تو اس کا اپنا بھائی اس کے دروازے پر کھڑا ہے۔ اگرچہ دنت نے اس کو اچھا خاصا بدل دیا ہے لیکن اپنا خون تو نہیں بھلا جا سکتا۔ تو کہا نا دیا ان کی بھئی ہے؟ کہا دنت نے اپنے آپ کو پھر سے دہرایا۔ وہ جواب تک دنیا کی نظروں سے چھپی ہوئی تھی، اس کا راز فاش ہو جانے کا دنت آگھا ہے؟ میں اپنا راز چھپاؤں با نادبہ کو بچا لوں، اگر یہ بچی ان کے حوالے کر دی گئی تو اس کا زندہ بچنا محال ہوگا۔ نادبہ کی زندگی کی قیمت اس کا راز ہے؟ ایک ہی لمحے میں بچانے کتنے سوال اس کے سامنے آنے لگے۔ سب سے۔ ان میں انہی سکت نہیں تھی کہ وہ کسی بھی سوال کا جواب دے سکے۔

”بہن! بھیجنا، اس لڑکی کو۔“ بھاء حمید نے کہا تو زبیدہ ایک دم سے چونک گئی، پھر لمحے کے ہزاروں حصے میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ نادبہ کو نہیں دے گی۔ بھئی اس نے بڑے دل سے پوچھا۔

”بھاء حمید! یہ جو شخص غصے میں بات کر رہا ہے۔ کیا اس کا نام ولاور شاہ ہے اور یہ سلامت مگر کا ہے؟“ اس

میں بیٹھنے کا اشارہ کر کے اندر آ گیا اور بیدار ہو گیا۔

”تمہیں شاید معلوم نہیں۔“ نادیر دو برس کی تھی جب ظاہر شاد اپنی بیوی سمیت ایک کار حادثے میں اللہ کو بار بار ہو گیا ہے۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

”اُدھ۔“ اتر نادیر تہیم سے اور اس کے سر پرست ہو تم۔“ وہ احتجاجی دکھ سے بولی۔ اپنے بھائی کے بارے میں سن کر وہ ایک دم سے غم زد ہو گئی تھی۔

”خدا نہ کر آبا۔ اسے میرے ساتھ جانے دو۔ وہ میری بیوی بیٹے جا رہی ہے، بلکہ اب تو تم بھی میرے ساتھ چلو، میں ہانسی کی ساری باتیں بھلا دینا چاہتا ہوں۔“ ظہیر سائیں نے اکتا بھرے لہجے میں کہا تو اس کا دل کھینچ گیا۔ وہ صدمہ ہونے لگی۔

”ٹھیک ہے دلا دو۔“ اگر تم بیدار ہو کر وہ تم سے کچھ نہیں کہو گے۔ نولے جاؤ،“ وہ روئے ہوئے بولی۔

”تم بھی ہمارے ساتھ چلو آ پ۔“ اس نے دکھ سے کہا۔

”نہیں، میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔ میں اپنے بیٹے کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی۔“ وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔

”بھجور نادیر کو۔“ ایک دو دن میں غم لوگوں کو لینے دہوں آ جا میں گے۔“ ظہیر سائیں نے کہا تو دروازے سے لگی نادر سے فخریہ پوچھنے ہوئے کہا۔

”نہیں پھو پھو! میں ان کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ اگر آپ نے مجھے بھیجا تو حوصلی میں میری لائی جانے گی۔ میں نے وہاں جا کر بھی مرنا ہی ہے۔“

دو دنوں میں اس کی صبح بھری آواز پر چونک گئے اور جو اس نے بات کی تھی، اس کا سب سے زیادہ اثر بھاء حیدر پر ہوا۔ جب وہ نوبت گر بولا۔

”زہیدہ! میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔ میری نگاہ میں آپ کا کتنا احترام ہے۔ آپ جانی ہیں۔ آج آپ کوئی بار میرے سامنے آئی ہیں۔ صبر نہ کرنا۔“ اسے اس وقت تک اپنے پاس رکھیں۔ جب تک یہ خود جانے کے لیے تیار نہ ہو جائے۔“

”ہمارا خاندانی مسئلہ ہے۔“ ظہیر سائیں نے تیزی سے کہا۔

”وہ انہیں لے کر ڈرائیونگ روڈ میں آگئی۔ جب تک نادر بیدار ہو چکا نہیں۔ اسے لڑکیوں نے جگا دیا تھا کہ باہر کیا بیگم ہو رہا ہے، جو اس کی وجہ سے ہے۔ وہ بھی دروازے سے آن لگی تھی۔“

”کہاں ہے اُدھ؟“ ظہیر سائیں نے بیٹھتی ہی پوچھا۔

”میرے پاس سے، مگر اسے قطعاً معلوم نہیں ہے کہ میں کون ہوں اور میرا بیٹا کون ہے۔ اسے فقط میرے بیٹے کی شاعری پسند ہے۔ اسی تاتے وہ یہاں آگئی۔ کہیں آگئی ہے، وہ اب اسے دیکھ کر پہلے نہیں جانتی تھی مگر اب سمجھ رہی ہوں۔ اب بولو۔ تم کیا چاہتے ہو؟“ زہیدہ نے سکون سے کہا۔

”میں اسے وہاں لے جانا چاہتا ہوں،“ اس نے جواب دیا۔

”تا کہ تم اسے لے جا کر مار دو۔ میں نہیں جانتی نہیں۔“ اس نے اسے۔“

”آج اس کی شادی ہے میرے بیٹے ظہیر شاد کے ساتھ۔ دو لاکھ سے صرف اسی لیے آیا ہے۔ اور۔۔۔“

”وہ نادر تمہاری بیٹی نہیں اور اسے تمہارا بیٹا پسند نہیں ہے۔“ نکمیا وہ جوئی کی زندگی چھوڑ کر ایک غریب شاعر کے چہچہے آگئی۔ اب میں تمہی وہ مجبوری میں بنا دی خاطر یہاں تک آئی ہے۔“ اس نے طنز پر لہجے میں کہا۔

”تمہارا بیٹا کدھر ہے۔ میں اس سے بات کرتا ہوں اسے سمجھاتا ہوں۔“ ظہیر سائیں نے اسے گل سے کہا۔

”وہ یہاں نہیں ہے۔ اپنے کام سے کہیں گیا ہوا ہے۔ دو آ جائے گا تو میں اس سے مشورہ کر کے جو فیصلہ ہوا وہ تمہیں بتا دوں گی۔“

”وہاں نادیر کی شادی ہونے والی ہے، اس بات کو سمجھو۔“

”اگر وہ یہاں تمہیں نہ ملتی، تب شادی کی تاریخ کا کہا ہوتا تھا۔ جب نادیر ہی کو شادی منظور نہیں ہے تو میں اسے تمہارے ساتھ کیسے بیچ دوں۔ وہ داخلہ پانچ ہے، اپنی مرضی کر سکتی ہے، پھر تم ہی کیوں، جاؤ اس کے باپ کو سمجھو۔“ اس نے زہیدہ سے زرا سختی سے کہا۔

”میں نے زہیدہ سے زرا سختی سے کہا۔“



کیا کرے، کس طرح اپنی بیٹی سے ملے، چاہئیں زہیدو  
حوہی آج بھی سیکھی گئی؟ ان کا بیٹا نما کے کبسا ہوگا؟  
ان حالات میں وہ کیا ناریہ کو قبول کرے گا؟ کہا لاہ و شاہ  
اب تا وہ کو قبول جائے گا؟ ایسا ممکن تو نہیں ہو سکتا؟ کیا

اسے ہی اپنی بیٹی سے ملنے جانا پڑے گا؟ کہا اس عمر میں وہ  
حوہی سے باہر قدم رکھ جائے گی؟ سوالوں کا ایک سلسلہ نما  
اور ہر ایک سوال کی اپنی الگ سے جیمن تھی۔ مستان کی  
نرپ، ریشوں کا دکھ اور حالات کے جبر کا اعتبار وہ لفظ  
آنسو بہا کر ہی کر سکتی تھی۔ ان چند گزروں میں ہی وہ  
برسوں کی بنا دکھائی دینے لگی تھی۔ اس کا کس نہیں چل رہا  
نما کہ وہ اپنی بیٹی سے جا ملے۔ انہی لمحوں میں اس نے  
دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تو اس نے جلدی سے  
اپنے آنسو پونچھ لیے۔ وہ بلا در شاہ کو دستک کو پہچانی  
تھی۔ وہ کالی حد تک حیران نگاہوں سے اس کی طرف  
دیکھنے لگی۔ وہ اس وقت اس کے کمرے میں کھسے آ

گیا؟ وہ تو اس سے کمرے سے باہر ملتا کرتا تھا۔ وہ اس  
کے فریب آ کر کمری پر بیٹھ گیا۔ وہ خاموش رہی اور اس  
کے برتنے کا انتظار کرتی رہی۔

☆.....☆

کچھ دیر بعد اس نے کہا۔  
”اماں بی، میں جانتا ہوں زہیدو کے بارے میں  
سن کر آپ اس سے ملنے کی شدید خواہش رکھتی ہیں۔ کیا  
آپ اس سے ملنا چاہیں گی؟“  
”کہیں نہیں بیٹا! میں اسے دیکھنے کے لیے اس  
سے ملنے کے لیے بے تاب ہوں۔“ وہ ہنسی بولے لہجے  
میں بولی۔

”آپ بفرمائیں کہ آپ اس کے پاس چاہیں گی یا  
پھر اسے یہاں بلا سکتی ہیں؟“ وہ سیات لہجے میں بولا۔  
”مجھے تم جاہر بیٹا۔“ وہ حیرت اور خوشی سے تھلے  
ہوئے لہجے میں بولی۔

”اماں بی۔ مجھے آپ کا زہیدو سے ملنے پر کوئی  
اعراض نہیں، لیکن میرے خیال میں اسے خود یہاں آنا  
چاہیے اور جب آئے تو اپنے ساتھ ماہر کو لے کر  
آئے۔“ اس نے حسی لہجے میں کہا۔  
”مگر وہ دونوں ذر کی وجہ سے یہاں نہ آسکتی تو.....“

”میں جانتا ہوں، لیکن وہ بھی مہربانی جیسی  
ہے۔ وہ جب تک نہیں چاہے گی، ہنسکے وہے گی، چاہے  
جو مرضی کر لو..... تم جتنے بھی طاقتور ہو، اپنی طاقت آزما  
لو۔“ بھیا بھید سے ہنسا کہتا۔

”جاؤ لاہ اور اٹلے جاؤ۔ میرا وعدہ ہے کہ میں چند  
دنوں تک ماہر کو لے کر خوشی آؤں گی۔“ زہیدو خانوں  
نے کہا اور زہیدو نظر روئے گی۔ پیرسائیں چند لمحے ہو گیا  
خاموش بیٹھا رہا پھر نرپ سے اٹھ کر باہر چلا گیا، چند لمحوں  
بعد ان کے دروازے کے آگے کوئی گاڑی نہیں تھی۔ زہیدو  
خانوں و دنوں ہاتھ چہرے پر دکھے روئے جلی جاری  
تھی۔ بھی ماہر اندر آئی اور جہرے سے اس کے کانہ سے  
پر ہاتھ رکھا۔ تب زہیدو نے اسے گلے کا باور ہوں روئی  
کہ جسے سارے آنسو آج ہی بہاؤ گی۔

☆.....☆

حوہی برسہ بہر کی و صرپ از آئی تھی۔ وہی سنا اور  
خاموشی تھی، لیکن داؤی اماں کا وجود ہوں نرپ رہا تھا کہ  
لیوں سے آواز نہیں نکلتی مگر آنسو ہوں و اس تھے کہ  
رکنے کا نام ہی نہیں لے وہے تھے۔ نما نے کب سے  
بندھے ہوئے بندھ نوئے تھے۔ اتنے برس بعد اپنی  
اکوئی بیٹی زہیدو کے بارے میں سن کر ان سے مہر نہیں ہو  
پاؤ تھا۔ انسان اگر اس وار فانی سے چلا جائے تو اس پر  
دھیرے دھیرے مہر آئی جاتا ہے، لیکن زندوں کے لیے  
خود پر جبر کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر وہ وقت نے  
زہیدو کی باور حالات نے منوں سنی ڈال دی تھی لیکن  
اسنے برس بعد بھی کے زندہ ہونے کی اطلاع پر وہ اس  
سے ملنے کے لیے نرپ آئی تھی۔ وہ شاید کسی پر نہیں نہ  
کرتی۔ اسے نہیں اس لیے کہا کہ خود اس کے بننے  
بہ بتایا تھا۔ ماہر کے حویلی سے چلے جانے پر وہ پہلے ہی غم  
سے نہ حال تھی، جب اس نے سنا کہ وہ زہیدو کے پاس  
چلی گئی ہے تو جہاں وہ خوشی سے بے حال ہوئی کہ چلا ان  
کی عزت پامال نہیں ہوتی، وہاں اپنی بیٹی کو دیکھنے اور اس  
سے ملنے کی نرپ نے اسے لے بس کر دیا۔ وہ لاہ اور شاہ  
سے اسی وقت اپنی اس خواہش کا اظہار کر دینا چاہتی تھی،  
پھر یہ سوچ کر خاموش رہی کہ نما نے اس کا رول کیا ہو؟ وہ  
نویسے ہی ماہر کے معاملے میں غصے سے بھرا ہوا ہے۔ وہ

”آپ کی یہ بات ٹھیک ہے کہ اس وقت مجھے مصلحت ہی سے کام لینا چاہیے، اپنی جو کچھ بھی ہے، وہ سب بعد کی باتیں ہیں، فی الحال نادیر کو جیل میں رکھیں بلوائیں۔ اس کے ساتھ اگر زبیدہ بھی آجائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اس وقت صورت حال کیا ہے۔ آپ خود سمجھتی ہیں۔“ دلدار شاہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو داہی اماں اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ چند لمحوں کے بعد وہ سانس پھینکے بغیر دلدار نے اپنا فون نکالا اور نمبر ملانے ہوئے بولا۔ ”بس۔۔۔ یہ کہیں بات زبیدہ سے۔“ کچھ ہی دیر بعد رابطہ ہو گیا۔ اس نے فون ان کی جانب بڑھا دیا اور رخو دکر سے سے باہر چلا گیا۔ دوسری جانب سے پہلو کی آواز سن کر اماں بی بی نے ہنسنے کے بجائے پوچھا۔

”زبیدہ“

”اماں۔۔۔ آپ۔۔۔“ جس جھپکی ہوئی آواز میں اس کا نام لیا گیا تھا۔ دو آواز لے کے ہزاروں حصے میں بچکان گئی۔ ممانیں گوندھا ہوا یہ لفظ اس کی سامعوں سے نکرا بنا جذبات کے بندھ ایک دم سے ٹوٹ گئے۔ اسے یوں لگا جیسے کسی گہرے گھاؤ پر سر ہم رکھ دیا گیا ہو۔ وہ سکون کی ان انتہا آواز پر جا بھٹی جہاں سے وہ دور تک اپنے مامی کو ایک ہی نگاہ میں دیکھ سکتی تھی۔

”ہاں۔۔۔ میں ہوں جو آج تک خیر ری راوندک رہی ہوں۔ کہاں تم ہو گئی ہو تم برس گئی ہوں تمہیں دیکھنے کے لئے۔۔۔“ وہ اپنی رزم میں کسی جلی گئی، تب زبیدہ کو خود پر قابو نہیں رہا۔ وہ دسکھنے ہوئے بولی۔

”میں کہیں بھی تم نہیں ہوئی ہوں اماں، بس اپنا آپ چھپا کر بیٹھی ہوں۔“

”نادیر اگر تم تک نہ پہنچ پائی تو شاید میں زبیرنی آواز بھی نہ سن پائی۔“ اماں نے پتھر سے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ہاں۔۔۔ کوئی افغان تھا یا زبیرت ہی کو بہرا مان منظور تھا۔ وہ جو یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ یہ بھی تو میرے اللہ کا احسان ہے، نا، ورنہ وہ اگر کہیں۔۔۔“ وہ انجانے خوف سے کرزتے ہوئے بولی۔

”وہ اللہ ہی تو ہے جو عزتیں رکھنے والا ہے، بندہ تو نجانے کہا کچھ کرتا پھر رہا ہے۔ میں نادیر کو بھی دہلی نہیں رہاں گی کہ اس نے اب کہاں کہاں۔ یہ بات ساری دیا میں

اکیلی آجائے نو۔ میں اسے سمجھا لوں گی۔۔۔“ وہ مکندہ جذبے کے باعث سوچتے ہوئے انداز میں بولی۔

”اب یہ تو آپ پر منحصر ہے کہ آپ کی بیٹی، آپ سے ملنا بھی چاہے گی یا نہیں؟ اگر اس کے دل میں آپ کے لیے کوئی تڑپ ہو تو یہی ملنا چاہے گی، اب اگر وہ نادیر کو لاتی ہے اسے ساتھ بھی اس کو جیل میں قدم رکھ پائے گی ورنہ اس کو یہاں کیا کام۔ اگر وہ نادیر کی بیہ سے نہیں ملنے آئے گی تو تمہیں وہ دوسری دیکھن ہو گی۔“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”تمہیں۔۔۔ نہیں بیٹا۔ وہ ابنا نہیں کرے گی۔“ داہی اماں تیزی سے بولی۔

”یہ آپ پر ہے اماں جی کہ آپ اسے مجبور کریں، تاکہ وہ نادیر کو لے کر ہی یہاں آئے۔ آپ کچھ ہی گئی ہوں گی کہ میں ایسا کیوں کہہ رہا ہوں۔“ وہ ہر سکون لہجے میں بولا۔

”دلدار شاہ وہ تمہیں نہ کر دے ورنہ جو کچھ تم چاہو رہے ہو، دبا ممکن نہیں ہو جائے گا۔“ انہوں نے نشوونما سے کہا۔

”آپ ابنا ممکن کر دیاں بی، ورنہ حوصلی کی عزت منی میں مل جائے گی۔ یہ ساری شان و شوکت میرے لوگوں کی عظمت سب ختم ہو جائے گی۔“ زبیرنی سے بولا۔

”کچھ بھی ختم نہیں ہوگا۔ اگر تم عمل سے کام لو تو۔۔۔“ ذرا درداشت کر دے۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ بڑبڑا۔

”بس۔۔۔ کیسے ہوگا سب ٹھیک۔۔۔ بس زبیدہ کوئی اور اب نادیر۔۔۔ زبیدہ کے سچے پوتے ہو، پڑ گیا تھا۔ اب

نادیر کے ساتھ اس کا معاملہ بھی لوگوں کی زبان پر ہوگا، ان دونوں کو خاموشی سے چھپنا ہوگا۔ ورنہ میں دونوں کی آواز بند کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔“ وہ انتہائی غصے میں بولا۔

”دیکھو۔۔۔ اور اصل سے سوچو تم نے بتایا ہے تاکہ زبیدہ کا ایک بیٹا بھی ہے۔ اگر تم خود پر قابو نہ کرو اور میری بات مانو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ سارے معاملات درست ہو جائیں گے۔“ انہوں نے ہر سکون انداز میں کہا۔ تب وہ ہنسنے ہوئے بولا۔

”آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں اماں بی؟“ ”بیٹا۔۔۔ افرح بھی نو نمبر داری بیٹی ہے۔ تم اگر مصلحت سے کام لو تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ اشارے میں سمجھاتے ہوئے بولی۔

اپنے بچے کو بھی جواب دینا ہوگا۔ وہ کہا سوچے گا۔ اماں میں نے اسے اپنے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میں اگر حریف بنی جاتی ہوں تو پھر آپ کچھ وہی ہیں نا۔“ وہ اٹکنے ہوئے انداز میں بولی۔

”کامیاد یہ کیسے جوڑوں سے۔ معاملہ نہیں کھلے گا۔ وہ سوال نہیں کرے گا کہ یہ کون ہے؟ کیا تم بچوں کی پھوپھی کا رشتہ چھپا پاؤ گی۔ یہ ماضی تو ایک دن اٹھل ہی جاتا ہے۔ ہاں بھر ڈر لی کیوں ہو؟“ اماں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”جب تک ممکن ہو میں اپنا ماضی چھپاؤں گی، جیسے آج تک چھپائی آئی ہوں۔ اگرچہ میں نے غلط نہیں کیا مگر بہت سادگی و جرات ہیں جس کی وجہ سے میں اپنے بیٹے کو نہیں بتاتی ہوں۔ میں شرمندہ نہیں ہوں اماں۔ ہاں! جہاں تک ماہی کا معاملہ ہے، اس بارے میں آپ کو سوچ کر بتا دوں گی۔“ وہ غصت خورہ لہجے میں کہنے ہوئے باہر نکلی۔

”بیٹی! اب جو بھی بات جو ملی کی عزت تہا وہے ہاتھ میں ہے۔ یہ اچھا ہفت ہے کہ تمہارے ماضی پر سوال اٹھائے بنا غصہ و اعلتوں جو ملی سے جڑ سکتا ہے تم اس لیے۔“ انہوں نے کہا جاپانہ وہ بات قطع کرنے ہوئے بولی۔

”جو ملی کی عزت کا خیال نہ ہے، لیکن ان روایات کا کیا ہوگا؟“

”میں سمجھ سکتی ہوں زبرد و اب ادونت آگیا ہے، جب ان وہ بات کو دیکھا پرکھا جائے۔ ہفت کے ساتھ سمجھتا کرتا ہی پڑے گا۔ یہ سب وار بھڑ کر نہیں پاس آ کر بات کرنے سے ہو گا۔ تم جو بھی جانتی ہو۔ یہاں جو ملی میں بیٹھ کر منہ نہ کہتی ہو۔“ اماں نے تیزی سے کہا۔

”اماں! میں جو ملی اُسکوں پانہ آئیں۔ کیا فرنی پڑتا ہے لیکن معاملہ فرما دے گا کہے نا۔ کیا خانت کے کہ اس کے ساتھ کوئی ظلم نہیں ہوگا میرے کہنے پر وہ جو ملی آ بھی جائے مگر ہونا وہی ہے جو وہ نہیں چاہتی تو پھر اسے کہا ضرورت ہے جو ملی آنے کی۔“ وہ انتہائی سنجیدہ لہجے میں بولی۔

”میں خانت وینی ہوں۔ ماہی صرف جو ملی میں ہے۔ وہ اپنی جو ہوگا۔ اس کی مرضی کے مطابق ہوگا۔ اگر پھر بھی دو چھٹ کر محسوس کرے۔ تب وہ تمہارے پاس وہ سکتی ہے۔ تم جانتی ہو کہ جو ملی سے ماہی کا اہل خانت ہو جانا

سے زیادہ تم اچھی طرح سمجھ سکتی ہو لیکن بنی! کیا جو ملی کی قسمت میں ایسا ہی لکھا ہوا ہے۔“ داوی اماں کے لہجے میں ٹھنڈو ڈا ہٹا۔

”اماں! میرا فر معاملہ ہی کچھ اور تھا مگر ماہی کے ساتھ تو ظلم ہونے جا و اتنا۔ مجھ سے زیادہ او کو کون سمجھ سکتا ہے۔ جو ملی اگر انسانوں کے جذبات کو چل کر دے گی تو اس کی قسمت میں ایسا ہی ہے گا۔“ زبرد نے واضح لفظوں میں بہت کر کے کہہ دیا۔

”ہاں! تم ٹھیک کہتی ہو۔ ایسا ہی ہے۔ اب وہ ہفت نہیں رہا کہ عورتوں کو وہاں رکھا جا سکتا ہے۔ اب انہیں سمجھنا ہوگا۔ ان روایات پر سمجھنا کرنا ہوگا مگر بنی! یہ پرکھوں کی عزت کا معاملہ بھی تو ہے نا۔ سبھی اوتھو۔“ داوی اماں نے اس سے پوری طرح اتفاق کرنے ہونے اپنی بات کہہ دئی۔

”اماں! میں کسی حد تک سمجھ سکتی ہوں کہ دل اور شہار اس معصوم بچی کے ساتھ کیوں ایسا چاہ رہا ہے۔ صرف چاہیو کی خاطر کب تک وہ اس جا کھائو سے ناامد اٹھائے گا۔ اس بچی کو تو چاہی نہیں کہ اصل میں اسے جو ملی میں قید کس وجہ سے رکھا جا رہا ہے۔ اماں! کبھی روایات ہیں۔ یہ جو انسانوں کو نگل رہی ہیں۔“

”میں تم سے اختلاف نہیں کرتی اور یہ ہفت بحث کا بھی نہیں ہے مہر کی بیٹی۔ اتنے برسوں بعد تم مجھ سے ملی ہو۔ کہا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تم مجھ سے ملو، میں نہیں مانتی ہوں تمہاری صورت و بچنے کے لیے اسٹاپے۔ تمہارا بیٹا بھی ہے۔“ اماں نے پرجھا۔

”ہاں! میں نے اپنے بیٹے ہی کے سہارے اٹھا طو میں وقت گزار لیا ہے۔ اب وہ جوان ہو گیا ہے برسوں سے وہ گھر ہے اور اماں میں تو ملی ہی آپ کیلئے بڑی ہوں۔ میں کہوں نہیں ملتا چاہوں گی آپ سے۔“ وہ حسرت زدہ لہجے میں بولی۔

”تو پھر تمہیں کس نے روکا ہے۔ آ جاؤ تو میری بیٹی۔ جب سے تمہارے بارے میں پتا چلا ہے تمہیں دیکھنے کو تم سے ملنے کو دل نہ پڑا۔“ اماں کا لہجہ پھر سے جھینکے لگا تھا۔

”ایسا ہی حال میرا ہے۔ اماں۔ پر کہا کروں مجھے

”نہیں میری بیٹی، رونا نہیں۔ یہ دلت بہت سوج  
کچھ کر کوئی فیصلہ کرنے کا ہے۔ دلت دلت ہمارے ہاتھ  
سے بھی نکل سکتا ہے۔ مجھے ذہر صرف اس بات کا ہے کہ  
اگر شعب کو اس سارنی صورت حال کا پتا چل جاتا ہے تو  
اس کا رد عمل کیا ہوگا۔ اسے شاگ تر ضرور لگے گا۔“ زہبیدہ  
نے سوچنے ہوئے کہا۔

”سب کچھ ناپاؤں ہو جائے گا۔ اگر میں وہاں جوہلی  
میں چلی جاؤں گی۔ ظہیر شاہ سے میری شادی ہو جائے گی  
اور میں.....“ اس نے کہنا چاہا تو زہبیدہ نے بات کانٹنے  
ہوئے کہا۔

”نہیں..... میں ایسا نہیں ہونے دوں گی..... تم  
لوں جو صلت، بارڈ“

”اس کے سوا کوئی حل نہیں ہے چھو پھو، آپ کا راز  
بھی رو جائے گا جوہلی والوں کی عزت بچ جائے گی اور  
شعب کو کبھی معلوم نہیں ہوگا تو پھر رد عمل کیسا؟ میں نہیں  
چاہتی کہ آپ کی زندگی میں کوئی ایسا وقت آئے جس سے  
آپ کو کوئی بچھڑاؤ ہو۔ میں وہاں چلی جاؤں گی۔ مجھے  
لگتا ہے کہ میری قسمت میں.....“

”کوئی جذبائی فیصلہ مت کرو۔ میں دیکھتی ہوں کہا  
کرنا ہوگا۔ ابھی شام ہونے میں بہت وقت ہے۔ ہم کوئی  
سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کریں گے۔“ زہبیدہ نے است  
ذہاؤں دنی اور پھر اٹھ کر کچن کی جانب چل دی۔

یہ لمحات تارہ کے لیے بہت گھٹن تھے۔ اس کے  
ذہن میں بھی نہیں تھا کہ اسے ایسی صورت حال کا سامنا  
بھی ہو سکتا ہے۔ جہاں خون کے جذباتی رشتے اس کی واہ  
میں آن کھڑے ہوں گے۔ اسے سب سے زیادہ افسوس  
اس بات کا ہو رہا تھا کہ وہ تو اختر رومانوئی کے پاس آئی  
تھی۔ اس نے تو یہ سوچا تھا کہ ایک غریب شاعر جس کے  
پاس اگر دلت اچھا نہیں تو کم از کم برا بھی نہیں گذرے  
گا۔ وہ جوہلی والوں کی نگاہ ہی میں نہیں، دنیا کی نظروں  
میں بھی کم ہو جائے گی۔ اس کی جگہ تو شعب نے لے لی  
تھی جو خود ایک ہی ایسی لی آفسر تھا اور اس کے شہر میں  
تھا۔ اس سے اتنا غریب تھا۔ وہ خود اس سے دور آئی  
ہے۔ اختر رومانوئی کا تم ہو جانا اسے شاید صد سے  
دو جا کر رہا تھا۔ اسے یہ نفعاً دکھ نہیں تھا کہ شعب نے

کس قدر اور کتنی افواہوں کی وجہ بن سکتا ہے۔ ایک بار  
تارہ جوہلی میں آجائے، پھر دو چارے تیرے پاس رہے یا  
جوہلی میں ماہاں نے سمجھانے ہوئے کہا۔

”ماہاں! میں کتنی ہوں۔ آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔  
میں نے کہا تاکہ میں سوچتی ہوں۔“ تارہ ہنسکی سے بولی۔

”کہا سوچنا ہے تمہیں؟“ انہوں نے تیزی سے پوچھا۔  
”مجھے تارہ سے پوچھنا ہے، وہ کیا چاہتی ہے۔“ تارہ  
سکون سے بولی۔

”اس سے پوچھنا نہیں، اسے سمجھانا ہے، اور نہ دو جوہلی  
سے جانی ہی کیوں؟ تم نو سمجھ وار ہو۔ تم دو دنوں آؤ۔ یہاں  
بچہ کر بات کرنے ہیں، پھر جو تیرا فیصلہ ہوگا، وہی ہوگا۔ یہ  
میرا تم سے وعدہ ہے۔“ تارہ پورے اعتماد سے بولی۔

”ٹھیک ہے ماہاں، میں بتاتی ہوں آپ کو۔“ زہبیدہ  
نے پھر آسکی تے کہا اور چند باتوں کے بعد فون بند کر  
دیا۔ دادنی ماہاں فون بند کر کے یوں ہو گئی جیسے اس میں  
جان ہی نہ رہی ہو۔ دو آنے والے وقت کے بارے میں  
انتہا سے کچھ بھی نہیں کہہ سکی تھی۔

☆.....☆

تارہ حیرت سے اپنی پھوپھو کے چہرے پر دیکھ رہی  
تھی یہاں حسرت، اندامت اور محبت کے نمجانے کئے  
رنگ پھرے ہوئے تھے۔ دو دادنی ماہاں کے فون آنے  
کے بارے میں پوری تفصیل سن چکی تھی۔ وہ دو دنوں آنے  
سامنے خاموش تھی ہوئی تھیں۔ کانی در بعد دو بولی۔

”پھوپھو! میں آپ کی کینٹن کو کچھ کہتی ہوں۔ ایسے  
میں آپ جو بھی فیصلہ کریں گی وہ مجھے قبول ہوگا۔“  
زہبیدہ نے انتہائی حسرت سے اس کی طرف دیکھا  
اور نہ بولے ہوئے بولی۔

”تھیں میری جان، میری مجبور باں اپنی جگہ لیکن  
میں تیری زندگی کے عوض کوئی ایسا سوا نہیں کروں  
گی، جس میں تیری مرضی شامل نہ ہو۔“

”مگر میں بھی تو یہ نہیں چاہوں گی کہ دروازہ جو آپ  
نے ساری عمر شعب سے چھپا کر رکھا، وہ میری وجہ سے  
کھل جائے۔ نہیں پھوپھو، میں ایسا نہیں چاہوں گی۔“ وہ  
گھٹے گھٹے لہجے میں بولی اور آخری لفظ کہنے ہوئے اس  
کی آنکھوں میں آنسو رواں ہو گئے۔

”نہیں جینی۔ میں تمہیں لنن دیواروں میں قید نہیں  
 ہونے دوں گی، بلکہ اب وقت آ گیا ہے کہ ان روایات  
 کے خلاف آواز اٹھانی جائے۔ ہم جو بنی جائیں گے اور  
 انہیں احساسِ دلا نہیں گئے کہ لنن روایات کو ختم کر دے جس  
 سے زندگیاں دور گرد ہو جاتی ہیں، ہم صبر کرو۔ اب اگر راز  
 فاش ہو جاتا ہے تو ہو جائے مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔“ وہ  
 منہ پر سے ہونے لگے میں بڑے اٹھناوے ہوئی، پھر ہار  
 کی آنکھوں میں آئے آنسو صاف کر دیے زیادہ دہر نہیں  
 گذری تھی کہ جو جلی سے فون آ گیا۔  
 ”تو بھر کیا فعلہ کیا تم نے زبیدہ؟“

”ہاں! میں آ رہی ہوں، میرے ساتھ مادہ بھی  
 آئے گی، لیکن آپ کو یہ ضمانت دینا ہوگی کہ اس کی مرضی  
 کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔“ اس نے صاف لفظوں سے اپنا  
 مدعا کر دیا۔

”میں ضمانت دیتی ہوں، جو اس کا من چاہے گا،  
 دیکھنا ہی ہوگا۔“ انہوں نے پورے یقین سے کہا۔  
 ”تھک ہے پھر میں آ جاؤں گی۔“ اس نے حسنی  
 انداز میں کہا اور لوگوں کو بھیجوں کے بعد فون بند کر دیا۔ وہ  
 چند لمحے سوچتی رہی پھر بھرا جھد کون کر دیا۔  
 ”بھائی جی! مجھے سلامت مگر جانا ہے، گاڑی نو کوئی  
 بھجوا دیں۔“ فون ریمو ہوتے ہی اس نے کہا۔  
 ”اپنے شیب کے پاس جاتا ہے۔۔۔ آ جانی ہے  
 گاڑی، ابھی چاہیے۔“ اس نے پوچھا۔  
 ”کچھ دیر بعد مجھے جس جگہ شیب کے پاس نہیں،  
 مادہ کو چھوڑنے جاتا ہے آپ بھی اسے مت بتائیے  
 گا۔“ اس نے سمجھانے ہوئے کہا۔  
 ”کیا اسے نہیں معلوم کہ مادہ یہاں۔۔۔“ وہ کہتے  
 کہنے رک گیا۔

”نہیں اور نہ ہی کبھی معلوم ہوتا چاہئے، یہی سمجھ لیں  
 کہ وہ کبھی یہاں نہیں آئی تھی اور جو ذرا بھروسہ ساتھ میں  
 سمجھیں، وہ بہت بھروسے کا بندو ہوتا چاہیے۔“ زبیدہ نے  
 زندہ سے ہونے لگے میں کہا۔

”اچھی بات ہے، بہن جی، جیسا آپ چاہیں۔ میں  
 کچھ دیر بعد گاڑی بھجوا دوں گا۔“ اس نے انتہائی احتیاط  
 سے کہا اور فون بند کر دیا۔ ابھی لمحات میں وہاں نے

اس سے جموت کیوں برلا، حالانکہ اس نے خود کو لنن سا ج  
 بولا تھا، تاہم جس طرح کے حالات کا اسے یہاں آ کر  
 واسطہ پڑ گیا تھا، ایسے میں شیب کہا اسے بول کر لے گا؟  
 پھر پھوکی بھجورنی بھی یہی ہے کہ شیب کو معلوم نہ ہو اس  
 لیے اسے جو بنی وہاں جا مانہی ہوگا۔ جس کے پاس وہ آئی  
 تھی، وہی سراب نکلا۔ وہ وہاں سے دے، اگر وہ اب بھی  
 اپنی قسمت سے لڑے گی تو بڑی ٹوٹ پھوٹ ہو جائے  
 گی۔ وہ اسی اور جہز بن جس رہی اور شام کے سامنے پھیل  
 گئے۔ وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ جو بنی سے آنے والے  
 فون نے منتظر نہیں۔ اس سے پہلے کہ فون آتا، مادہ نہرونی  
 اپنی پھو پھو کے پانچ چلا جینی۔

”پھو پھو! میں تمہیں ہوں کہ اب ایسے دور ہے پر  
 آن کھڑی ہوئی ہیں، جہاں سے نکلے والا ہر راستہ آپ کی  
 انجی، یہاں زندگی میں انجینس بھروسے گا۔ اس لیے۔۔۔“ وہ  
 کہنے کہنے رک گئی۔

”اس لیے۔۔۔“ زبیدہ نے چونک کر پوچھا تو وہ  
 بڑے اعتماد سے بولی۔  
 ”مجھے جو بنی چلے جانا چاہیے۔“

”وہ ہمارا ہی شانہ نہیں ہے کہ وہاں کے اور اب شاہ  
 نہ ہارنا وہ اہمیت نہ رہے گی جو جلی سے ندم نکالنے سے  
 پہلے تھی۔“ وہ آتشیں سے بولی۔

”پھو پھو، اگر میں آخر روانہ کی کہیں ہوئی تو یہ  
 الگ بات تھی اس وقت تو معاملہ میری پھو پھو کا  
 ہے۔ ایک ایسی ماں کا جو اپنے بچے کے سامنے اپنا راز نہیں  
 کھیلنا چاہتی۔ یہ آپ پر کوئی احساس نہیں، میرا فرض بنتا  
 ہے پھو پھو، ہانی رہی اہمیت کی بات ہو وہ پہلے کہاں  
 تھی۔ یہاں ہے کہ شیب کو میرے بارے میں علم نہیں ہو  
 سکا۔ میں اسے آپ کی رست ہی سمجھوں گی۔ آپ  
 بھی اسے کچھ مت کہنے گے گا۔ میں جو بنی کی ان خانہ میں  
 دیواروں میں زندگی جی لوں گی۔“ مادہ نے کہتا تو بڑے  
 اعتماد سے شروع کیا تھا مگر کہنے کہنے اس کے آنسو چٹک  
 پڑے اور لہجہ بھینکا چلا گیا۔ زبیدہ تھی وہ رات جہز سے  
 دیکھتی رہی پھر اسے نکلے گا کہ شدت سے رو پڑی۔ کچھ دیر  
 تک وہ دونوں آنسو بہاتی رہیں۔ زبیدہ نے اسے خود  
 سے الگ کرنے ہوئے کہا۔



”اماں بی صاحبہ کا نام نہ کر بڑا چٹا مکھل کھل گیا، لیکن ذرا فاصلے پر آئیں روک لیا گیا اور ایک ملازم اندر اطلاع دینے کے لیے چل دیا۔“



شعبہ اچانک ہی پریشان ہو گیا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ وقت کی گٹائیں اس کے ہاتھ سے نکلتی جا رہی ہیں۔ سلامت نگر آنے ہوئے جو ذہنی طور پر پرسکون ہو گیا تھا۔ ایک دم سے پریشانی نے ان پر حملہ آور ہو گیا تھی، انہی دو ذوقوں میں دو ایسے واقعات ہو گئے، جس نے اس کا دماغ مازوف کر کے رکھ دیا تھا۔ مادہ کا نمبر اچانک بند ہوا تو پھر اس سے کوئی رابطہ ہی نہ ہو سکا۔ ان کے ساتھ کیا ہوا؟ کچھ معلوم نہیں تھا۔ دو خود پرچران خفا کی وہ انا پریشان کیوں ہے؟ یہ وہی مادہ ہے جس سے وہ کبھی خود رابطہ نہیں رکھتا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس سے نطفن ختم ہو جائے۔ اب وہی مادہ اسے اپنے انتہائی فریب محسوس ہو رہی تھی۔ بوئیں کھیل ہی کھیل میں ایک ساتھ چلنے چلنے انہی کوئی فریب نہ ہو جائے گی، ایسا تو کبھی اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ ان فریب کی شدت کا اندازہ اسے ان لحظات میں ہوا تھا جب وہ اندوہ جبر میں کم ہو گئی تھی۔ وہ مسلسل اس کے نمبر پر رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر ہر بار ایک ہی سبب سنائی دے رہی تھی۔ اگرچہ اس کے لاشعور میں کبھی تھا کہ وہ بوئیں ایک دن کم ہو جانے گی۔ لیکن وہ کہوں کم ہو گئی؟ اس سوال کا جواب اسے حیرت زدہ کر رہا تھا۔ یہ مادہ ہی کی کوشش تھی کہ وہ وہی کی راہ پر چلنے چلنے بہت دور تک آگئے تھے۔ اس کا بناؤ کچھ کہے اچانک غائب ہو جانا پریشانی کا باعث ہی نہیں ٹکر مند کی بھی پیدا کر رہا تھا۔ وہ اسے کیاں سے اور کیسے تلاش کرے؟ یہی آواز سے سمجھتیں آ رہی تھی۔ سوائے ایک نمبر کے ان کے پاس تھا ہی کیا؟ یہی ایک سہارا تھا، ایسے کیے دھماکے سے وہ مادہ تک کیسے رسائی پاسکتا ہے۔ یہ تو کبھی بھی اور نہیں سے بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ اسے یقین نہیں ہوا تھا کہ یہ وہی مادہ ہے جس نے دو دن اور دو دنوں سے اس سے بات نہیں کی تھی، کیوں؟ اس کے بعد سب کچھ اندھیرے میں کم ہو جاتا اور ان پر مایوسی چھائے چلی جا رہی تھی۔

نظری طور پر ایک دوسرے کو دیکھا تو مادہ بھی انداز میں لیوں پر مسکراہٹ لے آئی جس سے زبرد کادل کٹ کر رہ گیا۔ وہ کوئی بات کہیے بنا حوصلی جانے کے لیے نار ہوئے لگیں۔ یہ زبرد ہی جانتی تھی کہ وہ کس دل سے اسے برسوں بعد جوئی جانے کی نیازی کر رہی تھی جبکہ مادہ یہاں سے اٹھ کر شعبہ کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ کتنی ہی دہرنگ اس کی تصویر کے سامنے کھڑی رہی۔ یوں بت بنی ساکت و صامت جیسے وہ بھی کوئی تصویر ہی ہو۔ کافی دیر تک بوئیں تصور کو جتنے رہنے کے بعد وہ ایک دم سے غائب ہو کر بس وہی۔ رات گئے زبرد نے اپنا گھر ایک اعتماد والی عورت کے سپرد کیا اور وہ دونوں بھاء جمید کی بھیجی، بوئی گاڑی میں بیٹھ کر سلامت مگر کی جانب چل دیں۔

رات کے غائب میں وہ پوری طرح واضح ہو گیا تھا۔ جب ان کی گاڑی سلامت مگر تھکی گئی۔ وہاں کی تو دنیا ہی پیل گئی ہوئی تھی۔ یہ زبرد اپنے ہی بائبل کے وہاں میں اسی جگہ تھی۔ اسے برسوں بعد وہ سلامت مگر کی راہوں پر آئی تھی۔ اسے بالکل بھی اندازہ نہیں ہو پارہا تھا کہ جوئی کدھر ہے اور ایسا ہی حال مادہ کا تھا۔ وہ بھی سلامت مگر کی گلیوں اور راہوں سے ما آشنا تھی۔ وہ تو خود اندھیرے میں گئی تھی اور اب وہ ان روشنی میں اسے جوئی کا راستہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بس قسمت یہی تھا کہ سلامت مگر میں صرف ایک دوڑی ہی، ہر سامنے کی تھی۔ جہاں تک پہنچنا مشکل نہیں تھا۔ پورا تھبہ گذر گیا اور اس کے باہر دو بائرنٹھ نہیں کے ساتھ جوئی اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ ابستاہ تھی۔ بڑے پچانگ پر اب بھی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ زبرد اور مادہ نے چہرہ دسمت اپنا پورا بدن سہا جاب میں چسپا ہوا تھا۔ وہاں موجود لوگوں کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ دون ہیں؟ اسے لیے انہیں روک لیا گیا۔ زبرد سمجھ گئی کہ مادہ کے ہارے کوئی خبر ابھی جوئی سے باہر نہیں نکلی اور یہی ہی اسے کسی نے دیکھا ہے کہ کہنے ہی پہچان گیں۔ ایک شخص ان کے پاس آتا تو رانہور نے ہی کہہ دو باجو زبرد نے اسے بتایا تھا۔

”اماں بی صاحبہ سے ملنا ہے، انہیں اطلاع دیں۔ ہم شہر سے آئے ہیں۔“

دوست نے تھوڑی دیر بعد مصنوعات اپنے کا وعدہ کر لیا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے کافی حد تک اطمینان ہونے کے ساتھ ساتھ حوصلہ بھی ہوا۔ اب وہ اپنے آپ کو مطمئن کر سکتا تھا کہ اس نے کوشش تو کی۔ ماپوسی کے باول کسی حد تک جھٹ گیا۔ دو تازہ دم سا ہو کر آگس چلا گیا۔ راستے میں اسے خیال آیا کہ تاجاں مانی کے معاملے میں بھی ایسی ہی کوئی چنگڈی تلاش کر لی جائے۔ اسے خیال آیا کہ میرا کسی ایک نائل مان کے ہاں پڑنی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کا دیوانہ اسے بڑے شگھے ہوئے انداز میں دھمکیاں دے کر گناہاں مکن سے اس نائل کی وجہ سے کوئی سووے بازی مکن ہو سکے۔ تاجاں مانی کی بازیابی کے لیے اسے اگر کوئی غیر قانونی حربہ بھی آزما پڑا تو وہ آزما لے گا۔ آگس دیکھنے ہی اس نے اپنے ابا پر سے دو نائل لانے کے لیے کہہ دیا۔ ابھی نائل اس تک نہیں پہنچی تھی کہ چودہ نثار اٹھارہ تاجاں مانی کا بیٹا ایان علی ان کے پاس آگئے۔ وہ ان کے ساتھ بڑے تباک سے ملا اور حال احوال کے بعد پوچھا۔

”سنائیں چوہدری صاحب۔ دکوئی پیش رفت ہوئی؟“  
 ”میں نے پوچس سے تعاون لینے کی کوشش کی تھی، لیکن آپ کا بھی معلوم ہے کہ وہ سب سے سبھا تیار نہیں ہیں۔ ہاں بس اب ایک ہی راستہ چننا ہے۔“ وہ اعتماد سے بولا۔

”وہ کیا؟“ شعیب نے پوچھا۔  
 ”بہی عدالت کا راستہ۔۔۔۔۔ ان نے تانا۔“  
 ”اس میں تو بڑا وقت لگے گا۔ میں نے بھی یہ سوچا تھا، مگر اب تک تاجاں مانی۔۔۔۔۔ اس نے بے یقینی کے سے انداز میں کہتے ہوئے زفر اور جہرا چھوڑ دیا۔“  
 ”میں سر! تاجاں مانی ابھی تک محفوظ ہے، ہاں مگر اس پر تشدد بہت ہوا ہے۔ یہ اس کا بیٹا کریم علی ہے، اسے وہیں سے معلوم ہوا ہے۔“ وہ پھر اعتماد سے بولا۔ ”جہاں تک عدالت کی بات ہے تو ہم نے ایک مشہور وکیل کے ذریعے ایک کوشش کی ہے۔ آپ کا تعاون ہو تو ہم ابھی کچھ دیر بعد حوثی سے تاجاں مانی کو برآمد کر سکتے ہیں۔“ یہ کہہ کر دو قانونی معاملات کے نکات سمجھانے لگا۔ شعیب غور سے سنتا رہا، وہ پھر بولا۔

ماپوسی بھرے ان حالات میں چوہدری شہا، اٹھارہ کی اطلاع کا بوجہ ان کے فیصلے پر بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ اس شہر میں اس سے تھوڑی دور چوہدری میں تاجاں مانی نقل ہو جانے والی بھی یا پھر شاپا سے نقل بھی کر دیا گیا ہوا وہ اب تک وہ دنوں ٹٹی تے وہ دن ہی ہو۔ یہ بات اس کے علم میں نہ آئی تو انک بات تھی۔ نتیجے سے ایسے واقعات ہوتے ہیں، جن کا علم نہیں ہوتا تو ایسے میں دکھ بھی من میں نہیں اترتا۔ اب یہ اطلاع آتھی۔ ذمے داری اور انسانی بہدرونی کا بوجھ تھا کہ اس پر بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ اگر وہ جھرت نقل ہو جاتی ہے اور اس شخص میں اس نے کوئی کوشش بھی نہ کی کہ اسے بجائے تو وہ اپنے آپ کو بھی معاف نہیں کر پائے گا۔ اس کے پاس ایسے کوئی اعتبار نہیں تھے، جنہیں وہ استعمال کرتے ہوئے حوثی کی تاشی لے سکتا اور تاجاں مانی کو برآمد کر لیتا۔ یہ اختیار دوسرے آفیسر کے تھے۔ وہ شہر کا سب سے بڑا انتظامی آفیسر ہونے کے باوجود بھی بے بس تھا۔ ان کے پاس اختیار نہیں تھے جس کے باعث وہ کچھ نہیں کر پاتا تھا۔ اسی بے بسی اور مایوسی والی کیفیت میں وہ آگس جانے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

اگرچہ شعیب کو اس کا داغ ایک خاص حد تک جا کر مایوسی کا فیصلہ تو وہ چکا تھا لیکن وہ مضطرب تھا، باونیس ماننا چاہتا تھا، کوئی واڈو لانا چاہتا تھا۔ صاف راستے پر اگر رکاوٹ آجائے تو ساتھ میں کوئی نہ کوئی چنگڈی ضرور منزل تک پہنچا دیتی ہے۔ وہ ایسی ہی کسی چنگڈی کی تلاش میں تھا۔ دل اسے مسلسل افسوس رہتا کہ مایوسی کے لیے نہیں بنی۔ کامیابی کے لیے وہ کوشش ضرور کرے۔ وہ اسی تکلیف میں تھا کہ آگس جانے کے لیے تیار ہوئی تھا لیکن رماح مسلسل سوچ رہا تھا۔ دوسروں پر بیٹھا جائے ہی رہتا کہ اگرچہ ایک خیال اس کے داغ میں آ گیا۔ وہ نادیدہ کو تلاش کرنے میں ایک قدم تو اٹھا سکتا ہے۔ وہ چنگڈی اس نے تلاش کر لی تھی۔ دو سبیل فون نمبر ہی سے آگے بڑھنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ یہ کوئی قانونی طریقہ نہیں تھا مگر اسے پورا بھروسا تھا، جو مصنوعات بھی ملیں گی، دوست ہوں گی۔ اس نے اپنا سبیل فون اٹھا لیا اور اپنے قابل اعتماد دوست کو فون کر کے نمبر دے دیا۔ اس

”میں ابھی بات کر لیتا ہوں۔ آپ کی ہیر سائیکل سے بات ہو جائے گی تو زیادہ اچھا ہے۔ یہ شا، اللہ جیسے بلکہ سب کو لوگوں کے ہتھے نہ چڑھیں، یہ خراب کر رہے۔“ وہ جلدن سے فون نکالنے کوئے فیزی سے بولا۔

”ٹھیک ہے، ہنر جاؤ اور فائل مجھے لا کر دو۔ ان سے بات کر لو، میں آج بلکہ ابھی ان سے ملنا چاہوں گا۔“ اس نے حسی انداز میں کہا اور سامنے بڑی فائل کھول لی، اٹکار سمجھ گیا کہ اس نے کیا کر رہا ہے۔ اس لیے فوراً ہی پلٹ گیا۔ تب شعبہ دونوں آپشن پر سوچنے لگا، جو بھی ہوا اور جیسے بھی ہو، اسے اپنا مفید چاہے تھا۔

☆.....☆

حوبلی کی دوسری منزل پر، پوربھ سے بالکل اوپر والے کمرے میں اماں بی اور زبیرہ بی بی ہو چکی تھیں۔ ان دونوں کے درمیان اتنی باتیں ہو چکی تھیں کہ سب کچھ جاننے کے باوجود کئی سوال جنم لے چکے تھے۔ اتنے برسوں کا فاصلہ اتنی درمیان تو نہیں سمٹ سکتا تھا، وہ دو بھئیوں کو اس فاصلے کو سمیٹنے کی غرض سے باتیں کر لی چلی جا رہی تھیں۔ اور یہ اپنے کمرے میں جلی گئی تھی۔ فرج اپنے کمرے میں بجلی دہی لگی کہ وہ نادر سے ملے، پھر اس کی امی نے اسے اوند سے ملنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ ظہیر شاہ نے جب ہمدردی کی آمد کے بارے میں سنا تو وہ حوبلی سے باہر چلا گیا تھا، کہاں تھا اس کی انہیں خبر نہیں تھی۔ حوبلی کے ماحول میں وہی انتہائی خاموشی شہر دی تھی۔ اسی ہی بے آسماؤ فضا میں دلاور شاہ اپنی ماں کے پاس آ گیا۔ تب وہ دونوں خاموش ہو گئیں۔ کتنے ہی لمحے خاموشی کی گذر ہو گئے۔ ہر کوئی یہی خیال کر رہا تھا کہ وہ بات کی ابتدا کرے۔ بی بی دلاور شاہ نے بڑے ظہیر لہجے میں کہا۔

”آہا، آپ نادر کو وہاں حوبلی لے آئی ہیں۔ آپ کا شکریہ۔ آپ نے اسے یہ تو سمجھا دیا ہے، اے اے اے اس حوبلی میں کیسے رہتا ہے۔“

”کیسے رہتا ہوگا۔ مطلب..... میں سمجھی نہیں۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ زبیرہ نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

”اس میں نہ سمجھنے والی کون سے بات ہے۔ اس نے جو کچھ کہا، اس کی حوبلی سمجھ کر معاف کیا جا سکتا ہے، لیکن آئندہ کے لیے اسے حوبلی کی رہا بات کے مطابق رہنا ہو

”آپ درمست کریں۔ میں آپ کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کروں گا۔ میں ڈی ایس بی صاحبہ کو ابھی یہاں بلوا لیتا ہوں، پھر سب معاف لیتے ہیں۔ آپ فوراً غم ہار لے آئیں۔“ شعبہ نے کہا تو شاہ اللہ فوراً ہی اٹھ گیا۔ وہ ڈی ایس بی کو فون کرنے لگا۔ اس وقت وہ فون پر بات کر رہا تھا جب اس کا اٹکار اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔ وہ اس کے سامنے ٹھہرا بات سن رہا تھا۔ وہ فون کر چکا تو اٹکار سے پوچھا۔

”میں نے وہ فائل لانے کے لیے کہا تھا۔“

”سر! میں نے وہ فائل لانے سے صرف اس لیے ہی منہ کی کہ میں پہلے بھی ہیر سائیکل کے ساتھ کام کر رہا تھا، بنا ہوں۔ سوچیں ہی بات سے کہ اس میں کوئی جائز کام نہیں ہے اور پھر آپ اٹکار بھی کر چکے ہیں۔ اس لیے اب وہ کیوں سر؟“ اس نے آخری لفظ بہت جھجک کر کہے تھے۔

”اور میں بھی نہیں صاف بتانا چاہتا ہوں۔ اس فائل کے ذریعے ممکن ہے میں ہیر سائیکل سے کوئی سوری بازی کر سکیں۔“ انہیں شاید علم نہیں ہے کہ.....

”سر! کتنا ہی صاف! میں شاہ اللہ کو لکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ ہیر سائیکل کے خلاف ہی جائے گا۔“ وہ فیزی سے بولا۔

”تم کہتے کیسے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”سر! ان کا پرانا ہی معاملہ چلتا چلا آ رہا ہے۔ خیر! اب کو سو دے بازی کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی اور جو معاملہ ابھی روٹیں ہے، میں اس کے بارے میں تو نہیں جانتا لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جو معاملہ ہو گا میں اسے آرام سے حل کر دوں گا۔ ان خانوں میں کہہ سکتا ہوں۔“ اٹکار نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”کیسے! جبکہ تمہیں معلوم ہی نہیں ہے کہ معاملہ کہاں ہے۔ وہ سیدھے سبھاؤ عمل بھی ہو سکتا ہے یا نہیں؟“

شعبہ نے پوچھا۔

”سر! مجھے معاملہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں ابھی رہبان صاحب سے کہہ کر آپ کی ملاقات ہیر سائیکل سے گفتگو کر دوں گا، آپ براہ راست خود ہی بات کر لیجئے گا۔“ اٹکار نے فیزی سے کہا۔

”کتنا وقت لگے گا؟“ اس نے پوچھا۔

گلہ ظہیر شاہ سے شادی کے بعد اس نے کہا چاٹو بہدر نے نوک و لب۔

”دلدار اس کے یہاں آنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب تم جو چاہو اس سے منوالو۔ مجھے مت یہ وعدہ کہا گیا ہے کہ جو تاروہ چاہے گی وہی ہوگا، لہذا وہی ہوگا جو تاروہ چاہے گی۔“ زبیر نے حیرت دھندھے اور افسردگی کے لٹے جٹے جذبات میں تیزی سے کہا۔

”ابہا ممکن ہی نہیں ہے آواز بیدار! میں اگر آپ کے گھر سے خاموشی کے ساتھ واپس آ گیا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اپنی روابات بھول گیا ہوں۔ میں نے صرف اس لیے خاموشی اختیار کی کہ اسی میں وہ جلی کی بھلائی ہے۔ بات نکلتی تو گڑھے مروے اکھاڑ لیے جاتے۔ اس میں آپ کا کردار کہا ہے۔ ساویہ بنا کر معلوم ہو جاتا۔ آپ اگر یہاں اس وقت حویلی میں بھی ہیں تو اس وجہ سے کہ میں نے تاروہ کو حویلی میں راپیں لانا تھا اور بس دور آگئی ہے۔“ حیرت میں نے خود غرضی سے کہا۔

”دلدار شاہ! تم بہت غلط سوچ رہے ہو۔“ زبیر نے دھندھے میں کہا۔

”غلط ہاں درست! یہ میں نہیں جانتا، مجھے فوراً پتا چلتا ہے جو میں جانتا ہوں۔ آج ہی باویہ کی شادی ظہیر شاہ سے ہو جائے گی۔ اب آپ کا کام تم سے اب آپ سے مجھے کسی تعلق کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“ اس نے واضح لفظوں میں اپنا مدعا کا تو وہ دونوں حیران رہ گئے۔ انہیں حیرت میں اس قدر خود غرضی کی ذوق نہیں تھی۔ اس پر زبیر نے غمزدگی سے لہجہ میں کہا۔

”تم نے یہ سب معلومت کے تحت کہا اور تمہیں رشتے تانوں اور تعلق کی کوئی قدر نہیں، نہ ہی اپنے وعدہ کی۔“

”جو کچھ بھی آپ مجھ کو میرے خیال میں اگر ہم بات نہیں ختم کروں تو زبیر اور بہتر ہے۔ آپ چاہیں تو نکاح کے وقت تک یہاں رہ سکتی ہیں مگر خوراک اپنی آٹھوں سے دیکھ لیں کہ اس کا نکاح ظہیر شاہ سے ہو گیا ہے۔“ اس نے کہا اور اٹھ کر جانے لگا تو زبیر نے بھرتے ہوئے کہا۔

”جو کچھ تم نے کہا یہ فقط تمہاری سوچ ہے۔ یہ اس وقت تک حقیقت نہیں بن سکتی جب تک تاروہ نہیں چاہے گی اور پھر تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تمہاری مصلحت کے چال

میں آ کر باویہ کو یہاں لے آتی ہوں اور اسے جھوٹا کر داپس جلی چاؤں گی۔ وہ بھی منہاؤں دھکیوں سے زبرد کر اب بھی وقت سے پہلے جاؤ۔“

”میں نے جو سوچا ہے، وہی کرنا ہے۔ ابھی تم خود ہی دیکھ لو گی۔“ زبیر نے اس وقت اب بھی بھول گیا۔ وہ انھا تو اس لیے نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”دلدار شاہ! کیا تم اپنی ماں کے وعدوں کا پاس بھی نہیں کروں گے۔ میں نے زبیر کو یہ زبان دہرائی ہے۔“

”حویلی کی عزت سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے، دلدار شاہ کی ذات بھی نہیں۔“ اس نے کہا ہی تھا کہ اس کا سائل فون بج اٹھا۔ اس نے کال ریسپونڈ کر دوسری طرف دہانہ اٹھا۔ وہ چند لمحے اس کی بات سننا اور پھر بوللا۔ ”اب میں مروان خانے میں بٹھاؤں۔ میں آتا ہوں۔“ یہ کہنے ہوئے وہ اس کھڑکی کی جانب بڑھ گیا جہاں سے حویلی کا باؤر راز در کھلائی رہے وہاں پھر کچھ کیے جانے اور وہی کمرے سے نکلی گیا۔ دونوں ماں بیٹی نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ زبیر نے اٹھنے ہوئے کہا۔

”اماں! آپ فکر نہ کریں، دلدار شاہ نے اگر مجھے دھوکہ دیا ہے تو میں بھی اسے معاف نہیں کروں گی۔“

”ابہا کرو گی تم۔۔۔ کچھ بھی نہیں کر سکتی ہو مجھ سے ہی غلطی ہو گئی جو میں نے تمہیں یہاں بلوالیا۔“ اماں نے جھجکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اماں! میں جب یہاں آئی تو یہ سب سوچ کر آئی تھی، مجھے کسی حد تک اندازہ تھا کہ وہ کہا کر سکتا ہے اس لیے میں نے۔۔۔ زبیر کو یہ کہنے ہوئے چونک گئی۔ وہ تیزی سے کھڑکی تک پہنچی اور ہونٹوں کی مانند ہارو کھینچنے لگی جیسے ہار میں نے کوئی جن بھوت دیکھ لیا ہو، پھر زبیر نے ہونٹیں آراز میں دہرائی۔ ”بہ سبب۔۔۔ یہاں کبے بچ گیا؟“

”کون۔۔۔ کون بچ گیا؟“ اماں بیٹی نے ٹھہرا کر اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ زبیر کی حالت دیکھ کر حیران ہو گئی تھی۔

”میرا بیٹا شعب! تو ولز زبیر ہونے آواز میں زبیر۔“

”شعب یہاں۔۔۔ کہاں سے وہ۔۔۔“ اماں نے شدید حیرت سے کھڑکی کے پاس آن کر گیت کی طرف دیکھا۔ ایک سرکاری گاڑی کے پاس ٹین لوگ کھڑے تھے۔ ان میں ایک شعب تھا، ایک زبیر اور دوسرا ہارکا۔

کھڑی سرکاری گاڑی کو کئے جا رہی تھی۔ جس میں اس کا بیٹا قایم تھا۔ چند لمحوں میں ملازمہ ماں بی بی کے پاس آگئی۔

”پتا کرو، مردان خانے میں کون لوگ آئے ہیں اور کیوں؟“ ملازمہ بی بی سن کر ہلنے لگی تو ماں بی بی نے جیسے لہجے میں تاکید کی: ”اور سنو، کبھی کو معلوم نہ ہو۔“

”جی ماں بی بی.....“ ملازمہ نے کہا اور اٹلے قدموں واپس پلٹ گئی تو ماں بی بی نے زہید کی طرف دیکھ کر کہا۔

”آہ زہید، بیٹھو اصر میرے پاس، تو پریشان نہ ہو، ولاور شاد نے وعدہ خلافی کر کے اچھا نہیں کیا، میں اسے سمجھاؤں گی..... اور اسے.....“

”وہ تو اب میں اسے دو کھلوں گی کہ وہ ادا بی بی کی مرضی کے خلاف کیا کر سکتا ہے، لیکن شعیب یہاں کیسے آ گیا۔ یہ کوئی تھوڑی پریشانی نہیں ہے۔ لگتا ہے اب میرا راز کھل جائے گا۔ میں..... میں اسے بیٹے کا سامنا کیسے کر پاؤں گی؟“ وہ اگلوں کی طرح خود کلائی میں کتتی ہوئی کھڑکی ہی کے پاس کھڑی ہوئی۔

”خوصلہ کو دیر سی بی بی! اگر اسے معلوم ہو بھی گیا ہے تو کیا ہو گا۔ کیا ماں اور بیٹے کا رشتہ ختم ہو جائے گا؟ ایسے پاگلوں کی طرح مت سوچو، سکون سے میرے پاس آ کر بیٹھو، ممکن ہے وہ اسے ہی کسی کام سے آیا ہو۔ یہ آفسیرو لوگ تو یہاں آتے ہی رہتے ہیں۔ آفسیرو بی بی، بیٹھو اصر۔“

”اللہ کر کے ایسا ہی ہو..... میں نے ساری زندگی اس سے یہ بات چھپائی ہے اور اگر اب.....“ وہ کہتے ہوئے رک گئی، بھر غصے میں بھرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”میرے بارے میں پتا چلتے ہی ادا بی بی کے بارے میں بھی معلوم ہو جائے گا..... بات نہیں ٹھیک نہیں کہنے والی۔ لیکن اب مجھے کوئی پر دانی نہیں ہے۔ بات کھلتی ہے تو کھل جائے۔ اب میں ولاور شاہ کو معاف نہیں کر سکتی۔“

”اللہ خبر کرے گا، تم صبر تو کرو۔“ ماں بی بی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا تب پھر ان دوؤں میں خاموشی چھا گئی۔

وہ لاشعوری طور پر ملازمہ کی آید کا انتظار کرنے لگے۔ اس کی اطلاع پر ہی وہ سوچ سکتی تھی کہ اب اس نے کیا کرتا ہے۔ یہ نکات بہت بھاری تھے۔ گنڈا رے نہیں گذر رہے تھے۔ ایک طرف ولاور شاہ لیکر سچ کر جا چکا

”وہی شعیب ہے، جو تینوں میں سے لمبا ہے“ زہید نے آسکتی سے پوچھا، جیسے وہ شعیب سے اپنی آواز بگھی چھپا رہی، جبکہ ماں بی بی نے نہال ہوتے ہوئے کہا۔

”ماشا اللہ! کیا کڑیل جوان ہے۔ میرا خواہہ اللہ نظر بد سے بچائے، بالکل باپ پر گیا ہے۔“

”یہ آئیے کیا.....؟“ زہید نے کہا۔ وہ مسلسل نیچے اٹھیں دیکھ رہی تھی۔

”ماں..... یہ تو ہے، لیکن تم تو کہہ رہی تھی وہ کہیں کام سے گیا ہے۔ گھر آ کر پوچھا ہو گا تو.....“ یہاں آ گیا۔ اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔“ واوی نے اپنے تئیں انداز دگا کر کہا۔

”نہیں ماں! میں نے شعیب کے بارے میں جتنا بتا تھا آپ کو، وہ سچ نہیں ہے، اسے ادا بی بی کے بارے میں قطعاً نہیں معلوم کہ وہ میرے گھر وہاں کبھی ہی اور نہ ہی میرے بیٹے کو یہ معلوم ہے کہ میرا بھی کوئی حلقہ اس حوالی سے ہے۔“ وہ سوچتے ہوئے لہجے میں بولی۔

”تو پھر یہ یہاں کیسے آ گیا.....؟“ ماں بی بی نے شدت حیرت سے پوچھا تو وہ کھڑکی سے شعیب کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”میرا بیٹا ہمیں اس سلامت گھر میں سب سے بڑا انتظامی آفسیرو ہے۔“ اس کے لہجے میں فخر تھا، ایک ماں کا فخر جزا بی بی، زہید اور لاو کے لیے ہوتا ہے۔

”آؤ، ان طرح تو پھر یہاں ایک طوفان اٹھ جائے گا۔“ ماں بی بی نے لکھوں میں سوچتے ہوئے کہا۔

”میب خوف کے سناٹوں میں شعیب گھے بارے میں ہونے والی خوشی اچانک دب کر رہ گئی، یوں جیسے خوف کی ہوا میں غطیل ہو کر رہی گئی ہو۔“

”کاش ولاور شاد اپنی من مانی نہ کرے اور.....“ زہید نے کہا اور غور سے نیچے دیکھنے لگی۔ دیوان اس کے پاس چلا گیا تھا اور اس کو لے کر مردان خانے کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ اسی طرف غور سے دیکھے چلی جا رہی تھی، پھر خود کلائی کے سے انداز میں بولی۔ ”یہ آیا کیسے ہے؟“

”میں ابھی معلوم کرتی ہوں۔“ ماں بی بی نے اٹھتے ہوئے کہا اور اپنی ملازمہ کو آواز دے دی۔ ”مضطرب سی زہید کھڑکی سے لگی کھڑکی میں ادا بڑے بچانک کے پاس



زہدہ نے سنا تو انجانے خوف سے لرزتی ہوئی  
چوٹک اٹھی، اسے غظا اپنے منہ کی ٹکڑی لٹکائی۔

\*\*\*

تاوہ کو اپنے کمرے میں آنے ہی سب سے پہلی  
نشوونش تاجاں مائی کے بارے میں ہی ہوئی تھی۔ وہ اپنے  
کمرے میں اس وقت تک بے چین رہی جب تک  
اسے تاجاں مائی کے بارے میں پتا نہیں چل گیا کہ اس  
کے جانے کے بعد اس پر کیا گذری۔ تاوہ کا دل بھر  
آیا۔ تاجاں مائی نے اس کے لیے اتنی بڑی قربانی  
دی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد تاوہ کو یہ معلوم ہو گیا کہ  
تاجاں مائی اس وقت کہاں ہے؟ تاوہ کے گمان میں بی  
خفا کہ پیرسا میں اب اپنا راز رکھنے کے لیے تاجاں مائی کو  
فصل کروا دے گا۔ نجی اس جوئی کی روایت میں خفا کہ  
راز افشا کرنے والے کی سانس سچ لی جاتی تھی۔ دو  
اپنی جھوٹی زہدہ کا راز رکھنے کے لیے وہاں جوئی آگئی  
تھی۔ یہاں جوئی آنے کا مطلب خفا کہ اپنی زندگی کو واؤ  
پر پھر سے لگارتی تھی۔ اگرچہ پھوپھو زہدہ اور اماں بی نے  
اسے یقین دلا تھا کہ ہو گا وہی زہدہ خود چاہے گی، لیکن یہ  
بات اس کے دل میں نہیں اترتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ  
ابہا ہی ہوگا۔ پھوپھو زہدہ سے جہاں خون کا رشہ نکل آیا  
خفا وہاں وہ شیب کی ماں بھی تھی۔ وہ شیب جس پر  
دیکھے بنا اعتماد کر چکی تھی۔ اس نے خود کو ان پر قربان کر دیا  
خفا۔ اس کی اپنی ذات تو نہ رہی تھی لیکن تاجاں مائی بے  
چاری کا کیا تصور اس کی نوید کرنی چاہیے نا، اگر اسے  
کچھ ہو گیا تو اسے داؤد ہی ہوگی جس کے باعث وہ نشو و  
کے اذیت ناک مرضے سے گذری ہے۔ اب اگر وہ  
جوئی میں ہے تو اس کا یہ فرض بننا ہے کہ وہ تاجاں مائی کی  
مدد کرے۔ اس جوئی کی روایات سے وہ بخوات نو کر رہی  
تھی ہے۔ بائیں کے لیے جو مزہ ہے وہ نو مفر ہوئی تھی ہے  
تو کیوں تاہی مرضی کرے۔ یہ سوچتے ہی وہ اپنے  
کمرے سے اٹھی اور اس جانب چل دی، جہاں نہ خانے  
میں تاجاں مائی کو رکھا ہوا تھا۔

نہ خانے کا دور دورہ ہوا، لاک تھا۔ وہوازے پر جڑا تالا  
اس کی طرف بڑی حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ نجی تالا  
تاجاں مائی کی راہ میں رکاوٹ تھا۔ وہ واپس پلٹ

خفا وہ دوسری طرف شیب جوئی آن پہنچا تھا۔ اس وقت  
زہدہ ابھی کیفیت میں تھی جیسے کوئی خلا میں ہوتا ہے۔ نہ  
ہی کچھ سوچ سکتی تھی اور نہ ہی کچھ کہہ سکتی تھی، ایک جمو  
اس پر طاری تھا کہ وہ انتہائی بے بسی محسوس کر رہی تھی۔

فرضاً آدھے گھنٹے کے بعد ملازمہ پلٹ آئی اس  
کے چہرے پر عجیب طرح کا اثر پھیلایا ہوا تھا۔

"بولو کون لوگ ہیں دو۔؟" اماں بی نے اس کے  
چہرے پر دیکھتے ہوئے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔

"دو شہر کے افسر ہیں اماں، لیکن تاجاں مائی کو  
لینے آئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ پیرسا میں نے اسے  
فصل کر دیا ہے۔ دو اسے... دو تیزی سے کہنے لگی تو  
زہدہ نے پوچھا۔

"ولادہ شاہ کارو یہ کہا ہے ان کے ساتھ...؟"

"لہجہ ہے۔ غصے میں نہیں ہیں۔ کہہ دے سنے  
کہ تاجاں مائی کو جانے کی اجازت نہیں، اس سے ملوایا  
جاسکتا ہے۔"

"دو وہ نہیں مان رہے ہوں گے؟" اماں بی نے  
جلدی سے پوچھا

"بس نجی بحث چل رہی ہے۔" ملازمہ نے دھمے  
لہجے میں کہا۔

"تاجاں مائی کہاں ہے۔" اماں بی نے انتہائی  
آہستگی سے پوچھا تو ملازمہ نے زہدہ کی طرف دیکھتے  
ہوئے جھجک کر کہا۔

"وہ نہ خانے میں ہے۔ پیرسا میں نے اسے وہاں  
بند کر دیا ہوا ہے۔"

"دو ضد کا بڑا لگا ہے۔ تاجاں مائی کو لے کر رہی جائے  
گا مگر وہ تاجاں مائی ہی کو کہوں لینے گیا۔" زہدہ نے پوچھا۔

"تاجاں مائی کا بنا کر مرلی ان کے ساتھ ہے۔"  
ملازمہ جلدی سے بولی تو اماں بی چند لمحے سوچتی رہی پھر

اس سے بولی۔  
"اچھا، جو... میں جب تجھے ملاؤں تو آتا۔"

ملازمہ بہ سننے ہی تو وا پلٹ گئی۔ اماں بڑبڑانے  
ہوئے کہنے لگی۔

"تاجاں مائی تو سب کچھ کہہ دے گی۔ اس کا منہ  
کون بند رکھے گا۔ اس نے منہ کھولا تو..."

گئی۔ اس سارے دودھ میں تاد بے نے تاجاں مائی کو اعتماد میں لے لیا اور اس کی بوہی حفاظت کے نوے دارنی بھی لے لی۔ دکانی حد تک پہنچ گئی مگر پھر سائیکس کا خوف اب بھی اس پر مسلط تھا۔ دودھ گھرائی، ذرا پی اور پیٹی ہوئی تاد بے کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ حیران ہو وہی تھی کہ یہ سب کیا ہو گیا۔

”تلی بی سائیکس! آپ صرف تلی بی نہ بیدو کے لیے یہاں آئی ہیں۔ اپنی سارنی زندگی۔“

”ہاں! وہ بھی میرے ساتھ آگئی ہیں اور انہاں بی کے پاس ہیں۔ میں نے ان کا راز رکھنا ہے۔“ تاد بے نے عزم سے کہا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دینی، کمرے کا دروازہ کھلا اور زبیدہ کے ساتھ مائی بی، چن آگئیں۔ زبیدہ حسرت سے تاجاں مائی کو دیکھ رہی تھی اور ایسی ہی حالت تاجاں مائی کی تھی تھی۔ وہ اس عہد کو دیکھ رہی تھی جس سے دفاع کرنے ہوئے اس کی ماں شہراں مائی نے اپنی جان دے دی تھی۔

”تم بہت چھوٹی ہی تھی جب میں نے حوہلی کو چھوڑا تھا۔ میں قسمت رہی کہ شہراں مائی کو نہ پہچانے، لیکن تاد بے نے تمہیں پہچان لیا۔“ زبیدہ نے انتہائی دکھ سے کہا۔ بھی تاد بے نے بے پھر لہجے میں کہا۔

”بھو پھو۔! اب اسے اپنے ساتھ شہر لے جائیں۔ یہاں میں خود سنبھال لوں گی۔“

”کہا مطلب اتم یہاں رہنا چاہتی ہو؟“ زبیدہ نے چونکنے ہوئے کہا۔

”جی پھو پھو۔! اب بھی جانتی ہیں اور میں بھی۔ آپ کا راز اور میرا راز صرف اسی صورت میں چھپاوا سکتا ہے، جب تک میں یہاں ہوں۔“ تاد بے نے کہنا چاہا۔

”میں مانتی ہوں تاد بے کہ یہ تم صرف میرے لئے کر رہی ہو اور میں بھی جانتی ہوں کہ میرا راز کھل گیا تو شاید شہب سے بھی ننگا ہیں، نہ ملا سکیں، میں چاہتی ہوں کہ میرا راز ہرگز ہی سے بھی ننگا ہی رہے، لیکن اس کی اتنی بھادنی قسمت تم از کم میں نہیں ادا کر سکتی۔ میں جو سوچ کر یہاں آئی تھی، حالات وہی نہیں رہے۔ اس وقت یہاں اس حوہلی میں شہب موجود ہے اور وہ اسے لینے کے لیے آیا ہوا ہے۔“ زبیدہ نے کہا تو تاد بے کی طرح چونک گئی۔ پھر

آئی، کچھ دیر بعد جب دودھ ہاں پر واپس آئی تو حوہلی کی دو ملازمتیں اس کے ساتھ تھیں اور وہ تاد بے نے کامیابان ان کے پاس تھا۔ ذرا ہی دیر میں تالانوت گیا اور وہ اس کمرے میں داخل ہوئی۔ سامنے ننگے فرش پر تاجاں مائی چت لیٹی ہوئی تھی۔ وہ یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے وہ اپنی آخری سانسوں پر ہو۔ شدو کے باعث اس کا چہرہ سو جا ہوا تھا۔ کئی جگہ سے جلد بھی ہوئی تھی۔ جس سے خون وہیں دس کر سوک چکا تھا، پھر آنسوؤں کی ٹیکروں میں یہ گیا تھا۔ وہ سیم جان حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ تاد بے ان کے پاس جا کر بیٹھی۔ اس کی حالت دیکھ کر خود اس کا اچانک بھرا تھا۔ اس نے تاجاں مائی کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور دھیرے سے آواز دی۔

”تاجاں مائی۔!“

”تلی بی سائیکس! آپ۔۔۔۔۔! آپ۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔ یہ مار دیں گے۔۔۔۔۔ جاؤ آپ۔۔۔۔۔“

”میں آگئی ہوں، تاد بے نے اس کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ تاد بے نے اسے تسلی دلا سادینے ہوئے کہا۔

”ابھی۔۔۔۔۔ پھر سائیکس مار دیں گے۔ آپ کو بھی اور مجھے بھی۔“ وہ مزب کر بولی، تاد بے نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

”کہا ہے نا، کچھ نہیں ہوتا۔ تم اٹھو اور میرے کمرے تک چلو۔۔۔۔۔ میں دیکھ لینی ہوں سب کو۔۔۔۔۔ چلو۔“

”تلی بی سائیکس! وہ بہت ظالم ہیں۔“ وہ روہانسا ہونے ہوئے بولی۔

”جہیں کہا نا، اب کچھ نہیں ہوتا۔ میں جہیں سب بتاتی ہوں۔ چلو اٹھو۔“ اس نے آٹھنگی سے کہنے ہونے اسے اٹھایا۔ تاجاں مائی بہت کوشش کے بعد اٹھ گئی۔ اس سے چائٹھیں جا رہا تھا۔ تاد بے اسے سہارا دے کر کمرے سے باہر نکلے آئی، پھر دونوں ملازمتوں کی مدد سے وہ کافی کوشش کے بعد اسے اپنے کمرے میں لانے میں کامیاب ہو گئی۔

تاد بے نے تاجاں مائی کو فالہیں پر لٹایا اور اس کے ذہنوں پر عزم پٹی کرنے لگی۔ تب تک ایک ملازمہ اس کے لیے کھانے پینے کے لیے کچھ چیزیں لے کر آ

دہلڑتے ہوئے بولی۔ ہوں گے کہ بڑی سی جاوڑ میں لپٹی ہوئی تاجاں مائی ان کے پان آکھڑی ہوئی۔ جیجی ان کا بیٹا حیرت اور درد بھری خوشی میں پکارا تھا۔

”ماں! اتھ ٹھیک تو ہوتا۔۔۔“  
 ”ہاں پترا! میں ٹھیک ہوں۔“ پھر بڑے سوز و گم سے بولی۔

”ماں! اتھ ٹھیک تو ہوتا۔۔۔“  
 ”ہاں پترا! میں ٹھیک ہوں۔“ پھر بڑے سوز و گم سے بولی۔

”ماں! اتھ ٹھیک تو ہوتا۔۔۔“  
 ”ہاں پترا! میں ٹھیک ہوں۔“ پھر بڑے سوز و گم سے بولی۔

”ماں! اتھ ٹھیک تو ہوتا۔۔۔“  
 ”ہاں پترا! میں ٹھیک ہوں۔“ پھر بڑے سوز و گم سے بولی۔

”ماں! اتھ ٹھیک تو ہوتا۔۔۔“  
 ”ہاں پترا! میں ٹھیک ہوں۔“ پھر بڑے سوز و گم سے بولی۔

”ماں! اتھ ٹھیک تو ہوتا۔۔۔“  
 ”ہاں پترا! میں ٹھیک ہوں۔“ پھر بڑے سوز و گم سے بولی۔

”ماں! اتھ ٹھیک تو ہوتا۔۔۔“  
 ”ہاں پترا! میں ٹھیک ہوں۔“ پھر بڑے سوز و گم سے بولی۔

”ماں! اتھ ٹھیک تو ہوتا۔۔۔“  
 ”ہاں پترا! میں ٹھیک ہوں۔“ پھر بڑے سوز و گم سے بولی۔

”ماں! اتھ ٹھیک تو ہوتا۔۔۔“  
 ”ہاں پترا! میں ٹھیک ہوں۔“ پھر بڑے سوز و گم سے بولی۔

”ماں! اتھ ٹھیک تو ہوتا۔۔۔“  
 ”ہاں پترا! میں ٹھیک ہوں۔“ پھر بڑے سوز و گم سے بولی۔

”ماں! اتھ ٹھیک تو ہوتا۔۔۔“  
 ”ہاں پترا! میں ٹھیک ہوں۔“ پھر بڑے سوز و گم سے بولی۔

”ماں! اتھ ٹھیک تو ہوتا۔۔۔“  
 ”ہاں پترا! میں ٹھیک ہوں۔“ پھر بڑے سوز و گم سے بولی۔

”ماں! اتھ ٹھیک تو ہوتا۔۔۔“  
 ”ہاں پترا! میں ٹھیک ہوں۔“ پھر بڑے سوز و گم سے بولی۔

دہلڑتے ہوئے بولی۔

”شعیب یہاں کیسے ہے؟“  
 ”یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم، وہ ہر حال میں تاجاں مائی سے ملتا چاہتا ہے، بلکہ اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔“ زبیر نے کہا تو اادیہ نے ماں بی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ماں! یہ سب کیا ہو گیا ہے۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔“  
 شدت جذبات سے کچھ نہ کہہ سکی۔ جب ماں بی نے سکون سے کہا۔

”تم سب سکون کرو۔ میں کچھ کرتی ہوں۔“ پھر پاس کھڑی ملازمہ سے کہا۔ ”جاؤ۔ دیوان سے کہنا، میں بلا رہی ہوں۔“

دوستے ہی پلٹ گئی۔ تب ماں نے تاجاں مائی سے کہا۔ ”تم باہر سے آنے والوں سے ملاؤ گی۔ کچھ بھی نہیں بتاؤ گی، بلکہ یہ کہو گی کہ تم یہاں حوٹلی میں رہنا چاہتی ہو، تم پر کوئی تشدد نہیں ہوا۔ وہ لوگ بچلے جائیں تو پھر میں سنبھال لوں گی۔ اپنے بیٹے کو بھی سمجھا دینا۔“

”جی جی! ہاں بی سائیں۔ میں ایسا ہی کروں گی۔“  
 تاجاں مائی نے سعادت مندی سے کہا اور پرسکون ہوئی۔

نادیہ کچھ گئی تھی کہ ماں بی کیا کرنے جا رہی ہیں۔ اس لیے خاموش رہی۔

مردان خانے میں چیر سائیں اپنی خصوصیت نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دائیں طرف پرے سے صوفوں پر شعیب اور ابا کاڑھی بیٹھے ہوئے تھے اور تاجاں مائی کا بیٹا کچھ کاٹیلے پر کھڑا تھا جیسا دیوان بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے درمیان بائیں قسم ہو چکی تھیں، صرف فیصلہ چیر سائیں پر تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ شعیب اس سے زرا مرعوب نہیں ہوا تھا۔ اس نے چیر سائیں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تاجاں مائی کا مطالعہ کیا تھا۔ اس دوران نون بھی آتے رہے اور بحث بھی چلتی رہی۔ تب اچانک چیر سائیں نے کہا۔

”ٹھیک ہے، میں آپ لوگوں کو تاجاں سے ملوا دیتا ہوں۔“

یہ کہنے کے ساتھ ہی باتیں ختم ہو گئی تھیں اور وہ لوگ تاجاں مائی کی آمد کے منتظر تھے۔ چند لمحے گزرے

مردان خانے میں چیر سائیں اپنی خصوصیت نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دائیں طرف پرے سے صوفوں پر شعیب اور ابا کاڑھی بیٹھے ہوئے تھے اور تاجاں مائی کا بیٹا کچھ کاٹیلے پر کھڑا تھا جیسا دیوان بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے درمیان بائیں قسم ہو چکی تھیں، صرف فیصلہ چیر سائیں پر تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ شعیب اس سے زرا مرعوب نہیں ہوا تھا۔ اس نے چیر سائیں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تاجاں مائی کا مطالعہ کیا تھا۔ اس دوران نون بھی آتے رہے اور بحث بھی چلتی رہی۔ تب اچانک چیر سائیں نے کہا۔

”ٹھیک ہے، میں آپ لوگوں کو تاجاں سے ملوا دیتا ہوں۔“

یہ کہنے کے ساتھ ہی باتیں ختم ہو گئی تھیں اور وہ لوگ تاجاں مائی کی آمد کے منتظر تھے۔ چند لمحے گزرے

مردان خانے میں چیر سائیں اپنی خصوصیت نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دائیں طرف پرے سے صوفوں پر شعیب اور ابا کاڑھی بیٹھے ہوئے تھے اور تاجاں مائی کا بیٹا کچھ کاٹیلے پر کھڑا تھا جیسا دیوان بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے درمیان بائیں قسم ہو چکی تھیں، صرف فیصلہ چیر سائیں پر تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ شعیب اس سے زرا مرعوب نہیں ہوا تھا۔ اس نے چیر سائیں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تاجاں مائی کا مطالعہ کیا تھا۔ اس دوران نون بھی آتے رہے اور بحث بھی چلتی رہی۔ تب اچانک چیر سائیں نے کہا۔

دردیوار میں رہے گی، کیوں ظلم کرتے ہیں آپ؟“ زبیدہ کے لہجے میں حد درجہ احتجاج تھا۔ جب اماں نے چند لمبے خاموشی رہیں، پھر انتہائی نکل سے بولیں۔

”زبیدہ! یہ تمہیں نے کہا تھا کہ جو نادبہ چاہے گی، دبی ہوگا۔ اگر یہ تمہارے ساتھ جانا چاہتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اگر اسے دلدادہ شادھی روکے گا، تو میں تمہارے ساتھ کھڑی ہوں گی۔“

زبیدہ نے سنا اور پھر نادبہ کی طرف دیکھا، جو سر جھکائے ان کی بانہیں سن رہی تھی۔ اس نے سر اٹھایا اور زبیدہ کی جانب دیکھا، پھر لڑتے ہوئے لہجے میں بولی۔

”پھر بھو! اس نے اگر حویلی سے جانا ہی نہ تھا..... تو آپ کے ساتھ آپ کے گھر سے آئی ہی تانتا.....“

”یہ کیا کہہ رہی ہو دم؟ تم صرف میرا راز رکھنے کی خاطر خود کو بھینٹ چڑھا رہی ہو۔ میں اپنے نمبر پر یہ بوجھ قطعاً برداشت نہیں کر پاؤں گی۔ مہربی چند سے ایک پھیر لڑکی“ زبیدہ نے کہنا چاہا لیکن نادبہ نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں! میں مجبور نہیں اور نہ ہی کمزور ہوں۔ حویلی کے باہر جا کر اتنا حوصلہ مجھے ہو گیا ہے کہ میں اپنے حق کے لیے لڑ سکوں اور یہ حوصلہ اور ہمت میں نے حویلی والوں کو دکھا بھی دیا ہے۔ سبکی بات اگر میں کہوں کہ میری بہو سے آپ کا راز افشا ہو جاتا ہے تو میں اور میرا ضمیر یہ کیسے برداشت کر پائیں گے۔ بولیں۔“

”مجھے نظر اسے بیٹے کا ذرے۔ میں اسے بتا دوں گی..... تو پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ زبیدہ نے اُلجھتے ہوئے کہا۔

”آپ کے پاس کہا ضمانت ہے کہ وہ پھر بھی مجھ سے اپنا سیت پھرا سلوک کرے گا۔ وہ نفرت نہیں کرے گا۔ مجھ سے۔ میں زندہ دردگور جو گاؤں کی پھیر بھرا؟“ اس نے سوا لہ انداز میں بڑے جذباتی لہجے میں پوچھا۔

”نہیں جہاں میرا راز۔ کیا ہے میرا راز..... میں اپنے بیٹے کے لیے تمہیں کھودوں۔ مجھے امتحان میں مت ڈالو۔ ہم اسے بتائیں گے ہی نہیں کہ تم کون ہو، پھر مناسب دقت پر بتا دیں گے۔“ زبیدہ نے کہا۔

”جھوٹ کی بنیاد پر تیسری گئی عمارت کوچ کو ذرا سی

باتہ ملائے بغیر وہاں سے نکل کر باہر آ گیا۔ دو تیزی سے چلتا ہوا سردان خانے سے نکلا تھا۔ پیرس میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر دیوان کی طرف دیکھا اور بولا۔

”ان لوگوں کو بھی مجبور اور میں اب آرام کروں گا۔“

یہ کہہ کر وہ بھی سردان خانے سے نکل گیا۔ تب جانا مائی کا بیٹا فوراً اپنی ماں کی جانب آیا اور احتجاج کرنے والے انداز میں کہا۔

”اماں! یہ تو نے کیا کہا۔ کیوں جھوٹ بولا۔“

”نہم نہیں جانتے پترا تم جاؤ۔ میں حویلی ہی میں رہوں گی..... جاؤ تم۔“ جانا مائی نے بڑے پیار سے کہا۔

”نہیں اماں! میں نہیں جانتا کہ تو کیوں جھوٹ بول رہی ہے، پر میں تجھے یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ چلو میرے ساتھ بیٹے نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں، میں نے کہا نا..... تم جاؤ..... میں نہیں رہوں گی۔“ اس نے کہا اور وہاں پس پلٹ گئی۔ تب دیوان نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”جاؤ پترا جاؤ۔ اس حویلی کے بغیر تم لوگوں کا کوئی دردگا نہیں ہے۔ آرام سے گھر جا کر بیٹھو۔ جا۔“

اس کے یوں کہنے پر وہ سر نیچا کیے وہاں سے چلا گیا تو دیوان نے اپکار کی طرف دیکھا اور دونوں مسکرا دیئے۔

☆.....☆

نادبہ کے کمرے میں زبیدہ، اماں بی اور جانا پائی بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ شہب چاہتا ہے۔ وقت طور پر راز افشا ہونے کا خطرہ نہ لگیا تھا۔ اماں بی نے دیوان کے ذریعے سارا معاملہ سنسنا لیا تھا، لیکن نادبہ کے بارے میں زبیدہ تذبذب میں تھی کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ یہی سوال لیے وہ خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ ”مجھ اماں بی نے کہا۔“

”زبیدہ! میرے خیال میں تم وہاں لوٹ جاؤ۔ ایک طوفان جو حویلی میں اٹھنے والا تھا، وہی طور پر ہی کسی دودھم مچا ہے، اب جبکہ نادبہ بھی حویلی سے نکل جاتا جا تا تھا، ہم یہ سب بھول جاؤ، سمجھو کہ تم نے خواب دیکھا تھا۔ تم اپنی دنیا میں لوٹ جاؤ۔“

”لیکن اماں! آپ لوگ جانتے ہو جیسے نادبہ کو اپنی زندگی میں دھکیل رہے ہو۔ جہاں اس کی اپنی مرضی نہیں ہوگی۔ وہ زندہ ہوتے ہوئے بھی ایک لاش کی مانند ان

ہوا بھی گراؤتی ہے۔ کب تک ایسا کر پائیں گے۔ آپ خدا کے لیے اپنی دنیا میں چلی جائیں، اور مجھے میری قسمت کے حوالے کر دیں۔ جو ہو گا اب دیکھا جائے گا۔" نادیر نے اپنا بیعت سے کہا تو زبیدہ اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ اس کا دل نہیں مان و ہاتھ نہ تارو کہ وہ جس تباہ چھوڑ کر واپس چلی جائے۔ تب وہ چونک کر رہی۔

"نادیر! اجی! اگر میں شعیب کو سب کچھ بتا دوں اور اس کا رومل ووندہ جو جو تم سوچ رہی ہو، وہ بڑھ چھڑھیں میرے پاس اوت کر آنا ہوگا۔ میں تمہیں..."

"نہیں پھو پھو! میں جانتی ہوں۔ ظہیر شاہ میری زندگی میں آچکا ہوگا۔ ایسے میں ہی سب نامکون ہو جائے گا۔ خدا کے لیے پھو پھو، سب کچھ ہو کر رہیں۔ بھول جائیں مجھے۔ خدا کے لیے بھول جائیں۔" نادیر نے رو بانسا ہوتے ہوئے کہا تو اس نے اپنے مخصوص محل سے کہا۔

"زبیدہ! میرا نہیں خیال کہ یہ اب تمہارے ساتھ جائے گی۔ تم حیب چاہ واپس پلٹ جاؤ۔ میں ہلا در شاہ کو چھٹی نہیں بتاؤں گی کہ شعیب کون ہے۔ اسی خاموشی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے بی کے ذہنوں کی گالوں تک آگئے تھی۔ زبیدہ چند لمحے سر جھکا کر سوچتی رہی، اس کی آنکھوں سے بھی آنسو، وہاں ہو گئے تھے۔ وہ کچھ دیر تو خود پورا پورا پانی رہی، پھر اپنی ماں کے گلے لگ کر زار و قطار روئے گی۔ کافی دیر بعد اس کا من بلکا ہوا، پھر وہ نادیر کے گلے لگ کر خوب رہی۔ آنسوؤں کا یہ سیلاب کچھ دیر بعد ختم کیا تو وہ اٹھی اور باہر کی جانب چل دی۔ اس نے اپنی زانہ اور تاجاں ہائی اسے جانا ہوا دیکھتی رہیں۔ اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور حویلی سے نکلتی چلی گئی۔

☆.....☆

شعیب اپنے سرکاری گھر کے ولان میں یوں سر جھکائے جھٹا ہوا تھا جیسے زندگی کی بہت بڑی بازی ہار چکا ہو۔ اگرچہ وہ جس عقیدے کے لیے گیا تھا وہ پورا ہو گیا تھا، اسے تاجاں ہائی کی زندگی سے غرض تھی۔ وہ نہ صرف زندہ تھی، بلکہ اس کے سامنے آ کر اس نے بیان بھی دے دیا تھا۔ لیکن اسے اس وقت تک نہ دیکھا کہ وہ اپنے سب کچھ میں کیا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر انتہائی دکھی ہو گیا تھا۔ اس وقت وہ چوہدری ثار، اللہ کی بے بسی کو بھی دیکھ رہا تھا کہ ایک ایسے شخص کو کس

قدر ہے کس ہو گیا ہوگا۔ وہ وہاں اپنے دفتر نہیں گیا تھا، بلکہ سید صاحب کار کی رہائش گاہ آ گیا۔ وہ کچھ دیر تباہی میں خود کو نوسلہ دینا چاہتا تھا۔ پہلے تو اس نے سوچا تھا کہ زندگی کس قدر ہسک رہی ہے اور کتنی بے بسی ہے۔ اس کا بلکا و ناسخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ساتھ واپس نشست۔ پر بیٹھا اسے سمجھا تا رہا تھا کہ میرا سائیں سے سمجھ کر لینے میں ہی فائدہ ہے۔ وہ انہی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ اس کے دوست کا فون آ گیا۔ جسے اس نے نہر سے کہ پوچھا تھا کہ معلوم کرو۔ اس نے فال ریسیو کی اور پوچھا۔

"ہاں! میں گیا کوئی اپنا پنا۔"

"ہاں!... ٹوٹ کر... یہ کہنے ہی پنا لکھوانے لگا۔ وہ جلدی سے فون کرنے لگا۔ اس کے دوست نے پنا لکھوا ابا و فون بند کر دیا، جبکہ شعیب حیرت میں ڈوب گیا۔ اس کے سامنے جہ پنا تھا وہ۔ یہیں سلامت گھر کا تھا اور جس شخص کے نام تھا، وہ تاجاں ہائی کا بیٹا البان تھا۔ اس کا وائس محوم کرو گیا۔

"یہ کیا؟" اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا پھر زوراً ہی اس نے اپنے دوست کو فون کیا۔ اسے خبر پتا کر دو بارہ تصدیق کی۔ پتا وہی تھا۔

شعیب کی کچھ میں فضا کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ جس فون نمبر سے بات کر رہی ہے۔ وہ الیاں کا ہے۔ یہ کیا ماجرا ہے، کیا حویلی سے بھاگ جانے والی لڑکی، جس کا پاداش میں تاجاں ہائی مقرب ہوئی تھی۔ کیا ان کا آپس میں کوئی تعلق ہے۔ کہیں؟ وہ یہ وہی لڑکی تو نہیں ہے جو حویلی سے بھاگ گئی؟ کہیں وہ تارہ... اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا تھا۔ یہ کہا اتفاق ہے، جس نے اسے پوری جان سے لڑا کر رکھ دیا تھا۔ کافی زبردتہ کہ وہ سوچ ہی نہ سکا کہ یہ معنی کیا ہے؟ وہ بالکل سناکت و صامت یوں کر کہی پر بت بن گیا جسے اس میں کوئی جان ہی نہ ہو۔ وہ بالکل خالی الذہن ہو گیا تھا۔ اسے یہ پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اسے ہوش اس وقت آیا جب فون کی مسلسل بجتی ہوئی تھل نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ وہ چونک گیا۔ وہ فون اس کی والدہ کا تھا۔ اس نے جلدی سے کال ریسیو کر لی اور تیزی سے پوچھا۔ (جاری ہے)

☆.....☆



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڑیوم ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

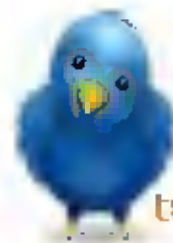
# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)